Registered No. L. 4584

منظور شدہ ڈائرکٹر صاحبان محکمۂ تعلیم برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ سندھ، ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

ماہنامہ

پیغامِ حق

اشاعت خاص

کتب سماوی پر ایک نظر

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈیمی

اقبال پر ایک نظر ۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ ۔ چہر

شرح اسرارِ خودی ۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے ۔ جہر

تعلیماتِ اقبال ۔ " " " " ۔ عہر

اقبال کا پیامِ حریت ۔ " " " " ۔ ۸ر

اقبال کا تصور زمان و مکان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۰ اہر

موت و حیات اقبال کے کلام میں " " " " ۔ ۱۴ر

تعلیم کا مسئلہ ۔ " " " " ۔ عہر

اقبال کے چند جواہر ریزے ۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید ایم اے ۔ ۱۰ر

یادِ اقبال ۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار ۔ عہر

حقیقتِ نفاق ۔ مرتبہ مولانا صدر الدین اصلاحی ۔ عہر

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ " " " ۔ عہر

اسلام اور وطنیت ۔ " " " ۔ جہر

معرکۂ اسلام و جاہلیت ۔ " " " ۔ جہر

محمد عبدہٗ ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات ۔ عہ

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈیمی

۵۴۔ (الف) سرکلر روڈ، بیرون موچی گیٹ، لاہور

ماھنامہ

پیغام حق

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۱۰	فروری ۱۹۴۵ء	عدد ۲

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر و پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس بیرون اکبری گیٹ

لاہور میں

طبع کرا کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا ——

قیمت سالانہ پانچ روپے   فی پرچہ

انگریزی اناجیل پر ایک نظر

انجیلوں کی قلت اور کمیابی کا زمانہ جاتا رہا۔ یہ کتابیں اب بہت کثرت سے شائع ہو رہی ہیں اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں لیکن آج کل انگریزی زبان نے دنیا میں جو پھیلاؤ اختیار کر رکھا ہے اس کی بنا پر بائبل پر تبصرہ پورا نہ ہوگا اگر اس کے انگریزی ترجمہ کی تاریخ پر بھی نظر نہ ڈالی جائے۔ اس کا کچھ تھوڑا سا ذکر توریت کے تحت میں بھی آ چکا ہے۔

انگلستان میں انگریزی ترجمہ کے لحاظ سے بھی انجیل پر دو دور گذر چکے ہیں ایک قبل ایجاد طباعت قلمی نسخوں کا دور۔ دوسرا بعد ایجاد طباعت مطبوعہ بائبلوں کا دور۔

دور اوّل میں ساتویں صدی عیسوی تک انجیل کے بعض حصوں کے ترجمے نظم میں کئے جاتے تھے آٹھویں صدی میں نثر میں ترجموں کی ابتدا ہوئی مگر یہ ترجمے بھی بائبل کے متفرق اجزاء کے ہوتے تھے چودھویں صدی کے وسط تک پوری بائبل کا کوئی مکمل ترجمہ انگلستان میں نہیں ہوا۔ سب سے پہلا مکمل ترجمہ بائبل کا انگلستان میں انگریزی زبان میں وکلف (Wycliffe) نے تقریباً ۱۳۸۲ء میں انجام کو پہنچایا اس کے ساتھ اس کام میں قابل لوگوں کی ایک جماعت بھی شریک رہی جن میں سے ایک شخص کا نام نکولاز (Nicholas) تھا۔ وکلف ان لوگوں میں سے تھا جو اس امر پر زور دیا کرتے تھے کہ پادریوں نے جو اہمیت اختیار کر رکھی ہے اور لوگوں کے دین و ایمان کے مالک بن بیٹھے ہیں اس کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں انجیل خدا کا کلام ہے اور ہر شخص کی ہدایت کے لئے کافی ہے ہر شخص خدا کے احکام براہ راست انجیل سے معلوم کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا شخص پادریوں کی نگاہ میں مقبول نہیں ہو سکتا چنانچہ اس ترجمہ پر پادریوں نے شور مچایا کہ ترجمہ غلط اور گمراہ کن ہے وکلف نے اس شور و واویلا کی پرواہ نہ کی اور اس نے اور اس کی جماعت کے لوگوں نے

مردانہ وار اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ ۱۳۹۵ء اور ۱۳۹۷ء کے درمیان جماعت وکلف نے پہلے ترجمہ پر نظرِ ثانی کی اور اس پر ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دوسرا ترجمہ جان پروی (JOHN PURVEY) کی نظرِ ثانی کا نتیجہ ہے اور مقدمہ بھی اسی کا لکھا ہوا ہے اور یہ سب کچھ اس نے وکلف کے انتقال (۱۳۸۴ء) کے بعد کیا۔ پہلا ترجمہ بیشتر لفظی تھا اور دوسرا ترجمہ با محاورہ۔ یہ چودھویں صدی کا کارنامہ تھا۔ پندرھویں صدی میں بائبل کی کوئی خدمت نہ ہوئی۔ بلکہ حکومت کی جانب سے کتب مقدسہ کی اشاعت اور ترجمہ کرنے والی جماعتوں پر سختیاں توڑی گئیں اور پادریوں کی تبلیغ پر بدترین قسم کا غلبہ رہا۔ چودھویں صدی میں انگلستان میں ریفارمرز یعنی مجددین مذہب کی ایک جماعت لالرڈس (LOllARds) کے نام سے پیدا ہوگئی تھی اور وکلف جان پروی اور سرجان اولڈکیسل وغیرہم اسی جماعت کے پیشوا اور رہبر تھے۔ پندرھویں صدی میں اس جماعت کو ایسا نیست و نابود کر دیا گیا۔ کہ آج ان کا کوئی نشان تک باقی نہیں۔ اس جماعت کے زبردست اور معزز سرپرست اور برگزیدہ سرجان اولڈکیسل (SIR JOHN OLDCASTLE) کو اس سرپرستی کی جرم میں مرتد قرار دیکر زندہ جلا دیا گیا۔

ایجادِ طباعت کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے مگر اس دور کے شروع ہونے کے بعد بھی انگلستان بہت عرصہ تک سوتا رہا۔ فنِ طباعت کی ایجاد ۱۴۵۰ء میں وقوع میں آئی۔ ۱۵۲۲ء تک جرمنی میں بائبل کے ترجمہ کی طباعت و اشاعت ہو چکی تھی اور لوتھر کی اصلاحی جدوجہد کے آغاز سے قبل یعنی تقریباً ۱۵۲۱ء سے پہلے وہاں وہ کتاب سترہ (۱۷) مرتبہ اور چھپ چکی تھی۔ ہینری ششم کے تختِ انگلستان پر آنے سے قبل یعنی ۱۵۰۹ء سے بہت پیشتر فرانس، اسپین، اٹلی، بوہیمیا اور ہالینڈ میں بائبل کے ملکی زبانوں میں ترجمہ طباعت کے ذریعے شائع ہو چکے تھے۔ مگر انگلستان میں ۱۵۲۵ء سے قبل طباعتِ انجیل کا اہتمام ناممکن رہا۔ اس سے قبل انگلستان کے ایک فاضل ولیم ٹینڈیل (William TYNdAle) نے اپنے ہموطنوں کو مضامین بائبل سے آگاہ کرنے کے شوق میں انجیل کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا اور کئی برس تک اسی جدوجہد میں رہا۔

اس کام کے لئے انگلستان کی زمین کو اس نے اپنے لئے تنگ پایا اور وہ اپنی جان بچا کر ممالک غیر میں بھاگ گیا۔ اور ۱۵۲۴ء میں پہلے ہیمبرگ میں پھر وٹن برگ میں پناہ گزین ہوا اور اپنے ترجمے کے کام میں مصروف رہا۔ ۱۵۲۵ء میں مقام کلون میں اس نے عہد جدید کا ترجمہ چھپوانا شروع کیا۔ مگر ریفارمیشن کے دشمن جان کاکلیس نے طباعت انجیل کے کام کو موقوف کرا دیا اور انگلستان کے بادشاہ کو کہلوا بھیجا کہ یہ زہریلے اوراق اس ملک میں داخل نہ ہونے پاویں۔ ٹینڈیل یہاں سے بھی بھاگ کر مقام ورمس میں پہنچا۔ جہاں اس نے اپنے کام کو جاری رکھ کر کسی نہ کسی طرح انجام پر پہنچایا اور ۱۵۲۶ء کے اختتام سے قبل اپنے مطبوعہ ترجمہ کو انگلستان میں داخل کر دیا۔ انگلستان میں یہ نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونا شروع ہو گئے۔ اس کا حکومت کی جانب سے یہ انعام ملا کہ جتنے نسخے مل سکے وہ سب کے سب برسر بازار جلائے گئے۔ مگر ٹینڈیل مردانہ وار اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے اپنے ترجمے کے متعدد ایڈیشن ہر مرتبہ نظر ثانی کے بعد نکالے اور سب سے آخری ایڈیشن انٹورپ سے ۱۵۳۴ء میں نکالا جس کا ایک نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک نسخہ آکسفورڈ ایگزیٹر کالج میں آج بھی موجود ہے مگر اس کارنامے کے بعد ٹینڈیل گرفتار کر لیا گیا قید میں رکھا گیا اور بالآخر ۶ اکتوبر ۱۵۳۶ء کو گلا گھونٹ کو مار ڈالا گیا اور اس کی نعش کو جلا دیا گیا۔

تماشہ کی بات تو یہ ہے کہ ۱۶۱۱ء میں انگلستان میں جو پوری بائیبل پہلی مرتبہ طبع ہوئی وہ ٹینڈیل ہی کی ترجمہ کی ہوئی بائیبل کی طرح جدید تھی ڈاکٹر ویسٹکوٹ اپنی کتاب تاریخ انگریزی بائیبل کے صفحہ ۲۱۶ پر لکھتے ہیں کہ

"انگریزی بائیبل کی تاریخ کی ابتدا ٹنڈیل کے کارناموں سے ہوتی ہے۔ نہ کہ وکلف کے کارناموں سے۔"

تقریباً اسی زمانہ میں مائیلس کورڈیل (MILES COVERDALE) نے بھی ایک ترجمہ چھپوایا۔ اور یہ ترجمہ بھی انگلستان سے باہر چھپا۔ یہ شخص ٹینڈیل ہی کی جماعت کے لوگوں میں سے تھا۔ اس نے اپنے ترجمہ میں لوتھر کی تفسیر سے بہت مدد لی۔

ٹنڈیل اور کوورڈیل کے نسخوں کی مقبولیت دیکھ کر انگلستان کے کتب فروشوں کے منہ میں بھی پانی آگیا۔ اور انہوں نے خیال کیا کہ انجیل کے ترجموں کی طباعت و اشاعت دولتمند بننے کا نہایت اچھا ذریعہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ چاروں طرف سے ترجموں کا شور مچنا شروع ہوگیا۔

جان راجرس (JOhN ROGERS) نے ٹامس متھیو (THOMAS MATTNE) کے نام سے بلحاظ طباعت ایک نہایت نفیس ترجمہ شائع کیا جو متھیوز بائیبل (MATTHEW BIBLE) کے نام سے موسوم ہے۔ مگر اس بیچارہ کا حشر بھی یہ ہوا کہ اُسے گرفتار کرکے زندہ جلا دیا گیا۔

اس کے بعد رچرڈ ٹریورنر (RICHARa TRAVERNER) نے اِدھر اُدھر کے ترجموں سے چوری کرکے ایک ترجمہ نکالا مگر یہ کچھ مقبول نہ ہوا۔

اب تک جتنے ترجمے شائع ہوئے تھے وہ افراد کی جانب سے تھے اور نجی طور پر شائع ہوئے تھے۔ حکومت کو ان میں کوئی دخل نہ تھا نہ پادریوں کو اُن سے کوئی سروکار ۱۵۳۹ء میں پادریوں اور بشپوں نے بڑے پیمانوں پر اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی جانب سے ایک مستند ترجمے کے طبع کرانے کا انتظام کیا۔ اور اُس کا نام دی گریٹ بائیبل (THE GREAT BIHIE) رکھا۔ پادریوں کے اس گروہ کے سرغنہ ٹامس کرینمر (THOMAS CRNMER) آرچ بشپ آف کینٹربری یعنی انگلستان کے لاٹ پادری تھے۔ مترجموں کی ایک جماعت مرتب کی گئی جس کے سرغنہ کوورڈیل بنائے گئے اور ترجمہ کی بنیاد میتھیوز بائیبل کو قرار دیا گیا۔ ترجمہ کا کام پیرس میں شروع اور لندن میں ختم کیا گیا طباعت کے لحاظ سے اور نمائشی اعتبار سے یہ بائیبل اپنے زمانہ میں بےنظیر تھی ۱۵۳۹ء سے ۱۵۴۱ء تک اس کتاب کے سات ایڈیشن نکل چکے تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۵۴۰ء میں نکلا ایک طویل دیباچہ آرچ بشپ کرینمر کے قلم کا لکھا ہُوا شامل کیا گیا اور اس بنا پر اس کا نام کرینمرز بائیبل پڑ گیا۔

اس وقت ایک طرف تو مذہبی بیداری کا یہ عالم تھا کہ اناجیل کے ترجموں پر ترجمے شائع ہو رہے تھے

حتیٰ کہ پادریوں کی جماعت تک نے ایک مستند ترجمہ شائع کر دیا تھا اور دوسری طرف حکومت کی طرف سے یہ برتاؤ ہو رہا تھا کہ احکام صادر ہو رہے تھے کہ ٹنڈیل کا ترجمہ کوئی نہ پڑھے کورڈیل کی بائبل کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ دوسرے ترجموں سے نوٹ اور حواشی خارج کر دیئے جائیں کوئی معمولی عورت، مزدور، قلی، کسان کاشتکار، خدمتگار، کاریگر، مسافر، بائبل کے کسی حصہ کو نہ پڑھے نہ اُسے کسی اور کام میں لائے نہ اُس پر عمل کرے، ورنہ سزائے جرمانہ یا قید کا مستوجب ہوگا۔ گریٹ بائبل کے موجد آرچ بشپ کرینر زندہ جلائے گئے۔ جان راجرس ان سے قبل ہی ختم کر دیئے گئے تھے۔ کورڈیل اور ان کے ہم مشرب ساتھی اپنی جان بچا کر بھاگے۔ اور جنیوا میں پناہ گزین ہوئے اس وقت جنیوا میں کالون اور بیزا بھی مقیم تھے جو اپنے زمانہ کے مشہور مصلح عیسویت اور ریفارمر تھے۔ یہاں ان لوگوں کو مل کر اپنا کام جاری رکھنے کی خاص مہلت مل گئی چنانچہ انہوں نے پھر ترجموں پر نظر ثانی کر کے بائبل کا ایک جدید ایڈیشن نکالا۔ جنیوا میں آ کر ان لوگوں کی محنت کا پہلا ثمرہ یہ نکلا۔ کہ جون ۱۵۵۷ء میں عہد جدید کا ایک نیا ایڈیشن نکلا جس میں کالون کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی شامل تھا۔ اور آیات و ابواب کی تقسیم بھی کی گئی تھی اناجیل میں یہ آیات و ابواب کی پہلی تقسیم تھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس تقسیم کے کرنے میں دوسری زبانوں کی اناجیل کی پیروی کی گئی ہے علاوہ اس کے اس نسخہ میں حواشی بھی تھے۔ بعض لوگ کالون کی اس کارگذاری کو ولیم وٹنگم (WILLIAM WHITTINGHAM) سے منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد جنیوا ہی سے سن ۱۵۶۰ء میں بائبل کا ایک مکمل ایڈیشن نکالا گیا جس میں عہد عتیق اور عہد جدید دونوں شامل تھے اور عہد عتیق میں بھی مثل عہد جدید مذکورۃ الصدر کے آیات و ابواب کی تقسیم کر دی گئی تھی۔ حواشی بھی درج تھے۔ اس کی طباعت کے مصارف اہل جنیوا نے برداشت کئے تھے اس لئے اس کا نام جنیوا بائبل پڑ گیا۔ اس نسخہ کے خاص مولف ولیم وٹنگم (WILLIAM WHITTINGHAM) انٹونی گلبی (ANTHONONY GILBY) اور ٹامس سمپسن (THOMAS SAMPSON

بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ نسخہ بہت مقبول ہوا اور گریٹ بائبل پر بھی فوقیت لے گیا آرچ بشپ میتھو پارکر (ARCHBISHOP MATTHEW PARKER) نے ۱۵۶۸ء میں جنیوا بائبل پر نظر ثانی کر کے اور چند حواشی کا اضافہ کر کے ایک جدید بائبل بنائی۔ اور اس کا نام بشپس بائبل (BISHOP S' BIBLE) رکھا مگر مقبولیت عام میں یہ جنیوا بائبل پر سبقت نہ لے جا سکی۔

ٹنڈیل کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک جتنے ترجمے شائع ہوئے سب اصلاح پسند لوگوں کے کئے ہوئے تھے۔ اب قدامت پسند رومن کیتھولکس کو بھی میدان میں آنے کا شوق ہوا چنانچہ "غلط ترجموں کے ذریعہ لوگوں کے عقاید کی خرابی کی روک تھام" کی غرض سے انہوں نے بھی ایک ترجمہ کر ڈالا۔ جو رومن ترجمہ ولگٹ کا لاطینی آمیز انگریزی ترجمہ ہے۔

انقلاب زمانہ کی اس سے عجیب تر مثال کیا ہوگی کہ جو حکومت پارلیمنٹری احکام کی قوت سے انجیل کے ترجموں کو جلا ڈالتی تھی، ترجمہ کرنے والوں کو قتل کر دیتی تھی، اور انجیل پڑھنے والے عوام الناس کو قید کر دیتی تھی وہ اب خود بائبل کا ترجمہ بڑے اہتمام سے کرتی ہے بادشاہ انگلستان شاہ جیمس اول جنوری ۱۶۰۳ء میں تخت انگلستان پر بیٹھتا ہے اور چند ہی ماہ بعد ہیمپٹن کورٹ کے محل میں ہر طبقہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے پادریوں کی کانفرنس کرتا ہے خود اس کا صدر بنتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کا ایک مستند ترجمہ کیا جائے بہترین اشخاص اور اعلیٰ ترین تعلیم کے لوگ بہترین انگریزی زبان میں ترجمہ کریں۔ سب پادری اور بشپ اس پر نظر ثانی کریں۔ پھر پریوی کونسل میں وہ پیش ہو اس کے بعد مہر شاہی اس پر ثبت ہو اور سارا چرچ اس کا اور صرف اسی کا مطیع ہو جائے۔ گویا فرمان خداوندی کو ایک عاجز دنیوی بادشاہ کی منظوری کا (نعوذ باللہ) محتاج بنا دیا گیا چنانچہ حکم کی تعمیل ہوتی ہے ۱۶۰۷ء میں کام شروع ہوتا ہے اور ۱۶۱۱ء میں کتاب چھپ کر تیار ہو جاتی ہے دی آتھرائزڈ ورشن (THE AUTHORIZED VERSION) یعنی مستند ترجمہ اور کنگ جیمس بائبل (KING JAME'S BIBLE) یعنی خدا کی نہیں بلکہ شاہ جیمس کی بائبل اس کا نام رکھا جاتا ہے

مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۵۶۸ء کی بشپس بائیبل (BISHOPS BIBLE) پر نظر ثانی کے سوا اس میں اور کچھ نہیں۔ اس مستند ترجمہ پر عیسائی علماء ہی کی جانب سے جس کثرت اور جس شدت سے اعتراضات ہوتے رہے ہیں ان کی جانب اشارہ ہم اپنے مضمون نمبر ۲ میں کر چکے ہیں انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (طبع جدید ۱۹۲۹ء جلد ۳) میں زیر عنوان "بائیبل" صفحہ ۵۲۳ پر صاف اعتراف کیا گیا ہے کہ "باوجود اس کے (یعنی باوجود اس خوبی کے جس سے کہ یہ ترجمہ کیا گیا ہے) ترجمہ کی اصلاح اور بہتری کا کام صدیوں سے اب بھی جاری ہے چنانچہ اس مستند ترجمہ کی جدید اشاعت کا مقابلہ ۱۶۱۱ء کی اصلی اشاعت سے کیا جائے تو بہت بڑا فرق نظر آئیگا" اصلاح و بہتری کی یہ کوششیں تو صدیوں تک جاری رہیں گی مگر ان سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہوگا اس مستند ایڈیشن کے بعد اس کام میں بعض امریکہ والوں کی بھی شرکت ہو گئی۔ اور ۱۸۸۱ء میں عہد جدید اور ۱۸۸۴ء میں عہد عتیق کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ ریوائزڈ ورشن (THE REVISED VERSION) کے نام سے چھپ کر نکل چکا ہے مگر خود عیسائی علماء کی بھی تسکین اس سے نہ ہوئی اور وہ اب تک تحقیق و تنقید و تفتیش کی ضرورت کو محسوس کئے جا رہے ہیں۔ منصف مزاج محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ ۱۲۸ء سے بائیبل کے اصل عبرانی متن سے کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ چوتھی صدی میں سینٹ جروم نے یونانی ترجمہ سے اپنا لاطینی ترجمہ کیا اور اس لاطینی ترجمہ سے رومی ولگٹ مرتب ہوا اور رومی ولگٹ سے یورپ کی تمام بقیہ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جس میں انگریزی زبان بھی شامل ہے اور اس بات کا سب کو اعتراف ہے کہ بائیبل کا اصلی اور سچا نسخہ اب دنیا سے مفقود ہے بس قصہ ختم شد۔ ظنیات کی بنا پر صحت کے متعلق اطمینان محال ہے۔

خصوصیات تعلیمی

اب تک کتب عہد جدید کے بحیثیت مجموعی معتبر یا غیر معتبر ہونے سے بحث تھی اب ان کتب مروجہ کی تعلیمی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے ضمناً اس امر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی کہ بعض تعلیمات حقیقتاً ہیں کیا اور انہیں عام طور پر کیا سمجھا گیا ہے۔

اناجیل مروجہ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کوئی جدید شریعت لیکر نہیں آئے۔ بلکہ

موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کو قائم رکھنے اور اُسے یہودیوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک صاف کرنے آئے تھے۔ گویا عیسویت موسویت ہی کا تتمہ ہے متی باب ۵ آیت ۱۷ تا ۲۰ میں خود عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے۔

"یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں۔ توریت کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی حکم کو توڑے گا۔ اور دوسروں کو توڑنے کی ہدایت کرے گا۔ وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو ان پر عمل کرے گا۔ اور ان کی دوسروں کو تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائے گا۔ پس میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکو گے۔"

متی باب ۲۳ آیہ ۱ تا ۳ میں منقول ہے کہ:۔

"تب یسوع لوگوں اور اپنے شاگردوں سے کہنے لگا کہ فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں اس لئے وہ جو کچھ تمہیں ماننے کو کہیں مانو اور عمل میں لاؤ لیکن اُن کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں مگر کرتے نہیں۔"

جب یہ ثابت ہو گیا کہ عیسویت موسویت کی ناسخ نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے ہر حکم کی تعمیل عیسائیوں پر فرض ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اس شریعت کے جس حکم کو چاہیں مانیں اور جسے نہ چاہیں نہ مانیں تو عیسوی تعلیمات کی خصوصیات دریافت کرنے کے لئے ضروری ہو گیا کہ توریت اور انجیل دونوں پر یکساں طور پر نظر ڈالی جائے انجیل میں توریت کی طرح احکام شریعت

کا نہ ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ عیسائی قیود شریعت سے آزاد ہیں دیگر صحف انبیا بنی اسرائیل بھی توریتی احکام شریعت سے خالی ہیں مگر داؤد اور یرمیاہ اور یسعیاہ اور عزرا اور دانیال اور حزقیل اور یشوع اور سموئیل نے اپنے آپ کو احکام توریت کی تعمیل سے مستثنیٰ نہ رکھا بلکہ خود عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ان احکام کی حفاظت کی اور اپنی امت کو ان کی تعمیل کا حکم فرمایا اور بار بار حکم فرمایا۔ اِن حالات میں عیسائیوں کا صرف مسیح پر ایمان لے آنا اور عملی اعتبار سے اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے آزاد رکھنا عیسوی نقطہ نظر سے بھی قابل اعتراض ہے۔

ایمان و عمل اناجیل کی رُو سے ایمان بلا عمل نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں گلیتون کے باب ۴ آیہ ۴ میں ہے کہ :-

" جب وقت پورا ہُوا تب خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو عورت سے پیدا ہو کے شریعت کے تابع ہُوا "

۱۔ تمطاؤس باب ۵ آیہ ۷ میں ہے کہ :-

" اگر کوئی اپنوں کی اور خاص کر اپنے ہی گھر کی خبر گیری نہ کرے تو ایمان سے منکر اور بے ایمان سے بدتر ہے "

گھر کی خبر گیری عمل ہے اور اس عمل سے غافل رہنا ایمان تک کی بربادی کا باعث بتلایا گیا ہے عمل کی ضرورت اس سے ظاہر ہے۔

۲۔ تمطاؤس باب ۲ آیہ ۱۹ میں ہے کہ " جو مسیح کا نام لیتا ہے بدی سے باز رہے " لوقا باب ۱۹ آیہ ۷، ۸ میں یہ واقعہ درج ہے۔ کہ محصول لینے والوں کے سردار اور متمول شخص زکی نے جب کھڑے ہو کر مسیح سے کہا کہ " میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر کسی کا کچھ دغا بازی سے لیا ہے تو اس کا چوگنا دیتا ہوں " تو یسوع نے اس کے حق میں کہا کہ " آج اس گھر میں نجات آئی " یہاں بھی نجات کا انحصار عمل پر ہوا

متی باب ۷ آیہ ۲۱ تا ۲۴ میں ہے کہ :۔

"ہر ایک جو مجھے خداوند خداوند کہتا ہے آسمان کی بادشاہت میں شامل ہوگا مگر وہی جو میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے اُس دن بہتیرے مجھے کہیں گے اے خداوند اے خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے دیوں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سی کرامات ظاہر نہیں کیں۔ اس وقت میں ان سے صاف کہوں گا کہ میں کبھی تم سے واقف نہ تھا۔ اے بدکارو میرے پاس سے دور ہو پس جو کوئی میری یہ باتیں سنتا اور اُنہیں عمل میں لاتا ہے میں اسے اس عقلمند آدمی کی مانند ٹھہراتا ہوں جس نے چٹان پر اپنا گھر بنایا۔"

متی باب ۱۶ آیہ ۲۷ میں قیامت کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ درج ہیں :۔

"ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آوے گا تب ہر ایک کو اُس کے اعمال کے موافق بدلا دیگا۔"

عہد عتیق اور عہد جدید کی متعدد کتابوں میں بکثرت اور بصراحت آیا ہے کہ قیامت کے دن اعمال نیک اور اعمال بد پر جزا وسزا مترتب ہوگی۔ لوقا کے باب ۱۰ میں ایک واقعہ درج ہے کہ کسی شریعت سکھلانے والے نے عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ میں کیا کروں جو نجات پاؤں آپ نے فرمایا کہ شریعت کے احکام بجالا۔ نجات اسی سے ہوگی۔ یوحنا باب ۱۴ آیہ ۱۵ میں ہے کہ :۔

"اگر تم مجھے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو" طیطس باب ۱ آیہ ۱۶ میں ہے کہ :۔

"خدا کے پہچاننے کا اقرار تو کرتے ہیں پر کاموں کی راہ سے اس کا انکار کرتے ہیں وے نفرت کے لائق اور نافرمانبردار ہیں۔ اور ہر ایک نیک کام کے لئے نامقبول" مکاشفات باب ۲۲ آیہ ۱۴ میں ہے کہ :۔

"مبارک وے ہیں جو اُس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں تاکہ زندگی کے درخت پر ان کا اختیار ہو اور وے اُن

دروازوں سے شہر میں داخل ہوں مگر کتے اور جادوگر اور حرامکار اور خونی اور بت پرست اور جو کوئی جھوٹ کو چاہتا اور بولتا ہے سب باہر ہیں" یعقوب باب ۲ آیات ۱۴ تا ۲۶ بھی ملاحظہ ہوں :-

اے میرے بھائیو اگر کوئی کہے کہ میں ایماندار ہوں اور عمل نہ کرتا ہو تو کیا فائدہ کیا ایسا ایمان اسے بچا سکتا ہے۔ اگر کوئی بھائی یا بہن ننگا ہوے اور روزینہ کی روٹی میسر نہ ہو اور تم میں سے کوئی انہیں کہے کہ سلامت جاؤ گرم اور سیر ہو پر تم انہیں وے چیزیں نہ دو جو بدن کو ضرور ہیں تو کیا فائدہ۔ اسی طرح ایمان بھی اگر عمل کے ساتھ نہ ہو تو وہ اکیلا ہو کر مردہ ہے لیکن شاید کوئی کہے کہ ایمان تجھ میں ہے اور میرے پاس اعمال - بھلا تو اپنا ایمان بغیر اپنے اعمال کے مجھ پر ظاہر کر۔ اور میں اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے تجھ پر ظاہر کروں گا۔ تو ایمان لاتا ہے کہ خدا ایک ہے اچھا کرتا ہے شیاطین بھی یہی مانتے ہیں اور تھرتھراتے ہیں پر اے واہی آدمی کب تجھ کو معلوم ہو گا کہ ایمان بے اعمال کے مردہ ہے کیا ہمارا باپ ابرہام اعمال سے راست باز نہیں ٹھیرایا گیا . . . . . پس تم دیکھتے ہو کہ آدمی اعمال سے راست باز ٹھیرایا جاتا ہے اور صرف ایمان سے نہیں × × × × پس جیسا بدن بے روح مردہ ہے ویسا ہی ایمان بے اعمال مردہ ہے"

انجیل میں جہاں اقتباسات مندرجہ بالا کی رو سے ایمان کے ساتھ عمل کی ضرورت پر اس شد و مد کے ساتھ زور دیا گیا ہے وہاں تماشے کی بات یہ ہے کہ بعض "کتب مقدسہ" میں مثلاً پولوس کے رومیوں کے نام خط کے ابواب ۳ و ۴ و ۶ میں اور انہیں پولوس کے گلیتون کے نام خط کے باب ۵ میں یہ بھی لکھا ہے کہ صرف مسیح پر ایمان لانا نجات کے لئے کافی ہے اور اعمال خیر پر اعتماد محض بیوقوفی ہے اور شریعت پر چلنے والے لوگ مسیح سے جدا ہو جاتے ہیں اور سرے سے عیسائی ہی نہیں رہتے اور خدا کی رحمت سے مایوس ہیں چنانچہ زمانہ کے مدعیان عیسویت کا مسلک بیشتر یہی پایا جاتا ہے۔ جن کتابوں میں تحریفات و الحاقات و اختلافات

ہونا مسلم ہو اُن میں اس قسم کے متضاد و متناقض مضامین کا پایا جانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔
ایمان و عمل کے مسئلہ میں اس اختلاف کی ابتداء پولوس کے زمانہ میں واقع ہوئی اور پولوس کی جماعت ہی شریعت موسوی کی اس بے احترامی کی ذمہ دار ہے ابتداء میں حواریوں نے تبلیغ مذہب کا دائرہ صرف یہودیوں ہی تک محدود رکھا تھا۔ پولوس اس زمانہ میں علیسویت کا سخت دشمن تھا اس نے حواریوں اور ان کے متبعین کو بڑی بڑی ایذائیں پہنچائیں جب وہ تائب ہو کر اپنی ان حرکتوں سے باز آیا اور دین علیسوی میں داخل ہوا تو برنباس کی ہمراہی میں اس نے بھی تبلیغی امور میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی تبلیغی کوششوں کو اقوام غیر یہود تک (جنھیں اس زمانہ میں "جنٹائلز" کہتے تھے) پہنچایا۔ ان کوششوں کی کامیابی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس نے جو تدبیریں سوچیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ غیر یہود اقوام کے لوگوں میں سے جدید ایمان لانے والوں کو احکام توریت کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے چنانچہ بیت المقدس کی مذہبی جماعت کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ عہد جدید کی کتاب اعمال باب ۱۵ (از آیہ ۲۲ تا ۲۹) میں ان الفاظ میں درج ہے۔

تب رسولوں اور بزرگوں نے سارے کلیسیہ سمیت بہتر جانا کہ اپنے میں سے کئی شخص چن کے پولوس اور برنباس کے ساتھ انطاکیہ میں بھیجیں۔ یعنی یہوداہ کو جس کا لقب برسباس ہے۔ اور سیلاس کو جو بھائیوں میں مقدم تھے۔ اور ان کے ہاتھ یہ لکھ بھیجا کہ اُن بھائیوں کو جو غیر قوموں میں سے ہیں اور انطاکیہ اور شام اور سلیشیہ میں رہتے ہیں رسولوں اور بزرگوں اور بھائیوں کا سلام۔ از بسکہ ہم نے سُنا ہے کہ ہم میں سے بعضوں نے جن کو ہم نے حکم نہیں کیا جا کر تمہیں اپنی باتوں سے گھبرا دیا ہے اور تمہارے دلوں کو یہ کہہ کے پریشان کر دیا ہے کہ ختنہ کرو اور شریعت پر چلو۔ سو ہم نے باہم متفق ہو کر یہ بہتر جانا کہ اپنے عزیزوں برنباس اور پولوس کے ہمراہ جو کہ ایسے لوگ ہیں

جنہوں نے اپنی جان ہمارے خداوند یسوع مسیح کے نام پر خطرہ میں ڈالی۔ بعض منتخب اشخاص کو تمہارے پاس بھیجیں چنانچہ ہم نے یہوداہ اور سیلاس کو بھیجا جو تم سے زبانی بھی یہ باتیں بیان کریں گے۔ کیونکہ روح القدس نے اور ہم نے بہتر جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور کوئی بات کا بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کے چڑھاووں اور لہو اور گلا گھونٹی ہوئی چیزوں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے کو بچائے رہو گے تو خوب کرو گے۔ سلامت رہو۔ تب وے رخصت ہو کر انطاکیہ میں آئے اور جماعت کو اکٹھا کر کے وہ خط اُنہوں نے دیا اور جماعت کے لوگ اُس خط کو پڑھ کر اس تسلی کی بات سے خوش ہوئے۔"

یہ پہلا پولوسی گولہ تھا جو عیسائیوں کی پابندی شریعت پر پڑا۔ آگے چل کر یہودی اور غیر یہودی عیسائیوں کا امتیاز بھی اُٹھ گیا اور اس رخصت نے اباحت کی صورت اختیار کرلی۔ پھر اباحت نے استحباب کی صورت اختیار کی اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ شریعت کی پابندی بدعت اور بعض صورتوں میں کفر قرار دی گئی۔ شریعت موسوی سے نفرت اور بیزاری کا اظہار ہونے لگا اور اس اظہار نفرت میں توریت و شریعت ہم معنی الفاظ سمجھے جانے لگے۔ یہی پولوس ہیں جو رومیوں کے خط باب ۴ آیہ ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ۔

"شریعت قہر کا سبب ہے"

اور قرنتیوں کے دوسرے خط کے باب ۳ آیہ ۱۳ و ۱۴ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہم موسیٰ کی طرح عمل نہیں کرتے جس نے اپنے چہرہ پر پردہ ڈالا تاکہ بنی اسرائیل اس اٹھ جانے والی کی غایت تک بخوبی نہ دیکھیں"

اور عبرانیوں کے خط باب ۷ آیہ ۱۸ و ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اگلا قانون (یعنی توریت کے دس حکم) اس لئے کہ کمزور اور بیفائدہ تھا اُٹھ گیا۔

کیونکہ شریعت نے کچھ کامل نہ کیا۔"

اور گلیتون کے خط باب ۵ آیہ ۴ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"تم جو شریعت کی رو سے راست باز بنا چاہتے ہو تو مسیح سے جُدا ہوئے اور فضل کی نظر سے گر گئے۔"

اور قلسیون کے خط باب ۲ آیہ ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اُس نے (یعنے مسیح نے) تمہارے سب گناہ بخشدے اور حکموں کی دستاویز جو ہمارے مخالف تھی۔ (یعنی توریت کے احکام خداوندی جو پولوس کے مخالف تھے ہماری بابت مٹا ڈالی (یعنی پولوسیوں کے لئے وہ احکام منسوخ کردئیے) اور اس کو بیچ میں سے اٹھا کے صلیب پر کیلیں جڑ دیں۔ (یعنی ان احکام کو نہ صرف نیست و نابود کر دیا بلکہ ذلت کی سزا دیکر نیست و نابود کیا کہ عیسائیوں کے سامنے اب ان کا نام لینا بھی گناہ ہوگیا) اور حکومتوں اور ریاستوں کا اقتدار چھین لیا۔ اور اُنہیں برملا رسوا کرکے اُن پر شادیانے بجائے۔"

یہاں "حکومتوں اور ریاستوں کا اقتدار چھین لیا" سے یہ مراد ہے کہ شریعت سکھلانے والے ہوں اور فریسیوں کو جو اقتدار حاصل ہوگیا تھا وہ بوجہ تعطیل شریعت اُن سے جاتا رہا اور ان کی رسوائی اور بیقدری پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

بلندی سے پستی کی جانب اترنا آسان ہے مگر پستی سے بلندی پر آنا ذرا مشکل ہے انسان بالطبع آزادی پسند اور آسانی پسند واقع ہوا ہے جب پولوس نے شریعت کی بندشوں کو نہایت بے باکی کے ساتھ اس ڈھیلا کردیا تو ان کے متبعین نے ان کے بعد کیا کچھ گل نہ تراشے ہوں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے مشہور مجدد و مصلح و ریفارمر اور فرقہ پروٹسٹنٹ کے بانی مارٹن لوتھر ۱۴۸۳ء تا ۱۵۴۶ء عیسائیوں کو کلیہ

اور پادریوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے جوش میں انہیں اصلی مذہب کی پابندی سے بھی آزاد کئے دیتے ہیں۔ لوتھر صاحب کی تصانیف میں اس طرح کے فقرے بکثرت پائے جاتے ہیں کہ:۔ "ہم نہ سنیں گے اور نہ دیکھیں گے موسیٰ کو اس لئے کہ وہ صرف یہودیوں کے لئے تھا اور اس کو ہم سے کسی چیز میں علاقہ نہیں ہے" "ہم نہ قبول کریں گے موسیٰ کو اور نہ اس کی توریت کو اس لئے کہ وہ تو دشمنِ عیسیٰ ہے"۔ "موسیٰ تو جلادوں کا استاد ہے"۔ "دس حکموں کو عیسائیوں سے کچھ علاقہ نہیں"۔ "ان دس حکموں کو خارج کرنا چاہئے تاکہ تمام بدعت ابھی موقوف ہو جائے کیونکہ یہ احکام جملہ بدعات کے سرچشمے ہیں"۔ "خدا گناہ کا موجب ہے" (نعوذ باللہ)۔ "انسان گناہ سے بچنے پر مختار نہیں"۔ "دس حکموں پر عمل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے"۔ "فقط ایمان۔ رکھو اور یقین کر لو کہ روزے اور پرہیزگاری اور اعمال نیک کی مشقت کے بغیر تم بخشے جاؤ گے اور تمہاری نجات اتنی یقینی ہے جتنی کہ خود مسیح کی۔ ہاں گناہ کرو اور خوب دلیری سے گناہ کرو فقط ایمان رکھو اگرچہ ایک دن میں تم ہزار مرتبہ حرامکاری یا خون کے مرتکب ہو صرف ایمان رکھو۔ اور میں کہتا ہوں کہ تمہارا ایمان تم کو بچا لیگا"۔

لوتھر کے شاگرد رشید یوسی بیوس جو کہ فرقہ انٹی نومنس کے بانی ہیں لکھتے ہیں کہ:۔ "یہ دس حکم کلیسہ میں نہ سکھلائے جائیں"۔ "جو لوگ دس احکام کی تعمیل میں مصروف رہتے ہیں وہ شیطان سے علاقہ رکھتے ہیں۔ وہ سولی پائیں موسیٰ کے ساتھ"۔ یہ دس احکام عہدِ عتیق کی کتاب خروج باب ۲۰ میں بالتفصیل درج ہیں اور مختصراً یہ ہیں۔

۱۔ شرک نہ کرو۔

۲۔ بت پرستی نہ کرو۔

۳۔ خدا کا نام بے فائدہ مت لو۔

۴۔ یوم السبت کو پاک رکھو اور اس دن کوئی کام نہ کرو۔

۵- ماں باپ کی عزت کرو۔

۶- خون مت کرو۔

۷- زنا مت کرو۔

۸- چوری مت کرو۔

۹- پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دو۔

۱۰- ہمسایہ کو تکلیف نہ دو۔

ان احکام عشرہ کے عدم تعمیل کے معنے یہ ہوئے کہ شرک کرو، بت پرستی کرو، خدا کا نام بے فائدہ لو یوم السبت کی بے احترامی کرو۔ ماں باپ کی عزت نہ کرو، خون کرو، زنا کرو، چوری کرو، پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہیاں دو" ہمسایوں کو تکلیف پہنچاؤ۔ اس دستور العمل کا نام مذہب رکھا گیا ہے اور اس پولوسی مذہب کے بانیوں نے اس دستور العمل کی صرف زبانی تعلیم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور ان لوگوں کے سوانح کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لوتھر اور پوپی بیوس وغیرہ نے اس کے مطابق عمل کر کے بھی دکھلا دیا۔ اس زمانے کے جو عیسائی اُن تعلیمات پر عمل کرتے ہیں ان کو مسلمان علمائے محققین عیسائی نہیں کہتے بلکہ پولوسی کہتے ہیں اور اہل کتاب کے زمرہ سے خارج کرتے ہیں جو احکام کہ اسلام میں اہل کتاب کے متعلق اور مسلمانوں کے اہل کتاب سے برتاؤ کے متعلق آئے ہیں ان سے پولوسی گروہ کو متمتع ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بہر حال ہم کو اس سلسلہ مضامین میں پولوسی گروہ کے عقائد و اعمال سے سروکار نہیں ہم کو تو کتب سماوی کے سلسلہ میں تعلیمات انجیل پر تبصرہ کی ضرورت ہے ان تعلیمات کو موجودہ عیسائی مسیحیت قبول کریں یا نہ کریں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو حکم دیا تھا کہ علمائے یہود کی ذاتی خرابیوں سے بچو اور ان خرابیوں میں ان کی تقلید نہ کرو۔ مگر جو کچھ وہ انہیں شریعت موسوی کی بابت تعلیم دیں اُس پر

...ر کیونکہ احکام توریت عیسائیوں کے لئے واجب العمل ہیں گویا شریعت موسوی اور شریعت ...وی ایک ہی چیز ہے اب ہم اس اعتبار سے شریعت عیسوی کی چند خصوصیات یہاں بیان کرتے ...تاکہ لوگوں کو آج کل کے "عیسائیوں" یا پولوسیوں کی عام روش دیکھ کر اصلی عیسوی تعلیم کے متعلق غلط ...یاں واقع نہ ہوں ۔

...ہارت | احبار باب ۱۵، اور استثنا باب ۲۳، اور دوم سموئیل باب ۱۱ اور عہد جدید کے دوم ...تھیوں کے باب ۷ میں طہارت پر بڑا زور دیا گیا ہے مگر ان کی تعمیل پر آج کل بالعموم اس قدر زور نہیں ...یا جاتا

ختنہ | پیدائش باب ۱۷ میں آیہ ۹ سے ۱۵ تک ختنہ کا حکم ہے اور اس حکم پر زور دیا گیا ہے اور ...سے اللہ کا عہد قرار دیا گیا ہے یہ حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے :۔

> "اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے (یعنی ابراہام کے) درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے تمہارے پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا کیا گھر کا پیدا کیا پردیسی سے خریدا ہوا جو تیری نسل کا نہیں لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زرخرید کا ختنہ کیا جائے اور میرا یہ عہد تمہارے جسموں میں عہد ابدی ہوگا اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا۔ وہ ہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا"

تعجب ہے کہ ایسے صریح اور ایسے شدید ایسے اہم حکم کو عیسائیوں نے پس پشت ڈال دیا حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کا ختنہ ہوا تھا (دیکھو لوقا باب ۲ آیہ ۲۱) اور یوحنا بپتسما دینے والے کا بھی ختنہ ہوا تھا (دیکھو لوقا باب ۱ آیہ ۵۹) پولوس نے بھی عروج مسیح کے بیس سال بعد یعنی تخمیناً ۵۲ء یا ۵۳ء میں تماؤس کا ختنہ کیا

(دیکھو اعمال باب ۱۶ آیہ ۱ تا ۳)

آج کل کے عیسائی اصطباغ کو ختنہ کا قائم مقام قرار دیتے ہیں مگر یہ خیال کئی وجوہ سے غلط ہے:

۱- انجیل میں کہیں کوئی حکم ایسا نہیں پایا جاتا جس کی رو سے اصطباغ کو قائم مقام ختنہ قرار دیا جا سکے۔

۲- اگر اصطباغ صحیح طور پر قائم مقام ختنہ ہے تو مختونوں کو اصطباغ کیوں دیا جاتا ہے؟ یعنی کوئی یہودی یا مسلمان عیسائی ہو تو اسے اصطباغ دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

۳- اصطباغ یہودیوں میں بھی ختنہ کے ساتھ ہمیشہ سے جاری تھا ایسی صورت میں ایک چیز دوسری چیز کی قائم مقام صرف اپنی رائے سے کیسے ہو سکتی ہے؟

روسن تاریخ کلیسا حصہ ۲ صفحہ ۳ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم کے کلیسا میں عیسائیوں میں سنہ ۱۵۰ء کے قریب تک ختنہ کا دستور جاری رہا۔ جب یہودیوں کی مخالفت کے سلسلہ میں قیصر ادرین نے حکم جاری کیا کہ ہر ختنہ کرنے والا قتل کیا جائے اس وقت فلسطین کے عیسائیوں نے اس خوف سے کہ ان پر یہودی ہونے کا شبہ کیا جائے نہ صرف ختنہ کو بلکہ تمام ان رسوم کو جن میں وہ اور یہودی مشترک تھے موقوف کر دیا۔ اور ایک غیر یہودی مرقس کو اپنا پیشوا قرار دے کر الگ ہو گئے اور جان کے خوف سے اپنی روش کو بدل ڈالا۔ مگر بعض عیسائیوں نے باوجود ان خطرات کے اپنی روش کو نہ بدلا۔ اور اپنی قدیم چال پر قائم رہے اور اپنی جماعتوں کو علیحدہ کر لیا۔ انہیں لوگوں کو ابیونی کہتے ہیں۔

لحم الخنزیر سور کا گوشت نہ صرف کھانا بلکہ اسے ہاتھ تک لگانا حرام ہے دیکھو احبار باب ۱۱ آیہ ۷ اور استثناء باب ۱۴ آیہ ۸ اور یسعیاہ باب ۶۵ آیہ ۳ و ۴ اور باب ۶۶ آیہ ۱۷ عہد جدید کی کتاب اعمال کے باب ۱۵ کی آیہ ۲۹ میں ہے کہ:-

"تم بتوں کے چڑھاووں اور گلا گھونٹی ہوئی چیزوں اور حرامکاری سے پرہیز کرو"۔ اس آیہ میں تحریف ہے بجائے "لحم الخنزیر" کے "حرامکاری" کا لفظ داخل کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف کھانے پینے کی

چیزوں کی علت و حرمت کا ذکر ہے حرامکاری دوسرے مقامات پر حرام قرار دی گئی ہے یہاں اس کا ذکر بے جوڑ ہے قدیم یونانی نسخوں میں اس جگہ کو تر یاس کا لفظ پایا جاتا ہے جس کے معنی لحم الخنزیر کے ہیں۔ جدید نسخوں میں اس لفظ کو پورنیاس سے بدل دیا گیا جس کے معنی زنا کے ہیں۔ ڈاکٹر بینٹلی اور مسٹر رویس جو اناجیل کے بڑے مصحح ہیں لفظ کو تر یاس ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

مئے نوشی احبار باب ۱۰ آیہ ۹ و ۱۰ کی رو سے شراب قطعاً حرام ہے اور نہایت شدت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے حرام کر دی گئی ہے۔ عہد جدید کی کتاب اول قرنتیوں کے باب ۶ کی آیات ۹ اور ۱۰ کی رو سے شرابی "خدا کی بادشاہت کا وارث" نہیں ہو سکتا یعنی اس کا جہنمی ہونا قطعی ہے متی باب ۲۴ آیہ ۴۹ و ۵۰ سے تو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ شرابیوں اور متواوں کے ساتھ کھانا بھی مسیح کی نگاہ میں گناہ تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ انجیل یوحنا (باب ۲) میں جو مسیح کا سب سے پہلا معجزہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شرابیوں کی مجلس میں جا کر مشکوں میں بھرے ہوئے پانی کو شراب بنا دیا۔ پولوس نے تطاؤس کو حکم دیا کہ شراب پیا کرو۔ (اول تمطاؤس باب ۵ آیہ ۲۳) کہتے وقت عیسائی سیکرمنٹ میں نان پاؤ اور شراب کا استعمال کرتے ہیں اور اُسے مسیح کی آخری وصیت اور یادگار سمجھتے ہیں اور اسے عشاء ربانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پولوس نے طیطس کے نام اپنے خط میں (باب ۱ آیہ ۱۵) صاف لکھ دیا ہے کہ:۔

"پاک لوگوں کے لئے سب کچھ پاک ہے پر ناپاکوں اور بے ایمانوں کے لئے کچھ پاک نہیں" اس الہام کی رو سے تو برگزیدہ لوگوں کے لئے سب ہی کچھ جائز ہو گیا۔ ان متضاد تعلیمات کو دیکھ کر بھی تحریف اناجیل میں شبہ کرنا انتہائے سادہ لوحی کی بات ہے۔

سود مندرجہ ذیل آیات میں سود لینے کی بہت سخت ممانعت آئی ہے:۔ خروج باب ۲۲ آیہ ۲۵ احبار باب ۲۵ آیہ ۳۶ و ۳۷ استثنار باب ۲۳ آیہ ۱۹۔ زبور ۱۵ آیہ ۵۔ امثال ۲۸ آیہ ۸۔ حزقی ایل باب ۱۸ آیہ ۸ یرمیاہ باب ۱۵ آیہ ۱۰۔ علاوہ ازیں اول پطرس باب ۵ آیہ ۲ اور

اوّل تمطاؤس باب ۳ آیہ ۳ میں جو ''نارواِنفع'' کی ممانعت ہے اُس میں سود کو شامل سمجھا جاسکتا ہے۔

یوم السبت یہودیوں کے نزدیک یوم السبت یعنی سنیچر کا دن مبارک سمجھا جاتا تھا اور اس دن سارے کام کاج چھوڑ کر عبادت کی جاتی تھی (خروج باب ۲۰ آیہ ۸ و ۹) عیسٰی علیہ السلام کے حواری بھی سنیچر ہی کے دن کی بزرگی کو مانتے تھے (متی باب ۲۴ آیہ ۲۰) اب بجائے سنیچر کے عیسائیوں نے محض اپنی ذمہ داری پر اتوار کا دن متبرک قرار دے لیا ہے جس کی کوئی سند نہ قدیم میں کہیں پائی جاتی ہے نہ انجیل میں اور یوں دیکھا جائے تو جمعہ کے دن عیسٰی علیہ السلام کی ولادت بیان کی جاتی ہے اور جمعہ ہی کے دن قصہ صلیب پیش آیا۔ اور نجات اُمت واقع ہوئی۔ اس اعتبار سے تو جمعہ کے دن کو سنیچر اور اتوار دونوں پر فضیلت ہوئی۔

احترام انبیائے سابقین تحریف والحاق کا بڑا ہو اس معاملہ میں بھی اناجیل مروجہ کی بعض عبارات اور عیسائی مفسرین کی اُن پر طبع آزمائیاں اطمینان بخش نہیں بلکہ مذاق سلیم کو یہ باتیں بہت کھٹکتی ہیں یوحنا باب ۱۰ آیہ ۸ میں ہے کہ ''سب جتنے مجھ سے (یعنی مسیح سے) آگے آئے چور اور بٹمار ہیں پر بھیڑوں نے اُن کی نہ سنی'' ٹامس اسکاٹ صاحب اس آیہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''وہ جو عیسٰی سے پہلے آئے ہمیں ان کو دغا دار اور ہادی اور نبی نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ انہوں نے اسی کے ماتحت حکومت کا کام کیا اور اسی کے پیش رو رہے'' لارڈ نزا اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بشپ انی بانی کا قول ہے کہ جناب مسیح کا یہ کلمہ خصوصیت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے حق میں تھا فاسٹس بھی اس قول کو موسیٰ علیہ السلام ہی کے حق میں قرار دیتا ہے لوتھر بھی اس معاملہ میں انہیں لوگوں کا پیرو ہے مگر یہ کوئی نہیں سمجھا تا کہ ایسی صورت میں عیسٰی علیہ السلام نے شریعت موسوی کو برقرار کیوں رکھا اور اپنی امت کو اس کی پیروی کا تاکیدی حکم کیوں فرمایا۔ ان دو متضاد باتوں میں سے ایک کو الحاقی ضرور ماننا پڑے گا قرائن تو اسی کی شہادت دیتے ہیں کہ انبیائے اولوالعزم کی شان میں اس نوع کے گستاخانہ کلمات پابندی شریعت سے ان لوگوں کی طبعی بیزاری کی دلیل ہیں جناب مسیح بھی اپنے متبعین کے ان گستاخانہ تیوروں سے نہیں بچے چنانچہ پوس فلسین کے

نام اپنے خط (باب ۱ آیہ ۲۴) میں لکھتے ہیں کہ "اب میں اپنی ان مصیبتوں سے جو تمہارے واسطے کھینچتا ہوں خوش ہوں اور مسیح کی مصیبتوں کی کمیاں اس کے بدن کے لیے یعنی کلیسہ کے لئے اپنے جسم سے بھرے دیتا ہوں" یہاں پولوس صاف طور پر عیسیٰ علیہ السلام کی مصیبتوں کو ناقص اور اپنی مصیبتوں کو کامل قرار دیتے ہیں جو لوگ اپنے خاص نبی اور رسول سے نہیں چوکتے وہ بھلا دوسروں سے کب باز آسکتے ہیں۔ یہی پولوس دوم قرنتیوں کے باب ۱۱ آیہ ۵ میں کہتے ہیں کہ "میں اپنے تئیں سب سے بڑے رسولوں سے کچھ کم نہیں سمجھتا ہوں"۔ اسی باب کی آیۂ میں یہ اپنے آپ کو ایک بات میں خدا تک سے تشبیہ دے جاتے ہیں لکھتے ہیں کہ "مجھے تمہاری بابت خدا کی سی غیرت آتی ہے"۔ ہم ان فقروں پر اس مضمون میں توجہ نہ کرتے اور صحف سماوی پر تبصرہ کرنے والے کو ضرورت بھی نہیں کہ زید عمرو بکر کی تحریروں پر التفات کرے۔ مگر جب ان تحریروں کو الہامی قرار دیا گیا ہو اور صحف سماوی کے تحت میں لاکر مجموعہ کتب عہد جدید میں انہیں شامل کر دیا گیا ہو تو ان کے مضحکہ انگیز پہلوؤں کو کیونکر نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

کثرت ازدواج اس مسئلہ پر دنیائے مغرب میں عام طور پر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اور یہ گمان کیا جاتا ہے کہ مذہب عیسوی ایک وقت میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ بائیبل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

ہم متعدد بار بتلا چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کو منسوخ نہیں فرمایا اور نہ عیسائیوں کو احکام توریت کی پابندی سے مستثنیٰ کیا ہے اصلی اور سچی عیسویت بائیبل کی رو سے توریت اور انجیل دونوں کی پابندی پر مشتمل ہے۔ پہلے توریت کو لیجئے اور مندرجہ ذیل حوالجات کو ملاحظہ فرمائیے۔

پیدائش باب ۱۶ آیہ ۳ و ۴، باب ۲۵ آیہ ۱، باب ۳۵ آیہ ۲۳ تا ۲۶۔ احبار باب ۱۸ آیہ ۱۸۔

استثنا باب ۲۱ آیہ ۱۵۔ قاضیون باب ۸ آیہ ۳۰۔ اوّل سموائیل باب ۱ آیہ ۱ و ۲ و ۳، باب ۲۵ آیہ ۴۲ و ۴۳، دوم سموائیل باب ۳، باب ۵ آیہ ۱۳، باب ۱۱ آیہ ۲۷، باب ۱۲ آیہ ۸، باب ۱۲ آیہ ۱۶۔ اول سلاطین باب ۱۱ آیہ ۱ تا ۴، باب ۱۱ آیہ ۱ تا ۱۳۔ اوّل تواریخ باب ۳ آیہ ۱ تا ۹، باب ۴ آیہ ۳۔ دوم تواریخ باب ۱۱ آیہ ۲۱، باب ۱۳ آیہ ۲۱، باب ۲۴ آیہ ۲ و ۳۔

کتب عہد عتیق کے متذکرہ بالا مقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس میں برکت اور برگزیدگی بھی ہے اور اللہ کے برگزیدہ بندوں اور انبیاء علیہم السلام کا اس پر نہایت شدومد کے ساتھ بکثرت عمل بھی رہا ہے ابراہیم علیہ السلام نے تین نکاح کئے۔ بی بی سارہ بی بی ہاجرہ اور بی بی قطورہ سے۔ اور اگر بی بی قطورہ سے عقد بی بی سارہ کی وفات کے بعد بھی تسلیم کیا جائے تب بھی دو بیویوں کا بیک وقت مجتمع ہونا تو بالاتفاق ثابت ہے یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ حضرت سموائیل نبی کے والد ماجد کی دو بیویاں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں۔ یہ وہ برگزیدہ نبی ہیں جن کی نسل سے بلحاظ جسم مسیح کا پیدا ہونا بائبل میں بیان کیا گیا ہے بڑی عظمت کے ساتھ آپ کا ذکر آیا ہے اور باستثناء اس معاملہ کے جو زوجہ اوریاہ کے متعلق بائبل میں آپ سے منسوب کیا گیا ہے اور کوئی الزام آپ پر نہیں لگایا گیا حتیٰ کہ آپ کی کثرت ازدواج پر بھی آپ پر کوئی اعتراض نہیں آپ کی زبور یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں اب تک کمال عزت و عظمت کے ساتھ موجود ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی سات سو (۷۰۰) بیویاں تھیں اور تین سو (۳۰۰) حرم۔ آپ پر بھی بائبل میں اس کثرت ازدواج پر کہیں کوئی الزام نہیں آیا۔ حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کی اٹھارہ (۱۸) بیویاں تھیں اور ساٹھ (۶۰) حرم۔ حضرت سلیمان کے پوتے ابیاہ کی چودہ (۱۴) بیویاں تھیں حضرت جدعون کی بھی بہت سی بیویاں تھیں

اب اناجیل کو لیجئے۔ اناجیل میں کہیں توریت کی اس اجازت کو منسوخ نہیں کیا گیا عہد جدید کی کتب مقدسہ میں سے کسی کتاب میں ایک سے زائد بیویوں کے ایک ہی وقت میں جمع کرنے کی ممانعت نہیں آئی صرف دو مواقع

اس قسم کی عبارت پائی جاتی ہے جس سے شاید اس نوع کی ممانعت کا التباس ہوتا ہو پولوس کے تمطاؤس کے نام پہلے خط کے باب ۳ آیہ ۱ و ۲ میں مندرجہ ذیل عبارت واقع ہوئی ہے۔

"یہ بات سچ ہے کہ جو کوئی کلیسے کی نگہبانی کی آرزو رکھتا ہے وہ اچھا کام چاہتا ہے پس چاہیئے کہ نگہبان بے عیب، ایک جورو کا شوہر، پرہیز گار، صاحب تمیز، مسافر دوست تعلیم دینے میں قابل ہو"

اسی سے ملتی جلتی اور اسی مضمون کی عبارت پولوس کے طیطس کے نام خط کے باب ۱ آیہ ۶ میں پائی جاتی ہے اول تو ان دونوں عبارتوں کو اناجیل اربعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ پولوس کے مشکوک اور غیر معتبر خطوط کی عبارت ہے اگر ان خطوط کو معتبر بھی مانا جائے تو یہ پولوس کی ذاتی رائے ہے جو نہ شریعت موسوی میں ترمیم کا باعث ہو سکتی ہے نہ شریعت عیسوی میں۔ علاوہ ازیں پولوس کی یہ رائے بھی صرف پادریوں اور کلیسے کے خدام سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ عام عیسائیوں سے۔ پادریوں اور مذہبی خدمت کرنے والوں کو صرف مشورہ دیا گیا ہے کہ بہتر ہو اگر ان کی ایک ہی بیوی ہو تاکہ بیوی بچوں میں ان کا زیادہ وقت صرف نہ ہو اور کلیسا کی خدمت کے لئے انہیں فرصت زیادہ ملے اس مشورہ کی رو سے بھی پادریوں کے لئے بہتر ہے اگر وہ ایک ہی بیوی رکھیں لیکن ایک سے زائد بیویاں اگر ان کے پاس ہوں تو اسے گناہ ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کرنتھیوں کے باب ۷ آیہ ۱ میں ہی پولوس لکھتے ہیں کہ:۔

"مرد کے لئے یہ اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے"

اور اسی باب کی آیہ ۲۸ میں مردوں اور عورتوں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے مگر اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے والوں کو گنہگار بھی نہیں ٹھیرایا گیا۔ چنانچہ اسی باب میں جہاں آیہ ۱ میں مرد کے لئے عورت کا نہ چھونا اچھا بیان کیا گیا ہے وہاں آیہ ۲ میں فوراً یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر حرامکاری سے بچنے کے لئے کوئی مرد جورو کرے یا عورت شوہر کرے" تو مضائقہ نہیں اور آیہ ۲۸ میں جہاں مردوں اور عورتوں کو شادی کے خلاف مشورہ دیا گیا ہے۔ وہاں اسی آیہ میں یہ بھی صاف بتلا دیا گیا ہے کہ اگر کوئی نکاح کرے تو گناہ نہیں بالکل اسی نوع کا مشورہ پادریوں کو بھی دیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک ہی بیوی پر قناعت کریں تو مذہبی خدمت کا انجام دینا ان کے لئے زیادہ آسان

ہوگا۔ اگر ایک سے زیادہ بیوی کا ایک ہی وقت میں رکھنا مذہباً گناہ ہوتا تو ممانعت عام ہوتی، نہ کہ پادریوں کے لئے خاص۔ اس ممانعت خاص سے اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں عیسائیوں میں کثیر الازدواجی کی رسم عام تھی جس سے پادریوں کو باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ حواریوں کے زمانہ میں، نیز اس کے بعد بھی اغیار کے ہاتھوں بیچارے عیسائیوں پر ایسے شدید مظالم اور مصائب کی بارش ہوتی رہی ہے کہ ان بیچاروں کو وطن چھوڑنا پڑتا تھا، برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپنا پڑتا تھا۔ جب پکڑے جاتے تھے تو بڑی اذیت سے قتل کئے جاتے تھے باپ کے سامنے بیٹا اور بیٹے کے سامنے باپ قتل ہوتا تھا۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جاتے تھے جب یہ لوگ بھاگتے تھے تو سارے گھر کو ساتھ لیکر بھاگتے اور عورتوں بچوں سمیت جنگلوں پہاڑوں میں بسر کرنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ پادری والش صاحب مصر کی بعض قبروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رومی سلاطین نے عیسائیوں کو دس بار ہولناک اور درد انگیز ایذائیں پہنچائیں اور تباہیاں ان پر برپا کیں ان میں عیسائی لوگ انہیں غاروں میں پناہ لیتے تھے۔ اور اپنے مردوں کو انہیں میں دفن کر دیتے تھے۔ قرنتیوں کے باب ۷ آیات ۲۶ تا ۲۹ میں انہیں مصائب کی جانب اشارہ ہے۔ ان حالات میں ایک بیوی کا ہونا بھی مصیبت ہوتا ہے چہ جائیکہ متعدد بیویاں ہوں، خصوصاً پادریوں کے لئے جن کے کاندھوں پر کلیسا کی خدمت اور متبعین مسیح کی رہنمائی کا بھی بار تھا۔ ان پادریوں کے لئے ان حالات میں یہ ایک عارضی مشورہ تھا جو پولوس نے پیش کیا تھا اور وہ کوئی مذہبی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

عیسائیوں میں ایک فرقہ ہے جو مورمن (MORMAN) کے نام سے موسوم ہے۔ ان میں ہر عیسائی کو بارہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ ان کے پیشوا برگھم ینگ (۱۸۷۷ء ولادت ۱۸۰۱ء) (BRING HAM YOUNG) کے پاس ایک وقت میں پچاس (۵۰) بیویاں رہ چکی ہیں عیسائی عقیدہ کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی دو بیویاں قرار پاتی ہیں ایک کلیسۂ قدیم یعنی جماعت یہود اور دوسری کلیسہ

جدید یعنی جماعت نصاریٰ (دیکھو دوم قرنتیون کا باب ۱۱ آیہ ۲۔ اور مکاشفات باب ۱۹ آیہ ۷، باب ۲۱ آیہ ۹ باب ۲۱ آیہ ۱۷) پراٹس ٹمینٹ فرقہ کے بانی مارٹن لوتھر نے ایک دولتمند شخص فلپ کو دو بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔ لوتھر صاحب اپنی بعض تحریروں میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ انسان دس یا زیادہ بیویاں ایک ساتھ رکھ سکتا ہے تاریخ میں عیسائی دنیا کی متعدد مشہور ہستیاں ایسی پائی جاتی ہیں جنہوں نے ایک ہی وقت میں متعدد بیویاں کیں۔ جرمنی اور فرانس کے متعدد بادشاہ تک اس زمرہ میں شامل ہیں۔ خود انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم نے جو فرقہ پراٹسٹنٹ کے زبردست سرپرست تھے متعدد نکاح کئے اور ایک وقت میں تین بیویاں رکھیں جرمنی کے پادری بونیفیس نے پوپ گریگوری سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں دریافت کیا کہ انسان کو کس حالت میں دو بیبیاں کرنی جائز ہیں پوپ نے جواب دیا۔ کہ جب بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ خاوند اس سے مباشرت نہ کر سکے اس صورت میں خاوند کو دوسرا نکاح کر لینا درست ہے بشرطیکہ وہ بیمار بیوی کی ہر طرح خبرگیری کرتا ہے عیسائیوں نے خود کثیر الازدواجی کے جواز میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ رومن کیتھولک فرقہ کے راہبوں کی ایک جماعت کپوشینز کے رہنما برنارڈ اکینس نے اس رسم کے پسندیدہ ہونے کی تائید میں ایک کتاب لکھی ہے ان تائید کرنے والوں میں سے جو کہ متعدد ہیں سب سے زیادہ مشہور شخص جان ملٹن (۱۶۰۸ء تا ۱۶۷۴ء) ہے جس نے اس رسم کی حمایت میں بڑا زور صرف کیا ہے وہ اپنی کتاب مضمون درباب مذہب عیسویت میں اس امر کے ثبوت میں انجیل سے بہت سے فقرے نقل کرتا ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ:۔

"علاوہ اس کے خدا تعالےٰ نے اپنے آپ کو استعارہ کے طور پر ایک حکایت میں مرد بتایا ہے (حزقی ایل باب ۲۳) جس نے احولا اور احولیا دو عورتوں سے نکاح کیا اگر یہ رسم درحقیقت بری ہوتی تو خدا تعالیٰ استعارہ میں بھی اس رسم کو اپنے لئے اختیار نہ کرتا جس رسم کی انجیل میں مخالفت نہ ہو ہم اس کو کس دلیل سے برا اور ذلیل کہیں کیونکہ انجیل نے کسی نئی قانون کو جاں

سے پہلے رائج تھا برا نہیں کہا۔ انجیل میں صرف یہ حکم ہے کہ ایلڈر اور ڈیکن پادری وہ لوگ بنائے جائیں جو صرف ایک بیوی رکھتے ہوں (اول تمطاؤس باب ۳ آیہ ۲ اور طیطس باب ۱ آیہ ۶) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا گناہ ہے کیونکہ اگر گناہ ہوتا تو یہ حکم سب کے لئے عام ہوتا۔ صرف پادریوں ہی کے لئے نہ ہوتا۔ اس حکم میں یہ مصلحت ہے کہ ایک بیوی والے دنیا میں اتنا گرفتار نہ ہوں گے جتنا کہ زیادہ بیویوں والے اور اسی وجہ سے یہ لوگ گرجے کا کام بخوبی انجام دے سکیں گے۔ یہ ممانعت بھی کچھ گناہ ہونے کے سبب سے نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب کو ایک سے زیادہ بیبیاں جمع کرنے کی اجازت ہے اور اکثر لوگوں نے اس رسم کو اختیار بھی کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کوئی جھوٹی صورت بیان نہیں کی۔ ہمارے اکثر نبیوں نے ایک سے زائد بیبیاں مجتمع کیں۔ لہذا مجھے یقین ہے کہ ایسی بے ادبی کوئی نہ کرے گا۔ کہ اس رسم کو حرام یا زنا ٹھیرائے کیونکہ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حرامکاروں اور زانیوں کو اللہ سزا دیگا اور اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اکا میں خود محافظ ہوں لہذا ایک سے زیادہ بیبیاں جمع کرنا نکاح ٹھیرا۔ اور نکاح ہر طرح حلال اور درست ہے۔ حضرت موسیٰ ہی فرماتے ہیں کہ نکاح کرنا بہت اچھا ہے اور گناہ نہیں ہے ۔

پادری فاکس صاحب اپنی کتاب الموسوم بہ "غلطیوں کی اصلاح" مطبوعہ امریکن مشن پریس لکھنؤ ۱۸۷۱ء کے صفحہ ۲۰۶ و ۲۰۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"تعدد ازدواج کے مقدمہ میں ہم بے تردد تسلیم کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں بھی اس دستور نے رواج پایا تھا اور خدا نے بھی اس کو منع نہیں کیا۔ بلکہ اسی رسم پر چلنے والوں کو اکثر برکت کا وعدہ فرمایا ہے"

یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ اگر رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بعض عیسائی اس معاملہ میں اعتراض پیش کیا کرتے ہیں اس کے جواب میں ایک عیسائی مصنف ہی کی تحریر کو پیش کر دیا جائے۔ جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب کے صفحہ ۷۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اور یہ جو عیسائی الزام لگاتے ہیں کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) شہوت پرست تھے (نعوذ باللہ) یہ اُن کا الزام باطل ہے کیونکہ جب آپ نے ظہور فرمایا اُس زمانہ میں اہل عرب میں بے انتہا نکاحوں کا رواج تھا۔ پس یہ امر بظاہر بیہودہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو خود شہوت پرست ہو وہ بدکاری کی اس رسم کو معدوم کر دے۔ علاوہ اس کے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہم یہ بات بھی آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ بھی اپنے ہم وطنوں کی مانند عورتوں سے بہت رغبت رکھتے تھے اور آپ نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ آپ اُن انسانی خواہشوں سے بری ہوں۔ جو سب آدمیوں کو ہوتی ہیں بلکہ برعکس اس کے یہ فرمایا ہے کہ میں بھی تمہیں جیسا آدمی ہوں اور بمقابلہ حضرت داؤد کے جو نبی اور بادشاہ تھے، اور جن کی تعریف انجیل میں لکھی ہے کہ وہ ایسے آدمی تھے جو خدا کا سا دل رکھتے تھے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) ایسے صاف تھے کہ بھینٹ کا ٹکڑا ڈالنا عفت و پاکدامنی کی دیوی کے مندر پر گراہوا ہو۔ ساؤل کی دوسری دختر بشت حضرت داؤد کی پہلی زوجہ تھی۔ اس زوجہ کو اس کے باپ نے آپ کی جلاوطنی کے زمانہ میں آپ سے لے لیا۔ بعدازاں آپ نے مسلسل کتنے ہی نکاح کئے۔ مگر باین ہمہ اپنی پہلی زوجہ کا بھی دعویٰ برابر کرتے رہے۔ حضرت داؤد نے ایک غیر مختون بادشاہ کی بیٹی سے بھی بے تکلف نکاح کر لیا۔ اور اگرچہ آپ کے ہاں اکثر بیویوں سے اولاد بھی تھی۔ مگر آپ یروشلم میں حرمیں کرتے رہے اور آخر کار رغبت سلیع کے معاملہ میں آپ نے حرام اور

خون ناحق بھی کیا (نعوذ باللہ) جب حضرت داؤد ایسے ضعیف ہو گئے کہ آپ پر ہر چند کپڑے ڈالے جاتے مگر آپ کو گرمی نہ پہنچتی اور سردی موقوف نہ ہوتی تو یہ تجویز ٹھیری کہ ایک نوجوان باکرہ عورت بہم پہنچائی جائے جو آپ کی خدمت کرے اور آپ کے ساتھ ہم خواب ہو۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ ایک نہایت حسین اور نوعمر عورت لائی جائے۔"

اقتباس مندرجہ بالا کے بعد ہم اپنی طرف سے صرف اس اضافہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جو لوگ خود شیشے کے مکانوں میں رہتے ہوں ان کا دوسروں پر پتھر پھینکنے میں پیش قدمی کرنا عقل مندی کے خلاف ہے۔

مہر عورتوں کو نکاح میں مہر دینا شریعت موسوی و عیسوی میں داخل ہے ملاحظہ فرمایئے پیدائش باب ۳۴ آیہ ۱۲۔ خروج باب ۲۲ آیہ ۱۶۔ استثنا باب ۲۲ آیہ ۲۹۔ اول سموئیل باب ۱۸ آیہ ۲۵۔

شوہر کی اطاعت لوگ موجودہ عیسائی دنیا کی عام روش دیکھ کر تعلیم عیسوی کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ انجیلی تعلیم عورتوں ہی کو مردوں کی فرمانبرداری کا حکم دیتی ہے افسیون باب ۵ آیات ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ میں ہے کہ:۔

"اے عورتو! اپنے شوہروں کی ایسی فرمانبردار ہو جیسے خداوند کی۔ کیونکہ شوہر زوجہ کا سر ہے جیسے کہ مسیح بھی کلیسہ کا سر ہے اور وہ بدن کا بچانے والا ہے تو بھی جیسے کلیسہ مسیح کی فرمانبردار ہے۔ ویسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کی ہوویں۔"

اسی طرح اوّل تمطاؤس باب ۲ اور اوّل پطرس باب ۳ میں بھی عورتوں کو اپنے شوہروں کی اطاعت کا تاکیدی حکم موجود ہے۔

فساق و فجار سے اجتناب عیسائی رواداری کا وعظ کہنے والے اس بات کو غالباً دلچسپی سے دیکھیں گے۔ کہ احکام انجیل کی رو سے عیسائیوں کو بالکل اجازت نہیں کہ وہ اپنے ان عیسائی بھائیوں تک

سے میل جول رکھیں اور ان کے ساتھ کھانا تک کھائیں جو حرام کار۔ یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والے یا شرابی یا ظالم ہوں اوّل قرنتیوں کے باب ۵ آیہ ۱۱ میں ہے کہ:-

"اگر کوئی بھائی کہلاکر حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا"

توحید و تثلیث تثلیث کے مسئلہ نے عیسائی دنیا میں بڑا تہلکہ برپا کیا، بڑی خونریزیاں کیں اور بہت سے فرقے پیدا کر دیئے۔ مگر ہم یہاں صرف انجیل کی روشنی میں اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

جن کتابوں کو آسمانی ہونے کا دعوٰے ہے۔ اُن کے مطالعہ کرنے والوں کے پاس ان کتابوں کی حقانیت دریافت کرنے کے لئے ایک اتنا اچھا معیار ہے جس میں مغالطہ نہیں ہونے پاتا۔ وہ معیار توحید کی تعلیم ہے۔ جن کتب سماوی میں توحید کو جس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اتنی ہی حقانیت کا ان میں پتہ چلتا ہے اور ان کی عبارتیں جس قدر توحید اصلی سے ہٹی ہوئی ہوں اتنا ہی ان میں تحریف والحاق کا گمان ہوگا اناجیل مروجہ میں باوجود اس کے کہ تحریف والحاق کے وقوع کا عیسائی علماء تک کو اعتراف ہے تعجب ہے کہ توحید الٰہی اور عبدیت مسیح کی تائید میں کافی مواد موجود ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اس مواد کے عیسائیوں نے تثلیث کو بے دھڑک اپنا مسلک قرار دے لیا اور الوہیت مسیح کے قائل ہو گئے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:-

"یسوع نے اس سے جواب میں کہا کہ سب حکموں میں اوّل یہ ہے کہ اے اسرائیل سُن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے" (مرقس باب ۱۲ آیہ ۲۹)

اسی نوع کا مضمون متی باب ۲۲ آیہ ۳۶ تا ۴۰ میں بھی موجود ہے اور اس توحید، نیز ہمسایہ کو پیار کرنے کی بابت آیہ ۴۰ میں مسیح کا یہ قول بھی درج ہے کہ "انہیں دو احکام پر ساری شریعت اور سب انبیاء کی باتیں موقوف ہیں" اس سے زیادہ زبردست ثبوت دین مسیح کی بنیاد کے توحید پر ہونے کا کیا ہو سکتا ہے؟

"خدا ایک ہے اور خدا اور آدمیوں کے بیچ ایک آدمی بھی درمیانی ہے وہ مسیح یسوع ہے"

(اول تمطاؤس باب ۲ آیہ ۵)

توحید الٰہی اور عبدیت مسیح کا اس سے واضح تر اعتراف کیا ہو سکتا ہے؟ کتب عہد جدید میں بکثرت ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے عیسیٰ علیہ السلام کا ابن آدم اور نبی اور اللہ کا برگزیدہ بندہ ہونا پایا جاتا ہے آپ کے حواری بھی آپ کو اللہ کا بندہ اور نبی تسلیم کرتے تھے مگر باوجود ان تمام باتوں کے بعد کے عیسائی علما اہل تثلیث بن گئے اور یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ خدا کی ذات واحد تین اقانیم پر مشتمل ہے وجود حیات اور علم جس سے باپ بیٹا اور روح القدس مراد ہیں بعض عیسائی فرقوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو بھی تثلیث میں داخل کر لیا۔

منجملہ دیگر اعتراضات کے ایک عقلی اعتراض جو اس تثلیث پر وارد ہوتا ہے یہ ہے کہ اگر اقانیم ثلاثہ میں سے ہر واحد کو ہر قسم کے کاموں کی یکساں قدرت کا مالک تسلیم کیا جائے تو تعین تعداد ثلاثہ اور تخصیص تثلیث کی ضرورت نہیں رہتی اور اگر اقانیم ثلاثہ میں سے ہر اقنوم کو بطرز خاص جدا جدا کاموں کی قدرت کا مالک تسلیم کیا جائے تو ہر واحد کی شان میں نقص عظیم کا ہونا لازم آئیگا کہ ایک کا کام دوسرا نہیں کر سکتا اور اس بنا پر ذات واحد میں تقسیم کا تعین تثلیث کی ضرورت ہوئی اور یہ بات قادر مطلق کی شان سے بہت بعید ہے۔

عیسائی توحید کا بھی دم بھرتے ہیں اور تثلیث کا بھی مگر یہ نہیں سمجھا سکتے کہ اس تثلیث کے ہوتے ہوئے توحید قائم کیونکر رہ سکتی ہے جب سوال کیا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہے انجیل سے بھی وہ کوئی سند پیش نہیں کر سکتے۔ توریت و انجیل میں لفظ "تثلیث" کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔ اور اس کی تعلیم نہ عیسیٰ علیہ السلام نے کسی کو دی نہ آپ کے کسی حواری نے۔ چنانچہ میزان الحق مطبوعہ مرزا پور ۱۸۴۳ء) میں جو کہ ایک عیسائی کی تصنیف ہے باب ۲ فصل ۴ صفحہ ۴۶ پر درج ہے کہ:۔

"مسیحیوں کے اعتقاد میں اس عمدہ مطلب کو تثلیث یا ثلاث واحد کہتے ہیں اور اگرچہ یہ لفظ بعینہ انجیل میں نہیں پائے جاتے مگر انجیل کی اس عمدہ تعلیم کا عادت کے موافق ایسا نام ہوا ہے"

باوجود میزان الحق کی اس عبارت کے عہد نامہ جدید میں تین مقامات ایسے ہیں جہاں تثلیث کا لفظ صاف صاف تو نہیں آیا مگر باپ بیٹے اور روح القدس کا ذکر ایک جگہ جمع ہو گیا ہے ایک تو متی باب ۲۸ آیہ ۱۹ میں ہے کہ:-

"اس لئے تم جا کر سب قوموں کو شاگرد کرو اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو"

یہ ذکر کسی اور انجیل میں نہیں اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اور انجیلوں میں بھی اس کا ذکر ضرور آنا جبکہ متعدد امور میں ایک ہی بات کا مختلف اناجیل میں اعادہ کیا گیا ہے لیکن اگر اس عبارت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے تثلیث ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب قوموں کو باپ کے نام سے جو کہ خدا ہے اور بیٹے کے نام سے جو کہ اس کا رسول ہے اور روح القدس سے پیدا ہوا ہے بپتسمہ دیکر شاگرد کرو۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ خدا کے نام کے ساتھ اس کے رسول کا نام آنا بھی ضروری ہے باپ اور بیٹے کے الفاظ کا استعمال اس زمانہ کی رسم کے مطابق محض رسمی ہے جس پر مزید گفتگو آگے آئے گی

دوسرے دوم قرنتیون کے باب ۱۳ آیہ ۱۴ میں ہے کہ:-

"اب خداوند یسوع مسیح کا فضل اور خدا کی محبت اور روح قدس کی صحبت تم سبھوں کے ساتھ ہووے۔ آمین"

یہ صرف دعائیہ کلمات ہیں اور اقانیم ثلاثہ کے ثبوت کا ان میں شائبہ تک نہیں تیسرے اوّل یوحنا باب ۵ آیہ ۷ میں ہے کہ:-

"تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح قدس اور یہ تینوں ایک ہیں"

یہاں البتہ تثلیث کا صاف صاف ذکر ملتا ہے اور یہی آیت اہل تثلیث کے تثلیثی عقیدہ کی بنیاد ہے لیکن بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس آیت کے الحاقی ہونے پر جمیع محققین علمائے عیسوی کا اتفاق ہے

پادری فانڈر صاحب اور گریسباخ اور شولز ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کے الحاقی ہونے کے معترف ہیں لندن میں ۱۸۳۳ء میں مسیحی علما کی جانب سے ایک کتاب لائبریری آف یوسفل نالج شائع ہوئی۔ جس میں مرقوم ہے کہ اسحٰق نیوٹن نے ایک پچاس صفحوں کا رسالہ لکھا ہے۔ جس میں نامہ یوحنا اور نامہ پولوس کے ان دو فقروں کے متعلق تحقیقی بحث کی ہے جن سے مسئلہ تثلیث پیدا ہوا ہے، اور نیوٹن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں کاتبوں نے تبدیلی کی ہے اس سے دونوں آیات مندرجہ بالا یعنی دوم قرنتیون کے باب ۳ آیہ ۱۴ اور اول یوحنا باب ۵ آیہ ۷ کے الحاقی ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں شہر کنٹربری (انگلستان) میں بائیبل کی تنقید کی غرض سے ۲۷ مشہور عیسائی علما کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں بالاتفاق یوحنا کی متذکرہ بالا آیت الحاقی قرار دی گئی۔

یہودیوں میں تو باوجود عقائد میں اختلافات باہمی کے کوئی شخص بھی عیسٰی علیہ السلام کی الوہیت تو درکنار رسالت تک کا قائل نہیں۔ نہ توریت اور صحف انبیائے بنی اسرائیل میں کہیں تثلیث کی تعلیم پائی جاتی ہے۔

عقیدہ تثلیث کے اسباب اور ان پر ناقدانہ نظر

کتب عہد جدید کے تعلیم تثلیث سے معرا ہونے کی بابت پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ آیئے اب عیسائی علما کے اقوال پر نظر ڈال کر یہ معلوم کریں کہ ان لوگوں کو الوہیت مسیح کا مغالطہ کن اسباب سے ہوا اور وہ اسباب معقول پسند نگاہوں میں کیا وقعت رکھتے ہیں۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح القدس کے وسیلہ سے پیدا ہوئے (متی ۱: ۱۸) تو حضرت سارہ اور حضرت ربقہ دونوں بانجھ تھیں اور قوائے انسانی کے ذریعہ توالد و تناسل کی امید دونوں سے مفقود ہو چکی تھی۔ صرف خدا کے حکم سے اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے (پیدائش ۱۸: ۱۱: ۲۵: ۲۱) حضرت یحییٰ کے پیدا ہونے کی بھی یہی شان ہے (لوقا ۱)

نظلی ایل بن اوری کو بھی خدا روح اللہ فرما چکا ہے (خروج ۳۱: ۲ و ۳) پھر عیسیٰ علیہ السلام کے لئے اس معاملہ میں کیا خصوصیت رہی؟

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ مسیح بے باپ کے پیدا ہوئے تو ثبوت الوہیت کے لئے یہ بات کافی نہیں اگر ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا الوہیت کے منافی نہیں تو ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہونا بھی الوہیت کے منافی نہیں ہو سکتا۔ عیسائی علما حضرت عیسیٰ کو پورا خدا بھی کہتے ہیں اور پورا انسان بھی۔ لیکن از روئے عقل وہ پورے انسان اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جبکہ اوصاف انسانی سے پورے طور پر متصف ہوں اور ماں باپ دونوں سے پیدا ہوئے ہوں۔ علاوہ بریں عیسائی عقیدہ کے مطابق پورے انسان کے لئے ضروری ہے کہ سب انسانوں کی طرح وہ بھی گنہ گار ہو (رومیوں ۳: ۹ تا ۱۲) اگر مسیح پورے انسان نہ تھے جو کہ ایک آسان تر کام ہے تو وہ پورے خدا کیسے ہو سکتے تھے جو کہ مشکل تر کام ہے؟ پھر یہ بھی غور طلب مسئلہ ہے کہ جب مسیح کے بے باپ کے پیدا ہونے پر الوہیت کا ان پر گمان ہو سکتا ہے تو آدم علیہ السلام پر یہ گمان کیوں نہ ہوا جو کہ بے ماں اور بے باپ کے پیدا ہوئے اور جنہیں خدا نے

اپنی صورت پر پیدا کیا (پیدائش ۱ : ۲۷) حوا علیہا السلام کا پیدا ہونا بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں کیونکہ وہ بغیر ماں کے پیدا ہوئیں۔ ملک صدق کا حال بھی عجیب وغریب ہے۔ جو توریت اور انجیل دونوں میں موجود ہے۔ عبرانیوں کے باب ۷ آیہ ۳ میں ہے کہ :۔

"یہ (یعنی ملک صدق) بے باپ بے ماں۔ بے نسب نامہ جس کے نہ دنوں کا شروع نہ زندگی کا آخر مگر خدا کے بیٹے سے مشابہ ٹھہر کے ہمیشہ کاہن رہتا ہے۔"

توریت میں (پیدائش ۱۴ : ۱۸ تا ۲۰) اور زبور (۱۱۰ : ۴) میں بھی اس کا ذکر آیا ہے علمائے اہل کتاب کے بیانات اس کے احوال میں بہت مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک فرشتہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ خود مسیح ہی تھا۔ جو اس وقت بھی ظاہر ہوا مگر یہ دونوں گمان غلط ہیں کیونکہ اگر وہ فرشتہ ہوتا تو کہانت سے اس کو کیا تعلق اور خود اپنی ذات سے مسیح ہوتا تو مسیح کے مشابہ یا مسیح کے مانند ہونے کے کیا معنی؟ علمائے یہود کہتے ہیں کہ وہ نوح علیہ السلام کا دوسرا بیٹا سام تھا۔ مگر عبرانیوں کے خط کی رو سے یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس خط میں تو ملک صدق کا بے باپ بے ماں اور بے نسب نامہ کے ہونا لکھا ہے مگر سام کے باپ کا نام نوح تھا اور اس کا نسب نامہ توریت میں درج ہے۔ بہرحال ملک صدق فرشتہ نہ تھا بلکہ ایک انسان تھا اور بقول انجیل کے اس کے نہ باپ تھا نہ ماں نہ نسب نامہ حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کے ماں تھیں اور آپ کا نسب نامہ اناجیل میں دو موقعوں پر درج ہے۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ انجیل میں جا بجا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے خدا کا لفظ آیا ہے تو اوّل تو اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اصلی عبرانی یا یونانی قدیم نسخوں میں بھی اسی طرح وارد ہوا ہے۔ چنانچہ اوّل تمطاؤس باب ۳ آیہ ۱۶ میں یہ وارد ہوا ہے کہ "خدا جسم میں ظاہر کیا گیا" اس کے متعلق گریسباخ کی تحقیقات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "خدا" کی جگہ "وہ" کا لفظ اصلی نسخوں میں ہے یعنی یوں ہونا چاہئے۔ کہ "وہ کہ جسم میں ظاہر کیا گیا" جس طرح یہاں کسی خدا گر نے "خدا" کا لفظ الحاق کر دیا۔

اسی طرح دوسرے مقامات پر بھی الحاق واقع ہوا ہو تو اب کوئی کیسے جان سکتا ہے دوسرے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عبرانی محاورہ میں اس زمانہ میں قاضیوں اور مفتیوں کو بھی خدا کہتے تھے۔ اسکاٹ صاحب بھی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کلام الٰہی میں مجسٹریٹ خدا کہلاتے تھے اور یہ لقب انہیں اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں میں خدا کے نائب تھے۔ چنانچہ کتب مقدسہ قدیم و جدید میں خدا کے لقب سے بندے متعدد جگہ مخاطب کئے گئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"خدا کی جماعت میں خدا کھڑا ہے الہوں کے درمیان وہ عدالت کرتا ہے" (زبور ۸۲: ۱)

"میں نے تو کہا کہ تم سب الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو" (زبور ۸۲ : ۶)

"میں نے تو کہا تم سب خدا ہو" (یوحنا ۱۰ : ۳۴)

"جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا" (یوحنا ۱۰ : ۳۵)

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لئے خدا سا بنایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا" (خروج ۷ : ۱)

"اور تو (اے موسیٰ) اس کے لئے (یعنی ہارون کے لئے) خدا کی جگہ ہوگا" (خروج ۴ : ۱۶)

"سارہ ابراہام کی فرمانبرداری کرتی اور اسے خداوند کہتی تھی" (۱۔ پطرس ۳ : ۶)

یوسف علیہ السلام نے اپنی بابت فرمایا کہ :۔

"خدا نے مجھ کو سارے مصر کا خداوند کیا" (پیدائش ۴۵ : ۹)

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ توریت و انجیل میں "خدا" اور "خداوند" کے الفاظ عبد اور معبود دونوں کے حق میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ الفاظ صرف عیسیٰ علیہ السلام ہی کے لئے مخصوص نہ تھے بلکہ دیگر بندگان خدا کے حق میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور ان الفاظ کے استعمال سے ان لوگوں کی عبدیت میں فرق نہیں آتا اور ان میں الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

اگر اس مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو خدا کا بیٹا کہا ہے (یوحنا ۱۰: ۳۶ - متی ۲۷: ۴۳) تو انجیل میں ساٹھ (۶۰) مقامات پر آپ اپنے کو ابن آدم بھی فرما چکے ہیں جبکہ انجیلی اصطلاح میں (جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے) ہر شخص خدا ہے تو ہر انسان کا بیٹا بھی اس اصطلاح کے مطابق خدا کا بیٹا قرار پانا چاہیے۔ غالباً عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اندیشہ پیدا ہوا ہو گا کہ لوگ آپ کو بجائے خدا کا اصطلاحی بیٹا ہونے کے حقیقی بیٹا نہ سمجھنے لگیں اس لئے آپ نے اپنے آپ کو بار بار ابن آدم کہا تاکہ لوگ متنبہ ہیں اور آپ کو الوہیت سے متصف نہ کرنے لگیں۔ بائیبل میں جہاں عام طور پر لوگوں کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے وہاں خاص خاص بندوں کے لئے بھی یہ پیار کا خطاب خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے ایوب (۱: ۶ اور ۲: ۱) کی تفسیر میں اسکاٹ صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں "خدا کے بیٹوں سے مراد پاک فرشتے ہیں۔ اور ایوب (۳۸: ۷) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مفسرین کے نزدیک یہاں "خدا کے بیٹوں" سے مراد انبیاء ہیں۔ عبرانیوں کے خط (۱: ۶) میں آدم علیہ السلام کو "خدا کا پہلوٹھا" بیان کیا گیا ہے۔ لوقا کے باب ۳ میں جو نسب نامہ درج ہے۔ اس کے آخر میں جہاں آدم کا نام آیا ہے وہاں آدم علیہ السلام کو خدا کا بیٹا لکھا ہے پیدائش (۶: ۲) میں آدم علیہ السلام کے بیٹوں کو خدا کے بیٹے کہا گیا ہے۔ گلتیوں کے خط (۴: ۲۸) میں اسحق علیہ السلام "وعدے کے فرزند" بیان کئے گئے ہیں۔ خروج (۴: ۲۲) کی رو سے اسرائیل خدا کا پہلوٹھا اور پیارا بیٹا ہے۔ یرمیاہ (۳۱: ۹ و ۲۰) کے مطابق افرائیم خدا کا پہلوٹھا اور پیارا بیٹا ہے۔ زبور (۸۹: ۲۶ و ۲۷) میں حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خدا کا بڑا بیٹا کہا گیا ہے۔ اوّل تواریخ (۲۲: ۱۰ اور ۲۸: ۶) اور دوم سموائیل (۷: ۱۴) کی رو سے سلیمان علیہ السلام خدا کے فرزند ہیں۔ استثناء (۱۴: ۱) اور رومیوں کے خط (۹: ۴) کے بموجب جملہ اسرائیلی فرزندان خدا ہیں۔ رومیوں کے خط (۸: ۱۴) کی سند پر جملہ عیسائی فرزندان الٰہی ہیں۔ متی (۶: ۹ و ۱۸ اور ۷: ۱۱) میں ہر خاص و عام کو خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے اور یسعیاہ (۳۰: ۱) کی عبارت گنہ گار لوگوں کو بھی خدا کا فرزند ظاہر کرتی ہے بظاہر

ہے کہ ایسی فرزندی سے الوہیت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ابنیت کا خطاب مختص نہ تھا۔ اور اس سے آپ کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

اگر اس مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ یسوع کے لفظی معنی نجات دہندہ کے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یشوع علیہ السلام کے نام کے بھی یہی معنی ہیں اور حضرت یسعیاہ کے نام کے معنی خدا کی نجات کے ہیں تو گویا معنی کے لحاظ سے اس نام میں بھی کوئی خصوصیت نہ رہی۔

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ آپ کا شفیع ہونا دلیل الوہیت سمجھ لیا گیا ہے تو زبور (۹۹ : ۶) اور یرمیاہ (۱۵ : ۱) میں حضرت موسیٰ اور حضرت سموئیل کو اور حزقی ایل (۱۴ : ۲) میں حضرت نوح حضرت دانیال اور حضرت ایوب کو بھی شفیع کہا گیا ہے اور پیدائش (۱۸ : ۲۳ تا ۳۳) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھی شفاعت کرنے کا ذکر موجود ہے۔

اگر الوہیت مسیح کا گمان اس امر پر مبنی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کر دیئے تو بائیبل ہی میں اوّل سلاطین (۱۷ : ۲۲) میں ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت الیاس نے بھی ایک مردہ لڑکے کو زندہ کر دیا تھا۔ دوم سلاطین کے باب ۴ میں حضرت الیشع کا یہ عجیب و غریب واقعہ درج ہے۔ کہ آپ نے ایک عورت سے جس کا شوہر بوڑھا تھا فرمایا کہ تو اسی وقت سے حساب شمار کرنا شروع کر دے اور جب دن پورے ہو جائیں گے تو ایک بیٹا تو گود میں لیگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس معجزہ عجیبہ کی برکت سے وہ عورت اپنے بوڑھے شوہر کے پاس گئی بھی نہ تھی کہ حمل شروع ہو گیا۔ اس لڑکے کا شمار بھی ان ہی لڑکوں میں کرنا چاہئے جو بے باپ کے پیدا ہوئے۔ پھر جب جوان ہو کر یہ لڑکا مر گیا تو حضرت الیشع نے اسے زندہ بھی کر دیا اسی کتاب یعنی دوم سلاطین کے ابواب ۴ و ۵ و ۶ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الیشع علیہ السلام نے اور بھی عجیب و غریب معجزات کا اظہار فرمایا۔ مثلاً بیس روٹیوں اور ایک ٹوکری بھر اناج کی بالوں سے سو انبیا زادوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دیا اور بچ رہا۔ ایک مبروص کو برص کی بیماری سے صحت دیدی ایک تندرست شخص کو مبروص بنا دیا۔

لوہے کو پانی پر تیرا دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی اس دنیا ہی کی زندگی میں مردوں کو زندہ کیا تھا مگر دوم سلاطین (۱۳ : ۲۱) کے بموجب حضرت الیشع کی مدفون لاش اور مردہ ہڈیوں نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا۔ اعمال (۹ : ۳۶ تا ۴۳) میں درج ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری پطرس نے بھی ایک مردہ عورت کو جس کا نام تابیتھا تھا زندہ کر دیا۔ اعمال (۲۰ : ۹ تا ۱۲) میں ایک واقعہ درج ہے کہ ایک لڑکا کوٹھے پر سے گر کے مر گیا تھا جس کا نام یوتخس تھا۔ اسے پولوس نے زندہ کر دیا۔ جب بائیبل ہی نے مردوں کے زندہ کرنے کا سہرا اتنے بہت سے سروں پر باندھ دیا۔ تو یہ صفت کسی کے لئے الوہیت کی دلیل کیسے ہوسکتی ہے۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ مسیح نے جو معجزے دکھلائے وہ اپنی قدرت سے دکھلائے اور دوسرے نبیوں نے جو معجزے دکھلائے وہ مسیح کی طرف سے یعنی مسیح کی بخشی ہوئی قدرت سے دکھلائے مگر یہ لوگ اپنے اس قول کی تائید میں کوئی معقول دلیل پیش نہیں کرتے۔ یہ صرف ان کا خیال ہی خیال ہے اور موجودہ تحریف شدہ بائیبل میں بھی ان کے اس خیال کی تائید میں ایک لفظ تک نہیں ملتا۔ نبیوں کے ہاتھ پر اللہ کی قدرت سے معجزات کا ظہور ہوتا رہتا ہے مگر اظہار معجزہ اظہار نبوت کے لئے لازمی نہیں۔ جب معجزات دلیل نبوت نہیں تو دلیل الوہیت کیونکر ہوسکتے ہیں؟

اگر اس مغالطہ الوہیت کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہتے ہیں تو اس معاملہ میں بھی آپ تنہا نہیں۔ کیونکہ توریت کے بکثرت مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نبی اور بنی اسرائیل کا ہر بادشاہ اور کاہنوں کا ہر سردار ممسوح ہوتا تھا اور مسح کیا جاتا تھا چنانچہ دوم سموئیل (۱ : ۱۴) میں ساؤل کو مسیح کہا گیا۔ اول سموئیل (۱۶ : ۱۳) اور دوم سموئیل (۲۳ : ۱) میں داؤد علیہ السلام کو مسیح لکھا گیا یسعیاہ (۴۵ : ۱) میں کیخسرو بادشاہ فارس کو خدا کا مسیح بیان کیا گیا۔ حضرت یسعیاہ نبی نے اپنی کتاب (۶۱ : ۱) میں خود اپنی بابت تحریر فرمایا ہے کہ "خدا نے مجھے مسیح کیا" دوم سلاطین (۹ : ۱ تا ۶) میں یاہو کو اور (۲۳ : ۳۰) میں یہو اخز کو مسیح لکھا گیا۔ دوم قرنتیوں کے خط (۱ : ۲۱) میں حضرت

پولوس بھی اپنی شان میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"جس نے ہم کو مسوح کیا سو خدا ہے"

اگر مغالطہ کا باعث یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اُٹھائے گئے تو پیدائش (۲۴:۵)
سے حنوک کا اور دوم سلاطین (۲: ۱۱) سے حضرت الیاس کا آسمان پر زندہ اُٹھالیا جانا بھی
ثابت ہے۔ قرنتیوں کے دوسرے خط (۱۲: ۲ تا ۴) میں پولوس بھی تیسرے آسمان تک اور
فردوس بریں تک اپنی اسی دنیا کی زندگی میں پہنچایا جانا بیان فرماتے ہیں رومن کیتھولک فرقہ کے
نزدیک حضرت مریم بھی آسمان پر اُٹھائی گئیں، یہ لوگ حضرت مریم سے بھی دعائیں مانگتے ہیں اور
انہیں بہشت کی ملکہ کہتے ہیں۔

عیسائی یہ بھی کہتے ہیں کہ جب زبدی کے بیٹوں کی ماں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سجدہ کیا (متی ۲۰:۲۰)
تو آپ نے اُسے سجدہ کرنے سے منع نہ فرمایا اور یہ آپ کی الوہیت کی دلیل ہے۔

بات در اصل یہ ہے کہ انجیلی محاورہ میں سجدہ سے اکثر خوشامد یا فرمانبرداری مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ
اسی معنی میں مکاشفات (۳: ۷ تا ۹) میں آیا ہے کہ یہودی فلادلفیا کے کلیسہ کے پادریوں کے پاؤں پر آکر
سجدہ کریں گے جب اس سجدہ سے پادریوں میں الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔ تو زبدی کے بیٹوں کی ماں کے
سجدہ کرنے سے مسیح کی الوہیت کیسے ثابت ہوسکتی ہے؟ بنت سبع نے داؤد علیہ السلام کو سجدہ کیا (اوّل
سلاطین ۱: ۱۶) ساؤل کے پوتے مفیبوست نے داؤد علیہ السلام کو سجدہ کیا (۲ سموئیل ۹: ۶ و ۸) کوشی نے
داؤد علیہ السلام کے سپہ سالار یواب کو سجدہ کیا (۲ سموئیل ۱۸: ۲۱) اخیمعض نے بادشاہ داؤد کے آگے سجدہ کیا۔
(دوم سموئیل ۱۸: ۲۸) شاہ بنوکدنضر یعنی بخت نصر اوندھے منہ گرا اور دانیال کے آگے اس نے سجدہ کیا۔
(دانیال ۲: ۴۶) روت جو کہ مسیح کی پر دادیوں میں سے تھیں بوعز کے سامنے زمین پر سجدہ میں گریں
(روت ۲: ۱۰) بائیبل میں اس قسم کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کیا یہ سب لوگ جن کے آگے سجدے

ہوئے مستحق الوہیت ہو گئے؟ ایک اور مثال سن لیجئے۔ جہاں ایسے شخص کے آگے سجدہ کرایا جاتا ہے۔ جو بت پرست تھا اور خدا سے ناواقف تھا۔ ایسے شخص کے متعلق الوہیت کا گمان کسی صورت سے ہو ہی نہیں سکتا۔ کورس بادشاہ یعنی کیخسرو کی بابت یسعیاہ (۴۵: ۴) میں خدا فرماتا ہے کہ تو مجھ کو نہیں جانتا پھر اگلی آیت میں فرماتا ہے کہ میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا۔ اسی کورس یعنی کیخسرو سے یسعیاہ کے باب ۴۵ ہی کی آیہ ۱۴ میں یہ خطاب ہوتا ہے کہ:۔

"خداوند یوں فرماتا ہے کہ مصر کی دولت اور کوش کا منافع اور سبا کے قد آور لوگ تیرے پاس آویں گے اور تیرے ہوویں گے اور تیری پیروی کریں گے وے بیڑیاں پہنے ہوئے اپنا ملک چھوڑ کے آویں گے اور تیرے آگے سجدہ کریں گے وے تیرے آگے منت کریں گے"۔

صاف ظاہر ہے کہ یہاں سجدہ سے مراد منت و خوشامد ہے عبرانی انداز بیان اسی طور پر واقع ہوا ہے کہ ایک ہی مضمون کو دو مختلف طور پر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ مقصد دونوں بیانوں کا ایک ہی ہوتا ہے مثلاً اقتباس بالا میں:۔ تیرے آگے سجدہ کریں گے، وے تیرے آگے منت کریں گے" یہاں عبرانی محاورہ کے مطابق سجدہ کرنے اور منت کرنے کے ایک ہی معنی ہیں اس طرح سے یہاں سجدہ کے معنی کو سمجھا یا ہے۔

بعض عیسائی علما کی عبارت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب ذرا مسیح علیہ السلام کے انکسار و عبدیت کی بھی سیر کیجئے آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے آقا سے بڑا نہیں اور نہ وہ جو بھیجا گیا ہے اپنے بھیجنے والے سے اگر تم یہ باتیں سمجھتے اور ان پر عمل کرتے ہو تو مبارک ہو" (یوحنا ۱۳: ۱۵ و ۱۶ و ۱۷)

مسیح نے شمعون سے فرمایا کہ:۔

"میں نے تیرے لئے دعا مانگی کہ تیرا ایمان جاتا نہ رہے" (لوقا ۲۲: ۳۲)

فلٹن صاحب کا قول ہے کہ:-

"قسطنطین کے زمانہ سے بہت پہلے اکثر عیسائی خراب ہو گئے تھے اور اصول مذہب میں فتور آ گیا تھا۔ مگر بعد ازاں جب اُس نے اس مذہب کی بہت قدر کی اور انہیں اعلیٰ اعلیٰ مرتبوں پر پہنچایا تو یہ لوگ دولت کے خواہشمند اور اختیارات ملکی کے شائق ہو گئے اور انہوں نے مذہب عیسوی کو خراب کر دیا"

قسطنطین کے فیصلہ تثلیث کے باوجود اور باوجود دردناک خونریزیوں کے ایریس اپنے ہی عقیدۂ توحید پر جما رہا۔ اور اپنے عقیدہ کی لوگوں کو تعلیم بھی دیتا رہا۔ اس کے بعد بھی عرصہ تک یہ تعلیم جاری رہی اور اب بھی عیسائیوں میں یونی ٹیرین فرقہ موجود ہے جو تثلیث کا قائل نہیں الوہیت صرف خدا کے لئے قرار دیتا ہے اور مسیح کو ایک الہام یافتہ انسان سمجھتا ہے ایام گزشتہ میں عیسائیوں میں ایک ابیونی فرقہ تھا جس کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ محض ایک انسان تھے۔ سنہ ... میں ارٹمن فرقہ پیدا ہوا۔ اس کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ مسیح انسان ہیں۔ ساسینین فرقہ والے بھی مسیح کو صرف انسان یا الہام یافتہ سمجھتے تھے۔

مراتب ثلاثہ عیسائی علماء یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ جس طرح مسیح اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم ہیں اسی طرح اس ایک اقنوم میں بھی تین مرتبے شامل ہیں۔ یعنی نبوت۔ بادشاہت اور کاہنوں کی سرداری۔ مگر انجیل سے سوا مرتبۂ نبوت کے اور کوئی مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام میں ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ یوحنا (۱۸: ۳۶) میں ہے کہ:-

"یسوع نے جواب دیا کہ میری بادشاہت اس جہان کی نہیں اگر میری بادشاہت اس جہان کی ہوتی تو میرے نوکر لڑائی کرتے تاکہ میں یہودیوں کے حوالہ کیا جاتا۔ پر میری بادشاہت یہاں کی نہیں ہے"

کاہن کے عہدہ یا کاہنوں کی سرداری پر آپ کا مقرر نہ ہونا جملہ اناجیل و حالات مسیح سے ثابت ہے صرف مرتبۂ نبوت کا ثبوت اناجیل موجودہ میں بھی بکثرت پایا جاتا ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام خود اپنی بابت مرقس (۶: ۴) میں فرماتے ہیں کہ:-

"نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں"

آپ کے اس قسم کے الفاظ جن سے آپ کی نبوت کا آپ ہی کی زبان سے اقرار پایا جاتا ہے متی (۵۷:۱۳) اور لوقا (۴ : ۲۴) اور یوحنا (۴ : ۴۴) میں بھی موجود ہیں۔ حواریوں نے قصہ صلیب کے بعد بھی آپ کو نبی ہی کہا۔ (لوقا ۲۴ : ۱۹) جب آپ نے ایک بیوہ کے مُردہ لڑکے کو زندہ کر دیا تو سب ڈر گئے۔ اور خدا کی تعریف کر کے بولے کہ :۔

"بڑا نبی ہم میں اُٹھا ہے" (لوقا ۷ : ۱۶)

جب آپ نے پانچ ہزار آدمیوں کو پانچ روٹیوں سے سیر کر دیا تو ان لوگوں نے کہا کہ :۔

"فی الحقیقت وہ نبی جو جہان میں آنے والا تھا یہی ہے" (یوحنا ۶ : ۱۴)

غرضکہ آپ نے خود اپنے آپ کو صرف نبی ہی فرمایا۔ آپ کے حواریوں نے آپ کے اُٹھ جانے کے بعد بھی آپ کو نبی ہی جانا۔ اور عوام الناس میں جن جن سے آپ کو سابقہ پڑا۔ اُنہوں نے آپ کو نبی ہی سمجھا۔ جس طرح توحیدِ الٰہی میں اقانیمِ ثلاثہ ثابت نہیں ہوتے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام میں مرتبہ نبوت کے ساتھ بادشاہت اور کہانت کا اجتماع بھی ثابت نہیں ہوتا۔

افسانۂ صلیب

عیسائی علماء کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ مسیح علیہ السلام یہودیوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے، صلیب پر چڑھائے گئے۔ مرنے کے بعد تین دن تک قبر میں دفن رہے، پھر زندہ ہوئے، حواریوں کو نظر آئے، اور آسمان پر اُٹھا لیے گئے۔ اور صلیب پر مسیح کی یہ قربانی عیسائیوں کے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی۔ مگر اناجیل اربعہ پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ تو ان میں سے ایک بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، بیانات میں اس قدر اختلافات ہیں کہ افسانۂ صلیب کا کوئی پہلو ثابت نہیں ہوتا۔ روایت و درایت کی رُو سے کوئی بیان تحقیق کی کسوٹی پر قابلِ اعتماد نہیں پایا جاتا۔

سب سے پہلے گرفتاری کے واقعات کو لیجئے۔ اس واقعہ کی صورت میں اختلاف ہے۔ متی (۲۶ : ۴۸ : ۴۹) میں لکھا ہے کہ مسیح کے حواری یہوداہ اسکریوطی نے اپنے ساتھیوں کو گرفتاری مسیح کے لئے یہ علامت قرار دی تھی کہ جسے میں چوموں اُسے گرفتار کر لینا چنانچہ ایسا ہی عمل میں آیا۔ مگر یوحنا (۱۸ : ۴ تا ۸) میں واقعہ اس طور پر درج ہے کہ عیسٰی نے خود آگے بڑھ کر دو بار اپنے پکڑنے والوں سے کہا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو یسوع میں ہوں وہ لوگ یہ سُن کر پیچھے ہٹے اور زمین پر گر پڑے آخر کار عیسٰی علیہ السلام نے خود ہی اپنے آپ کو خوب پہچوا کر اپنے کو گرفتار کرا دیا۔ اور اب ان دو بیانات میں سے ہم کسے سچا سمجھیں؟ لازمی طور پر ان میں سے ایک بیان غلط ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ دونوں بیان غلط ہوں کیونکہ جب کسی کتاب میں غلطیوں کا احتمال ہو جاتا ہے۔ تو ساری کتاب بے اعتبار ہو جاتی ہے۔ خصوصًا وہ کتاب جسے آسمانی یا الہامی ہونے کا دعوےٰ ہو۔

دوسرا اختلاف تعین صلیب بردار میں ہے۔ یوحنا (۱۹ : ۱۷) میں ہے کہ یسوع خود اپنی صلیب کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔ اور متی (۲۷ : ۳۲) اور مرقس (۱۵ : ۲۱) اور لوقا (۲۳ : ۲۶) میں یہ لکھا ہے کہ مسیح کی صلیب شمعون قرینی سے اٹھوا کر لے گئے تھے۔ علاوہ اس اختلاف کے یہاں ایک اور امر بھی قابل غور ہے۔ اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں زیر آیت ۳۲ باب ۲۷ متی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ کا دستور یہ تھا کہ جس شخص کو صلیب دی جاتی تھی وہ شخص خود ہی اپنی صلیب اٹھا کر لے جاتا تھا۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ عیسٰی علیہ السلام نہ قتل کئے گئے نہ آپ کو صلیب دی گئی۔ بلکہ اس بارہ میں لوگوں کو شبہ میں ڈال دیا گیا وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ (۴ : ۲۲۱)

عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے کہ قبل نزول قرآن بھی عیسائیوں میں چار فرقے ایسے تھے۔ جن کا اعتقاد یہ تھا کہ عیسٰی علیہ السلام مصلوب نہ ہوئے تھے بلکہ اُن کی جگہ شمعون قرینی پکڑا گیا اور مصلوب ہوا وہ چار فرقے یہ ہیں :- (۱) باسلیدی (۲) سرنتھی (۳) کاپوکراتی (۴) اگناستک جارج سیل بھی قرآن کے انگریزی

ترجمہ میں سورۂ آل عمران کے رکوع ۵ میں وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ کے تحت ان فرقوں کے وجود اور انکے بہت قدیم ہونے اور ان کے متذکرہ بالا عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں اسی سلسلہ میں سیل صاحب اپنے اسی نوٹ میں برنباس کی انجیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کرتے ہیں :-

"اے برنباس میری بات پر یقین کر کہ ہر گناہ کی خواہ وہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو خدا بڑی دردناک سزا ضرور دیتا ہے کیونکہ خدا گناہ سے ناراض ہوتا ہے چونکہ میری والدہ اور میرے وفادار شاگردوں کو جو مجھ سے محبت تھی اس میں محبت دنیا کی بھی آمیزش تھی خدائے عادل نے یہی مناسب سمجھا کہ اس جرم کی پاداش میں انہیں اسی دنیا میں رنج دیا جائے تاکہ آخرت میں وہ دوزخ کے شعلوں سے نجات پائیں۔ اور میرا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ میں دنیا میں بے قصور رہا۔ تاہم بعض لوگوں نے مجھے خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اس لئے مشیت الٰہی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ قیامت کے دن شیاطین میری ہنسی نہ اڑائیں بلکہ اس کی رضا اسی میں ہوئی کہ یہوداہ کی موت کے ذریعہ سے اسی دنیا میں میری جگ ہنسائی ہو جائے۔ اور ہر شخص یہ گمان کرلے کہ میں نے صلیب پر جان دی۔ اور یہ ساری ہنسی اور ہتک اس وقت تک رہے کہ محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اس دنیا میں آئیں اور میرا ایمان دار کو اس غلطی سے نکالیں"

ممکن ہے کہ اسی نوع کے مضامین کی بنا پر انجیل برنباس کو عیسائیوں نے جعلی قرار دے کر مروجہ مطبوعہ کتب مقدسہ سے خارج کر رکھا ہو مگر اکثر قدیم قلمی نسخوں میں یہ انجیل موجود ہے اور نسخہ سینا میں بھی یہ انجیل موجود ہے یہ وہی نسخہ ہے جسے حال میں انگلستان نے ایک لاکھ پونڈ پر خریدا ہے اور جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ۔ سیل صاحب اپنے نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ عبارت مسلمانوں نے اس انجیل میں شامل کر دی ہے باوجود اس اہتمام کے سیل صاحب نے اس عبارت کو اس قدر اہمیت دی کہ اپنے نوٹ میں اسے بالکلیہ نقل کر دیا اور اپنے اس خیال کی تائید میں نقل کیا کہ نزولِ قرآن سے بہت

قبل عیسائیوں کی متعدد جماعتیں اس عقیدہ پر قائم تھیں کہ مسیح نہ مصلوب ہوئے نہ قتل ہوئے بلکہ
اور غلط بیان کو غلط جان کر کوئی معقول پسند شخص اپنی تائید میں اس بیان کو پیش نہیں کیا کرتا۔ علاوہ
بریں جس زمانہ میں انجیل برنباس لکھی گئی اور مشہور ہوئی اور اس کی نقلیں پھیلیں اس زمانہ میں اہل اسلام کا
کا وجود ہی کہاں تھا کہ مندرجہ بالا عبارت کو انجیل میں شامل کر دیتے اگر مسلمانوں نے "اپنے وجود میں
آنے کے بعد کسی نہ کسی تدبیر سے انجیل میں اس عبارت کو شامل کر دیا تو عیسائی اس الزام کے ثبوت میں
کسی ایک ہی قدیم نسخہ انجیل برنباس کو پیش کر دیں جس میں یہ عبارت نہ ہو۔ عیسائی دنیا میں یقیناً متعدد
نسخے ایسے ہوں گے۔ جو محض عیسائیوں ہی کی تحویل میں رہے ہوں گے اور جن تک کسی مسلمان کا ہاتھ
نہ پہنچا ہوگا۔ اگر ان نسخوں میں بھی یہ عبارت موجود ہے تو مسلمانوں پر یہ اتہام ظلم ہے۔ بفرض محال اس
بات کو مان بھی لیا جائے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے عیسائیوں کی انجیل میں تحریف ہو گئی اور عیسائی اب
ایک بھی نسخہ ایسا پیش نہیں کر سکتے۔ جو اس تحریف سے بچا ہو تو اس صورت میں بھی عیسائیوں کی کتابیں
غیر محفوظ اور تحریف شدہ اور ناقابل اعتماد ثابت ہوتی ہیں۔

بہرحال صرف ایک انجیل میں یہ لکھا ہے۔ کہ صلیب اٹھا کر لے جانے والے خود مسیح تھے اس کے مقابلہ
میں تین انجیلیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ نہیں بلکہ اس صلیب کا اٹھا کر لے جانے والا شمعون قرینی تھا پھر یہ
بھی معلوم ہوا کہ اس زمانہ کا دستور یہی تھا کہ جو صلیب پر لٹکایا جاتے وہی صلیب کو خود اٹھا کر لٹکنے کی جگہ لے بھی جاتا
اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قدما کی چار جماعتیں یہی کہتی ہیں کہ مصلوب ہونے والا شمعون قرینی تھا نہ کہ مسیح علیہ السلام
مزید برآں حضرت مسیح کے قول مندرجہ انجیل برنباس پر بھی نظر ڈالی جائے اس کے بعد منصف مزاج حضرات
خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ افسانہ صلیب میں صداقت کو کس حد تک دخل ہے۔

تیسرا اختلاف صلیب دیئے جانے کے وقت سے متعلق ہے مرقس (۱۵: ۲۵) میں ہے کہ تیسرا
گھنٹہ تھا جبکہ انہوں نے اسے صلیب دی یعنی صبح کے نو (۹) بجے تھے اور یوحنا (۱۹: ۱۴) میں ہے کہ چھٹے

گھنٹے کے قریب سولی دی گئی جس کے معنی یا تو یہ ہوسکتے ہیں کہ چھ (۶) بجے صبح سولی ملی یا چھ (۶) گھنٹے دن چڑھے یعنی ۱۲ بجے دوپہر کو۔ متی (۲۷: ۴۶) سے نویں (۹) گھنٹے تک یسوع کا زندہ رہنا پایا جاتا ہے۔ اور اس وقت ان کا بڑے شور سے چلا کر یہ کہنا بیان کیا جاتا ہے کہ "ایلی ایلی لما سبقتانی" یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا۔ لاطینی زبان کی ایک کتاب سیلیس انالیس کرونالاجیکا کے باب ۸ صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے کہ صبح کے دن شام کے وقت انہوں نے اُسے صلیب پر لٹکایا تھا اہم واقعہ اور اس میں اس درجہ اختلاف متذکرہ بالا جملہ اوقات مذکورہ کی بے اعتباری پر دلالت کرتا ہے۔

چوتھا اختلاف ان دو چوروں کی بابت ہے۔ جو مسیح کے ساتھ صلیب پر دائیں بائیں لٹکائے گئے تھے۔ متی (۲۷: ۴۴) کا بیان ہے کہ دونوں چور مسیح کو بُرا کہہ رہے تھے مگر لوقا (۲۳: ۳۹ تا ۴۳) کا بیان ہے کہ صرف ایک ہی چور آپ کو بُرا کہتا تھا اور دوسرا چور آپ کی تعریف کرتا تھا۔ بعض مفسرین نے ان ہی اختلافات کے دُور کرنے کی کوشش کی ہے مگر نتیجہ تشفی بخش نہ نکل سکا مثلاً اسکاٹ صاحب نے اپنی طرف سے ترتیب زمانی وضع کر کے بیانات مختلفہ کو آگے پیچھے اس طرح بیان کر دیا کہ پہلے دونوں چور آپ کو بُرا کہتے تھے۔ پھر ایک نے بُرا کہنے سے توبہ کی اور اچھا کہنا شروع کر دیا۔ اس تطبیق بلا دلیل سے کسی کی بھی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس صورت سے تو تمام متضاد و متناقض امور میں تطبیق باہمی دی جا سکتی ہے اور صدق و کذب کا امتیاز ہی اُٹھ جاتا ہے۔

پانچواں اختلاف اس کتبہ کی عبارت میں ہے جو مسیح کی صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ یوحنا (۱۹:۱۹) میں یہ عبارت درج ہے "یسوع ناصری یہودیوں کا بادشاہ" متی (۲۷: ۳۷) کی عبارت ہے کہ "یہ یسوع یہودیوں کا بادشاہ ہے" ناصری کا لفظ یہاں درج نہیں مرقس (۱۵: ۲۶) اور لوقا (۲۳: ۳۸) میں کتبہ کی عبارت یہ بیان کی گئی ہے کہ "یہودیوں کا بادشاہ ہے" یعنی یہاں نہ یسوع کا لفظ ہے نہ ناصری کا۔

چھٹا اختلاف اس میں ہے کہ مسیح کو صلیب پر چڑھتے اور جان دیتے کس کس نے دیکھا متی (۲۶ : ۵۶) میں لکھا ہے کہ جب مسیح گرفتار ہوئے اسی وقت "سب شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے" تو ظاہر ہے کہ مصلوبی کے وقت شاگردوں میں سے ایک بھی مسیح کے پاس نہ تھا۔ مرقس (۱۴ : ۵۰) سے بھی اسی بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ لوقا (۲۳ : ۴۹) میں لکھا ہے کہ عورتیں وغیرہ مسیح کے صلیب پانے کے وقت دُور سے کھڑی ہو کر سارا حال دیکھ رہی تھیں مگر یوحنا (۱۹ : ۲۵) میں لکھا ہے کہ یہ سب لوگ اور عورتیں صلیب کے پاس کھڑی تھیں اور اتنے قریب تھے کہ مسیح نے اپنی والدہ کو اپنے ایک شاگرد کے سپرد فرمایا اور فرمایا کہ دیکھ یہ تیری ماں ہے۔ ان بیانات میں کس قدر اختلاف ہے؟

متی (۲۷ : ۵۰ تا ۵۵) میں مسیح کے جان بحق تسلیم ہوتے وقت کا منظر یوں کھینچا گیا ہے کہ ہیکل کا پردہ پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑخ گئے اور قبریں کھل گئیں اور مُردے نکل پڑے اور زندہ ہو گئے متی ہی کا یہ قول ہے کہ مسیح کی گرفتاری کے وقت سب شاگرد مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے پھر یہ دیکھا کس نے کہ ہیکل کا پردا پھٹ گیا اور زمین کانپی اور مُردے قبروں میں سے نکل کر زندہ ہو گئے اور اندھیرا چھا گیا؟ کیا دشمنانِ مسیح کی شہادت پر یہ سارے واقعات درج انجیل کر دیئے گئے؟ اگر انجیل یوحنا کے مطابق یوحنا اُس وقت حاضر تھا تو یوحنا نے تو ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کیا۔ پھر متی نے یہ جملہ عجائبات کہاں سے دیکھ لئے؟ ایک طرف متی لکھتے ہیں کہ قبروں میں سے مردے نکل کھڑے ہوئے اور زندہ ہو گئے۔ دوسری طرف ایوب (۷ : ۹ : ۱۰) میں لکھا ہے کہ جو قبر میں جاتا ہے وہ پھر قیامت تک واپس نہیں آتا۔ اب ان دونوں میں سے اگر ایک بات صحیح ہے تو دوسری یقیناً غلط ہے اور دونوں میں سے ایک قول کی بھی غلطی موجود ہ بائیبل پر سے اعتبار اُٹھا دینے کے لئے کافی ہے اور جب بائیبل ہی سے اعتبار اُٹھ گیا تو محتاط لوگوں کے نزدیک اُس کا ہر بیان جس کی کہیں خارج سے تائید نہ ہو مشکوک ہے

ساتواں اختلاف ان لوگوں کی بابت ہے جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے

مسیح کو مر کر دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا۔ قرنتیوں کے (۱۵ : ۵ و ۶) میں پولوس لکھتے ہیں کہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا بارہ حواریوں نے دیکھا پھر اس کے بعد" پانچ سو بھائیوں سے زیادہ تھے جنہیں وہ ایک بار دکھائی دیا"۔ اوّل تو بارہ حواریوں کی تعداد ہی غلط ہے زمانہ مسیح میں صرف گیارہ (۱۱) ہی حواری تھے۔ بارہواں حواری مسیح کے آسمان پر جانے کے بعد بذریعہ قرعہ اندازی کے منتخب ہوا ہے جس کی تفصیل کتاب اعمال کے باب اوّل میں درج ہے پھر اناجیل اربعہ متفق ہیں کہ سوا گیارہ حواریوں کے کسی نے مسیح کو دوبارہ زندہ نہیں دیکھا۔ اعمال (۱۰ : ۴۰ و ۴۱) میں بھی صاف لکھا ہے کہ —
اس کو (یعنی مسیح کو) خدا نے تیسرے دن اٹھایا اور ظاہر کر دکھایا ساری قوم پر نہیں بلکہ ان گواہوں پر کہ آگے سے خدا کے چنے ہوئے تھے یعنی ہم پر"۔ پھر پولوس نے یہ کہاں سے کہ دیا کہ ۵۰۰ پانچسو بھائیوں سے زیادہ تھے جنہیں وہ ایک بار دکھائی دیا۔ اعمال (۱ : ۱۵) کی رُو سے شاگردوں کی تعداد ایک سو بیس (۱۲۰) سے زائد نہ تھی۔ یہ تعداد عروج مسیح سے بعد کی ہے نہ کہ وقوع صلیب سے قبل کی قبل کی تعداد اس سے بھی کم ہوگی۔ پولوس کے یہ پانچسو سے زائد بھائی کہاں سے پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے مسیح کی حیات ثانی کا مشاہدہ کر لیا۔ کیا متی اور یوحنا اور پطرس وغیرہم جو مسیح کے مقرب حواری تھے پولوس کے پانچ سو بھائیوں میں شامل نہ تھے کہ یہ بھی اپنی تصانیف میں کچھ اس کا ذکر کرتے بقول مسیحی علماء کے لوقا اور مرقس نے پولوس اور پطرس ہی کی تعلیم سے اپنی اپنی انجیلیں لکھیں مگر ان دونوں نے بھی یہ بات کہیں نہ لکھی۔ لوقا نے خاص طور پر پولوس ہی سے پوچھ پوچھ کر مسیح کا حال لکھا مگر باوجود اس کے یہی لکھا کہ صرف گیارہ حواریوں ہی نے مسیح کی حیات ثانی کا مشاہدہ کیا اس نے نہ بارہ حواریوں کا ذکر کیا نہ پانچسو سے زائد بھائیوں کا۔

اب جنہیں اس حیات ثانی کا مشاہدہ ہوا ان کی بابت بھی مختلف بیانیاں ذرا ملاحظہ ہوں۔
یوحنا (۲۰ : ۱۴) میں لکھا ہے کہ مریم مگدلینی نے مسیح کو مصلوبی کے تیسرے دن دیکھا مگر

نہ پہچانا۔ لوقا (۲۴: ۴ و ۵ و ۶) میں لکھا ہے کہ مریم مگدلینی نے فرشتوں سے یسوع کے جی اٹھنے کا حال سن کر شاگردوں کو خبر دی تھی مگر یوحنا (۲۰: ۱ و ۲ و ۴) سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی کو مسیح کے جی اٹھنے کی خبر نہ تھی اور جب تک کہ مسیح کو مرنے کے بعد زندہ نہ دیکھا یہی سمجھا تھا کہ مسیح کی نعش کو کوئی قبر سے نکال کر لے گیا ہے اور جب مسیح کو دیکھا بھی تو انہیں نہ پہچانا بلکہ یہی سمجھا کہ کوئی باغبان ہے مرقس (۱۶: ۹) میں ہے کہ یسوع قبر سے جی اٹھنے کے بعد پہلے مریم مگدلینی کو دکھائی دئے۔ لوقا (۱۴: ۱۳ و ۳۴) میں ہے کہ پہلے دو مردوں کو یا شمعون کو دکھائی دیا۔ متی (۲۸: ۹) میں ہے کہ مریم نے یسوع کو دیکھ کر ان کے قدم پکڑے مگر یوحنا (۲۰: ۱۷) میں ہے کہ یسوع نے کہا کہ مجھ کو مت چھوؤ۔ کیونکہ میں ہنوز اوپر اپنے باپ کے پاس ابھی نہیں گیا۔ پھر یوحنا (۲۰: ۱۲) میں ہے کہ مریم نے دو فرشتے یسوع کی قبر میں بیٹھے دیکھے۔ لوقا (۲۴: ۴) میں ہے کہ دو شخص اپنے پاس کھڑے دیکھے مرقس (۱۶: ۵) میں ہے کہ ایک جوان کو سفید پوشاک پہنے ہوئے قبر میں بیٹھے دیکھا۔ متی (۲۸: ۲) میں ہے۔ کہ ایک فرشتے کو قبر کے باہر پتھر پر بیٹھے دیکھا اب خیال فرمائیے کہ ایک ہی واقعہ کو چار انجیلوں میں چار مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے بیانات میں اختلافات کی اس سے زیادہ بین مثال اور کیا ہو سکتی ہے،

پھر مرقس باب ۱۶ اور لوقا باب ۲۴ میں جو لکھا ہے کہ عورتیں تیسرے دن خوشبو لے کر قبر پر گئیں کہ یسوع کی نعش پر وہ خوشبو ملیں یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ بقول اناجیل ہی کے قبر پر ایک بھاری پتھر رکھا گیا تھا اور اس پتھر پر مہر لگا دی گئی تھی۔ اور رومی سپاہیوں کا وہاں بہت سخت پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔ اس پہرہ کا باعث یہ تھا کہ یہودیوں کو پہلے سے اس بات کا خوف تھا کہ ایسا نہ ہو کہ عیسائی لوگ مسیح کی نعش کو قبر میں سے چوری سے نکال لے جائیں اور مشہور کر دیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہو گیا تو اس صورت میں یہ فتنہ پہلے فتنے سے شدید تر ثابت ہوگا۔ چنانچہ بعد میں عیسائیوں نے جب مسیح کا پھر زندہ ہو جانا بیان کیا۔ وہ یہودیوں میں اس مصلوب کی نعش کا چوری ہو جانا مشہور ہے جس کی تائید متی (۲۸: ۱۳ و ۱۴ و ۱۵)

سے بھی پوری طرح ہوتی ہے اور رومی سپاہیوں کا پہرہ بہت سخت ہوتا تھا۔ اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رومی فوج میں یہ قانون تھا کہ جو سپاہی اپنے پہرے پر سو جائے وہ قتل کر دیا جائے۔ ایسے سخت پہرے کے ہوتے ہوئے وہ عورتیں کیا دیوانی تھیں جو خوشبو لے کر مصلوب کی قبر پر جا پہنچیں اگر یہ سمجھا جائے کہ انہیں مسیح کے جی اٹھنے کا یقین تھا۔ تو اول تو یہ بات کسی انجیل سے ثابت نہیں ہوتی دوم ایسی صورت میں قبر پر جانے کی کیا ضرورت تھی زندہ شخص کو اب قبر سے کیا تعلق۔ سوم ان عورتوں نے پھر یہ کیوں کہا کہ :۔ ہمارے لئے پتھر کو قبر کے دروازے پر سے کون ڈھلکائے گا "

متی (۲۷ : ۳ : ۶) میں جو یہ قول مسیح سے منسوب کیا گیا ہے کہ میں تین دن زمین کے نیچے رہونگا وہ قول اگر صحیح ہے تو ممکن ہے کہ اس سے اس جانب اشارہ ہو کہ عیسٰی علیہ السلام نے زمین پر تین برس نبوت کا کام کیا اور اس کے بعد اٹھا لئے گئے۔ کیونکہ حزقی ایل (۴ : ۶) کی رو سے نبیوں کے ایک دن سے ایک سال مراد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جان مکڈول بھی اپنی کتاب تعلیم الایمان مطبوعہ امریکن مشن لدھیانہ ۱۸۶۹ء کے صفحہ ۱۳۰ پر لکھتے ہیں کہ :۔ اکثر عالموں نے کلام الٰہی کی تفسیر میں ایک دن کو ایک برس تصور کیا ہے اور قدیم یہودی اور سب مسیحی عالم بھی اسی شمار میں متفق ہیں " اگر قول مسیح سے مندرجہ بالا معنی نہ سمجھے جائیں بلکہ یہ معنی لئے جائیں کہ آپ تین دن قبر میں رہ کر اٹھ کھڑے ہوں گے تو یہ قول غلط ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ اناجیل کی رو سے آپ صرف ایک دن اور دو رات قبر میں رہے۔

جب صلیب ہی کا افسانہ غلط ہے تو مر کر زندہ ہو جانے کا قصہ تو اور بھی غلط ہونا چاہئے۔ افسانہ صلیب کی تردید اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے۔ کہ استثنا (۲۱ : ۲۳) میں لکھا ہے کہ جو لکڑی پر لٹکایا جاتا ہے یعنی جو سولی دیا جاتا ہے وہ خدا کا ملعون ہوتا ہے اگر یہ آیت صحیح ہے تو اللہ تعالٰے نے ضرور اپنے پیارے اور برگزیدہ بندے عیسٰی علیہ السلام کو اس لعنت سے دور اور صلیب پانے سے محفوظ رکھا ہوگا۔ اس کے خلاف اناجیل میں جس قدر واقعات درج ہوں وہ سب یقیناً غلط اور الحاقی ہیں

اور ان میں اس قدر اختلافات ہیں کہ وہ سب بیانات پایۂ اعتبار سے گرجاتے ہیں۔

قربانی اور کفارہ | اگر عیسائی عقیدہ کے مطابق تھوڑی دیر کے لئے اس بات کو مان بھی لیا جائے۔ کہ مسیح نے صلیب پائی تو تفتیش طلب مسئلہ یہ باقی رہتا ہے کہ یہ مصلوبی قربانی کیونکر ہو گئی اور اس قربانی کی ضرورت کیا پیش آئی تھی اور یہ دوسروں کے لئے کفارہ کس حد تک ثابت ہو سکتی ہے۔

اوّل تو وہ تخیل ہی غلط ہے جس پر قربانی اور کفارہ کے اس عقیدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ یہ بات عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے کہ آدم علیہ السلام کے گناہ میں جملہ بنی آدم شریک ہیں آدم سے ایک گناہ ہوا تھا جس کی انہیں دو سزائیں مل چکیں ایک بہشت سے خراج دوسری موت (پیدائش ۳ رومیوں ۵:۱۲ تا ۱۹) اوّل قرنتیوں ۱۵:۲۱) جب ایک گناہ کی دو سزائیں مل چکی ہیں تو وہ گناہ اب باقی کہاں رہا جو اولاد آدم سینکڑوں ہزاروں پشت تک اس ناکردہ گناہ کی سزائیں مبتلا رہے اگر خروج (۲۰:۵) کا سہارا ڈھونڈا جائے جس کا مضمون یہ ہے کہ باپ دادا کی بدکاریوں کا بدلہ اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک لیا جاتا ہے۔ یا استثناء (۲۳:۲) سے مدد لی جائے جس میں لکھا ہے کہ حرامی بچہ اور اس کی دس پشتیں خداوند کی جماعت میں داخل نہیں ہو سکتیں تب بھی مطلب براری نہیں ہو سکتی کیونکہ آدم علیہ السلام کی سینکڑوں ہزاروں پشتیں گزر چکی ہیں یہ خیال بھی غلط ہے کہ موت گناہ کا نتیجہ ہے پرندوں اور جانوروں نے حضرت آدم کی طرح کس نیکی و بدی کی شناخت کے درخت کا پھل کھالیا تھا۔ جو وہ اور ان کے بچے بھی مرتے ہیں حالانکہ سانپ آدم کے اس گناہ کا باعث ہوا تھا مگر اس کے بچے ہزاروں برس تک زندہ رہتے ہیں پھر مسیح کی قربانی اگر کفارہ بن گئی تو مسیح پر ایمان لانے والوں کے لئے چاہئے تھا کہ موت نہ ہوتی۔ مگر تعجب ہے کہ وہ بھی اسی طرح مرتے ہیں جس طرح مسیح پر ایمان نہ لانے والے آدم کے اس گناہ میں حوا بھی شریک تھیں بلکہ حوا ہی نے آدم کو اس گناہ پر ابھارا تھا۔ چنانچہ پیدائش (۳:۱۶) کی رو سے حوا کو یہ سزا سنائی

گئی۔ کہ بچہ پیدا ہوتے وقت عورت دردِ زہ میں مبتلا ہو گی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی عورتیں آج بھی دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان کا مسیح اور مسیح کی قربانی پر ایمان انہیں اس درد کی تکلیف سے نجات نہیں دیتا۔ کفارہ کا فائدہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ مسیح پر ایمان لانے والے موت سے نجات پاتے۔ اور ایمان لاتے ہی فوراً بغیر مرے بہشت میں داخل ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ لوگوں نے مسیح پر ایمان لانے کے بعد بھی ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائی ہیں جو موت سے بھی شدید تر تھیں عیسائیوں میں ایسے فرقے بھی گزرے ہیں جو اس عقیدہ کو لغو سمجھتے ہیں اور لوگوں کو آدم کی نسل میں ہونے کی بنا پر ناپاک اور گنہگار نہیں تسلیم کرتے اور موت انسانی کو آدم کے گناہ کی سزا نہیں قرار دیتے۔

دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ ایک طرف تو بائیبل میں یہ لکھا ہے کہ :"وہ جو جان کے لئے کفارہ دیتا ہے سو لہو ہے" (احبار ۱۷ : ۱۱) یعنی قربانی کے خون کے بغیر گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتا۔ "بغیر لہو بہائے معافی نہیں ہوتی" (عبرانیوں ۹ : ۲۲) وہ (یعنی مسیح) ایک بار ظاہر ہوا کہ اپنے تئیں قربانی کرنے سے گناہ کو نیست کرے۔" (عبرانیوں ۹ : ۲۶) اور لہو بہانے کی تفسیر علمائے نصاریٰ یہ کرتے ہیں کہ اس قدر خون بہایا جائے کہ موت واقع ہو جائے یعنی ایک طرف تو بائیبل میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بغیر قربانی کا خون بہائے گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا اور نجات کی کوئی دوسری تدبیر ممکن نہیں اور مسیح مصلوب نہ ہوئے ہوتے تو جہان میں کوئی نجات نہ پاتا۔ اور خدا کا عدل اور رحم پورا نہ ہوتا اور دوسری طرف اسی بائیبل میں ایسی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں کہ صلیب کا قصہ پیش آنے سے قبل بغیر اس کے کہ کوئی قربانی عمل میں آئی ہو یا خون کی ایک بوند بھی زمین پر ٹپکی ہو مسیح نے محض اپنے اختیار سے لوگوں کے گناہ معاف کر دیئے متی (۹ : ۲ تا ۶) میں وہ واقعہ درج ہے جبکہ مسیح نے اپنی مصلوبی سے بہت پہلے ایک مفلوج کے گناہ بخش دیئے تھے اور کہا تھا کہ :" ابن آدم (یعنی مسیح) کو زمین پر گناہ بخش دینے کا اختیار ہے۔" لوقا (۷ : ۴۸) میں ہے کہ مسیح

نے ایک عورت کے بھی گناہ بخش دیئے تھے حالانکہ قصہ صلیب ابھی پیش نہ آیا تھا۔ یوحنا (۸: ۱ تا ۱۱) میں ہے کہ مسیح نے ایک زانیہ عورت کو بھی معاف کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جا اور پھر گناہ نہ کرنا لوقا (۱۹: ۹) میں ہے کہ محصول لینے والوں کے سردار اور متمول زکی کو بھی نجات کی بشارت دیدی گئی تھی۔ لوقا (۲۳: ۴۳) میں ہے کہ صلیب پر (یعنی ابھی قربانی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ) مسیح نے ایک چور کے گناہ بخش دئے تھے متی (۲۰: ۱۵) میں مسیح کا یہ قول درج ہے کہ :- کیا روا نہیں کہ میں اپنے مال میں سے جو چاہوں سو کروں" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو اپنی اُمت کو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کے بندے اس کی ملکیت ہیں وہ اپنی ملکیت میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے اور وہ اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے میں کسی قربانی یا کفارے یا کسی اور چیز کا محتاج نہیں اور مندرجہ بالا مثالوں سے اگر وہ صحیح ہیں تو یہ پایا جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار مل گیا تھا کہ وہ جس کے چاہیں گناہ معاف کر دیں بغیر اس کے کہ کوئی قربانی کی گئی ہو یا کفارہ ادا کیا گیا ہو پھر مصلوبی اور کفارہ کی حاجت ہی کیا رہی؟

گناہوں کی بخشش نے عیسائیوں میں وہ وسعت اختیار کر رکھی ہے کہ صرف مسیح ہی نہیں بلکہ مسیح کے شاگردوں کو بھی جنت اور دوزخ کی چابی عطا فرمادی گئی تھی حالانکہ ان شاگردوں میں سے ایک بھی مصلوب نہ ہوا تھا یوحنا (۲۰: ۲۳) میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ "جن کے گناہ تم بخشو گے ان کے گناہ بخشے جائیں گے اور جنہیں تم نہ بخشو گے نہ بخشے جائیں گے"۔ یوحنا کی رو سے یہ اجازت حواریوں کو مصلوبی کے بعد مسیح کی حیات ثانی میں عطا ہوئی مگر متی (۱۶: ۱۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ مصلوبی سے بہت دن قبل جنت دوزخ کا یہ اختیار حواریوں کو مل چکا تھا چنانچہ پاپائے روم نے صدیوں اس اختیار پر عمل کیا اور گناہوں کی معافی کی چٹھیاں یروشلم پر لڑنے والے عیسائیوں کو سینکڑوں برس تک تقسیم کیں۔

نہ صرف حواریوں اور ان کے جانشینوں بلکہ ہر عیسائی مرد اور عورت کو اپنی گنہ گار زوجہ یا گنہ گار شوہر کو دوزخ سے بچا لینے کا مرتبہ حاصل ہے (اول قرنتیون ۷: ۱۶) بلکہ عیسائیوں میں ہر فرد تنہا اپنی نجات کی

آپ ہی تدبیر کر سکتا ہے (لوقا ۱۰: ۲۵ تا ۲۸ متی ۲۲: ۱۰) ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے حضرت عیسٰی کی مصلوبی اور کفارہ کی قطعاً کوئی حاجت نہ تھی۔

تیسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ مسیح کی یہ قربانی مسیح پر ایمان لانے والے کے لئے اس کے تمام عمر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یا صرف ایمان لانے کے وقت تک کے گناہ ہی معاف ہوتے ہیں؟ اگر تمام عمر کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو پھر دین کی پابندی اور عبادت و ریاضت اور یوم السبت کے احترام کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور وہ جملہ پند و نصائح وامر و نواہی جن سے کتب مقدسہ پُر ہیں لایعنی اور بیکار ہو جاتی ہیں اگر ایمان لانے سے قبل ہی گناہ معاف ہوتے ہیں تو ایمان لانے سے بعد کے گناہوں کے کفارہ کے لئے اسے دوسری قربانی کرنی پڑے گی! اور جب وہ بعد کے گناہوں کو قربانی سے دور کر دیتا ہے تو پہلے کے گناہوں کو بھی خود ہی قربانی سے دور کر سکتا تھا قربانی مسیح کی کیا ضرورت تھی؟ مگر عبرانیوں کے باب ۱۰ آیہ ۲۶ میں یہ عبارت بھی درج ہے کہ:-

"بعد اس کے کہ ہم نے سچائی کی پہچان حاصل کی ہے جان بوجھ کے گناہ کریں تو پھر گناہوں کے لئے کوئی قربانی باقی نہیں"

بہت کم عیسائی ایسے ہوں گے جو عیسائی ہونے کے بعد کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں مندرجہ بالا آیت کی رو سے افسوس ہے کہ اُن کے ان گناہوں کی معافی کی کوئی صورت نہیں۔ ان سے کافر ہی اچھے جو مسیح پر ایمان لاتے ہی گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں ان عیسائیوں کے گناہ تو مسیح پر ایمان لانے سے بھی دور نہیں ہوتے۔ اور کسی دوسری قربانی سے بھی ان گناہوں کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا۔

چوتھا امر قابلِ توجہ یہ ہے کہ قربانی ہمیشہ عمدہ نفیس بے عیب اور مال طیب کی دی جاتی ہے عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسٰی میں کمال الوہیت اور کمال انسانیت دونوں کا اجتماع تھا الوہیت کی حیثیت کو تو قربانی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ الوہیت ہی کیا ہے جو قربان ہو سکے چونکہ کفارہ انسانی گناہوں کا مقصود تھا اس لئے قربانی انسان ہی کی ہو سکتی تھی اور مسیح صرف انسان کامل ہونے کی حیثیت ہی سے صلیب پر چڑھے

اور قربان ہو گئے۔ مگر عیسائی عقیدہ ہی کے رو سے مسیح بحیثیت انسان ہونے کے بے عیب نہ تھے اور (نعوذ باللہ) گناہ سے پاک نہ تھے۔ رومیون (۳: ۹ تا ۱۲) کا فتویٰ ہے کہ آدم کی اولاد میں کوئی بے گناہ نہیں کوئی راستباز نہیں، کوئی سمجھدار نہیں، کوئی خدا کا طالب نہیں سب گمراہ ہیں نکمے ہیں اور بدکار ہیں ایوب (۱۵: ۴) کا فیصلہ ہے کہ :۔ "وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے"۔ چنانچہ مسیح نے یوحنا اصطباغی (یعنی جان دی بپٹسٹ) سے بپتسمہ لیا اور یوحنا صرف توبہ ہی کا بپتسمہ دیتے تھے اور توبہ گناہوں سے ہوتی ہے، (متی باب ۳ مرقس باب ۱) لہٰذا مسیحیوں کے ان اقوال کے بموجب قربانی مسیح بے داغ نہ تھی۔ یہاں صرف مسیحی اقوال ہی سے بحث ہے ورنہ مسلمان تو عیسیٰ علیہ السلام اور تمام دیگر انبیاء کو معصوم قرار دیتے ہیں اور ان گستاخیوں سے لرزتے ہیں جو بعض عیسائی عقائد اور عیسائی تحریروں سے جناب مسیح اور دیگر انبیاء کی شان میں واقع ہوتی ہیں۔

پانچویں بات جو غور طلب ہے یہ ہے کہ عیسائی عقیدہ کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام صلیب پانے کے بعد جب جی اُٹھتے تھے تو انسانیت کے ساتھ آسمان پر گئے۔ کیونکہ مصلوبی کے بعد اگر عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت مفقود ہو گئی یا اُس انسانیت نے دوبارہ عود نہ کیا تو جی اُٹھنے کے نہ کوئی معنی ہیں نہ جی اُٹھنے کا ثبوت۔ الوہیت تو ماورائے موت و حیات ہے مرنے جینے کا اطلاق انسان پر ہوتا ہے مخلوق پر ہوتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی اسی انسانیت کے ساتھ جس سے آپ اس دنیا میں متصف تھے اور اپنے اسی انسانی جسم کے ساتھ جس سے اس دنیا میں آپ نے زندگی بسر فرمائی آسمان پر نہ گئے ہوتے تو آسمان پر جانے کی فضیلت ہی کیا تھی یوں تو ہر شخص مرتا ہے اور اُس کی روح آسمان پر جاتی ہے مگر یہاں فضیلت تو اس میں تھی کہ حضرت الیاس اور حضرت حنوک (یعنی ادریس) کی طرح حضرت عیسیٰ بھی دنیوی انسانی جسم کے ساتھ آسمان پر اُٹھائے گئے مصلوبی کے بعد خود مسیح نے لوگوں کو اپنا جسم دکھلایا لوقا (۲۴: ۳۷ تا ۴۴) کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو مصلوبی کے بعد کے زمانہ سے متعلق ہے :۔

"مگر اس نے (یعنی مسیح نے) ان سے کہا کہ تم کیوں گھبراہٹ میں ہو اور کیا ہے کو تمہارے دلوں میں اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھو کہ میں ہی ہوں اور مجھے چھوؤ اور دیکھو کیونکہ روح کو جسم اور ہڈی نہیں جیسا مجھ میں دیکھتے ہو اور یہ کہہ کے اُنہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے اور جب مارے خوشی کے اعتبار نہ کرتے تھے اور متعجب تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ تب اُنہوں نے بھونی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اور شہد کا ایک چھتا اس کو دیا۔ اس نے لے کے اُن کے سامنے کھایا"

اسی نوع کی گفتگو مصلوبی کے بعد مسیح اور توما میں بھی یوحنا (۲۰:۲۷) میں درج ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسیح کی انسانیت برقرار ہے اور ان کا دنیاوی جسم قائم و محفوظ ہے تو سولی پر کون چڑھا اور قربان کون ہوا اور قربانی میں نذر کیا چیز ہوئی اور انسانی گناہوں کا کفارہ کیونکر ادا ہو سکا؟ وہ نذر یہی فدیہ ہے جو واپس کر دیا گیا ہو؟ وہ قربانی بھی قربانی ہے جو قبول نہ کی گئی اور جسم کو اور جان کو واپس کر دیا گیا؟ اور ایسی نامقبول قربانی جو رد کر دی گئی ہو کیا انسانی گناہوں کا کفارہ ہو سکتی ہے جبکہ قربانی کی شرط یہ ہو کہ اس قدر خون بہایا جائے کہ موت واقع ہو جائے؟ بات دراصل یہ ہے کہ اناجیل مروجہ سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ کہ عیسٰی علیہ السلام کو سولی دی گئی اور جب آپ کو سولی ہی نہیں دی گئی تو مر کر جی اُٹھنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا اور قربانی اور کفارہ کے تخیلات بھی ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔

باوجود جملہ امور مندرجہ بالا کے عیسائی حضرات اسی پر مصر ہوں کہ مصلوبی مسیح کو ثابت کر کے اس قربانی کو اپنے گناہوں کا کفارہ قرار دیں تو انہیں معاملہ کے ذرا اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ قربانی کا فائدہ قربانی گزراننے والے کو ملتا ہے اس قاعدہ کی رُو سے قربانی مسیح کا فائدہ صرف یہوداہ اسکریوطی ہی کو پہنچتا ہے جس نے یہ بیش قیمت قربانی گزرانی نہ کہ اُن عیسائیوں کو جو صرف باتیں بناتے رہتے ہیں جب تک ہر عیسائی مسیح کے گرفتار کرا دینے میں اپنی شرکت ثابت نہ کر دے اس قربانی کے مفاد میں حصہ دار کیونکر ہو سکتا ہے اور اگر مسیح کو صرف ایک ہی شخص

یعنی یہوداہ اسکریوطی نے گرفتار کرایا اور اس گرفتاری اور قربانی سے لاکھوں کروڑوں عیسائیوں نے فائدہ اٹھایا اور دوزخ سے نجات پائی اور جنت کے مستحق ٹھیرے تو یہوداہ اسکریوطی نے بہت بڑا کام کیا اور بہت بڑا ثواب کمایا اور بہت اچھا آدمی اُسے سمجھنا چاہئے اور تمام عیسائیوں کو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے اور کم از کم اس کے ذاتی گناہ تو اسی کی گزرانی ہوئی قربانی کے طفیل میں معاف ہو ہی جانے چاہئیں مگر تعجب ہے کہ متی (۲۶: ۲۴) میں مسیح اسی یہوداہ اسکریوطی کی بابت فرماتے ہیں کہ "اس شخص پر افسوس جس کے ہاتھوں ابن آدم گرفتار کروایا جاتا ہے اگر وہ شخص پیدا نہ ہوتا تو اس کے لئے بہتر تھا" گویا اپنی اُمت کے لئے یہ قربانی یہ کفارہ اور گناہوں کی بخشش عام جناب مسیح کو بہت ناگوار گزری اور آپ نے اس قربانی گزرانے والے کے اس دنیا ہی میں ہونے پر تاسف فرمایا پھر یوحنا (۶: ۷۰) میں جناب مسیح یہوداہ اسکریوطی کو شیطان کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں عجائبات قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک حیرت میں ڈالنے والی نشانی ہے کہ اس شیطان نے بہشت کا دروازہ ساری خلقت کے لئے کھول دیا ایک شیطان آدم علیہ السلام کے بہشت سے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ دوسرا شیطان اولاد آدم کے بہشت میں جانے کا باعث بنا۔ گویا بہشت سے نکالنا اور بہشت میں لے جانا شیاطین ہی کے اختیار میں ہو گیا عیسائی علماء اگر اپنے موجودہ عقائد پر اڑتے ہیں جن کے لئے اناجیل مروجہ میں بھی کوئی قابل اعتماد تائید نہیں ملتی تو ان جملہ لازمی نتائج کو انہیں طوعاً و کرہاً ماننا پڑیگا۔ اور ان کا مذہب دنیا کے لئے ایک مضحکہ انگیز چیز بن جائے گا۔

مختلف مذاہب پر تنقیدی نظر ڈالنے والوں کے لئے اس کی ضرورت سب سے پہلے ہے کہ وہ اصلی اور حقیقی تعلیم کو بدعات مابعد سے علیحدہ کر کے دیکھیں پھر مختلف مذاہب کی اصلی تعلیمات کا باہمی موازنہ کر کے اُن مذاہب کی حقانیت یا عدم حقانیت کے متعلق رائے قائم کریں۔ اور اگر کسی مذہب زیر تفتیش میں اُنہیں لغویات اور بیہودگیوں سے سابقہ پڑے تو اس غلط نتیجہ پر نہ آجائیں کہ ہر مذہب ایسی ہی کچھ لغویات اور بیہودگیوں کا مجموعہ ہوتا ہے سچ اس جہان سے مفقود نہیں ہوا اور سچا مذہب لغویات اور توہمات و ظنیات و ہمیات لایعنی سے اب بھی محفوظ ہے اور آئندہ بھی محفوظ رہے گا۔ صرف چشم حق بیں کی ضرورت ہے۔

توریت و انجیل پر اسلامی رائے

اب تک توریت و انجیل کے متعلق ان مضامین میں جو کچھ لکھا گیا وہ بیشتر یا تو علمائے اہل کتاب کے اقوال تھے یا وہ نتائج جو ان اقوال سے پیدا ہوتے ہیں یہ سلسلہ ناقص اور یہ تبصرہ نامام رہے گا اگر علمائے اسلام کی تحقیقات کے نتائج سے بھی یہاں بحث نہ کی جائے کیونکہ مسلمانوں کو بھی توریت و انجیل سے بہت قوی تعلق ہے اور ان کا اسلام پر ایمان لانا توریت، زبور، انجیل وغیرہم پر بھی ایمان لانے کو مستلزم ہے قرآن میں کم از کم ایک سو کتنیں جگہ ان کتب سماوی کا ذکر آیا ہے کہیں فرداً فرداً اور کہیں مجموعاً جن مقامات پر یہود و نصاریٰ یا انبیائے سلف کا ذکر بغیر تذکرہ کتب مقدسہ آیا ہے ان کا شمار اس کے علاوہ ہے مثلاً۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۵ : ۳) اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

یہاں توریت و انجیل کا ذکر نہیں صرف یہود و نصاریٰ ہی کا ذکر ہے۔

شہادت قرآنی کی مثالیں | جن آیات میں کتب سماوی کا ذکر مجموعاً آیا ہے ان کی ایک مثال یہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹ : ۱۱۱) "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان و مال کو خرید لیا ہے کہ ان کے لئے جنت ہے، وہ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔"

یہاں توریت و انجیل و قرآن کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔

جن آیات میں ان کتابوں کا فرداً فرداً ذکر آیا ہے ان کی دو مثالیں یہ ہیں:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اور تحقیق ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں بعد نصیحت کے کہ میرے

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱: ۱۰۵) "صالح بندے زمین کے وارث بنیں گے۔"

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (۶۲: ۵) "جن لوگوں کو توریت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لادا جاتا ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کتابوں پر ایمان لانے کا بھی حکم دیا ہے اور ان کتابوں کے منکروں کو گمراہ بتایا اور ان پر عذاب نازل کیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (۴: ۱۳۶)

"اے ایمان والو! (یعنی اے مسلمانو) یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی قبل اس کے اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر وہ شخص یقیناً گمراہی میں بہت دور جا پڑا۔

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ۝ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ۝ (۴۰ : ۸)

"جنہوں نے جھٹلایا اس کتاب کو اور اس چیز کو جسے ہم نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ بھیجا انہیں البتہ معلوم ہو جائیگا (یعنی حقیقت حال ان پر کھل جائیگی) جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں انہیں گھسیٹتی ہوئی کھولتے پانی میں ڈال دیں گی پھر وہ آگ میں جھونک دئے جائیں گے۔"

یہ ہیبت ناک سزائیں صرف انہیں کے لئے نہیں ہیں جو قرآن کے منکر ہیں بلکہ ان کے لئے بھی ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے صحیفوں کے منکر ہیں۔

مگر یہ ساری تاکید اس چیز پر ایمان لانے سے متعلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائی اور جس پر صحیح طور سے وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ اور وَبِمَا أَرْسَلْنَا

بہ رُسُلنا کا اطلاق ہوتا ہو نہ کہ اُن تحریروں کے متعلق جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے خود خبر دیدی ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ جہاں قرآن میں اللہ تعالےٰ نے صحف سماوی پر ایمان لانا مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ وہاں اس بات کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ توریت و انجیل میں اہل کتاب نے تحریفیں کی ہیں۔

تحریف کے متعلق شہادتِ قرآنی توریت و انجیل میں تحریف اور تبدیلیوں کے واقع ہونے کی اطلاع اللہ تعالےٰ نے صاف صاف قرآن مجید میں دے دی فرماتا ہے:-

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲: ۹)

"(مسلمانو!) کیا تمہیں یہ اُمید ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) تمہاری تصدیق کریں گے حالاں کہ ان میں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کا کلام سُنتے تھے پھر جان بُوجھ کر اس کو بدل ڈالتے تھے۔"

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲: ۹)

"پس خرابی ہے اُن کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب (کتاب، آیات والفاظ کتاب) لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں تاکہ اس کے بدلے تھوڑا سا دُنیوی فائدہ کرلیں۔"

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (۴: ۷)

"یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے بول (یعنی آیات و کلمات) کو اپنے ٹھکانے سے بدل دیتے ہیں اور (منہ سے) کہتے ہیں۔ ہم نے سُنا اور (دل سے) کہتے ہیں ہم نے نہیں مانا۔"

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا

"یہودیوں کی عہد شکنی کے سبب ہم نے اُن کو پھٹکارا اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیا ہے وہ خدا کے بول اپنے ٹھکانے سے بدلتے ہیں اور نصیحت سے فائدہ اُٹھانا بھول

مِمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۵:۱۳) گئے ہیں تو ہمیشہ ان کی خیانت (یعنی کتاب میں رد و بدل کرتے رہنا) دیکھتا رہیگا بجز ان میں سے تھوڑے لوگوں کے"

وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (۵:۴۱) "یہودیوں میں بعض جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کے لئے وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کی طرف کے جو تجھ تک نہیں آئی وہ کلام کو بدل ڈالتے ہیں اُس کے اصلی ٹھکانے سے"

تحریف | جب قرآن میں اس قدر وضاحت کے ساتھ توریت و انجیل میں تحریف کا واقع ہونا بیان کیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے کیسے ممکن ہے کہ اس تحریف کے وقوع سے انکار کرے لہٰذا نفس تحریف پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اس امر پر البتہ مسلمانوں میں بحث یہی ہے کہ کتب مذکورہ میں تحریف لفظی واقع ہوئی ہے یا تحریف معنوی یا دونوں۔

بکثرت علمائے اسلام کی تحقیقات یہ ہے کہ توریت اور انجیل میں دونوں قسم کی تحریفیں ہوئی ہیں الفاظ بھی بدل دیئے گئے ہیں، دور باطل تاویلوں سے معانی بھی بگاڑ دیئے گئے ہیں لیکن امام بخاری صرف تحریف معنوی کے قائل ہیں وہ صحیح بخاری کے آخری حصہ میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور لفظ "رقیب" کی تفسیر نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ "یحرفون" کے معنی "یزیلون" کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اپنی کتابوں سے کچھ نکال ڈالتے یا اُس میں کچھ ملا دیتے۔ اس کے بعد امام بخاری لکھتے ہیں:-

وليس احد يزيل لفظ كتاب من كتب الله ولكنهم يحرفونه يتاولونه على غير تاويله (بخاری صفحہ ۱۱۲۰) "کتاب اللہ کے الفاظ کو کوئی شخص کتاب سے نکال نہیں سکتا۔ ان کے ازالے سے یہی مراد ہے کہ وہ لوگ اس میں ایسی تاویل کرتے ہیں جو درحقیقت صحیح تاویل نہیں ہوتی"

یہ قول درحقیقت امام بخاری کا ہے مگر بعض حضرات کو یہ اشتباہ و مغالطہ ہوا، کہ یہ قول حضرت ابن عباس کا ہے حالانکہ آپ کا قول "یحرفون بمعنی یزیلون" پر ختم ہو گیا اور اس کے بعد کا یہ قول جو اوپر نقل کیا گیا ہے امام بخاری کا اپنا قول ہے

"یحرفون یعنی یزیلون" سے ثابت نہیں ہوتا۔ کہ حضرت ابن عباس تحریف لفظی کے قائل نہ تھے کیونکہ آپ کے قول کی صریح اور صحیح تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ اہل کتاب الفاظ توریت و انجیل کو توریت و انجیل سے نکال دیتے تھے اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ اپنی طرف سے داخل کر دیتے تھے اس کی تائید حضرت ابن عباس کا وہ قول بھی کرتا ہے جو اسی صحیح بخاری کی کتاب التوحید اور کتاب الاعتصام اور کتاب الشہادت میں امام بخاری ہی نے نقل کیا ہے

ان ابن عباس قال یا معشر المسلمین کیف تسئلون اهل الکتب عن شیئ وکتابکم الذی انزل علی نبیکم احدث الاخبار باللہ محضا لم یشب وقد حدثکم اللہ ان اهل الکتب بدلوا کتاب اللہ وغیروہ وکتبوا بایدیھم الکتب وقالوا ھو من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا اولا ینھکم ما جاء کم من العلم عن مسئلتکم لا واللہ ما رأینا منھم رجلا یسئلکم عن الذی انزل علیکم (بخاری، صفحہ ۱۹۳۰،۳۶۹ / ۱۱۲)	"ابن عباس نے کہا اے مسلمانو! تم اہل کتاب سے کیونکر باتیں پوچھتے ہو، حالانکہ تمہاری کتاب جو تمہارے نبی پر نازل ہوئی ہے خدا کی طرف سے بعد میں آئی (یعنی جدید ترین ہے) وہ خالص ہے اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی۔ اہل کتاب کی نسبت خدا نے تم کو یہ خبر دی ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں کو بدل دیا ہے اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھا اور کہہ دیا کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس کے بدلے تھوڑا سا مول لے لیں کیا جو تم کو خدا نے علم دیا ہے وہ تم کو اہل کتاب سے استفسار میں مانع نہیں ہوتا؟ بخدا ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہارے دین کی بات تم سے پوچھتا ہو (یعنی پھر تم ان کے دین کی باتیں ان سے کیوں پوچھتے ہو؟)

یہ قول فیصل ہے اس بارہ میں کہ حضرت ابن عباس تحریف لفظی اور تحریف معنوی دونوں کے قائل ہیں امام بخاری ہی صرف تنہا وہ بزرگ ہیں جو توریت و انجیل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں مگر ان کا

قول اس باب میں حجت و سند نہیں حدیث کی تصحیح و تضعیف اور رجال کی جرح و تعدیل میں البتہ اُن کا قول مستند مانا جاتا ہے لیکن فنون حدیثیہ کے علاوہ دیگر فنون و مسائل میں تنہا اُن کا کوئی قول جمہور علماء کے اقوال کے مقابلہ میں مستند نہیں سمجھا جا سکتا بالخصوص اُس حالت میں جبکہ وہ قول محض ظن اور قیاس پر مبنی ہو اور اس کی تائید میں وہ کوئی سند یا دلیل نہ رکھتے ہوں۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں سلف میں بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جو ایک فن کے امام تھے مگر دوسرے فنون سے ناآشنا تھے۔ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ :-

"بہت لوگ ایسے گذرے ہیں جو ایک فن میں ماہر اور دوسرے فنون میں قاصر تھے مثلاً سیبویہ علم نحو میں امام تھے مگر یہ نہ جانتے تھے کہ حدیث کیا شئے ہے وکیع حدیث میں امام تھے مگر عربیت (یعنی علم ادب) نہ جانتے تھے۔ ابو نواس شاعری کا رئیس تھا۔ مگر دیگر فنون سے عاری۔ عبدالرحمٰن بن مہدی حدیث میں امام تھے اور یہ نہ جانتے تھے کہ طب کیا ہوتی ہے۔ محمد بن حسن فقہ میں امام تھے اور نہ جانتے تھے کہ فن قرأت کیا شے ہے۔ امام حفص قرأت کے امام تھے۔ اور حدیث سے تہی دست، سچ ہے کہ میدان کارزار میں مرد میدان خاص ہی لوگ ہوتے ہیں جو لڑنے میں شہرت رکھتے ہیں۔"

اس طرح امام بخاری اگر توریت و انجیل پر غائر نظر نہ رکھتے ہوں تو یہ نہ کوئی تعجب کا محل ہے نہ فن حدیث میں جو وہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں اُس میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے بجز روایت و تحقیق حدیث و تنقید رجال کے کسی اور فن میں ان کا دخیل ہونا اور مشغول رہنا ثابت نہیں محض ظن کی بنا پر انہوں نے یہ فرما دیا کہ "کتاب اللہ کے الفاظ کو کون نکال یا بدل سکتا ہے"۔ ان کی نظر غالباً اُن الفاظ پر نہیں پڑی جو ان کتابوں میں موجود ہیں مگر کسی طرح خدا کے کلمات نہیں ہو سکتے اور نہ ان کی نظر اس جانب گئی کہ ظالموں نے خدا کی کتاب کو جلا دیا، خدا کے نبیوں کو تہ تیغ کیا۔ اور خدا کے نبیوں پر اتہامات لگائے کتاب کی عبارتوں میں رد و بدل کر دیا اور لفظی و معنوی

تحریفوں کا عمل میں لانا تو ایسے لوگوں کے لئے ایک ہلکا اور آسان کام تھا۔

علمائے اسلام نے نہایت شد و مد کے ساتھ امام بخاری کے اس قول کا مقابلہ کیا ہے اور ان کی ظنی دلیل کا کافی جواب دیا ہے اور واقعات تاریخی سے ثابت کیا ہے کہ ان کتابوں میں لفظی اور معنوی دونوں تحریفیں موجود ہیں۔ ان میں سے نمونہ کے طور پر بعض علماء کے چند اقوال ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ان سے موجودہ توریت و انجیل کے متعلق عام اسلامی رائے کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

اقوال علماء | قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں امام بخاری کے اس قول کے مقابلہ میں فرمایا ہے کہ:۔

"بہت سے علماء اسلام نے بتصریح کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے بہت سے الفاظ توریت و انجیل کو بدل دیا ہے بعض کا قول ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو بالکل ہی بدل ڈالا ہے اور اس خیال سے وہ ان کتابوں کی بے ادبی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں مگر یہ قول محل اعتراض ہے۔ بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی بہت سی چیزیں اپنی اصل پر ہیں جیسے رجم وغیرہ۔ بعض کا قول ہے کہ تھوڑے الفاظ میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ صرف معانی میں تبدیلی ہوئی ہے نہ کہ الفاظ میں۔ چنانچہ بخاری نے یہی لکھا ہے مگر یہ قول بھی محل اعتراض ہے۔ ان کتابوں میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ بعض علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ان کتابوں کا شغل رکھنا اور ان کو لکھنا دیکھنا جائز نہیں ہے ...... مگر اس باب میں بہتر قول یہ ہے کہ جو شخص صاحب تمیز و بصیرت نہ ہو اس کو ان کتابوں کا شغل جائز نہیں۔ اور جو صاحب تمیز ہو اور علم و دین میں مضبوط ہو اس کے لئے جائز ہے خصوصاً اس حالت میں جبکہ مخالفین اسلام کو ان کتابوں کی مدد سے جواب دینا پڑے اس پر دلیل یہ ہے کہ علمائے قدیم سے اب تک کے علماء توریت سے ایسی باتیں نکالتے آئے ہیں جن سے منکرین نبوت محمدیہ کو الزام دیتے چلے آ رہے ہیں۔"

حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام بخاری کے قول مذکور کے تحت میں لکھا ہے کہ:۔

"ہمارے شیخ ابن ملقن نے فرمایا کہ یہ جو بخاری نے تفسیر آیۃ "یحرفون" کے بارے میں کہا ہے یہ ایک قول ہے۔ جس کو امام بخاری نے پسند کیا ہے مگر ہمارے اکثر علمائے نے تصریح کی ہے کہ یہود و نصاریٰ نے الفاظ توریت وانجیل کو بدل ڈالا ہے اور اس پر انہوں نے یہ مسئلہ متفرع کیا ہے کہ ان کتابوں کی بے ادبی کرنی جائز ہے لیکن یہ بات قول بخاری کے مخالف ہے۔"

پھر آگے چل کر ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعض متاخرین شارحین بخاری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ تحریف میں کئی اقوال ہیں ایک یہ ہے کہ توریت وانجیل سب کی سب بدلی گئی ہیں ان کتابوں کی بے ادبی کا جواز اسی قول کا مقتضیٰ ہے مگر یہ زیادتی ہے اور اس قول کی یہ تاویل ضروری ہے کہ تحریف کل سے اکثر حصہ کی تحریف مراد ہے ورنہ یہ بے فائدہ کا جھگڑا ہوگا کیونکہ بہت سی آیات واحادیث سے ثابت ہے کہ ان کتابوں میں بہت سی چیزیں اپنی اصل پر ہیں۔ جن میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے ایک آیت میں ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ یعنی وہ جو رسول کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توریت میں لکھا ہوا پاتے ہیں واز انجملہ قصہ رجم ہے جس میں مذکور ہے کہ توریت میں حکم رجم موجود ہے اس امر کا مؤید خدا کا یہ قول ہے فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنے توریت لاؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو دوسرا قول یہ ہے کہ تحریف ان کتابوں کے اکثر حصہ میں ہوئی ہے اس قول کے دلائل (یعنی شواہد و امثال) بکثرت موجود ہیں۔ اور پہلے قول کو اسی قول کے معنی میں لینا واجب ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اکثر حصہ ان کتابوں کا محفوظ ہے تھوڑے حصہ میں تبدیلی ہوئی ہے چوتھا قول یہ ہے کہ تبدیلی صرف معنی میں ہوئی ہے۔ الفاظ سب محفوظ ہیں صحیح بخاری میں اس مقام میں یہی قول بیان ہوا ہے ابن تیمیہؒ

سے اس مسئلہ کی بابت سوال ہوا تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک فتویٰ لکھا جس میں کہا کہ اس باب میں علما کے دو قول ہیں ایک یہ کہ الفاظ میں بھی تبدیلی ہوئی ہے دوسرا یہ کہ صرف معانی میں ہوئی ہے۔"

اس کے بعد ابن حجر نے ابن تیمیہ کی طرف سے اُن دلائل کا رد نقل کیا ہے جو مجوزانِ تحریف معانی پیش کیا کرتے ہیں پھر علامہ ابن حزم کی کتاب الملل والنحل کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے توریت کی اُن باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو حق تعالیٰ کا کلام نہیں ہوسکتیں مثلاً یہ کہ (نعوذ باللہ) لوط علیہ السلام کی بیٹیوں نے اپنے باپ لوط کو شراب پلائی پھر ان سے بدفعلی کرا کے حاملہ ہوئیں اس کے بعد ابن حجر علامہ ابن حزم کی مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں :-

"بعض مسلمانوں سے ہم کو یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ توریت و انجیل میں لفظی تحریف واقع ہونے منکر ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں آچکا ہے کہ "یہود و نصاریٰ خدا کے کلام کو بدل ڈالتے ہیں۔ اور خدا پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں کہ یہ بات خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اور وہ حق بات کو چھپاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے" منکرین تحریف کے جواب میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں اصحاب نبوی کے حق میں فرمایا ہے کہ ان کا حال اور ان کی صفت توریت و انجیل میں یوں موجود ہے کہ "وہ ایک کھیتی کے مانند ہیں جس نے نکالا اپنا پٹھا" (تا آخر سورۃ الفتح) مگر اب توریت و انجیل میں اصحاب کی یہ صفت مذکور نہیں ان منکرین تحریف سے جن کا قول یہ ہے کہ جب توریت بہ نقل متواتر منقول ہے۔ تو اس میں تحریف کیونکر ممکن ہے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق ہیں کہ توریت و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ذکر موجود نہیں اب اگر تم ان کی اس کتاب کی (جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ذکر نہیں)

تصدیق کروگے تو تم کو اس امر کی بھی تصدیق کرنی پڑے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب کا ذکر توریت میں نہیں ہے (جس سے تصدیق قرآن فوت ہوگی) اور اگر اس امر کی تصدیق کروگے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ باقی سب کتاب کی تصدیق کرو اور اس کو تحریف سے محفوظ مان لو کیونکہ وہ سب یکساں ہے؟

حافظ ابن القیم حنبلی نے بھی کتاب اغاثۃ اللہفان میں اس مسئلہ پر طول طویل بحث کی ہے اور امام بخاری کے قول کے جواب میں ابن تیمیہ کی لمبی چوڑی عبارت ان کی تالیف "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" سے نقل کی ہے۔ پھر اہل کتاب نے جو تحریفات لفظی و معنوی کی ہیں انہیں بیان کیا ہے اور ان کے تحریف سمجھے جانے کے وجوہ بیان کئے ہیں انہوں نے اور دیگر علمائے اسلام نے تحریف لفظی کی دس مثالیں پیش کی ہیں تحریفات کا شمار تو اس سے بہت زیادہ ہے مگر مسلمان علماء نے مثال کے طور پر صرف انہیں تحریفوں پر زور دیا ہے جن کا تحریف ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے وہ دس مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) موجودہ توریت میں بجائے اسمٰعیل علیہ السلام کے اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح اور ابراہیم علیہ السلام کا پہلوٹھا یا اکلوتا بیٹا قرار دیا ہے اس قول کے غلط ہونے کے ابن القیم نے دس وجوہ بیان کئے ہیں

(۲) لوط علیہ السلام پر اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ زنا کی تہمت اور ان دونوں بیٹیوں کا زنا سے حاملہ ہو جانا اور ان سے حرامی اولاد کا پیدا ہونا۔

(۳) یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا پر اپنی بہو سے زنا کی تہمت اس کا حاملہ ہونا اور حرامی بچہ جننا اور اس حرامی بچہ کی نسل سے داؤد علیہ السلام کا پیدا ہونا۔

(۴) ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا بانی قرار دینا۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اور آپ کے متعلق پیشینگوئیوں کو اہل کتاب کا اپنی کتابوں سے نکال دینا۔ علمائے اسلام نے اس پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بڑی فاضلانہ بحثیں کی ہیں۔

(۶) سورۃ الفتح کے آخر میں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں اور جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ان اوصاف کا ان کتابوں سے خارج کر دینا۔

(۷) عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل میں بذریعہ تحریف لفظی ابن اللہ بنا دینا اور بذریعہ تحریف معنوی اس ابنیت کو حقیقی قرار دینا۔

(۸) انجیل میں ایسے الحاقی الفاظ داخل کر دینا جن پر عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

(۹) عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب پر موت اور دوبارہ زندگی۔

(۱۰) عیسیٰ علیہ السلام کی اس موت کو قربانی اور دوسروں کا کفارہ قرار دینا۔

بعض لوگوں کو امام رازی کے متعلق بھی یہ التباس ہوا ہے کہ مثل امام بخاری کے یہ بھی تحریف لفظی کے قائل نہیں مگر بات صرف اتنی ہے کہ جن آیاتِ قرآنی میں تحریف معنوی کی جانب اشارہ ہے وہاں وہ اپنی تفسیر میں تحریف معنوی کا مراد ہونا بیان کرتے ہیں اور اس کو صحیح کہتے ہیں اور جہاں تحریف لفظی کی جانب اشارہ ہے وہاں تحریف لفظی کا بخوبی اثبات کرتے ہیں۔ اور اس کو بہتر قرار دیتے ہیں جن لوگوں نے صرف ایک ہی قسم کے قول یعنی کلام مثبت تحریف معنوی کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا۔ کہ امام صرف تحریف معنوی ہی کے قائل ہیں انہوں نے غلط نتیجہ نکالا سورہ بقرہ کی آیت (جو اوپر درج ہو چکی ہے) کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ تحریف لفظ میں ہے یا معنی میں۔ لیکن لفظی تحریف کی تجویز معنوی تحریف کی تجویز سے بہتر ہے کیونکہ اگر کلام الٰہی اپنی اصلی صورت پر باقی رہے اور صرف اس کے معنی میں تاویل کی جائے تو اس صورت میں وہ لوگ کلام الٰہی کے بدلنے والے نہ کہلاتے بلکہ صرف اس کے معنی کے محرف بنتے (حالانکہ وہ کلام الٰہی کے بدلنے والے ٹھہرائے گئے ہیں) اس تحریف سے یہ معنی (یعنی تحریف لفظی کے)

مراد لئے جائیں تو بہتر ہے جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "اہل کتاب نے ان کتابوں میں کمی و بیشی کی ہے" یہ معنی نہ ہو سکیں تب تحریف معنوی مراد لینا واجب ہے" تفسیر کبیر صفحہ ۵۵۰ جلد اوّل)

آیت سورۃ النسأ کی تفسیر میں امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ :۔

"خدا تعالےٰ نے یہاں "عَنْ مَّوَاضِعِہٖ" فرمایا ہے اور سورۃ المائدہ میں من بعد مواضعہ فرمایا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سورۃ النسأ کے الفاظ سے تاویل مراد ہے اور اُس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ آیات توریت وغیرہ کی باطل تاویلیں کرتے ہیں اس میں یہ بیان نہیں ہے کہ وہ ان الفاظ کو کتاب اللہ سے نکال دیتے ہیں اور جو الفاظ سورۃ المائدہ میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں تحریفیں عمل میں لاتے ہیں۔ تاویل باطل بھی کرتے ہیں اور الفاظ بھی بدل ڈالتے ہیں۔ اس آیت میں "یحرفون الکلم" سے تاویل باطل کی طرف اشارہ ہے اور "من بعد مواضعہ" میں الفاظ کو کتاب میں سے نکال ڈالنے کی طرف اشارہ ہے"۔

تفسیر کبیر صفحہ ۳۰۸ جلد ۳۔

پھر امام رازی اپنی تفسیر میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ جس کتاب کے حروف و کلمات کی شہرت حد تواتر تک پہنچ چکی ہو اُس کے حروف و کلمات میں تبدیلی کیوں کر ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت اُس کی تبدیلی ہوئی تھی اُس وقت شاید اس قوم میں قلت ہو اور توریت کے جاننے والے علمأ اور بھی کم ہوں۔ اس لئے وہ لوگ اس تحریف و تبدیل پر قادر ہوگئے"۔ (تفسیر کبیر صفحہ ۲۳ جلد ۳)

ان کتابوں کی شہرت "حدِ تواتر" تک پہنچنے کی بابت بھی علمائے اسلام نے بہت کافی حد تک تنقید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کتابوں کا بجمیع الفاظ و اجزا متواتر ہونا ثابت نہیں اوّل تو ان کتابوں کے تعین مصنفین اور تعین زمانہ تصنیف میں خود اہل کتاب کے نزدیک اختلاف ہے اور ان کتابوں کے بہت سے

الفاظ و فقرات و ابواب کا مصنفین کتب سے بتواتر منقول ہونا اور کمی بیشی سے محفوظ ہونا وہ خود تسلیم نہیں کرتے اور ان کتابوں میں کمی و بیشی و تغیر و تبدل کے وہ صاف صاف معترف ہیں اہل اسلام کے نزدیک نقل متواتر کے لئے شرط ہے کہ اُس کی ابتدا اور وسط میں بھی ویسی ہی کثرت ہو جیسی کہ انتہا میں اور کسی درجہ میں ایسی قلت نہ ہو جس سے اس کے ناقلین کا کذب پر اتفاق ممکن ہو حالانکہ ہمارے مضامین سلسلہ ہذا کے گذشتہ نمبر ثابت کر چکا ہے کہ توریت و انجیل کو یہ تواتر حاصل نہیں ہوا۔ دوم یہ کہ عہد جدید کے متعلق یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ کہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ کتب عہد جدید کے تواتر میں بھی کوئی زوال نہیں آیا۔ اور جن لوگوں کی طرف یہ کتابیں منسوب ہیں مثلاً متی یوحنا پولوس وغیرہم انہی سے ان کتابوں کا ہر جز بنقل متواتر ہم تک پہنچا ہے تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کتابوں میں جو تعلیم و ہدایات و مضامین درج ہیں وہ عیسیٰ علیہ السلام سے جن پر انجیل کا نازل ہونا مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے بتواتر منقول ہوں لہٰذا اس تواتر مفروض الوجود کا سلسلہ متی وغیرہ ہی پر ختم ہوتا ہے اور ان لوگوں کا صاحب الہام یا خدا کی طرف سے رسول ہونا مسلمان تسلیم نہیں کرتے نہ عیسائی اسے ثابت کر سکتے ہیں مسلمانوں کے نزدیک وہی انجیل واجب التسلیم والایمان ہے جو کہ عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی نہ کہ موجودہ مجموعہ عہد جدید جسے اور لوگوں نے تصنیف کیا۔ اس امر کی بابت ۱۸۵۷ء سے قبل علماء دہلی نے ایک فتویٰ شائع کیا تھا جس پر متعدد علماء کی مہریں ثبت تھیں اُس کی پوری عبارت کے یہاں درج کرنے میں بیں طوالت ہوگی۔ اس لئے اس میں سے دو اقتباسات ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں :۔

"نزد اہل اسلام انجیل عبارت از کلام الہیٰ تبارک و تعالیٰ است کہ بر حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نازل شدہ بود مشتمل بر ہدایت و نور و مصدق احکام توریت و نصیحت برائے پرہیزگاران نہ از ایں مجموعہ عہد جدید۔"

دوسرا اقتباس یہ ہے :۔

"بودن ایں تراجم مذکورہ یا اصل آنہا ہم اگر مطابق ہمیں تراجم مسطورہ است ہماں انجیل یعنی کلام ربانی کہ او تعالیٰ جل شانہٗ بانزال فرمودن آں بر حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام در قرآن خبر دادہ نزد علماء شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف صلوٰۃ وتحیۃ بخبر آحاد ہم مروی ومحفوظ نیست چہ جا کہ خبر مشہور باشد و اعمال حواریین کہ تصنیف لوقا تابعی است و ہمچنیں نامجات پولوس وغیرہ بمذہب ما داخل نیستند بلکہ انجیل نزد ما فقط عبارت از آں کلام حضرت عیسیٰ بود کہ موافق وحی ربانی ارشاد آں فرمودہ پس اطلاق کلام ربانی بر ایں مجموعہ بااسناد شرعی چگونہ کردہ شود۔ بلکہ اطلاق کلام ربانی بر اصل توریت کہ بزبان عبرانی بودہ بر مجموع اصل انجیل بسبب تحریفات کثیرہ ہم نمیتواں کرد زیرا کہ تحریفات بیشتر در اصل ہر دو کتاب توریت وانجیل از ایشان واقع شدہ وقرآن شریف بر تحریفات ایشاں ناطق است۔"

مسلمان علما کے نزدیک موجودہ توریت وانجیل کا مرتبہ بلحاظ صحت وثبوت احادیث صحیحہ متواترہ سے گھٹا ہوا ہے بلکہ خبر واحد کے بھی برابر نہیں صحیح اور متواتر احادیث نبوی وہ سمجھی جاتی ہیں جن کی ہر زمانہ میں بکثرت روایت کی گئی ہو۔ اور عقل ان کے کذب کو محال جانے اخبار آحاد کا اطلاق ان احادیث پر ہوتا ہے۔ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صرف ایک یا دو یا چار صحابہ نے نقل کیا ہو گو بعد میں انکی نقل میں تواتر ہو گیا ہو۔ عیسائی محققین کی عینک سے بھی دیکھا جائے تو یہ کتابیں آحاد کے مرتبہ تک نہیں پہنچتیں۔ کیونکہ ان کے ابتدائی راویوں ہی کے وجود میں اختلاف وشکوک واقع ہو چکے ہیں۔

توریت وانجیل پر اسلامی رائے

فطرت انسانی کی ایک کمزوری جہاں فطرت انسانی میں اور کمزوریاں واقع ہوئی ہیں وہاں ایک قابل افسوس کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز کے غلبۂ ظاہری سے بلا امتیاز حق وباطل مرعوب مغلوب ہوجاتی ہے لیکن مسلمانوں کو اس کمزوری پر غالب ہونا چاہئے۔ باطل کے ظاہری اور عارضی غلبہ سے کسی مسلمان کا مرعوب ہوجانا ضعف ایمانی کی دلیل ہے مثلاً آج کل دہریت اور الحاد کا زور ہے اور نا تمام ناقص اور غیر مکمل سائنس کی عام طور پر لوگوں کے دل ودماغ پر حکومت ہے۔ اس دہریت اور سائنس سے متاثر ہوکر بعض ضعیف الایمان مسلمانوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ قرآن اور حدیث کی ہدایات کو تاویل باطل کے ذریعہ سے موجودہ سائنس کے مطابق ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اسی طرح اب سے تقریباً پچاس سال قبل ہندوستان میں پادری مبلغین کی مسیحیت کا زور شور ہوا تھا۔ اور اس زمانے کے بعض جدت پسند اور ہر نئی چیز سے جلد متاثر ہوجانے والے اور حکمران قوم کی ہر ادا پر فریفتہ ہونے والے اور مٹ جانے والے مسلمانوں نے توریت وانجیل کا مطالعہ اور ان پر تفسیریں لکھنا اور کتابیں شائع کرنا شروع کردیا تھا ان میں سے بعض لوگ تو علانیہ عیسائی بن کر اور پادریوں کے زمرہ میں داخل ہوکر تبلیغ عیسویت میں ان کے مددگار بن گئے تھے۔ اور ان میں سے بعض مسلمانوں کو یہ خبط پیدا ہوگیا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں میں اس نوع کے خیالات کی اشاعت شروع کردی تھی کہ مسلمانوں کے لئے موجودہ توریت وانجیل بلا واسطہ قرآن واجب العمل ہیں۔ اور ان کتب میں اور قرآن مجید میں بلحاظ عمل وتمسک کوئی فرق نہیں ہے۔

ان کا مقولہ تھا کہ:۔

"مسلمان ان کتابوں کو ویسا ہی پڑھیں جیسا کہ قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور ان واقعات وحوادث

میں جو ان کو روزمرہ پیش آتے ہیں ان کتابوں سے فتویٰ لیں اور اخذ احکام کریں جیسا کہ قرآن سے اخذ احکام کرتے ہیں خصوصاً ان مسائل میں جو قرآن میں نہیں ہیں اور ان کتابوں میں موجود ہیں"

ان میں سے بعض حضرات قرآن پر یہ مہربانی کرتے تھے کہ ان کتابوں کے رتبہ کو قرآن کے رتبہ سے کمتر مگر حدیث کے رتبہ سے بڑھ کر یا اس کے برابر خیال کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ :-

" جو حکم قرآن سے نہ ملے وہ ان کتابوں سے اخذ کیا جائے اور ان کتابوں میں نہ ملے تب کتب حدیث سے لیا جائے ۔ اور کم سے کم یہ ہو کہ ان کتب کو کتب حدیث کے برابر سمجھا جائے "

اگرچہ دہریت کے سیلاب نے اب اس علیویت کو بھی بہا دیا اور اس علیویت پسندی کا بھی نام و نشان باقی نہ رکھا تاہم ضرورت ہے کہ عام مسلمانوں کے فائدہ کی غرض سے عمل بالتوراۃ والانجیل پر مستندعاً مسلک یہاں بالصراحت بیان کر دیا جائے ۔

عمل بالتوراۃ والانجیل | زمانہ نبوت سے لیکر اس وقت تک موجودہ توریت و انجیل وغیرہ کی نسبت اہل اسلام کا یہ اعتقاد متواتر و متوارث چلا آرہا ہے کہ ان کتابوں کے جو احکام منجانب اللہ ہیں اور منسوخ نہیں ہوئے یا سابق امتوں کے ساتھ مخصوص نہیں ، وہ امت محمدیہ کے لئے واجب العمل ہیں مگر ان احکام پر مسلمانوں کا عمل قرآن پر عمل کے ضمن میں پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن مجید تمام کتب سابقہ کے واجب العمل احکام کا جامع ہے اور جملہ کتب منزل من اللہ اصلاً اس میں شامل ہیں حقیقتاً قرآن کی تعمیل کتب ماقبل کے احکام واجب التعمیل کی بھی تعمیل ہے حدیث صحیح بھی قرآن کے حکم کے تحت میں ہے گو اس میں قطعیت و ظنیت کا فرق ہے اس لئے جو حکم احادیث صحیح میں وارد ہے اس کو بھی مسلمان حکم قرآنی سمجھتے ہیں اور قرآن کی طرح واجب العمل جانتے ہیں اس بنا پر شرائع سابقہ کے جو احکام احادیث میں منقول ہیں ان کی تعمیل بھی گویا قرآن ہی کی تعمیل ہے ۔

مگر یہ اعتقاد متقدمین و متاخرین میں سے کسی محقق سے منقول نہیں کہ موجودہ توریت و انجیل سے

اخذ احکام بلا واسطۂ قرآن واجب ہے۔ اور قرآن کی طرح ان کتابوں سے تمسک کرنا مسلمانوں کا فرض ہے نہ یہ عمل ان سے مروی ہے کہ ان کتابوں پر بلا واسطۂ قرآن انہوں نے اعتماد کیا ہو اور واقعات روزمرہ میں ان کتابوں سے فتویٰ لیا ہو۔

احکام کتب سابقہ تین اقسام پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) وہ احکام جو قرآن وحدیث کے مطابق ہیں ان کی تعمیل قرآن کی تعمیل ہے۔

(۲) وہ احکام جو قرآن وحدیث کے خلاف ہیں ان کی تعمیل کا نہ کرنا ہی مسلمانوں پر لازم ہے اس قسم کے احکام یا تو وہ ہیں جو درحقیقت کتب قدیمہ میں تھے مگر اب شریعت محمدی نے انہیں منسوخ کر دیا۔ یا وہ ہیں جو اہل کتاب کی طرف سے اُن کتابوں میں بڑھا گھٹا دیئے گئے ہیں اور تحریف و الحاق کے تحت میں آتے ہیں۔

(۳) وہ احکام یا وہ امور جن کی بابت قرآن وحدیث میں نہ کوئی تائید و موافقت پائی جاتی ہے نہ تردید و مخالفت۔ ان کی بابت مسلمانوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ:

"مسلمانو! تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو اور یہ کہو کہ ہم اس چیز پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے یعنی جن امور پر قرآن وحدیث ساکت ہیں ان پر یہ مشروطی اور اجمالی اعتقاد مسلمانوں کے لئے کافی ہے کہ اگر وہ بات منجانب اللہ ہے تو ہم نے اسے مانا اور تسلیم کیا۔

قسم اول یعنی احکام واجب التعمیل کے متعلق علماء نے بہت کچھ بحث کی ہے۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل منقول ہے کہ آپ نے داؤد علیہ السلام کی موافقت میں سجدہ کیا۔

سنن نسائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ حضرت داؤد نے توبۃً سجدہ کیا تھا۔ اور ہم اُس کے شکریہ میں سجدہ کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آیا سورۃ ص میں سجدہ ہے؟ آپ نے فرمایا بے شک۔ اس میں سجدہ ہے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہلے نبیوں کے فعل کی پیروی پر مامور تھے۔

ان ہی افعال و اقوال سے علماؑ نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ جو فعل یا حکم انبیائے سابقین سے قرآن میں منقول ہوا اور کوئی حکم اس کا مخالف یعنی ناسخ ہماری شریعت میں وارد نہ ہو وہ حکم اہل اسلام کے لئے لائق دستاویز ہے۔

تفسیر کبیر میں امام رازی نے اللہ تعالےٰ کے اس قول کے تحت میں کہ "جن لوگوں کی ہم نے ہدایت کی ہے ان کی پیروی کرو" تحریر فرمایا ہے کہ:-

"ہدایت یافتہ لوگوں سے انبیا مراد ہیں اور ان کی پیروی کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہوا ہے۔ جن امور میں پیروی کا یہ حکم وارد ہوا ہے۔ ان کی تعیین میں علماؑ کے درمیان اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ ان سے وہ امور مراد ہیں جن میں سب انبیا کا اتفاق ہے۔ مثلاً توحید الٰہی اور اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات و افعال کو نامناسب اعتقاد سے پاک رکھنا وغیرہ۔ بعض کا قول یہ ہے کہ ان امور سے اخلاقِ حمیدہ اور صفاتِ رفیعہ کاملہ میں پیروی مراد ہے جیسے کہ سفہا کی ایذا پر صبر اور ان کے ساتھ عفو۔ بعض کا یہ قول ہے کہ اس سے ان کے جملہ احکام شریعت مراد ہیں بجز ان احکام کے جن کو مستثنےٰ و مخصوص کر دیا گیا ہو۔ اس قول کی رو سے یہی شریعتیں ہمارے لئے واجب العمل ٹھیرتی ہیں۔"

مگر امام قرطبی اور دیگر علماؑ نے مندرجہ بالا تیسرے قول کی تفصیل میں اس نہایت ضروری شرط پر زور دیا ہے۔ کہ شریعت سابقین آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہو۔ اور وہ اُمت سابقہ کے ساتھ مخصوص یا بعد میں منسوخ نہ ہوئی ہو کتب سابقہ میں تحریف و تبدّل

کے وقوع یقینی نے اس شرط کو بہت ضروری بنا دیا ہے۔

بعض علما کا یہ قول ہے کہ ہمارے لئے ان شریعتوں کی پیروی واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک شریعت بنا دی ہے) اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی شریعتیں خاص خاص اوقات و مقامات کے لئے مخصوص رہی ہیں اور ان اقوال خداوندی میں جن سے پیروی کا لزوم ثابت کیا جاتا ہے مثلاً فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ اور مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اصول اعتقادی مراد ہیں نہ فروع عملی۔

بعض علما کا یہ قول ہے کہ وہ شریعتیں ہمارے لئے واجب العمل ہیں مگر نہ اس اعتقاد سے کہ وہ پہلوں کی شریعتیں ہیں بلکہ اس اعتقاد سے کہ وہ اب ہمارے لئے شریعت بن گئی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا یعنی پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا۔ جن کو ہم نے چن لیا۔ (یعنی مسلمان بنالیا) اور ظاہر ہے کہ جو چیز کسی کی وراثت میں آتی ہے وہ اسی کی ملک ہو جاتی ہے۔ مورث سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا لہٰذا ہم ان شریعتوں پر اس اعتقاد سے عمل کریں گے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی شریعت ہے اس کی مزید تائید میں وہ اس قول نبوی کو بھی پیش کرتے ہیں کہ "اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے۔" علما کا یہ گروہ پہلی شریعتوں کو جو اپنی شریعت قرار دیتا ہے تو وہ صرف اصول دینی ہی کو نہیں لیتا۔ بلکہ پوری شریعتوں کو لیتا ہے جن میں فروع بھی شامل ہیں۔ ان میں سے جو احکام منسوخ ہو چکے ہیں ان کی بابت یہ گروہ کہتا ہے کہ اس سے شریعت بدل نہیں گئی بلکہ ان احکام کی تعمیل کی مدت معینہ ختم ہو چکی۔

اس نوع کے اختلاف محض لفظی ہیں۔ بات ایک ہی ہے صرف انداز بیان میں فرق ہے۔

پرانی شریعتوں کو خواہ اپنا قرار دیا جائے یا انبیاء قدیم کا مسلمانوں کے لئے واجب التعمیل وہ اسی صورت میں ہوسکتی ہیں جبکہ وہ قرآن وحدیث کی وساطت سے پہنچیں یا قرآن وحدیث کے مطابق ہوں۔ موجودہ توریت وانجیل سے براہ راست تمسک کا نہ سلف میں کوئی قائل ہے نہ خلف میں امام رازی کے قول کو بھی مزید اطمینان کے لئے ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے اپنی کتاب المحصل میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بیان کیا ہے کہ پچھلی کتابوں کا اتباع ہم پر واجب نہیں:

"دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان شریعتوں کی (یعنی جو اُن کتابوں میں پائی جاتی ہیں) پیروی کرتے تو ہر زمانے کے علماء پر یہ امر واجب قرار پاتا کہ وہ اپنے واقعات وحوادث پیش آمدہ میں ان کتابوں کی طرف مراجعت کریں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کی پیروی اُن پر واجب ہے اور جب اُنہوں نے یقیناً یہ نہیں کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وقوع میں نہیں آیا۔ اس سے ان کتابوں کا واجب العمل ہونا باطل ہوا۔

تیسری دلیل۔ اگر وہ کتابیں ہمارے لئے لائق دستاویز ہوتیں تو ان کتابوں کو یاد کرنا ہمارے لئے فرض کفایہ ہوتا۔ جیسا کہ قرآن وحدیث کا یاد کرنا فرض کفایہ ہے اور علماء باہمی اختلاف کے مواقع پر ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے جبکہ ان کو بعض مسائل میں اشتباہ ہوا تھا۔ مثلاً فرائض کا مسئلہ عول اور جدہ وزن مفوضہ (یعنی وہ عورت جس کا مہر وقت نکاح مقرر نہ ہوا اور اس کے شوہر نے قبل ہم بستری وفات پائی) کی میراث اور ام ولد کی بیع اور شراب وزنا کی حد اور مخنث کی دیت اور زر خرید کنیز عیب دار کا ہم بستری کے بعد واپس کرنا اور مباشرت بلا انزال سے غسل کا واجب ہونا وغیرہ ذالک۔ اور یہ امر کسی ایک سے بھی منقول نہیں کہ انہوں نے اپنی تمام عمر میں باوجود کثرت واقعات اور باہمی اختلافات کے توریت کی طرف

رجوع کیا ہو خاص کر اس حالت میں جبکہ یہودیوں کے علمائ مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب احبار اور وہب بن منبہ جن کے اقوال توریت کے متعلق مستند سمجھے جاسکتے تھے، ان کے ذریعہ سے یہ رجوع آسان تھا مگر ایسا نہ کیا۔ اور مسائل میں انہوں نے اپنے ہی قیاس کی طرف رجوع کیا۔ یہ بات کتاب اللہ سے مایوسی کے بعد جائز ہوتی ہے اور مایوسی کتاب اللہ کو سیکھنے سے پہلے ہو نہیں سکتی۔ جب انہوں نے نہ ان کتابوں کو سیکھا نہ ان کے احکام دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ان کتابوں کو قابل تمسک نہ سمجھا۔

چوتھی دلیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ کے اس قول کو کہ:۔
"میں کتاب اللہ اور سنت میں کوئی حکم نہ پاؤں گا تو اپنے اجتہاد سے فتویٰ دونگا"
پسند کیا اگر ان کو توریت کی پیروی کا حکم ہوتا تو ان کا اپنے اجتہاد پر عمل کرنا جائز نہ ہوتا تاوقتیکہ توریت وانجیل کو وہ دیکھ نہ لیتے۔ اس دلیل پر اگر یہ اعتراض ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاذ کو اسی صورت میں اجتہاد کی اجازت دی جبکہ کتاب اللہ میں انہیں کوئی حکم نہ ملے اور توریت بھی تو کتاب اللہ ہے۔ یا یہ اعتراض ہو کہ توریت کا صاف نام انہوں نے اس لئے نہیں لیا کہ توریت کی طرف رجوع کرنے کا حکم قرآن مجید میں آچکا ہے لہٰذا قرآن کی طرف رجوع کرنا خود توریت کی طرف رجوع دلاتا ہے۔ تو پہلے اعتراض کا ایک جواب تو یہ ہے۔ کہ (مسلمانوں میں) جب لفظ کتاب اللہ بے قید بولا جاتا ہے تو اس سے قرآن مراد ہوتا ہے لہٰذا اس سے توریت وانجیل بلا دلیل مراد نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل سے کہیں ثابت نہیں ہوا۔ کہ انہوں نے توریت وانجیل کو سیکھا۔ یا ان کے محرف وغیر محرف احکام میں تمیز کی ہو۔ جیسا کہ قرآن کا پڑھنا اور سیکھنا ان سے بخوبی ثابت ہے دوسرے اعتراض کا جواب بھی ادا ہو گیا۔ کہ موجودہ توریت وانجیل کی طرف

ہر بات میں رجوع کرنے کا قرآن میں حکم ہوتا تو حضرت معاذ ان کتابوں کو پڑھتے اور سیکھتے اور ان کی طرف کبھی تو رجوع کرتے۔"

اس بارہ میں جن لوگوں نے غلطی کھائی ہے انہوں نے غالباً ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے جن میں بطور اجمال ان کتابوں کو نور ہدایت کہا گیا ہے، اور بعض مواقع خاص میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ ان آیات و احادیث میں توریت و انجیل کی ہر بات کو ہدایت و نور نہیں کہا گیا۔ ورنہ ہر موقع و محل میں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا خدا و رسول نے حکم دیا ہے بلکہ ان کو بالاجمال ہدایت کہنے سے انہیں باتوں کا ہدایت ہونا مقصود ہے جن کا منجانب اللہ محفوظ و واجب العمل ہونا بشہادت قرآن و حدیث ثابت ہے۔ اور انہیں مواقع خاص میں ان کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن میں اہل کتاب کے تصرف کا دخل نہیں ہونے پایا۔ کوئی مسلمان اس بات کو نہیں مان سکتا۔ کہ موجودہ توریت و انجیل میں جو کچھ لکھا ہے سب سچ ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان اس بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ اور داؤد علیہ السلام نے اوریا کی جورو کے ساتھ (نعوذ باللہ) زنا کیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) خدا کے بیٹے یا خود خدا یا تین خداؤں کی کمیٹی کے ممبر تھے، اور باوجود اس کے گنہگاروں کے بدلے معذب ہوئے۔ اللہ و رسول اس سے بری ہیں کہ مسلمانوں کو ان لغو اور بے ہودہ باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیں۔ بلکہ اللہ و رسول نے ان کتابوں کی بہت سی باتوں کو رد کر دیا ہے اور ان کو کفر و ضلالت قرار دیا ہے۔ مزید تفصیل و تشریح میں طوالت ہے اس لئے مندرجہ بالا اجمال ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلاصہ — ان مضامین سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہوگی۔ کہ مسلمانوں نے جتنا احترام انبیاء سابقین اور کتب منزل من اللہ کا کیا ہے۔ اتنا خود ان لوگوں سے بھی نہ ہو سکا۔ جو ان انبیاء کی امت میں اپنے کو شامل کرتے ہیں۔

محققین اہل کتاب نے جو کچھ اپنی تحقیقات سے ان کتابوں کی بابت لکھا ہے اس کی ایک مختصر سی جھلک مضامین سابقہ میں دکھلائی گئی ہے۔ اس سے ہر صحیح الدماغ شخص ان ہی نتائج پر آسکتا ہے کہ ان محققین کی تحقیقات کے بموجب :-

(۱) موجودہ توریت و انجیل از اول تا بہ آخر بالکل قابل اعتبار نہیں۔

(۲) ان کے مصنفین و مؤلفین کا کچھ ٹھیک نہیں اور زمانہ تصنیف و تالیف کا بھی کوئی صحیح تعین نہیں۔

(۳) ان مصنفین و مؤلفین کی اصلی عبارتیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔

(۴) ان کتابوں پر اغیار کے بھی حملے ہوتے رہے ہیں اور احباب کے بھی جن کی وجہ سے اصلی اور ابتدائی نسخے مفقود ہو چکے ہیں۔ اور اب جو قدیم نقلیں پائی جاتی ہیں ان کے چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی سے قدیم تر ہونے پر عیسائی بھی متفق نہیں۔ پھر یہ نسخے بھی باہم مختلف ہیں اور اختلافات کی تعداد بقول اہل کتاب ہی کے لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہ سب قرأت یا کتابت ہی کے اختلاف نہیں بلکہ اہم اور اصولی امور میں بھی شدید اختلافات واقع ہو گئے ہیں۔ جن کا دور کرنا اصلی نسخوں کے فقدان کی وجہ سے اب محال ہے ان اختلافات نے ان بنیادی اصولوں ہی کو بدل ڈالا جن پر اصولاً مذاہب حقہ کی بنیاد ہوا کرتی ہے

(۵) آج کل ان کتابوں کے ترجموں ہی سے سابقہ رہتا ہے اور ان ترجموں میں بھی بکثرت غلطیاں ہیں جن کی اصلاح اب بوجہ اصل کے ضائع ہو جانے کے ناممکن ہو گئی ہے۔

(۶) ان جملہ تغیرات کی بنا پر موجودہ توریت و انجیل کو وہ توریت و انجیل نہیں کہہ سکتے۔ جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائیں۔

باوجود ان تمام خرابیوں کے جن کے اعتراف پر علمائے اہل کتاب مجبور ہیں مسلمان علماء اس درجہ

احتیاط سے کام لے رہے ہیں کہ وہ متفقہ طور پر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ :-

(۱) توریت و انجیل کو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر جو اللہ کے پیغمبر تھے نازل فرمایا۔

(۲) موجودہ توریت و انجیل میں جتنا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس پر ہم ایمان لاتے اور اس کا سچا ہونا ہم تسلیم کرتے ہیں۔

(۳) ان میں جو کچھ قرآن و حدیث کے خلاف ہے ان کو بشہادت قرآن و حدیث ہم الحاق سمجھتے ہیں۔ اور جن عبارتوں سے اللہ تعالیٰ کی توہین لازم آتی ہے یا انبیاء علیہم السلام کی بے احترامی پائی جاتی ہے۔ یا ادیان حقہ کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ان کو ہم توریت و انجیل سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۴) ان کتابوں کی وہ باتیں جن پر قرآن و حدیث ساکت ہیں ہمارے لئے بھی سکوت کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس لئے ہم ان کی نہ تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔

گویا عیسائی تحقیقات پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہماری کتابوں کی ایک بات بھی نہ مانو مگر اسلامی حق پسندی کہتی ہے کہ نہیں۔ ایسا نہ ہوگا۔ ان کتابوں میں جو باتیں قابل قبول ہیں انہیں ہم قبول کرتے ہیں اور جو باتیں قابل قبول نہیں ان سے ہم کنارہ کرتے ہیں۔

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

ہمارے ہندوستانی مسلمان - ولیم ہنٹر، آئی - سی - ایس ۲/۱۲/-

اقبال پر ایک نظر - مرتبہ سید محمد شاہ ایم - اے ۲/۱۲/-

تعلیمات اقبال - پروفیسر سلیم چشتی، بی - اے ۱/۸/-

شرح اسرار خودی پروفیسر سلیم چشتی بی اے ۱/۸/-

اقبال اور پیام حریت - پروفیسر سلیم چشتی بی - اے ۰/۸/-

اسلامی پارٹی کا آئین - مولانا عزیز ہندی ۱/۸/-

ہیگل کا فلسفہ - مولانا عزیز ہندی ۰/۴/-

اقبال کا تصور زمان و مکان - ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم - اے ۰/۱۰/-

موت و حیات اقبال کے کلام میں - ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ۰/۴/-

تعلیم کا مسئلہ - ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم - اے - پی - ایچ - ڈی .. ۱/۸/-

اقبال کے چند جواہر ریزے - خواجہ عبدالحمید ایم - اے ۰/۱۰/-

اشتراکیت اور اسلام - مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی - اے ۰/۶/-

محمد عبدہٗ، از چارلس ایڈمز مترجمہ مولوی مظہر الدین صدیقی ۱/۰/-

علمائے کرام کا مستقبل - مولوی محمد مظہر الدین صدیقی ۰/۸/-

حقیقت نفاق - مولانا صدر الدین اصلاحی ۰/۸/-

افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مولانا صدر الدین اصلاحی ۱/۴/-

معرکہ اسلام و جاہلیت از مولانا صدر الدین اصلاحی ۱/۸/-

دربار رسولؐ کے فیصلے مترجمہ ابو العرفان حکیم عبدالرشید ۳/۰/-

اقبال کا تصور خودی - ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے - پی، ایچ ڈی ۰/۸/-

المنبہات (عربی) حافظ ابن الحجر العسقلانی ۱/-/-

القول الجمیل (عربی) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - ۱/۸/-

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں از مولانا مودودی صاحب ۱/۸/-

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر " ۱/۰/-

انتخاب غالب از غالب ۰/۶/-

روح اقبال - از پروفیسر یوسف حسین خاں ایم اے - پی - ایچ ڈی - ۵/۱۲/-

ذکر اقبال مجموعہ مضامین ۳/۱۲/- ، آثار اقبال ۲/۴/- ، فلسفۂ عجم از ڈاکٹر محمد اقبالؒ ۳/۲/-

پتہ: اقبال اکیڈمی - ۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور -

...ئے کرام کا مستقبل۔ علما کو کیا کرنا چاہیئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام۔ (ایک نفسیاتی مطالعہ) " " " - ۸ر

انتخاب غالب۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندستانی مسلمان { سید صاحب بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال } ۱۲ر

المنبہات { عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف } ۲ر

اسلامی پارٹی کا آئین { مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے۔ از مولانا عزیز ہندی } ۸ر

ہیگل کا فلسفہ (فلسفہ اضداد کی تشریح)۔ از مولانا عزیز ہندی۔ ۴ر

ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے۔ " " " - ۴ر

القول الجمیل (عربی)۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ ۲ر

تقویۃ الایمان (اردو)۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید۔ ۸ر

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات)۔ ابو القاسم رفیق دلاوری۔ ۸ر

جیبی جنتری

۱۹۴۵

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

مکتبہ پاکستان

سرکلر روڈ بیرون موچی گیٹ - لاہور

قیمت ۸ر

افادات حضرت ۱/۸/-

معرکۂ اسلام و جاہلیت ... ۱/۸/-

حقیقت نفاق ۱/۸/-

کتب سماوی پر ایک نظر ... ۲/۸/-

زیر طبع

اسلام اور وطنیت ... ۱/۸/-

افادات حافظ ابن قیم ... ۱/۸/-

اشتراکیت اور اسلام ... ۱/۸/-

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈیمی

۵۳ - (الف) سرکلر روڈ، بیرون موچی دروازہ، لاہور

تالیفات

سید ابوالاعلیٰ مودودی

...ات ۳/۸/-

...ات ۲/۸/-

... ... ۲/۸/-

...ات ۲/۸/-

...ہ دینیات ۱/۸/-

...ق الزوجین ۱/۸/-

...ید و احیائے دین ... ۱/۸/-

...ئلہ قومیت ... ۱/۸/-

...سی کشمکش حصہ اول ... ۱/۸/-

" " دوم ... ۲/۸/-

" " سوم ... ۱/۱۲/-

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈیمی

... سرکلر روڈ، بیرون موچیدروازہ، لاہور

مضامین

ابوالاعلیٰ مودودی

نبوت محمدی کا عقلی ثبوت ... -/۶/-

اسلامی حکومت ... ... -/۶/-

اسلام کا نظریۂ سیاسی ... -/۶/-

اسلام و جاہلیت ... ... -/۶/-

سلامتی کا راستہ ... ... -/۶/-

دین حق ... ... -/۶/-

انسان کا معاشی مسئلہ ... -/۶/-

جہاد فی سبیل اللہ ... -/۶/-

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ... ...

اسلامی عبادات پر ایک نظر ... ...

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈیمی

۵۳ - (الف) سرکلر روڈ، بیرون موچیدروازہ، لاہور

مطبوعہ رپن پریس، لاہور

Registered No. L. 4584.

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحبان محکمہ تعلیم برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ سندھ، ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

مارچ ۱۹۴۵ء   جلد ۱۰—عدد ۳

ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے   قیمت فی پرچہ ۸ر

سلسلۂ مطبوعاتِ اقبال اکیڈمی

ماہنامہ

پیغام حق

ظفر منزل - تاج پورہ - لاہور

جلد ۱۰ | مارچ ۱۹۴۵ء | عدد ۳

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں طبع کرا کر ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

دنیا کی دوسری ہولناک جنگ اپنی تباہ کاریوں کا اثر چھوڑ کر قریب الاختتام ہے سیاسیین عالم نے اپنی اپنی قوموں کے بقا کے لئے پرانی داستانیں دہرانی شروع کر دی ہیں امن عالم کے نام سے دنیا پر طرح طرح کے افسوں پھونکے جا رہے ہیں۔ بہرحال بہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ موجودہ کانفرنسوں اور بحثوں کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ لیکن سیاسیین عالم کے گزشتہ کارناموں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا شبہ ضرور ہوتا ہے کہ کہیں امن کے نام پر جنگ کی چنگاریوں کو تو ہوا نہیں دی جا رہی۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ جنگ انسانیت کی آزادی کی حفاظت کی خاطر شروع کی گئی تھی اور آج تک جمہوری طاقتوں نے دنیا کے مختلف ممالک کو ساتھ ملانے کے لئے اسی اصول کو بار بار دنیا کے سامنے پیش کیا ہے لیکن جنگ ہی کے دوران میں مختلف قوموں کا پانسہ پلٹ جانے کے بعد اس اصول پر کس حد تک عمل ہوا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے سوویٹ روس اپنی پوری قوت کے ساتھ یورپ کے کمزور ممالک پر چھانے کی کوشش کر رہا ہے یہی نہیں بلکہ زبردست فرانس جو ابھی تک دوسروں کے سہارے زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ اب بھی شام شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک اور انڈوچائنا سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ ہالینڈ جیسا چھوٹا سا ملک بھی اپنے ایشیائی مقبوضات سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ آزادی کے نام لیوا دوسروں کی آزادی کی حفاظت کے ٹھیکیدار بدستور بنے رہنا چاہتے ہیں یا یوں کہیے کہ ایک قوم دوسری قوم پر اقتصادی اقتدار قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشینوں سے مال تیار کرنے والے ممالک اپنے مال کی کھپت کے لئے نہ صرف نئی منڈیوں کی تلاش میں ہیں بلکہ پرانی منڈیوں

——— پر بھی کسی نہ کسی شکل میں اقتدار باقی رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اندریں حالات زیادہ دیر تک دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ امن کے نام پر ایسی کوششیں ہمیشہ جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہیں۔ جن کی بنا نیکی اور مساوات پر نہ ہو۔ جب تک تمام بنی نوع انسان کو ایک واحد کنبے کے افراد نہیں مانا جائے گا۔ اور ایک عالمگیر بھائی چارے کی بنیاد نہیں ڈالی جائیگی۔ اس وقت تک دنیا میں حقیقی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کانفرنسوں یا جشنوں سے قائم نہیں ہو سکتا۔ انجمن بین الاقوامی کی تمام کارگزاریاں ہمارے سامنے ہیں اس کی تمام پیش بندیاں بھی دنیا کو جنگ کی تباہی سے محفوظ نہیں رکھ سکیں۔ آج بھی اگر اسی تاریخ کو دہرایا گیا۔ تو اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ الٹا اس سے نقصان پہنچنے کا امکان ہے۔

دنیا میں اقتصادی رقابتوں ہی کے نتیجے میں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوئے ہیں ہو رہے ہیں یا مستقبل میں ہوں گے اگر اقتصادی مشکلات کا صحیح حل دنیا کے سامنے عملی طور پر آ جائے تو ہمارے خیال میں اس وقت انسانیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ دنیا جس دور سے اس وقت گزر رہی ہے مسلمان اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے ——— ان پر کسی نہ کسی شکل میں ان باتوں کا اثر پڑ کر رہے گا۔ اب ہم مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ سوچا ہے یا کہ نہیں ہم ان خوش فہم لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ موجودہ اسلامی سلطنتیں اس اقتصادی مشکلات کے دور میں دنیا کے مسلمانوں کے لئے کوئی صحیح حل پیش کر سکینگی اوّل تو اس وقت تمام دنیا میں ایک بھی ایسی اسلامی ریاست موجود نہیں جس کے اندر شرعی قوانین کا نفاذ ہو، دوم۔ اسلامی حکومتیں مجموعی حیثیت میں بھی دنیا کی استعمارانہ قوتوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ ہندوستان کے نور دس کروڑ مسلمان اگر دنیا کے سامنے عملی طور پر اسلام کا اقتصادی نظام پیش کریں۔ اور دوسروں کو اس پر کاربند ہونے کی دعوت دیں۔ تو انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہم نہ صرف اپنے گھر کو درست کر سکتے ہیں۔ بلکہ مستقبل میں دنیا میں پیش آنے

والے واقعات پر بھی نمایاں طور پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ وہ جس پروگرام پر کاربند ہوں۔ اس کی دعوت تمام دنیا کو دے سکتے ہیں۔ دنیا کے نقشے پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کی دنیا میں مرکزی حیثیت ہے۔ موجودہ سیاسی جتھا بندیوں کے پیش نظر بھی سیاسیین عالم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہندوستان امن عالم کے لئے ایک بہت بڑی کڑی کا کام دے سکتا ہے۔ مزید برآں ہندوستان کے مسلمانوں کی مجموعی تعداد دنیا کے کسی ایک اسلامی ملک کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے۔ اندریں حالات مسلمانان ہند کا کوئی اقدام بھی دنیا کے مسلمانوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا بشرطیکہ ہم صحیح اسلامی نظریے کے ماتحت دنیا کے سامنے کوئی صحیح راہ عمل پیش کریں۔

مارچ کے رسالے کے مضامین:۔ مارچ کی اشاعت میں پہلا مضمون جناب عبدالرحیم صاحب شبلی کا ہے کام کا مالیات عامہ کا اسلامی نظام ہے جس میں شبلی صاحب نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی ٹیکس عاید کرنے کے طریق کار میں کیا فرق ہے۔ دنیا میں ٹیکس عاید کرنے کا یہ عام اصول ہے کہ کوئی ایسا ٹیکس عاید نہ کیا جائے جس سے عوام پر کسی قسم کا اقتصادی بوجھ پڑے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ چند انسانوں کے فائدے کے لئے عوام کو کس قدر ٹیکسوں کے بوجھ سے لادا گیا ہے جس کے نتیجے میں دنیا میں مختلف قسم کی جتھا بندیاں بنتی ہیں۔ جو آخرکار ایک دوسرے سے متصادم ہوکر دنیا کے امن کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں برخلاف اس کے اسلام نے ٹیکس عاید کرنے کا ایسا عام اصول وضع کیا ہے جس سے ہر انسان پر مساوی بوجھ پڑتا ہے اور سوسائٹی کے کسی فرد کو بھی اس سے کسی قسم کے اقتصادی نقصان پہنچنے کا امکان نہیں ہے نیز اسلام نے آمدنی کے علاوہ اخراجات کی بھی مختلف مدیں قائم کردی ہیں اور ایسا توازن قائم کیا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کے افراد سے جو روپیہ جمع ہو وہ ایسے طریقوں سے خرچ کیا جائے جس سے سوسائٹی کے مختلف گروہوں کو تعلیم و تربیت دی جائے جس کے نتیجے میں سوسائٹی کے تمام افراد ایسے ہوں جو ایک دوسرے کے لئے صحیح طور پر مفید ثابت ہوسکیں۔

مالیات عامہ کا اسلامی نظام

(عبدالرحیم شبلی - بی کام - مدیر عالمگیر و خیام لاہور)

حکومت کی نوعیت خواہ کچھ ہو۔ اس کے اہم فرائض کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اوّل وہ ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچائے۔ دوم رعایا کو فرقہ وار فسادات اور باہمی تنازعات سے باز رکھ کر ملک میں امن وامان قائم رکھے۔ سوم۔ ملک کی تجارتی و معاشی بہبودی کا بندوبست کرے۔ ظاہر ہے کہ ان فرائض کی بجاآوری کے لئے روپیہ درکار ہے لیکن روپیہ "الہ دین کے چراغ" کی بدولت حاصل نہیں ہوتا۔ نہ "مائدہ" کی طرح آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ بلکہ لوگوں کی جیبوں سے برآمد ہوتا ہے۔ اس لئے حکومت بعض خاص اصول کے ماتحت جبری چندہ کرکے لوگوں سے روپیہ اکٹھا کرتی ہے۔ اور اسے اپنے فرائض کی تکمیل پر خرچ کرتی ہے۔ جو علم سرکاری مداخل ومخارج اور مالی نظم ونسق پر بحث کرتا ہے۔ اسے "مالیات عامہ" کہتے ہیں۔ کارل لیہمن کے الفاظ میں "مالیات ایک سائنس ہے۔ جو سیاست دانوں کی ان کوششوں سے متعلق ہے جو وہ فرائض حکمرانی کی انجام دہی کے لئے مادی وسائل کے بہم پہنچانے میں صرف کرتے ہیں"

مالیاتِ عامہ کا دنیاوی نظریہ

جب سے انسان نے مل جل کر رہنا سیکھا ہے اور نظریہ حکمرانی بر روئے کار آیا ہے محصول بندی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ ابتدا میں جب مطلق العنانی کا دور دورہ تھا ٹیکس غیر متعین اور اچانک ہوتے تھے یعنی ٹیکس عائد کرنے سے پہلے نہ تو لوگوں کی رضامندی حاصل کی جاتی تھی۔ نہ ان سے محصول کی شرح، نوعیت اور وقتِ ادا کے متعلق کوئی مشورہ لیا جاتا تھا۔ جب

کبھی بادشاہ کو جنگ یا ذاتی عیش و آرام کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے کارندے بھیجتا جن کو تاجروں اور زمینداروں سے روپیہ وصول کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ چنانچہ وہ اکثر اوقات شاہی تجوریوں کو بھرنے کے لئے غیر انسانی مظالم اور ستم آرائیوں سے بھی کام لیتے۔ اور لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مختلف رقوم حاصل کر لیتے تھے۔ جب جنگ ختم ہوتی اور مال غنیمت کے علاوہ مفتوحہ علاقوں سے خراج بھی شاہی خزانے میں آنا شروع ہو جاتا تو ان مطلق العنان فرمانرواؤں سے امید نہ ہو سکتی کہ اس مال سے کچھ حصہ "محصول زدہ رعایا" کے تالیفِ قلوب ہی کے لئے تقسیم کر دیا جائے۔

جب شاہی کا ظالمانہ دور گزر گیا۔ اور جمہوریت پسندانہ خیالات کی اشاعت ہوئی تو عوام کے حقوق کا سوال پیدا ہوا۔ چنانچہ ماہرین مالیات نے ایک ایسا مالی نظام مرتب کرنا چاہا جس کے ماتحت حکومت کی گاڑی کو بھی تیل ملتا رہے اور محصول دہندہ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ آدم سمتھ نے محصول بندی کے چار اصول وضع کئے۔ (۱) مساوات (۲) تعین (۳) سہولت (۴) کفایت۔ مساوات یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی حکومت کی امداد کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق چندہ دینا چاہئے۔ پھر ٹیکس متعین ہونا چاہیے۔ یعنی اس کی شرح، نوعیت اور وقتِ ادائیگی پہلے ہی سے مقرر ہو۔ اس کے علاوہ ٹیکس کی وصولی کے وقت محصول دہندہ کی سہولت اور آسانی کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ فصلیں تو اپریل مئی میں تیار ہوتی ہیں لیکن مالیہ کا مطالبہ کر لیا جائے جنوری میں۔ اصولِ کفایت کے ماتحت ہر ٹیکس ایسا ہونا چاہیے۔ کہ جہاں لوگوں کی جیبوں میں کم سے کم روپیہ نکلے۔ وہاں حکومت کے خزانہ میں زیادہ سے زیادہ روپیہ آئے۔ اس کے ساتھ ہی ایسے محاصل سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جن کے نتیجہ میں صنعت و تجارت کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہو یا پس اندازی میں کوئی دقت پیش آئے۔ اور لوگ دل برداشتہ ہو کر یا تو کام ہی چھوڑ بیٹھیں یا محصول زدہ علاقہ سے

ہجرت کرکے کسی اور پُرسکون مقام کی طرف جانا شروع کردیں یہ آدم سمتھ کے قوانین محصول بندی کہلاتے ہیں۔ بعد کے مصنفین نے ان پر حاشیہ آرائی بھی کی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر سب نے انہی اصول کو تسلیم کیا ہے

مالی نظام کا دوسرا اہم شعبہ "مصارف" ہے۔ مصارف عامّہ کا پیدائش دولت پر ایک بہت بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کا سرمایہ عام رستہ چھوڑ کر ان شعبوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ جن کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے مثلاً اگر حکومت نے نمک کی ساخت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تو اکثر لوگ اسی مد میں اپنا سرمایہ لگانا شروع کردیں گے۔ اور عاملین بھی اسی طرف منتقل ہوجائیں گے۔ پس حکومت کو چاہئے کہ وہ اپنے اخراجات کی تقسیم ایسے مساویانہ انداز سے کرے کہ کسی صنعت کو زیادہ اور کسی کو کم مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ورنہ سرمایہ و محنت کے نظام میں خلل پیدا ہوجائے گا جس طرح محصولات عائد کرتے وقت حکومت کو چاہئے کہ دولت آفرینی کی کم سے کم حوصلہ فرسائی ہو۔ اسی طرح مصارف کی تقسیم کے وقت دولت آفرینی کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کے اصول کو مدِنظر رکھنا چاہئے۔ مصارف کے ذریعہ سے تعلیم، حفظانِ صحت، صنعت اور تجارت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اگر حکومت اپنے مصارف میں "عاقلانہ تناسب (SENSE OF PROPORTION) مدِنظر رکھے۔ تو لوگوں کی اہلیت کارکردگی اور پس انداز کرنے کی قوت و خواہش میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔

آمد و خرچ کے اصول وضع کرنے کے علاوہ جمہوریت پسند ماہرین مالیات کا یہ بھی خیال ہے کہ حکومت کے مالی نظام میں رائے عامہ کو زیادہ سے زیادہ دخل حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ تمام جمہوریت پسند ممالک میں محصول بندی اور تقسیم مصارف سے پہلے عوام کے نمائندوں سے مشورہ کرلیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ حکومت کا بہی کھاتہ یا حساب کتاب زیادہ سے

زیادہ صاف اور واضح ہو،

ان تمام اقدامات کے باوجود ماہرین مالیات اپنے مالی نظام میں سادگی کا عنصر داخل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ہر سال تمام جمہوری ممالک میں بجٹوں کا ایک سمندر موجزن ہو جاتا ہے لیکن عوام میں سے کتنے ہیں جو ان اعداد و شمار کی لہروں میں ڈوب کر بھی اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکتے ہیں؟ آپ کسی ملک یا صوبے کا بجٹ اُٹھا لیجئے۔ آپ کو اعداد و شمار کی صف در صف فوج کوچ کرتی ہوئی نظر آئیگی، کیا آپ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں تین قسم کے جھوٹ ہوتے ہیں جھوٹ، سفید جھوٹ اور اعداد و شمار۔ اعداد کی مدد سے آپ ہر نظریہ کو خواہ وہ غلط ہو یا صحیح پایۂ ثبوت تک پہنچا سکتے ہیں۔

بیت المال

اسلامی نظامِ مالیات مکمل ہو یا نہ ہو لیکن سادہ ضرور ہے اور اس کی بنیاد اعداد و شمار کے گورکھ دھندے پر نہیں بلکہ نیک نیتی، اخلاص اور ایمانداری پر ہے۔ اسلامی مالیات کا نظم و نسق جس ادارے کے سپرد ہوتا ہے اُسے "بیت المال" کہتے ہیں۔ بظاہر یہ لفظ سن کر ایک ایسی کوٹھڑی کا تصور ذہن میں آتا ہے جس میں مال و زر جمع ہو لیکن وسیع معنی میں "بیت المال" اُس نظام کو کہتے ہیں جو سرکاری آمد و خرچ کی تعیین و تقسیم کے لئے قائم کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں غنیمت، خراج اور زکوٰۃ وغیرہ کا مال اکٹھا کر کے اعراب، مجاہدین اور دوسرے حاجت مندوں کے درمیان بغیر کسی خاص اہتمام کے تقسیم کر دیا جاتا تھا لیکن حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں جب اسلامی سلطنت اتنی وسیع ہو گئی کہ قسم قسم کے لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اور بیت المال میں چاروں طرف سے نقدی اور اجناس وغیرہ کا سیلاب اُمنڈ پڑا تو مالی نظام کو بھی سائنٹیفک بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ اور ارشاداتِ ربانی اور سُنّتِ نبوی کے مطابق محصول

بندی اور مصارف کی تقسیم کا باقاعدہ گوشوارہ تیار کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں وہی "بیت المال" جو پہلے صرف ایک خزانے کی حیثیت رکھتا تھا اب ایک "ادارے" (Institution) کی شکل اختیار کر گیا جس کے فرائض عہدِ حاضر کے مالیات کی طرح وسیع اور عالمگیر ہو گئے۔

اسلام میں بیت المال کے مالکانہ حقوق کسی خاص فرد کے ہاتھ میں نہیں بلکہ جماعت کو تفویض کئے جاتے ہیں خلیفۂ وقت کی حیثیت صرف ایک نگران کی ہوتی ہے جو آمد و خرچ کی تقسیم میں توازن برقرار رکھتا ہے وہ بیت المال سے ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایک پائی بھی لینے کا مجاز نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ ملت کی منظوری سے اپنے اور بیوی بچوں کے گزارے کے لئے "روزینہ" لے لے۔ تو اس میں حرج نہیں ہے چنانچہ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رض خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے برسرِ منبر فرمایا "میری قوم کو معلوم ہے کہ میرا تجارتی کاروبار میرے اہل و عیال کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کافی تھا لیکن اب میں مسلمانوں کی خدمت پر مامور کیا گیا ہوں اس لئے ابوبکر رض کے اہل و عیال کا قوت لایموت مسلمانوں کی خدمت انجام دے گا" (کتاب الاموال۔ ابی عبیدہ ص ۲۶۶)

اسی طرح حضرت عمر رض نے مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی مسلمانوں کو جمع کیا اور پوچھا "بیت المال" کے خزانے میں سے خلیفۂ وقت کے لئے کیا جائز ہے؟ لوگوں نے متفق ہو کر جواب دیا "اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لئے روزینہ لینا۔ جس میں کمی و بیشی نہ ہونی چاہئے۔ اسی طرح وہ گرمی و سردی کے کپڑے اور حج و عمرہ کے لئے دو سواری کے جانور اور غنیمت کے مال میں سے عام مسلمانوں جتنا حصہ لے سکتا ہے۔ اور بس" (الاسلام والحضارۃ العربیہ جزو ثانی ص ۱۲۸)

پھر کتاب الخراج میں امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رض نے ایک دفعہ فرمایا "بیت المال" میں میرا حصہ اتنا ہی ہے جتنا یتیم کے ولی کا۔ اگر میں فارغ البال ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اگر ضرورت پڑی تو دستور کے مطابق کھانے کے لئے لوں گا" (ص ۶۷)

ان سب باتوں کے باوجود حضرت عمر فاروق اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خلفائے اسلام ذاتی اغراض کے لئے بیت المال کی کسی چیز کو چھونا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تو شعبۂ آمد کو تقویت دینے کی غرض سے اپنی تمام جائداد (جس کی آمدنی تقریباً پچاس ہزار دینار سالانہ تھی) بیت المال کے نام پر وقف کر دی اور اپنا گزارا معمولی رقم سے کرتے رہے۔ تاہم یہ استثنائی واقعات ہیں۔ ورنہ اصولی طور پر خلیفۂ وقت یا عمالِ حکومت اور فوجی سپاہیوں کے لئے بیت المال سے وظائف لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے چنانچہ ابی عبید "کتاب الاموال" میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مال کی بہتات ہو گئی اور اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب ہو گئے تو عمالِ حکومت اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہرے مقرر کئے گئے مال جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مسلمانوں کو کاشت کاری و زمینداری سے روک دیا گیا اور اُن کے اہل و عیال، بلکہ اُن کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے بھی وظائف مقرر کر دیئے گئے تاکہ تمام ملت اسلامیہ فوجی بن سکے۔ اور وہ ہر وقت کوچ کے لئے تیار رہیں کھیتی باڑی ان کے رستہ میں حائل نہ ہو سکے۔ اور عیش و عشرت میں نہ پڑ جائیں۔"

ظاہر ہے کہ وظائف کی تقسیم کا یہ طریقہ عارضی ہے۔ ورنہ اسلام کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے، کہ لوگ کسی حالت میں بھی کھیتی باڑی نہ کریں۔

آج کل کے مالی محکموں کی طرح اسلام کے ابتدائی ایام میں "بیت المال" بھی دو حصوں پر منقسم تھا یعنی (۱) آمد (۲) خرچ ۔ آمد کے ذرائع زیادہ تر تین تھے۔ ۱۔ زکوٰۃ (۲) مالِ غنیمت (۳) فئی۔ موجودہ اصطلاح کے مطابق ان کو ہم "ٹیکس" یا "محصول" کہہ سکتے ہیں لیکن اسلامی نظام میں ہر "محصول" کو جس مد پر خرچ کرنا ہے۔ وہ بھی متعین ہے۔ عام مالی محکموں کی طرح یہ نہیں کہ مختلف محاصل کی آمد کو گڈمڈ کر دیا جائے۔ مثلاً صدقات کی آمدنی کو فقرا، مساکین، عاملین، مسافروں اور غلاموں

وغیرہ کی ضروریات کے لئے وقف رکھنا ضروری ہے یہ نہیں کہ صدقات کو فوج کے استحکام کے لئے صرف کیا جائے۔ اب ہم مختلف اسلامی ٹیکسوں کی شرح، وجہ جواز اور مصرف پر گفتگو کرتے ہیں۔

زکوٰۃ

اسلامی مالیات میں ایک نہایت اہم ذریعۂ آمدنی "زکوٰۃ" ہے۔ یہ ٹیکس امرا اور متموّل طبقہ سے وصول کیا جاتا ہے اور اس کی آمدنی کو غربا اور حاجتمندوں وغیرہ پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل گورنر بحرین کے ایک استفسار کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس محصول کی علت و حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

تؤخذ من اغنیاءھم و ترد الیٰ فقراءھم (ترمذی) یعنی زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ مالداروں سے روپیہ وصول کر کے محتاجوں پر تقسیم کر دیا جائے۔

حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں مختلف علاقوں کے حاکم ٹیکس وصول کر کے مرکز میں بھجوا دیتے تھے۔ جہاں آپ کی نگرانی میں اس کی تقسیم عمل میں آتی تھی۔ یا بعض اوقات حاکم ہی کو یہ اختیار دے دیئے جاتے تھے کہ وہ مناسب طور پر اُسے غربا کی حاجت روائی پر خرچ کرے۔

اسلام نے زکوٰۃ کو چار اصناف میں تقسیم کیا ہے (۱) اُس مال سے زکوٰۃ لی جائے جس میں اضافہ ہو سکتا ہو۔ یا جس میں ترقی اور نمو کی استعداد ہو۔ یہ مال تین قسم کا ہوتا ہے (الف) وہ جانور جو چراگاہوں میں افزائش نسل کے لئے پلے جا رہے ہوں (ب) زراعت (ج) تجارت۔

(۲) زکوٰۃ اُن لوگوں سے لی جائے جو شریعت کی نگاہ میں سرمایہ دار ہیں۔ اور اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ کے ماتحت آتے ہیں۔ یعنی جن کے پاس ۷ ½ تولہ سونا۔ یا ۵۲ تولے چاندی جمع ہو۔

(۳) اُن اموال سے لی جائے جو محنت و مشقت کے بغیر حاصل ہوتے ہوں مثلاً خزانہ ہاتھ

آجائے۔ تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۴) اہل صنعت و حرفت پر زکوٰۃ لگائی جائے۔ الغرض زکوٰۃ تمام ایسے مسلمانوں پر واجب ہے۔ جن کے پاس سونا چاندی، پھل اور غلے وغیرہ کی ایک خاص مقدار یا مواشی کی ایک خاص تعداد ہو۔ اس کی شرح ہر حالت میں مختلف ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بحرین کے گورنر حضرت انسؓ کو جو چٹھی لکھی تھی۔ اس میں زکوٰۃ کی شرح باوضاحت درج ہے لہٰذا اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

"زکوٰۃ تمام مسلمانوں پر واجب ہے یہ حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا جس مسلمان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا جائے وہ فوراً ادا کرے۔ اگر شرح ناجائز ہو تو انکار کیا جا سکتا ہے۔ دو دو چن یا اس سے کم اونٹوں کی زکوٰۃ بکریوں کی شکل میں ادا کرنی چاہئے عام طور پر پانچ اونٹوں کی زکوٰۃ دو بکریاں ہیں۔ اگر اونٹوں کی تعداد ۲۵ سے ۳۰ ہو تو ایک اونٹنی بطور زکوٰۃ دی جائے۔ اس سے زیادہ اونٹوں کی صورت میں شرح زکوٰۃ حسب ذیل ہے:۔

۳۵ سے ۴۵ اونٹوں کے لئے	۲ سالہ اونٹنی
۴۶ " ۶۰ " "	۳ " "
۶۱ " ۷۵ " "	۵ " "
۷۶ " ۹۲ " "	دو ایک سالہ اونٹنیاں
۹۳ " ۱۲۰ " "	دو تین تین سالہ "

اگر کسی شخص کے پاس صرف چار اونٹ ہوں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگر پانچ اونٹ ہو جائیں تو ایک بکری بطور زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ چالیس سے ایک سو بیس تک بکریوں کے لئے ایک بکری، دو سو بکریوں کے لئے دو بکریاں اور دو سو سے تین سو تک بکریوں کے لئے تین بکریاں بطور زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ وقس علیٰ ذالک

جس شخص کے پاس سونا چاندی ہو وہ ½ ۲ فیصدی کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے۔ ۱۹۹ درہم سے نیچے زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اسلام نے موسمی حالات، اتفاقی حادثات اور عام معاشی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے زکوٰۃ کی مقدار اور ادائی کے لئے مدت بھی مقرر کی ہے چنانچہ فرمایا حولان حول یعنی خزانے پر ایک سال پورا ہو جانا ضروری ہے۔ تاکہ حوادثِ زمانہ اور موسم کے اثرات سے محفوظ رہنے کے بعد جو آمدنی ہو اُس پر زکوٰۃ لگ سکے۔ انفرادی ضروریات کو حسبِ معمول زکوٰۃ کے مال سے بھی مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

فقیہوں اور مفسروں نے زکوٰۃ کی شرح پر بہت بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معمولی آمدنی پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے لیکن "معافی کی حد" (Limit of Exemption) کے بعد زکوٰۃ ایک "ارتقائی ٹیکس" (Progressive Tax) ہے۔ یعنی اس کی شرح ملکیت کی مقدار اور محلِ وقوع کے مطابق مختلف ہے۔ مثلاً اگر پانی بہت مشکل سے دستیاب ہوتا ہو تو پیداوار کا صرف ½۱ حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر پانی کے حصول میں دقت نہ ہو (مثلاً بارانی زمین ہو) تو شرح ۱/۱۰ ہوگی۔ لیکن پھلوں پر زکوٰۃ صرف اُس صورت میں واجب ہے کہ پیداوار موجودہ وزن کے مطابق ۵ من ۱۳ سیر ۵ چھٹانک ہو۔ زرعی پیداوار پر بھی زکوٰۃ کی یہی صورت ہے زرعی پیداوار میں گیہوں۔ چاول، چنے اور ہر قسم کا غلہ شامل ہے لیکن ۵ من ۱۳ سیر ۵ چھٹانک سے کم پیداوار پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

خالص مالیاتی نقطۂ نگاہ سے زکوٰۃ کی بہت سی خصوصیات ہیں جن میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "فرار" (Evasion) کا امکان نہیں ہے کیونکہ اسلام میں "زکوٰۃ" اور "نماز" کا درجہ ایک ہی ہے۔ چنانچہ سورۂ "نمل" میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں ھدًی

وَبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ یعنی مومن کی علامت ہی یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ اسی طرح فرمایا وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹: ۳۴) یعنی "جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو"۔ اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ نہ ادا کرنے کی صورت میں اسلام نے سزا مقرر کی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک دفعہ مجمع عام میں فرمایا۔ وَاللّٰهِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (بخاری) یعنی خدا کی قسم میں اس شخص سے ضرور جہاد کروں گا۔ جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب ایک قبیلہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو اسے نہ صرف مرتد قرار دیا گیا بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے اس کے خلاف اعلان جہاد بھی کیا۔ پس سچے مسلمان کے لئے زکوٰۃ سے کوئی "مفر" نہیں ہے اور اس کے مقابلہ میں موجودہ ماہرین مالیات ایک ٹیکس بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے۔ جس میں "فرار" کا امکان نہ ہو۔

زکوٰۃ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ منصفانہ ٹیکس (EquitABLE TAK) ہے۔ جن لوگوں کی جائداد زیادہ ہو ان سے زیادہ اور جن لوگوں کی جائداد کم ہو ان سے کم شرح پر یہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے تیسرے۔ زکوٰۃ بہ آسانی وصول کی جا سکتی ہے۔ چوتھے۔ یہ ٹیکس متعین ہے پانچویں واضح اور مفید ہے۔ چھٹے آج کل کے محاصل کی طرح "متمیزانہ" (Discriminatory) نہیں ہے۔

صدقات

زکوٰۃ کے علاوہ مسلمانوں پر "صدقہ" بھی فرض کیا گیا ہے اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے (۱) انفرادی اور

(۲) اجتماعی۔ انفرادی صدقہ ہر شخص اپنی مرضی اور استطاعت کے مطابق دے سکتا ہے اور اسے مالیاتِ عامہ Public finance سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "اجتماعی صدقہ" حکومت کے ذریعے سے قوم کی بہبودی و مرفہ الحالی اور حاجت مندوں کی امداد کے لئے ہوتا ہے مثلاً عید، جہاد اور رفاہِ عامہ کے موقع پر صدقہ دینا واجب ہے اور اسے خلیفہ وقت کے توسط سے مفادِ عامہ پر خرچ کیا جاتا ہے۔ الغرض صدقات کا مصرف بھی وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے چنانچہ فرمایا:-

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ (۹ : ۶۰)

یعنی صدقے کا مال فقیروں، مسکینوں، محصلوں، مائل بہ اسلام لوگوں، قیدیوں، معترضوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

گویا زکوٰۃ کی طرح صدقے کے مستحق بھی آٹھ قسم کے آدمی ہیں پہلی قسم فقیروں اور محتاجوں کی ہے۔ یعنی جو لوگ کما کر کھانے کے اہل نہ ہوں۔ دوسری قسم مسکینوں کی ہے یعنی جن کے مالی ذرائع وسیع نہ ہوں۔ اور جن کی آمدنی دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے لئے بھی کافی نہ ہو۔ ان لوگوں کو دو سو درہم سے زیادہ رقم نہ ملنی چاہئے۔ ورنہ اُن پر بھی زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔ قاضی ابو یوسف اپنی تصنیف "کتاب الخراج" میں رقمطراز ہیں۔ کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اگر عیسائی اور یہودی بھی حاجت مند ثابت ہوں تو انہیں بھی زکوٰۃ اور صدقات کے روپیہ سے متمتع کیا جائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ زکوٰۃ اور صدقات کی تقسیم میں کتنی فیاضی سے کام لیا جاتا ہے صدقات کا تیسرا حصہ عاملین کو ملنا چاہئے۔ یعنی جو لوگ زکوٰۃ اور صدقات کا روپیہ اکٹھا کرتے ہیں اور خزانہ میں داخل کرنے کے وقت تک اس کے امین ہوتے ہیں۔ ان کو بھی اس روپیہ کی تقسیم میں شریک کیا جائے گا۔ یہ اصول عاملین کی اہلیت کارکردگی میں اضافہ کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت

ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ان کو یقین ہو کہ وصولی میں ان کا بھی حصّہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ زیادہ محنت و توجہ سے کام لیں گے۔

پھر صدقات کی آمدنی میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جن کے دل تو اسلام کی طرف مائل ہیں، لیکن ابھی انشراح صدر نہیں ہوا۔ یا ان کو خطرہ ہو کہ اگر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا تو وہ روزگار سے محروم ہو جائیں گے۔ اسلامی حکومت پر ایسے لوگوں کی امداد بھی فرض قرار دی گئی ہے یہ رشوت نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی مشکلات پر قابو پانے کے لئے ایک سہارا ہے۔ اگر ایسا شخص اسلام قبول نہ کرے۔ تو یہ امداد خود بخود بند ہو جائے گی۔

زکوٰۃ اور صدقات کے پانچویں مستحق غلام ہیں یہ روپیہ ان کی گردن کو انقیاد و اطاعت کے جوئے سے آزاد کرانے کے لئے خرچ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے ذریعہ سے مقروض کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ موجودہ قوانین تو زرعی و غیر زرعی مقروضین میں امتیاز روا رکھتے ہیں۔ لیکن اسلامی امداد کا دروازہ ہر فرد کے لئے کھلا ہے۔

صدقات کی ادائیگی میں بھی استطاعت اور مقدرت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے زکوٰۃ کی طرح یہ ٹیکس بھی "قوانین محصول بندی" کے عین مطابق ہے۔

مالِ غنیمت

اسلام عمل و جہاد کا مذہب ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو متعدد جنگوں اور لڑائیوں میں شریک ہونا پڑا۔ جنگ کے بعد جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا اُسے بھی مرکزی خزانہ میں داخل کر دیا جاتا تھا اسی طرح یہ مال بھی آمد کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا۔ "مالِ غنیمت" بالعموم چار قسم کا ہوتا تھا۔ (۱) قیدی (۲) لونڈیاں (۳) اراضی (۴) سیم و زر یا اسلحہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ قیدیوں کا "خون بہا" بھی مالِ غنیمت میں اضافے کا موجب بنتا۔ اگر خون بہا نہ ملتا۔ تو قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے

کے بجائے فاتح سپاہیوں کے درمیان تقسیم کردیا جاتا تھا۔

جب مسلمانوں کا کسی علاقے پر قبضہ ہو جاتا تو اوّل تو ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرکے بعض شرائط کے ماتحت کھیتی باڑی کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ ورنہ اُن کے مالکانہ حقوق ساقط کرکے اراضی مسلمانوں میں بانٹ دی جاتی تھیں اور اُن سے "خراج" وصول کیا جاتا تھا۔ جہاں تک منقولہ جائداد (مثلاً مویشی اور سیم وزر) کا تعلق ہے اُسے مسلمانوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ ابتدا میں کوئی نسبت مقرر نہ تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح مناسب خیال فرماتے اس کی تقسیم زیرِعمل لاتے تھے لیکن بعد کو وحیٔ الٰہی کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ۱/۵ ہے۔ چنانچہ بنی قینو قاع کی لڑائی کے بعد آپ نے مالِ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا۔ ۴/۵ حصہ مجاہدین کو دے دیا گیا۔ اور ۱/۵ حصہ ارشادِ خداوندی کے ماتحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چونکہ مال و دولت کی خواہش نہ تھی اس لئے اس کے بھی پانچ حصے کئے گئے۔ ایک حصہ حضور نے بیوی بچوں کی ضروریات کے لئے رکھ لیا۔ دوسرا حصہ نادار ہاشمی رشتہ داروں میں تقسیم کردیا۔ تیسرا یتامیٰ کو دے دیا گیا۔ چوتھا مساکین کے حصہ میں آیا اور پانچویں سے مسافروں وغیرہ کی امداد کی گئی۔ ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت کی تقسیم میں حد درجہ انصاف پسندی، مساوات اور غربا پروری کو روا رکھا جاتا تھا۔

قیدیوں اور لونڈیوں کے بارے میں اسلام کے احکام اس درجہ واضح ہیں کہ اُن کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے لوگ بالعموم مسلمان ہو جاتے تھے۔ اور ان کا درجہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔

زمینوں کے بارے میں عام طور پر یہی کوشش کی جاتی تھی کہ اہلِ ملک کے پاس رہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق اور شام فتح ہوئے۔ تو صحابہ نے مطالبہ کیا کہ ان ملکوں کو ہم پر تقسیم کردیا جائے۔ اور ہمیں ان کا مالک و مختار بنایا جائے۔ خصوصاً حضرت بلال رضؓ اور حضرت زبیرؓ نے

اس مطالبہ پر بہت زور دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ اگر ان زمینوں کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے۔ تو انتظامی ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی؟ اسی طرح فتح عراق کے بعد بعض عراقی مسلمانوں نے تجویز پیش کی۔ کہ مفتوحہ اراضی کو ہمارے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن آپ نے سعد بن ابی وقاص گورنر عراق کو لکھا:۔

"آپ کا خط ملا۔ آپ لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کے مشورہ کے مطابق مفتوحہ اراضی کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس خط کے ملتے ہی تمام مال غنیمت اپنے سامنے رکھ کر تقسیم کر دو اور اراضی کو ان کے مالکوں کے پاس ہی رہنے دو۔ اگر زمین کو بانٹ لیا گیا تو مقامی باشندوں کے پاس کیا رہیگا؟"

چنانچہ سعد بن ابی وقاص نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اور بعد ازاں حضرت عمرؓ کے مشورہ سے غیر مسلم زمین داروں پر محصول اراضی عائد کر دیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام عام محصول بندی میں لوٹ مار اور ناجائز وصولی کا حامی نہیں ہے۔ وہ صرف معقول اور جائز محاصل تک اپنے نظام کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی طرح حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی مفتوحہ ممالک کی اراضی مسلمان مجاہدین اور فاتحین میں تقسیم نہیں کی اور کاشتکاروں کا لگان حضرت عمرؓ کی سکیم کے مطابق مسلمانوں کی ضروریات پر صرف کرتے رہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف اسی حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "کتاب الخراج" میں فرماتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد کہ انہوں نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان اراضی کو تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنی رائے کی موافقت میں قرآن مجید کے دلائل پیش کئے حکمت الٰہی پر مبنی ہے۔ اور اسی میں مسلمانوں کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ کیونکہ خراج کا جمع ہونا اور اس کا مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہونا جماعتی مفاد کے اعتبار سے تقسیم اراضی کے مقابلہ میں بدرجہا مفید تھا۔"

پس حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد کہ مفتوح ممالک کی زمین مجاہدین پر تقسیم کرنے کی بجائے مقامی باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔ دراصل ایک زبردست مالیاتی حکمتِ عملی پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ زمین مسلمانوں میں بانٹ دی جاتی تو خراج وصول نہیں ہو سکتا تھا اور اس طرح اسلامی سلطنت ایک مستقل ذریعہ آمد سے محروم رہ جاتی۔ اس کے علاوہ زمین اپنے مالکوں کے پاس ہی رہی جس کا ان کے طبائع پر نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ اور وہ مسلمان حکمرانوں کو اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے اپنا محسن خیال کرنے لگے۔

خراج اور عشر

زرعی ممالک میں مالگذاری کو جو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ محتاج تصریح نہیں۔ محاصلِ اراضی پر حکومت کا پیٹ بھرنے کے لئے سونے کا انڈا ثابت ہوتے ہیں لیکن اگر یہ روپیہ کاشتکاروں سے وصول کر کے عام زرعی حالت کو بلند کرنے کے لئے خرچ نہ کیا جائے تو یہی مرغی سونے کا انڈا دینے سے انکار کر دے گی۔ اس کے علاوہ اجنبی حکومتوں کی عام طور پر یہی پالیسی رہی ہے کہ وہ محکوم رعایا کو صنعت و تجارت سے غافل کر کے کھیتی باڑی کی طرف مائل کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اُن پر محاصل کا اتنا بوجھ لاد دیتی ہے۔ کہ کاشتکار کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے۔ اور ہمیشہ محکوم رہتے تھے لیکن اسلام کا اقتصادی نظام چونکہ اخوت و مساوات پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ تمام ممالک سے یکساں سلوک سے ترجیح دیتا ہے۔ اور اجنبی و غیر اجنبی کا سوال ہی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ چنانچہ اسلام کے آئین محصول بندی کے ماتحت اوّل تو محکوم رعایا کو اسلامی نظام میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس دعوت کو ٹھکرا دے تو اس کی حفاظت کا ذمہ لیا جاتا ہے اور اس پر محاصل کا اتنا بوجھ نہیں لادا جاتا۔ کہ برداشت ہی نہ ہو سکے۔ اسی اصول کے ماتحت محصول اراضی عائد کرنے کے لئے زمین کو دو شقوں

میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) عشری (۲) خراجی۔

"عشری زمینیں" وہ ہیں جو مسلمان مجاہدین کو بطور "جاگیر" عطا کی جاتی ہیں یا جن بنجر اور غیر آباد زمینوں کو وہ کاشتکاری کے قابل بنا لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں "خراجی زمینیں" وہ ہیں۔ جو اہل ملک کے پاس ہی رہتی ہیں یا جن کے مالک "ذمی" بن کر اسلامی حکومت کے زیر سایہ آجاتے ہیں (کتاب الخراج۔ ابو یوسف ص ۶۹)

اسلامی آئین محصول بندی کے ماتحت "عشری زمین" کی پیداوار کا دسواں حصہ حکومت کا دیا جاتا ہے ــــ "خراجی زمین" پر ایک ہلکا سا ٹیکس مقرر ہے جو سالانہ ادا کرنا پڑتا ہے اور اسے "خراج" کہتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ "عشر" کے مقابلہ میں "خراج" زیادہ سہل ہے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سکیم کے ماتحت "ذمیوں" کے مقابلہ میں مسلمانوں پر زیادہ بوجھ تھا چنانچہ "عشر" کی شرح ہمیشہ کے لئے مقرر ہے جس میں کمی و بیشی کا امکان نہیں ہے اس کے مقابلہ میں "خراج" ایک سالانہ ٹیکس ہے جو پیداوار کے مطابق بدلتا رہتا ہے دوسرے "خراج" سال میں صرف ایک مرتبہ لیا جاتا ہے لیکن "عشر" ہر فصل کے موقع سال میں دو تین دفعہ وصول کیا جاتا ہے۔ تیسرے "خراج" خلیفہ کی صواب دید پر معاف ہو سکتا ہے۔ لیکن "عشر" کسی حالت میں معاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں پر صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے ٹیکس بھی عائد کئے گئے ہیں۔ لیکن "ذمی" ان سے محفوظ ہیں۔ پس بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مقابلہ میں "غیر مسلم ذمی" فائدے میں ہیں۔ اور محصولِ اراضی کا ان پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔

اسلامی نظام کے ماتحت "بندوبست اراضی" (Settlement of Land) بھی نہایت معقول اور منصفانہ ہے۔ اسلام سے پہلے فراعنہ کے مصر میں بندوبست چار سالہ ہوتا تھا۔ مالیہ نقد اور پیداوار دونوں صورتوں میں ادا ہو سکتا تھا اور "جمع بندی" کی تخصیص چند

سال کی پیداوار کا اوسط نکال کر کی جاتی تھی لیکن جب رومیوں نے مصر پر قبضہ کیا تو انہوں نے نہ صرف اپنی فوج کی رسد کے لئے بلکہ پائے تخت کے لئے بھی غلہ مصریوں ہی سے وصول کرنا شروع کیا ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل حد درجہ ظالمانہ اور اہلِ ملک کے حق میں تشدد آمیز تھا۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق رض کے عہد میں جب مصر فتح ہوا تو سب سے پہلے ان ظالمانہ قوانین کو منسوخ کیا گیا۔ اور مالگذاری کے حسب ذیل قاعدے مقرر کئے گئے۔

۱۔ "خراج" نقد اور پیداوار دونوں صورتوں میں ادا ہو سکتا ہے لیکن وصولی کے وقت مالگزار کی سہولت کا خاص خیال رکھا جائے۔

۲۔ تشخیص ہر سال ہو۔ کیونکہ چند سال کا اوسط نکال کر مالیہ مقرر کرنا کاشت کاروں پر ظلم ہے

۳۔ بندوبست کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہے حسب موقع مالکان اراضی اور کاشتکاروں کی سہولت دیکھ کر تشخیص کی جائے۔

۴۔ لگان کے علاوہ کچھ اور چندے وصول کرنا ظلم ہے۔ لہٰذا یہ طریق ترک کر دیا جائے۔

گویا ہندوستان میں "موٹرانہ"۔ "ہاتھیانہ" اور "شادیانہ" وغیرہ کے نام سے جو نذرانے مقرر ہیں۔ اسلام ان کا مؤید نہیں ہے۔

ان قاعدوں کے علاوہ اسلامی نظام کے ماتحت خاص حالات میں "معافی" بھی دی گئی ہے۔ مثلاً اگر قدرتی حوادث کے باعث فصل تباہ ہو جائیں تو مالیہ معاف ہو جاتا ہے اسی طرح اگر پیداوار نذر آتش ہو جائے تو "بٹائی" کی صورت میں فقہا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ لگان معاف ہو جاتا ہے۔ لیکن نقد کی صورت میں بعض فقہاء کو اختلاف ہے تاہم اکثریت کا خیال یہی ہے۔ کہ اس وقت بھی معافی دے دی جاتی ہے۔

بہرحال اسلامی نظام اراضی میں کاشت کاروں کی سہولت کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

اور کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اُن کی اہلیت کارکردگی پر اثر انداز ہوتا ہو یا جس کے نتیجہ میں وہ احساسِ غلامی میں مبتلا ہوتے ہوں۔ مالیاتی نقطۂ نگاہ سے اسلامی نظام اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس کے ماتحت حکومت کو اس اضافہ میں بھی شریک کیا گیا ہے جو کاشت کاروں کی کوشش کے بغیر عام مرفہ الحالی کی وجہ سے زمین کی مالیت میں ہوتا ہے اس اضافہ کو معاشیات کی اصطلاح میں (Unearned Increment of Land) کہتے ہیں اور یہ اُس وقت ظہور میں آتا ہے۔ جب کاشتکاروں کی سہولت کے لئے حکومت کوئی سڑک تعمیر کرائے یا نہر کھدوائے یا اراضی کے قریب ہی کوئی قصبہ آباد ہو جائے یا گاؤں کی آبادی بڑھ جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوش حالی کاشت کاروں کی اپنی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ عام مُلکی ترقی کے باعث پیدا ہوتی ہے لہٰذا اسے "غیر اکتسابی منافع" کا نام دیا گیا ہے اور حکومت کو اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے اسلامی نظام کے ماتحت چونکہ بندوبست ہر سال ہوتا ہے اور "خراج" کی شرح میں حالات کے مطابق ترمیم ہوتی رہتی ہے اس کے علاوہ حکومت کو رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی ہے اس لئے "بے کمائے ہوئے منافع" پر جتنا اسلامی محصول اراضی نفع آور ثابت ہو سکتا ہے اُتنا کوئی اور ٹیکس نہیں ہو سکتا۔

ماہرینِ مالیات نے اس سوال پر بہت بحث کی ہے کہ "مالگزاری ٹیکس" ہے یا کرایہ؟ اس کا جواب اس سوال پر منحصر ہے کہ زمین کا مالک کون ہے؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ زمین کا مالک خود کاشت کار رہتا ہے تو حکومت کا حصہ "ٹیکس" قرار پائے گا۔ اس کے برعکس اگر زمین حکومت کی قرار دی جائے۔ تو "مالگزاری" کرایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے زمین خواہ "عشری" ہو یا خراجی "کاشت کار کی ہوتی ہے۔ لہٰذا "خراج" یا "عشر" ٹیکس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ردّ المحتار میں لکھا ہے :-

"جو کچھ کہ قہر اور غلبہ سے فتح ہوا۔ اور وہاں کے باشندوں کے قبضہ میں رہنے دیا گیا۔ یا اُن سے صلح کی گئی۔ اور اُن کی زمینوں پر خراج مقرر کیا گیا تو یہ اُن باشندوں کی ملکیت ہے"۔
(جلد ۲ ص۲۱۳)

لیکن ہندوستان میں بندوبست اراضی کے تین طریق رائج ہیں (۱) زمینداری (۲) محال واری اور (۳) رعیتواری۔ زمینداری کا بندوبست زمیندار سے کیا جا سکتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ دوامی اور میعادی۔ "دوامی" کا رواج بنگال، بہار، بنارس اور شمالی مدراس میں ہے اور "میعادی" اودھ میں رائج ہے" محال واری" طریق کے ماتحت بندوبست ٹھیکیداروں سے کیا جاتا ہے۔ اور اس کا رواج آگرہ، اودھ، صوبہ متوسط، پنجاب اور شمالی بہار کے بعض اضلاع میں ہے۔ رعیتواری بندوبست براہِ راست کاشتکار سے کیا جاتا ہے اور یہ طریق آسام بمبئی اور مدراس میں جاری ہے۔ گویا چند اضلاع کو چھوڑ کر ہندوستان میں کہیں بھی کاشتکار اپنی زمین کا مالک نہیں ہے اور "زمیندار" کی حیثیت ایجنٹ کی سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ اسلام بحث و تحیص کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر پیداوار کی زکوٰۃ (عُشر) واجب نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی (مصنف کشاف اصطلاحات الفنون) فرماتے ہیں:

"اراضیٔ ہند نہ عُشری ہیں نہ خراجی بلکہ اراضی الحوزہ ہیں یعنی بیت المال اور حکومت کی ملکیت ہیں"۔

جن انگریز مصنفین نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے اُن میں سے سرجان شور اور گرانٹ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں سرجان شور زمین کا حق ملکیت زمیندار کو دیتے ہیں اور گرانٹ اس کا مالک سرکار کو بتلاتے ہیں۔ لیکن خود حکومت اس حق کا دعویٰ تو نہیں کرتی۔ تاہم عملاً اس نے زمیندار یا کاشتکار کو مالکِ اراضی کبھی تصور نہیں کیا۔ لہٰذا غالب خیال یہی ہے کہ ہندوستان میں

ملکیت کا حق چونکہ انگریزی اقتدار کو پہنچا ہے۔ اس لئے مسلمانوں پر "خراج" یا "عشر" واجب نہیں ہے بلکہ صرف مالگزاری ادا کر دینا کافی ہے۔

فئی اور جزیہ : بیت المال کا ایک اور ذریعۂ آمد "فئی" تھا جو اُس ٹیکس کو کہتے ہیں۔ جو بُت پرستوں سے جنگ کے بغیر وصول کیا جائے۔ اس میں "جزیہ" اور "خراج" بھی شامل ہیں۔ البتہ "خراج" کی ادائیگی تو مسلمان ہونے کے بعد بھی فرض رہتی۔ لیکن جونہی کوئی بُت پرست حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتا تو "جزیہ" یا "فئی" اُس سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ "فئی" کی تقسیم اُسی طرح عمل میں آتی جس طرح "مالِ غنیمت" کی بیان ہو چکی ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ⅕ حصہ قبول فرما لیتے۔ اور باقی بچے مہاجرین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد میں مجاہدین کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ اس لئے نظامِ مالیات میں بھی تغیّر و تبدّل کی ضرورت پیش آتی۔ چنانچہ یہی روپیہ اب مشاہروں کی صورت میں تقسیم ہونے لگا۔

"جزیہ" وہ محصول ہے جو غیر مسلموں پر فوجی خدمات انجام نہ دینے کی وجہ سے عائد کیا جاتا ہے اسلام کے دشمنوں نے اس معقول اور جائز ٹیکس کو ہمیشہ اپنی زہر آلود نکتہ چینیوں کا شکار بنایا ہے چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں تو "جزیہ" کے خلاف ہندوؤں کا جذبۂ تنفّر اس درجہ ترقی پا گیا کہ وہ بغاوت پر اُتر آئے۔ اور کھلے بندوں اس ٹیکس کی مخالفت کرنے لگے لیکن نکتہ چینوں نے اس ٹیکس کی نوعیت اور وجۂ جواز (justification) پر غالباً ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ وہ خلفائے راشدین اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف اُتنا زہر کبھی نہ اُگلتے جتنا اُن کی تحریروں سے ٹپکتا ہے۔

اگر "جزیہ" کی تاریخی حیثیت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے یہ ٹیکس عائد کر کے کوئی ایسی جدّت یا اختراع نہیں کی جسے "انوکھا" قرار دیا جا سکے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں یہ ٹیکس

ایشیائے کوچک کے ساحلی باشندوں پر ایتھنز کے یونانیوں نے عائد کیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا۔ اسی طرح رومی فاتحوں نے یہ ٹیکس اپنے محکوموں پر لگایا۔ چنانچہ گال د Mlsswgm کو نشانۂ استبداد بنانے کے بعد رومی جرنیلوں نے ان پر "جزیہ" عاید کر دیا اور اس کی شرح ۹ سے ۱۵ گنی فی کس تک رکھی۔ اب غور فرمائیے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جزیہ کی شرح اتنی ظالمانہ تو ہرگز نہ تھی اس کے باوجود دشمنان اسلام مسلمان حکمرانوں کے خلاف زہر چکانی کئے بغیر نہیں رہتے۔ اسے تعصب پر محمول نہ کیا جائے۔ تو کیا کیا جائے؟ رومیوں اور یونانیوں کے علاوہ ایرانیوں نے بھی اپنی رعایا پر یہ ٹیکس عاید کیا۔ چنانچہ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں کہ "جزیہ" کا لفظ ہی فارسی کے ایک لفظ سے بگڑ کر بنا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ٹیکس بعثت اسلام سے قبل بھی مروج تھا۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ نوشیرواں کے زمانہ میں بھی غیر نصرانی رعایا کو یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اس کی شرح کا انحصار زیر محصول افراد کی آمدنی پر تھا۔

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ "جزیہ" کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ فاتح حکمران اسے ہمیشہ تحفظ کے عوض اپنی محکوم رعایا سے وصول کرتے آئے ہیں اور نصرانی آبادی کو اس سے ہر حالت میں مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس ٹیکس کو آدم سمتھ کے قوانین محصول بندی (Canons of Taxation) کی روشنی میں دیکھا جائے، جب بھی یہ معقول اور جائز ثابت ہوگا۔ چنانچہ انصاف اور مساوات کے معیار پر اس ٹیکس کو جانچا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ غیر مسلموں (ذمیوں) کو جبری طور پر فوج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم انہیں زندگی کی وہی سہولتیں میسر تھیں جن سے عام مسلمان مستفید ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ غیر مسلموں کو بہت سے ایسے فرائض سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا جو مسلمانوں کے ذمے تھے۔ پس یہ عین مساوات اور صریح انصاف ہے کہ ان ذمہ داریوں کے معاوضہ میں ان سے کوئی ایسا ٹیکس وصول کیا جائے۔ جو ان کے ایثار کو مسلمانوں کے ایثار کی سطح پر لے آئے یہ امر قابل ذکر

ہے کہ جن لوگوں پر "جزیہ" عاید کیا گیا وہ برضا و رغبت اور خندہ پیشانی سے اس کو ادا کرتے رہے لیکن بعد کے متعصب اور کوتاہ بین نکتہ چینیوں کو کیا کیا جائے۔ کہ وہ اس جائز اور معقول ٹیکس کو بھی "ظالمانہ" اور "نفرت انگیز" قرار دے رہے ہیں۔

پھر ابتدا میں "جزیہ" کی شرح مقرر نہ تھی۔ اس کا انحصار حالات پر ہوتا تھا اس طرح ٹیکس "لچکیلا" ر [illegible] حق بھی تھا پس اس لحاظ سے بھی "جزیہ" اصولِ محصول بندی پر پورا اترتا ہے۔

اس کے علاوہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان حکمرانوں نے ہمیشہ مفتوحہ آبادی کی رضامندی سے "جزیہ" عاید کیا ہے۔ چنانچہ جب نجران فتح ہوا۔ تو وہاں کے باشندوں نے عاجزی اور اطاعت کا اظہار کیا اور بعد ازاں ماہِ صفر میں دو سو حُلّے اور ماہِ رجب میں ایک ہزار حُلّے ادا کرنا منظور کر لیا۔ گویا انہوں نے صرف ۴۸ ہزار درہم بطور جزیہ ادا کیا۔ اسی طرح مقنا کے باشندوں نے اپنی تجارتی و زرعی پیداوار کا ¼ حصّہ مسلمانوں کو ادا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کریمانہ اور نرم شرائط کی نظیر تاریخ عالم پیش نہیں کر سکتی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اسلامی سلطنت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تو مالیات کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے اور حساب کتاب میں باقاعدگی پیدا کرنے کی غرض سے "جزیہ" کی شرح بھی مقرر کی گئی۔ چنانچہ آپ نے فوجی افسروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں حکم دیا کہ ہر وہ شخص جو استرا استعمال کرتا ہے جزیہ ادا کرے یعنی ہر بالغ غیر مسلم پر "جزیہ" فرض قرار دیا گیا۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ جن لوگوں کے پاس چاندی ہو وہ چالیس درہم بطور "جزیہ" ادا کریں۔ اور جن کے پاس سونا ہو وہ ہر سال چار دینار خزانہ میں داخل کریں۔ اس کے علاوہ انہیں مسلمانوں کے لئے زیتون کا تیل اور گندم بھی مہیا کرنی چاہئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس شرح میں محصول دہندہ کی حیثیت کے مطابق تبدیلی کی گئی اور

قرار پایا کہ امرا ہر سال ۴۸ درہم اور متوسط حال ۲۴ درہم سالانہ بیت المال کو ادا کریں۔ بچوں، عورتوں اور درویشوں وغیرہ کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس معیار کے تعین کے باوجود مسلمان فاتحین کو اجازت تھی کہ وہ ہر ملک کا معیار محصول بندی وہاں کے حالات کے مطابق قائم کریں۔ چنانچہ جب عمرو بن العاصؓ نے مصر کو فتح کیا تو آپ نے حکم دیا کہ تمام قبطی خواہ امیر ہوں یا غریب دو دینار فی کس کے حساب سے جزیہ ادا کریں۔ البتہ بوڑھوں، نابالغوں اور عورتوں کو یہ ٹیکس معاف تھا اس کے علاوہ قبطیوں کو حکم دیا گیا کہ تین روز تک وہ مسلمانوں کو مہمان رکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ "جبری دعوت" بھی جزیہ کا ایک حصہ تھی لیکن اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ ملکیوں اور غیر ملکیوں کے درمیان میل جول اور خوشگوار تعلقات پیدا کئے جائیں۔

بعض اوقات "جزیہ" کا تعین لوگوں کے آمد و خرچ کا اندازہ لگانے کے بعد کیا جاتا تھا۔ اس صورت میں وہ اخراجات مستثنیٰ قرار دیئے جاتے تھے۔ جو "اہلیتِ کارکردگی" (EFSICIENCY) میں اضافہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں صرف اس خالص آمدنی پر جزیہ لگایا جاتا تھا جو اخراجات منہا کرنے کے بعد کسی فرد کی ثابت ہوتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ "جزیہ" نہ تو ظالمانہ ٹیکس ہے نہ اس کی ادائی لوگوں کی استطاعت اور توفیق سے باہر تھی۔ اور نہ اس کی وجہ سے لوگوں کے معیارِ زندگی میں کوئی فرق آسکتا تھا۔

امام ابوحنیفہ رحؒ کے نزدیک "جزیہ" کی شرح ۱۲ - ۲۴ - اور ۴۸ درہم ہے لیکن امام حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جزیہ کی شرح مقرر نہیں ہے بلکہ حالات کے مطابق اس کا تعین ہو سکتا ہے۔ امام مالک کا قول ہے کہ جزیہ کی شرح ۴ دینار یا ۴۰ دینار ہے۔ امام شافعیؒ نے جزیہ کی ایک ہی شرح مقرر کی ہے یعنی ایک دینار خواہ محصول دہندہ امیر ہو یا غریب۔

دراصل اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جزیہ کی کوئی بھی شرح مقرر نہ تھی۔ جس قسم کے حالات

ہوتے مسلمان حکمران یہ ٹیکس غیر مسلموں پر عائد کر دیتے تھے۔

بہر حال اس کے جائز، معقول، اور آئین محصول بندی کے عین مطابق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ اس کی وصولی میں انتہائی شفقت، فراخ دلی اور نرمی کا برتاؤ کیا گیا۔

محاصل درآمد و برآمد

معاشیات میں تجارت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اگر غور کیا جائے تو دنیا میں وہی قومیں سربلند ہوتی ہیں جو تجارت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتی ہیں جس قوم میں تجارت نہیں وہ آج یا کل ضرور نشانہ استعمار بنے گی۔ چنانچہ آج کل مسلمانوں کی محکومی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے تجارت کا بائیکاٹ کر رکھا ہے حالانکہ اسلام نے ذیل کے پُر زور الفاظ میں مسلمانوں کو تجارت کی ترغیب دی ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ یعنی جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین پر پھیل جاؤ اور وہاں تجارت و رزق اکو حاصل کرو۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن دیانتدار تاجروں کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا (ترمذی)

لیکن تجارت کے فوائد پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں، ہماری توجہ اُن محاصل تک محدود رہنی چاہئے۔ جو کاروبار پر عائد ہو سکتے ہیں۔

ماہرین مالیات نے اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ کہ تجارت "آزاد" ہونی چاہئے۔ یا "پابند" طرفین کے دلائل پر غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے۔ کہ "آزاد تجارت" بہر صورت مفید ہے اور تقابلی مصارف کے نظریہ (Theory of Comparative Costs)

کی رُو سے یہی وہ طریق ہے جس کے ماتحت دونوں ممالک (درآمد اور برآمد کرنے والے) فائدہ میں رہ سکتے ہیں۔ اسلام بھی "آزادِ تجارت" کا حامی ہے اور درآمد برآمد پر محاصل عائد نہیں کرنا چاہتا البتہ خاص حالات میں "تامینی محاصل" (Protective Tariffs) کا مؤید ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضؓ کے زمانہ میں جب شام و عراق میں مسلمان تاجروں پر محاصل لگائے جاتے تھے۔ تو "جوابی کارروائی" کے طور پر مسلمانوں نے بھی غیر ملکی مال پر "ڈیوٹی" لگانا شروع کر دی اس ڈیوٹی کا اصطلاحی نام "عشور" ہے ابی عبید "کتاب الاموال" میں لکھتے ہیں:-

وكان مذهب عمر فيما وضع من ذلك انه كان ياخذ من المسلمين الزكوٰة ومن اهل الحرب العشر تاما لانهم كانوا ياخذون من تجار المسلمين مثله اذا قدموا (ص۱۵۳)	حضرت عمرؓ کا مذہب یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے صرف زکوٰۃ لیتے تھے۔ اور اہلِ حرب سے عشور وصول کرتے تھے اس لئے کہ حربی حکومتوں کا دستور تھا کہ جب مسلمان تاجران کے ملکوں میں جاتے۔ تو اسی طرح کا محصول وہ اُن سے وصول کرتے تھے۔

اس کے باوجود حضرت عمرؓ کی ہدایت تھی۔ کہ اس قسم کے مال پر سال میں ایک ہی دفعہ محصول لیا جائے۔ خواہ مال دو دفعہ درآمد۔ اس کے علاوہ پھلوں پر کوئی محصولِ درآمد (Import Duty) عائد نہیں تھا۔

الغرض اسلامی تعلیم یہ ہے۔ کہ تجارت و صنعت محاصل کی پابندی سے آزاد ہوں۔ اگر انتقامی طور پر ان کی ضرورت بھی پیش آ جائے۔ تو اتنی سختی نہ کرنی چاہیئے۔ کہ تجارت کی حوصلہ فرسائی ہو یا ایک ملک کو دوسرے پر خواہ مخواہ کاروباری تفوق حاصل ہو جائے۔

اب اسلامی تعلیمات سے دنیاوی طرزِ عمل کا مقابلہ کر کے دیکھئے۔ تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ دُنیوی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ محاصل کی دیواریں تجارتی تفوق حاصل کرنے کیلئے کھڑی کی جائیں۔ چنانچہ امریکہ و انگلستان

محض اس لئے دنیائے تجارت پر حکمران ہیں کہ انہوں نے ترجیح شاہی (Imperial Preference) اور تائینی محاصل (Protection Duties) کی ناقابلِ عبور دیواریں قائم کر رکھی ہیں۔ اور وہ خود تو صنعتی ممالک بن کر تجارتی منڈیوں پر قابض ہو چکے ہیں۔ لیکن دوسروں کو زراعتی سطح سے اُبھرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے برعکس اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اگر ایسی دیواریں استوار بھی کی جائیں تو اُن کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ دوسروں کی تجارت میں رکاوٹ ڈالی جائے یا خود "تجارتی غلبہ" پالیا جائے۔

معدنیات

معدنیات کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ موجودہ تمدن کی بنیاد ہی کانوں پر ہے۔ اگر کوئلہ، چاندی، سونا، پٹرولیم وغیرہ دستیاب نہ ہوں تو حکومت کی گاڑی ایک لمحہ کے لئے بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اس شعبہ کو براہ راست حکومت کے ماتحت رکھا گیا ہے اور ہندوستان میں معدنی ذخائر کی آمد مرکزی حکومت کے بجٹ میں شامل ہوتی ہے۔ اسلام نے بھی معدنیات کو اہم قرار دیا ہے۔ اور ان کو "سرکاری جائداد" میں شامل کیا ہے۔ لیکن اسلام کانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔

(۱) جن کو کھودنے کے لئے محنت و مشقت کی ضرورت نہ ہو۔ اور دھات سطح ہی پر مل جائے

(۲) جن کو کھودنے کے لئے محنت و مشقت کی ضرورت ہو اور دھات زمین کے اندر پوشیدہ ہو

پہلی قسم کی کانوں کے متعلق اسلامی ارشاد یہ ہے۔ کہ وہ کسی خاص شخص یا حکومت کی ملکیت میں نہیں آسکتیں ہر شخص اُن سے حسب ضرورت فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ مثلاً اگر سمندر کے پانی سے نمک بہ آسانی میسر آسکتا ہو یا کسی پہاڑی ندی سے سونا نکالا جا سکتا ہو۔ یا سطح زمین پر کوئی دھات قدرتی طور پر بکھری ہوئی مل جائے۔ تو لوگوں کو اس کے استعمال کی عام اجازت ہے سرکاری اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ میں فرماتے ہیں۔

"یہ ایک صاف بات ہے کہ وہ کانیں جو سطح زمین سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اُن پر زیادہ محنت کی ضروریات نہیں اُن کا کسی ایک مسلمان کو بخش دینا عامۃ مسلمین کے لئے ضرر رساں اور اُن کی ضروریات کے لئے تنگی اور دشواری کا باعث ہے۔ اس لئے ایسا کرنا منع ہے"۔ (ص)

اس کے مقابلہ میں جو معدنیات سرکاری کاموں کے لئے مفید خیال کی گئی ہیں۔ ان پہ خلیفۂ وقت اور مجلس شوریٰ کا اقتدار تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابیض ما ٓربی کہتے ہیں کہ

"ایک دفعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور مآرب میں جو نمک کی جھیل تھی اسے عطیہ کے طور پر مانگا۔ آپ نے اجازت عطا فرمادی۔ لیکن ایک شخص نے اعتراض کیا اور کہا یا رسول اللہ! آپ نمک کا خزانہ اُس کے حوالے کیوں کئے دیتے ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اصل حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد یہ اجازت واپس لے لی"۔

(مجمع الزوائد جلد ۴)

"اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک دفعہ چاندی پیش کی گئی اور پیش کرنے والے نے کہا کہ ہماری کان سے برآمد ہوتی ہے تو حضور نے فرمایا وہ زمانہ آنے والا ہے جب کانوں پر بدترین لوگوں کا قبضہ ہوگا اور وہ اُسے ناجائز دولت و ثروت کا ذریعہ بنالیں گے"۔ (مجمع الزوائد جلد ۴)

گویا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کانوں کی ناجائز اجارہ داری سے منع فرمایا ہے لیکن پہلی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جائز طور پر ان کی ملکیت کا حق حکومت کو دیتے تھے۔ اور فقیہہ اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ جن کانوں پر محنت و مشقت کی ضرورت ہو اور جو اجتماعی زندگی کے لئے اہم ہوں اُن پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہئیے تاکہ وہ مساوی تقسیم کی نگرانی کر سکے۔ یہ نہیں کہ آج کل کی طرح اُس نمک پر بھی پابندی عائد کردی جائے جو سمندروں

سے بلا محنت برآمد ہوتا ہے۔ اور جو غربا کی ضروریات کا کفیل ہے۔ اگر اسلامی اصول پر عمل ہوتا تو غالباً مسٹر گاندھی کو "نمکین سول نافرمانی" کی ضرورت پیش نہ آتی۔

بیت المال کا میزانیہ

یہاں تک ہم نے بیت المال کے وسائل آمدنی اور عام نظم ونسق پر بحث کی ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے ٹیکس دانستہ نظر انداز کر دیئے گئے ہیں کیونکہ اصولی بحث میں اُن کی ضرورت نہیں ہے بہرحال اسلامی نظامِ مالیات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ کہ عہدِ حاضر کے بجٹوں کی طرح بیت المال کا میزانیہ بھی تیار کیا جاتا تھا۔ اور اس کی ایک ایک مد پر اگرچہ کسی نمائندہ مجلس میں بحث نہیں ہوتی تھی۔ تاہم خلیفہ اور اس کے مشیر کار کسی ناجائز سختی کو روا نہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی خاص قسم کا ٹیکس (مثلاً جزیہ وغیرہ) عائد کرنے سے پہلے مقامی باشندوں کی رضامندی حاصل کر لی جاتی تھی۔ اس طرح مالی امور میں رائے عامہ کو بھی دخل حاصل ہو جاتا تھا۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسلامی نظامِ حکومت نہ تو آمرانہ ہے نہ موجودہ اصطلاح میں جمہوریت پسندانہ۔ اور علی الخصوص اُن معاملات پر رائے عامہ نہیں لی جاتی تھی۔ جن کا حکم قرآن مجید میں بالصراحت موجود ہے۔ مثلاً صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی خدا تعالےٰ نے خود فرض قرار دی ہے اس لئے یہ مسئلہ آیا صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ کی ادائیگی ہونی چاہیئے یا نہیں عوام کے پیش کرنا غیر اسلامی فعل ہے۔ البتہ جب اسلامی سلطنت کی حدود وسیع ہو گئیں اور غیر مسلم رعایا کو بھی خلیفہ کے حیطۂ اقتدار میں لانا ضروری ہو گیا۔ تو بعض خاص قسم کے محاصل میں عوام کی منظوری لے لی جاتی تھی۔

بیت المال کے گوشوارہ کی دوسری خصوصیات شروع میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس لئے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر بیت المال کا میزانیہ تیار کیا جاتا ہے تو مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اس کا نقشہ کچھ حسب ذیل ہوگا:-

آمد	خرچ
۱ - زکوٰۃ ۲ - صدقات ۳ - فئی ۴ - خراج ۵ - عشرہ	(۱) تقسیم: برائے فقراء، مساکین، عاملین، تالیف قلوب، غلام - مقروض، فی سبیل اللہ مسافر وغیرہ
۶ - جزیہ ۷ - مال غنیمت (ا) قیدی (ب) لونڈی (ج) اراضی (د) سیم وزر (ہ) خون بہا - ۸ - محاصل درآمد و برآمد ۹ - کانیں ۱۰ - متفرقات - مثلاً نہروں کا ٹیکس، اوقاف اور وراثت وغیرہ -	فئی، خراج، عشرہ، جزیہ اور مال غنیمت: برائے مجاہدین و مہاجرین یعنی فوج تجارت، نہریں، کانیں وغیرہ -: رفاہ عامہ اور ملکی ترقی کے لئے

مصارف

افسوس کسی ایک سال کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ اسلامی مصارف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) فوج (۲) رفاہ عامہ یہی دو مدات ہیں۔ جن پر بیت المال

کے روپے کا بیشتر حصہ صرف ہو سکتا ہے۔ اسلام کے سیاسی عروج اور دفاع کے لئے کافی فوج کا رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوجی مصارف اسلامی مالیات میں جائز قرار دیئے گئے ہیں تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو ہر وقت جنگ و جدل میں مصروف رہنا چاہئے۔ اگر جہاد کا موقع نہ ہو۔ تو یہی روپیہ اشاعت اسلام اور تبلیغ پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

مصارف کے دوسرے حصے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا۔ کہ اسلام نے جماعتی تفوق اور امارت و غربت کے فرق کو مٹانے کے لئے مساکین، یتامیٰ اور غرباء کی امداد کرنا ضروری قرار دیا ہے بلکہ اگر یہ ذہن میں رکھا جائے۔ کہ اسلام نے انفرادی طور پر بھی صدقہ و خیرات کا حکم دیا ہے۔ تو معلوم ہو گا کہ اس مذہب کی اصل غرض و غایت ہی یہ تھی کہ سرمایہ داری کا قلع قمع کر کے پسماندہ طبقہ کو ابھارا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دولت سمیٹنے کو بار بار مذموم قرار دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنی آمدنی و ملکیت میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔

بیت المال کے میزانیہ کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پیداوار (Productive) اور غیر پیداوار (Unproductive) مصارف کا بے حد خیال رکھا گیا ہے۔ فوج پر روپیہ لگانے سے سیاسی تفوق حاصل ہوتا ہے اور رفاہ عامہ کے کاموں میں روپیہ خرچ کرنے سے معاشری، اقتصادی اور تجارتی مرفہ الحالی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر امارت و غربت کا سوال پیدا نہ ہو۔ اور وسائل معیشت سے استفادہ کی سب کو یکساں اجازت ہو تو قدرتی طور پر محنت کرنے اور روپیہ کمانے کی خواہش بڑھے گی۔ اور اس طرح ملک میں ایک عام خوش حالی کا دور دورہ ہو گا۔ اسلامی مالیات میں ایک بھی ٹیکس ایسا نہیں ہے۔ جو کام کرنے کی خواہش یا صلاحیت پر شانماز ہوتا ہو۔ یا ملک کی تجارتی و صنعتی ترقی میں حائل ہو۔ پس اسلامی مالیات عامہ کے منصفانہ اور مفید ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ذرائع آمد اور مصارف میں کافی سے زیادہ لچک موجود ہے اس لئے حالات کے

مطابق اُن میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ لیکن محصول بندی کے وقت سب سے بڑا اصول یہ مدنظر رکھنا چاہئیے کہ ٹیکس کا اثر اس طبقہ پر پڑے۔ جو اس کی ادائیگی کا اہل ہو۔ اسی طرح مصارف کی تقسیم کے وقت ادنیٰ اور غریب طبقہ کی خوش حالی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ باتیں ذہن نشین رکھی جائیں تو آمد و خرچ میں حسب حالات تغیر ہوسکتا ہے۔

چند "با اقبال" لمحے

(از مرزا عزیز فیضانی)

علامہ اقبال مرحوم کی وفات کے ساتھ ہی ان کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی داستانیں جرائد میں شائع ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ اس میں نامور و گمنام دونوں قسم کے لوگ تھے۔ ناظرین میں یہ خیال سا پیدا ہوگیا تھا؟ ذاتی ملاقاتوں کا خیال بیان کرنے کا رواج زور پکڑ گیا ہے۔ اس لئے اسے ریاد نمود سمجھ کر جی نے چاہا کہ محترز رہے۔ اسی لئے قلم رُکا رہا۔ مگر اب چند احباب کے پیہم اصرار پر امتثال امر ناگزیر نظر آ تی ہے۔

نہ راقم کی شخصیت کوئی شخصیت ہے اور نہ اس کا ملاقات کرنا اہم مگر اس خیال سے کہ علامہ اقبال کے نیاز حاصل کرنا البتہ ضرور اہم ہے اور یہ کہ شاید ان باتوں سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے، چند ملاقاتوں کا مختصر حال ہدیۂ ناظرین ہے۔

سب سے پہلی ملاقات جسے "زیارت" کہا جاسکتا ہے، ۱۹۲۰ئہ میں ہوئی جب علامہ موصوف انار کلی کے ایک مکان کی بالائی منزل میں اقامت پذیر تھے۔ راقم اپنے رفیق مکرم چوہدری ذکار اللہ تبسّل (ایڈووکیٹ) کے ہمراہ گیا۔ کیونکہ ابھی نوعمر تھا۔ اور ڈر رہا تھا کہ بغیر تعارف شاید گفتگو ہی نہ ہوسکے۔ مگر اقبال ایسے درویش نہ خلق کے کیا کہنے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کہنے والا یا سننے والا کون ہے امیر یا غریب

نامور ہے یا گمنام، عالم ہے یا جاہل۔ انہیں تو صرف خلوص و اخوت درکار تھی اندازہ یہ ہے کہ جب تک
تو وہ فراست کو ملاقاتی کے خلوص کا امتحان کرنے دیتے تھے۔ خاموش رہتے تھے مگر جونہی انہیں یقین آگیا کہ یہ
شخص درد اور خلوص کی دولت رکھتا ہے۔ انہوں نے اس طرح گفتگو شروع کردی گویا ملاقاتی امیر خاندانی، نامی
وگرامی، عالم و فہیم اور ولی حکیم ہے۔ خواہ وہ لوگوں کی طرح میں غریب و گمنام ہی کیوں نہ ہو۔ نہایت
شفقت سے پیش آتے، محبت سے سمجھاتے اور درد کی دولت سے مالا مال کرتے تھے۔

بسمل صاحب نے تعارف یوں کرایا کہ میرا یہ نوعمر بھائی ہم وطن ہے، نظم و نثر کا اسے ذوق ہے
اور بفضل خدا مذہبی و ملی ذوقی ہے، نعت گو بھی ہے، آپ کے کلام کا خصوصاً اس لئے مداح اور عاشق
ہے کہ آپ نے شاعری کے خداداد جوہر کو صحیح راستے میں استعمال کرنا شروع کیا ہے، اس لئے لاہور آتے ہی
آپ کی زیارت کا شوق اسے پیدا ہو گیا تھا۔ شاید آپ کی مثنوی کے ایک عنوان سے جو اس کے دل
میں اشکال پیدا ہو گیا ہے وہ بھی آپ سے دور کرلے۔

مکان کے صحن میں کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ جگہ اتنی ہی تھی کہ ایک کے پیچھے دوسری اور تیسری کرسی
نوکر نے بچھائی دائرہ کی شکل میں کرسیاں وہاں رکھی ہی نہیں جا سکتی تھیں اتفاق یہ کہ علامہ مرحوم ہماری طرف
پشت کئے بیٹھے تھے، بوجہ علالت کرسی کو موڑ نہ سکے، صرف ذرا سا پہلو موڑ لیا، اپنے خیال میں محو
تعارف کے فقرے سن رہے تھے "نعت گو" کہنے پر پہلی دفعہ آنکھیں کھول کر راقم کو دیکھا۔ پھر لفظ زیارت
پر۔ آخر فرمایا، میں زیارت کے لائق کہاں۔

اب بدقت کرسی کچھ موڑ لی۔ اور زیادہ سامنے ہو گئے۔ مزاج پرسی پر فرمایا کہ نقرس کا عارضہ ہے

ع یہ بھی تیرا کرم ہے کہ نقرس دیا مجھے صحت میں گو غریب مرض میں امیر ہوں

یہ اس لئے کہ کہتے ہیں یہ نقرس کا مرض بالعموم امرا کو لاحق ہوا کرتا ہے۔

مثنوی کے ذکر پر فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں مغربی تعلیم کا اثر مثنوی کے ذریعہ پھیلایا گیا ہے حالانکہ مغرب نے بھی نقالی سے کام لے کر اسلام ہی سے کئی باتیں اڑائیں اور انہیں بڑھا چڑھا کر توڑ موڑ کر اپنے مطلب کا بنا کر اپنی لکہ کر پیش کی ہیں۔ اب جو اصلی چیزوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ تو مسلمان اُسے اپنا ہی گمشدہ مال سمجھنے کی بجائے اسے یورپ کی ایجاد سمجھتا ہے۔ بھلا اس پر میں کیا کروں سوا اس کے کہ فریاد کروں۔

پھر پوچھا مثنوی کے کونسے عنوان پر اشکال پیدا ہوا۔ راقم پہلی مرتبہ جرأت کر کے گویا ہوا۔ یہ عنوان "جہاد کہ مقصد او جرح الارض باشد در مذہب اسلام حرام است" اس عنوان سے ان لوگوں کے دل میں شبہ پیدا ہوتا ہے جو مجاہد کے دل کا امتحان کر کے یہ معلوم نہیں کر سکتے یا ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ اُس میں صرف رضائے مولا ہے یا فتح اسلام بھی۔ کیونکہ فوج کا مقصد فتح بھی ضرور ہوتا ہے اب یہ فرق کرنا ہر شخص کا کام نہیں کہ فتح ممالک تو ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ مقصد اگر ہو بھی تو ادنیٰ اور دوسرے درجہ کا ہے۔ اصلی مقصد رضائے مولا ہے۔

فرمایا یہی چیز اُس شخص کو سمجھا دیجئے۔ جو فرق کرنا نہیں جانتا۔ معلوم ہو رہا ہے کہ آپ یہ فرق پہچانتے ہیں۔ اس لئے کوئی اشکال نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ عنوان باب دراصل احادیث کا معنوی ترجمہ ہے اور ملوکیت و استعمار کے شیدائیوں سے متعلق ہے ایک مجاہد اسلام کی خدمت اور تبلیغ کے لئے فتح ملک چاہتا ہے۔ ایک بادشاہ یا سرلشکر ملک فتح کر کے وہاں بادشاہت قائم کرنے کے لئے لڑتا ہے دونوں مسلمان ہیں دونوں لڑتے ہیں۔ پہلا شخص مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔ دوسرا نہیں۔

پس اب سلسلہ چل نکلا تھا، چند لطیفے اور اسرار و رموز بیان فرمائے، جن کا احاطہ قوتِ حافظہ قائم نہیں رکھ سکی۔ لطف انہی سے سننے میں تھا۔ اب دہرانے میں کہاں!

ایک آدھ مرتبہ اور بھی نیاز حاصل کئے۔ میکلوڈ روڈ پر ایک دفعہ اپنے فارسی قطعات پیش کئے،

ان میں سے دو بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

مومن و یاس! عین بوالعجبی! رحمتِ حق برائے ماست نبی ﷺ
نشنیدی کہ ہم خدا فرمود؟ "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ"!

ہیچ رنج و غم بلا با تست! مومن استی و ایں چہا با تست
حذر از خوف کن، دلیر بزی مرد شو، نعرہ زن، خدا با تست

پوچھا: "اصلاح کے لئے لایئے" عرض کیا "نہیں، وہ دل دکھانے کے لئے سرخ پھول گلستان میں لایا ہوں، خواہ نادان سمجھئے خواہ دیوانہ گردانیئے" مسکرا کر فرمایا "فلاں فلاں الفاظ والے دوبارہ پڑھیئے" تعمیل ارشاد ہوئی۔ پھر فرمایا "مخلصانہ نصیحت کرتا ہوں کہ مطالعہ زیادہ کیجیئے" پوچھا "فارسی زبان کا یا فنِ شاعری کا" فرمایا "کسی علم کا نہیں بلکہ دل کی کتاب کا"۔ دریافت کیا "کیونکر" فرمایا "دل سے پوچھئے"۔ اب راقم کچھ جھجک گیا۔ کچھ مطلب پا گیا۔ اور کچھ یہ خیال کر کے خاموش رہا کہ شاید مزید سوال ملالِ طبع کا باعث ہو یا گستاخی کا مظہر۔

ایک دفعہ خودی کی حقیقت سمجھنے کے لئے حاضر ہوا۔ کیونکہ بعض صوفیہ میں اقبال کی خودی کے زیرِ بحث آجانے پر چند نئی دریافت طلب باتیں سامنے آگئی تھیں۔ ہر چند کہ ابھی ابھی چند کالجیٹ نوجوانوں کو یہی چیز بالوضاحت سمجھا چکے تھے، اور راقم نے بھی عرض کر دیا کہ پھر کسی دن حاضر ہو کر سن لونگا آپ تکلیف نہ فرمایئے، مگر یہ علامہ موصوف کا خُلق تھا کہ پھر آمادہ ہو گئے۔ اور یہ فرما کر کہ "درست۔ مگر خدا کو کیا جواب دوں گا کہ ایک مسکین درویش صفت مسلمان بھائی پوچھنے کے لئے آیا اور اسے کسی دوسرے دن آنے کی تکلیف دی

گر دولتمندی خاندانوں کے وضعدار نوجوانوں کو اسرار سمجھاتا رہا۔" قصہ مختصر پندرہ منٹ اس حقیر کے لئے بھی صدقہ کئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خودی اثاثے صغیر ہے اور قوت ایمانی کا دوسرا نام۔ اس سے زیادہ تفصیل کے لئے ان چند صفحات اور اس مختصر صحبت میں گنجائش کہاں۔

آخری علالت کے آغاز میں بیمار پرسی کے لئے پہنچا۔ تو حقہ نوشی میں محو تھے چونکہ مجھ سے پہلے ایک صاحب نے اپنے نام کی چٹ اندر بھجوائی تھی اور خادم بھی مشہور عاشق اقبال یعنی علی بخش کی بجائے کوئی اور وہاں متعین تھا۔ اس لئے میں نے بھی نام کی چٹ بھجوا دی۔ حالانکہ علیل تھے اور آواز کمزور مگر خادم کے ہاتھ کہلا بھیجنے کی بجائے وہیں سے آواز دے دی" آئیے یہ چٹوں کی قید آپ کے لئے نہیں" جب راقم کمرے میں داخل ہوا تو نوکر سے فرمایا "حقہ اٹھالے جاؤ۔ مولوی صاحب آئے ہیں۔" عرض کیا "ایک تو مولوی نہیں ہوں، پھر حقے سے ایسی نفرت نہیں کہ سامنے پڑا ہوا بھی نہ دیکھ سکوں۔ علاوہ ازیں اس سے پہلے میرے حاضر خدمت ہونے پر آپ نے اس بات کا التزام کبھی نہیں کیا تھا۔" فرمایا "اب آپ کے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں۔ اس لئے لحاظ بھی زیادہ ہونا چاہیئے۔"

خیر، مزاج پرسی کی، فرمایا: "علاج ہو رہا ہے" طریق علاج وغیرہ دریافت کیا، فرمایا "تفصیل کی کیا ضرورت، دوا تو ہو رہی ہے دعا کیجئے" عرض کیا "دعا نہیں بلکہ دعائیں کی جا رہی ہیں۔ مگر مجھ ایسے بے عمل کی دعا بھی کیا؟" آہ۔ اس پر آبدیدہ ہو کر فرمایا:- "اپنی نعتوں کو پیش کر کے یوں دعا کیجئے کہ اے رسول پاکؐ کے اور سب کے آقا! میری نعتوں کو قبول کرتے ہوئے اس شخص کو صحت عطا کر جس کے یہ دو شعر ہیں ؎

معنئ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوت قلب و جگر گردد نبیؐ — از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

کچھ نہ پوچھئے کہ ان کے اس ارشاد پر آنسوؤں نے راقم کا کیا حال کیا — پھر اثنائے گفتگو میں سب سے پہلی ملاقات کا ذکر یاد دلایا گیا۔ جب آپ انارکلی میں رہتے تھے اور مرض نقرس میں مبتلا تھے اس پر فرمایا: "آپ کی سب سے پہلی ملاقات بھی بیمار پرسی تھی اور یہ شاید آخری ملاقات بھی بیمار پرسی ہی کے لئے ہے" دعائے صحت و درازی عمر پر یہ ملاقات ختم ہوئی۔

مگر آخری ملاقات اس کے علاوہ ایک اور ثابت ہوگی۔ اور وہ علامہ کی وفات کے کچھ ماقبل تھی یعنی جب آپ انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے بوجہ علالت و ضعف مستعفی ہونے کو تھے اس کی ایک وجہ تو وہی بیمار پرسی مگر فوری سبب یہ ہوا کہ سرحدی علاقے کا ایک پٹھان یتیم لڑکا جو انجمن کے یتیم خانے میں داخل تھا۔ اس کی بیوہ ماں بیچاری کسی گھر میں خادمہ کا کام کرتی تھی اور راقم کے گھر اس کا آنا جانا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی خاتون تھی اور پڑھی لکھی، وہ ایک دن آکر فریادی ہوئی کہ اس کے لڑکے کو یتیم خانہ سے نکال دیا گیا ہے اب خطرہ ہے کہ وہ بے علم رہ کر آوارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ راقم اور محترم دوست خان عطاء الرحمٰن خان دونوں پہلے تو یتیم خانے میں گئے حالات دریافت کئے معلوم ہوا کہ لڑکے کا چال چلن تو اچھا ہے صرف گستاخ ہے۔ مہتمم صاحب کے مشورے پر ہم سیکرٹری صاحب یتامیٰ کمیٹی کے پاس گئے مگر انہوں نے مایوس کن جواب دیا۔ اس پر ہم سیدھے صدر انجمن یعنی علامہ موصوف کی خدمت میں جا پہنچے سب سے پہلے عیادت کا فریضہ ادا کیا گیا۔ پھر معاملہ پیش کیا۔ فرمایا اس کی والدہ کی طرف سے عرضی لکھا کر اپنے نوٹ کے ساتھ مجھے بھجوا دیجیئے میں دوبارہ داخل کرنے کا حکم اس پر لکھ دونگا!

اس کے بعد ارشاد ہوا۔ غالباً آپ کی تسلی ہو گئی۔ اب اصل حقیقت سے آگاہ کروں؟ ہم دونوں نے عرض کیا۔ ضرور۔ آپ "ترجمانِ حقیقت" ہیں، حقیقت سے آپ آگاہ نہ کریں گے تو ہم اور کس سے دریافت کریں گے فرمایا "جس علاقے اور جس نسل کا یہ نونہال ہے اس کا تقاضا ہے کہ جالبیے ہاں

کی موجودہ تعلیم اس سے خاندانی جوہر چھین لیگی۔ نہ یہ کہ بقول اُس کی والدہ کے یہ تعلیم نہ پاکر وہ آوارہ ہو جائے!" ہمیں حیرت ہوئی جب لڑکے کی والدہ کو یہ نکتہ پسند آگیا اور اس نے لڑکے کو یتیم خانہ میں داخل کرانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

اثنائے گفتگو میں علامہ کی تصنیفات کی اشاعت کا ذکر آگیا۔ اس سلسلے میں راقم نے ایک تجویز پیش کی جو علامہ موصوف کی کتابوں کی اشاعت کا شوق رکھنے والوں کو شاید ثابت ہو۔ عرض کیا: "اس میں شک نہیں کہ حسنِ کتابت و طباعت اور کاغذ کی عمدگی سے آپ نے خصوصاً نظموں کی طباعت کا معیار بلند کر دیا ہے۔ مگر آپ کا کلام ذوق و شوق سے پڑھنے والے زیادہ تر غربا ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے درجہ کی ارزاں اڈیشن بھی ہو تو بہتر ہے کتابت ایک ہی ہو صرف کاغذ کے فرق پر قیمت کم کر دی جائے۔ یا اُسی کاتب سے علیٰحدہ مگر گنجان لکھوا کر حجم بھی کم کر لیا جائے۔"

فرمایا: "یہ تجویز میرے ذہن میں بھی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ کم از کم قیمت پھر بھی ضرور ضرور ہو ورنہ معیار گر جائے گا۔" آخر جب کافی دیر ہو گئی تو عرض کیا گیا کہ آپ علیل ہیں لیکن آپ کو اس ملاقات اور ہماری باتوں سے تکلیف نہ ہو۔ اجازت چاہتے ہیں، فرمایا کوئی تکلیف نہیں، بلکہ راحت ہے ـــــ یہ ملاقات بھی علامہ موصوف کی اس خواہش کے اظہار پر ختم ہوئی کہ "دعا کرتے رہئے" مگر ایسی ختم ہوئی کہ پھر قیامت ہی کو ہو تو ہو، یہاں ناممکن ہے۔

راقم خود اپنے حق میں یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی زندگی کے "با اقبال" لمحے وہی تھے۔ جو اقبالؒ کے ساتھ بسر ہوئے۔

افادات حضرت شاہ ولی اللہ پر ایک نظر

(ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر کشمیری ۔ شاہ منزل دیوبند)

ہندوستان کے مطلع روشن پر علم و فضل، تصوف و طریقت اور حکمت و سیاست کے جو آفتاب جہانتاب دور گذشتہ میں پے در پے ظاہر ہوتے رہے ہیں اُن سب کی فہرست بہت طویل ہے ہو نہیں سکتا کہ کسی ایک فرصت میں کسی خاص ترتیب سے ان سب کے اسماء گرامی زبان پر آسکیں لیکن اُن میں ایک انسان کامل، ایک عارف باللہ اور ایک عالم ربانی کی وہ شخصیت جو گیارہویں صدی ہجری کے بالکل شروع میں ہندوستان کی جماعت اسلامی کے اُس وقت اور اُس وقت کے بعد سے لیکر آج تک کے تمام امراض کی صحیح تشخیص اور ان کے کامیاب اور زود اثر علاج کے لئے کچھ نہیں تو کم از کم ۔ سال تک انہیں تصانیف اور اپنی شخصیت کے عظیم الشان اثرات سے اہم خدمات انجام دیتی رہی علماء و فضلاء کے اس انبوہ کثیر میں ناقابل فراموش بھی ہے ۔ اور ضرورت کے ہر موقعہ پر بے ساختہ یاد آجانے کے لائق بھی ۔ یہ واجب الاحترام شخصیت امام ہمام ۔ عالم یگانہ ۔ سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی تھی ۔ جو دردمند صفت بادشاہ عالمگیر کے عہد سے تھے اور ۱۱۱۴ھ میں آپ نے صورت تخلیق پاکر اپنے مرحلۂ وفات کے وقت ۱۱۷۶ھ تک ہزارۂ دوم کے بالکل شروع وقت میں اکبر بادشاہ کے "دین الٰہی" سے پیدا شدہ اُس شرک و لادینی اور اصل دین میں تحریف اور تنسیخ کی اس وبائے عام کی روک تھام کی جس کے پس پردہ عجم کے دو زبردست جادوگروں یعنی فیضی اور ابو الفضل کی شعبدہ کاریاں کام کر رہی تھیں ۔ یہ وقت ہندوستان پر اب سے بھی زیادہ شدید اور مایوس کن تھا ۔ عقائد و اعمال کی صورت مسخ تھی ۔ اور اسلامی تمدن و معاشرت اس قدر کھوکھلی ہو گئی تھی کہ اس کا جیتے رہنا محض سلیمان علیہ السلام کی لاش کا بیت المقدس کی تعمیر کے وقت اپنی لکڑی کے سہارے پر کھڑے رہنے کی طرح قدرت کی

ایک حیرت زا کرشمہ کاری تھی اور بس، امراض کی شدت وکثرت ہمیشہ ایک حاذق طبیب کی تلاش پر انسان کو مجبور کرتی ہے۔ اور یہی وقت وہ ہوتا ہے کہ جب مریض کو اگر کوئی قابل اطمینان علاج میسر آجاتا ہے تو اس کی جانبری ممکن ہوتی ہے ورنہ موت کا امکان غالب ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام کے عالیہ دورا دراس کے مستقبل کی خوش قسمتی تھی کہ اسے شاہ ولی اللہ حکیم الامت، نہایت صائب الرائے مدبر اور بالغ نظر مصنف نظر آیا جس کی نظر سلطنت وسیاست کے ان تمام امراض و مفاسد پر پہنچی تھی جس سے اسلام پر دم واپسیں کی ناتوانی اور کیفیات ضعف مسلط تھیں اور مریضوں کی حالت کچھ اس قدر مایوس کن تھی کہ تمام چارہ گر شکستہ دل تھے۔ اور بڑی حیرت ومایوسی کے ساتھ ہر پوچھنے والے سے کہ رہے تھے کہ

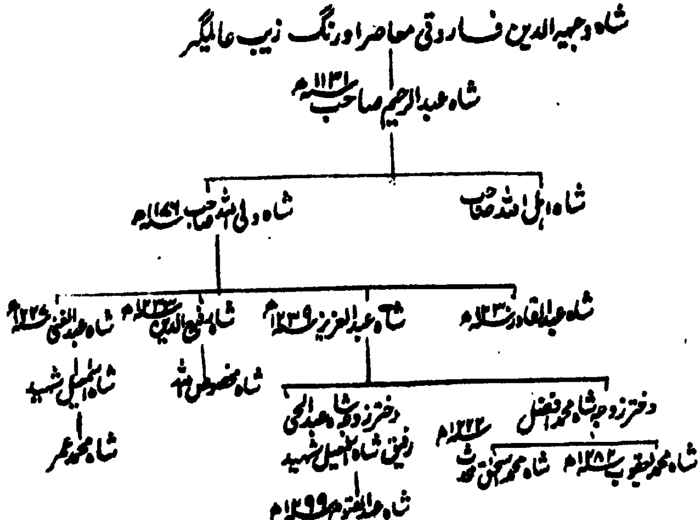
دم واپسیں برسر راہ ہے

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمت اور ان کی سیاست کو سمجھنا ابتداءً کے چند اہم مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے اور خود ان کی زندگی، ان کی تصانیف، ان کی خدمات، ان کے افکار وافادات کے بہت سے پہلو ہیں۔ جن کی تفصیل کے لئے لمبی چوڑی تصانیف کے کثیر اوراق ہی سے تھوڑا بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم شاہ صاحب کے مختصر تعارف کے لئے یہاں صرف دو چیزیں عرض کریں گے۔ بہت ممکن ہے کہ اہل نظر ان حقیقتوں کو جو حضرت موصوف اور دوسرے علماء اسلام کی زندگی میں مابہ الامتیاز ہیں۔ کچھ سمجھ جائیں اور ان کا ذہن اس نادرۂ روزگار ہستی کی جامعیت کو سمجھ پائیں۔

(۱) اہل عقل کے نزدیک یہ اگر کوئی حقیقت ہے، بعض انسانی خصوصیتیں سیرت و مزاج کے بعض کمالات وہبی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنی محنت سے حاصل کرلینا ممکن نہیں ہوتا، انہیں اپنے ارادے سے پانے کے لئے نہ لمبے لمبے مجاہدات کارگر ہوتے ہیں اور نہ استخواں گداز محنتیں اور ریاضتیں انہیں کسی انسان میں جمع کرسکتی ہیں۔ وہ ہفتوں اور مہینوں تک بھوکا پیاسا رہ کر مل سکتی ہیں۔ اور نہ خواہ

خونکی تمام ضروریات زندگی کو ترک کرکے اس نعمت سے سرفراز ہونا آسان ہے تو ماننا پڑے گا ۔
کہ قدرت نے حضرت شاہ ولی کو ہندوستان کے اس سب سے عالی مرتبہ اور عظیم الشان خانوادہ میں تخلیق فرمایا جو کم از کم ڈیڑھ صدی تک دہلی میں علم و فضل کا گہوارۂ اوّل اور عالمانہ و مرشدانہ رہنمائی کا مرکز رہا ہے اس تمام باطنی استعداد کار، قوت عمل اور فیض روحانی سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ جو ان کے آباو اجداد کے ذاتی کمالات تھے اور خود حضرت شاہ ولی اللہ کے لئے ان کے گھر کی چیزیں حضرت شاہ ولی اللہ کا یہ شجرہ مع ان کے ارکان خاندان کی تاریخ وفات کے پیش نظر رہے :۔



اس شجرہ کے ہر ہر نام پر غور فرما کر دیکھ لیجئے کہ شاہ ولی اللہ سے اُوپر کے دو حضرات اپنے عہد میں میں دینی خدمات کے مرکز اور عامۃ المسلمین کے عقیدت مندانہ جذبات کے تنہا مالک رہے ہیں اور ان میں ہر ایک دین اور سیاست دین کے لئے وہ کچھ کر گیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے اسی طرح شاہ صاحب کی بعد کی نسلیں، اپنی دینی خدمات، علمی جانکاہی اور مذہبی ولولے اور جذبے کی بنا پر ایک مستقل تاریخ رکھتی ہیں یہ وہ خاندان اور وہ ماحول تھا جس میں شاہ ولی اللہ نے آنکھ کھولی، ظاہر ہے کہ جس خاص کام کے لئے

شاہ ولی اللہ تشریف لاتے تھے۔ اس کے تمام اسباب بلا طلب اور بغیر خواہش کے اس وقت ہندوستان میں صرف اس علمی خانوادہ کے زیر سایہ مہیا ہو سکتے تھے، شاہ ولی اللہ کے علم و فضل اور حکمت و سیاست کی پشت پر اپنے خاندانی عز و شرف کی یہ اتنی بڑی قوت ہے کہ ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں شاید ہی کسی عالم کو اتنا بڑا کوئی فخر، اتنی بڑی کوئی طاقت، اتنی اچھی کوئی تربیت اور اس طاقت و تربیت اور خاندانی ماحول کے اتنے کثیر فوائد نصیب ہوئے ہوں۔

(۲) اپنے ہی خاندان کی کچھ روایات اور اپنے ہی بزرگوں کے کچھ اثرات تھے کہ شاہ ولی اللہ کو فقہی مسائل کی نہایت بے قیمت بحثوں، آپس کی طفلانہ چپقلشوں اور عقائد و اعمال میں مولویانہ موشگافیوں سے قطع نظر کر کے سلطنت اور سوسائٹی کی بربادی کے تمام اسباب کو جان لینے اور اسلام کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی۔ انہیں پا لینے کا ایک مذاق حاصل ہوا۔ شاہ صاحب نے شروع سے صرف اُن چیزوں سے تعلق رکھا جو مریض اسلام کی صحت و تندرستی سے قریب کا کوئی تعلق رکھتی تھیں، وہ تقلید و عدم تقلید کے اکھاڑے میں تشریف لائے اور نہ انہوں نے حنفیت اور شافعیت کے میدان میں بے فائدہ کشتیاں لڑیں، ان کا فقہائے فکر آمین بالجہر تھا اور نہ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ، وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک زبردست مذہب خود اہل مذہب کی نااہلیت اور بے علمی و تن پروری سے اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے، نام کے مسلمان، نام کی مسلمان سلطنتیں، نام کی مسجدیں، نام کی درگاہیں اور نام کی خانقاہیں سامنے موجود تھیں، مگر ان سب سے دین کی روح رخصت ہو چکی ہے اور اوپر سے لے کر نیچے تک غفلت و بدنظمی کی ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ اس ماحول میں کوئی شقی القلب عالم ہی ہوتا جو وقت کی اصل ضرورتوں سے غافل ہو کر بے نتیجہ قیل و قال میں الجھا رہتا، شاہ ولی اللہ ایک ایسی طبیعت کے آدمی تھے جو ہر حقیقت کو اس کی شکل میں پاتے تھے۔ وقت کے ہر تقاضے کو محسوس کرتے تھے اور اجتماعی اور انفرادی

زندگی کی ہر بڑی اور چھوٹی ضرورت انہیں پکارتی تھی لہٰذا شاہ صاحب کا نام آنے کے ساتھ ہی جان لینا چاہئے۔ کہ وہ اس دور کے اُن جامد علماء میں سے ہرگز نہیں تھے جنہیں آج تک خانہ جنگی میں فرصت نہیں ملی۔ بلکہ وہ ایک معمار تھے جو سلطنت کی تعمیر کی فکر کرتے تھے اور دین کی عمارت سے اُن تمام بوسیدہ اینٹوں اور پتھروں کو نکال کر ان کی جگہ نئے اور پائدار اجزا لگانا چاہتے تھے جن سے عمارتِ اسلام میں بوسیدگی اور شکستگی کے آثار ظاہر تھے۔

حضرت موصوف کی شخصیت اور ان کے دینی اور سیاسی افکار کے اجمالی تعارف کے لئے یہ چند باتیں عرض کرنے کے بعد اب ہم اپنے موضوع کلام پر توجہ کریں گے۔ اور وہ یہ کہ شاہ صاحب نے مختلف عنوانات پر کچھ کم ستر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اور جن میں سے اکثر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بطور الہام شاہ صاحب کی نوک قلم پر آئیں، شاہ صاحب نے گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں جو کچھ لکھا۔ وہ اس وقت کے ماحول کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھا، ان کی چیزیں اس زمانہ میں اس قدر نئی اور اوپری سمجھی گئیں کہ ۱۱۵۱ھ میں جب آپ نے "فتح الرحمٰن" کے نام سے فارسی میں قرآن عزیز کا ترجمہ کیا۔ تو اس دور کے علماء نے ان کے خلاف ایک تحریک جاری کر دی اور اعتراض ہوا کہ لیجئے صاحب! اب عوام بھی خود بخود قرآن پڑھیں گے۔ شاہ صاحب کے خلاف کم نگاہ و بے یقین اور بے بصر علماء کا یہ ایجی ٹیشن اتنا سخت تھا۔ کہ آپ کو ایک مدت کے لئے اپنے ملک سے باہر جانا پڑا۔ مگر بقول مرزا غالب

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن
ایں مئے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد وہ جواہر ریزے اور گوہر پارے چمک رہے ہیں۔ جن پر ناقدری اور کس مپرسی کے پردے پڑے ہوئے تھے شاہ صاحب کے یہ افکار و اناروات

عصرِ حاضر کے پریشان نظر اور آوارہ فکر جوانانِ اسلام کی روحانی بے چینی کا آخری علاج ہیں مغرب اور تہذیبِ مغرب نے اس دور کو شیشہ گری کا فن سکھایا ہے۔ مگر شاہ صاحب اسے خارہ شگافی کے طریقے بتانا چاہتے ہیں دو صدیوں کی المناک غلامی ہم سب کا دل توڑ گئی ہے اور پریشان حالات واسباب کا ایک ہجوم ہے۔ جس کے نیچے ہماری روح پڑی ہوئی تڑپ رہی ہے مگر یقین کیجئے۔ کہ ہمیں افادات شاہ ولی اللہ میں اپنی سیرابی دل و روح کا بڑا سامان مل سکتا ہے۔

کارکنانِ امام ولی اللہ اکاڈمی لاہور اور اس کے روحِ رواں مولانا سید محمد شاہ ایم اے ہم سب کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے افادات شاہ ولی اللہ کو اس خاص مقصد کے لئے پھیلانے اور آگے بڑھانے کے لئے جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی کے ان پانچ مضامین کو کتابی شکل میں یکجا شائع کیا ہے جو مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہیں۔

(۱) چوتھی صدی ہجری کا مذہبی اور فقہی انقلاب (۲) اختلافی مسائل اور ان کا نقطۂ عدل (۳) اسلام کا فلسفۂ عمران (۴) اسلام کا قانونِ معیشت۔ اس کی روح اور اس کے اصل (۵) دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب۔

یہ پانچ مضامین ۴۴ صفحات کی موزوں تر اور خوش شکل کتاب پر پھیلے ہوئے ہیں اور پانچوں مقالے حضرت امام ہمام کی مشہور عربی کتاب حُجَّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَہ سے ماخوذ ہیں۔ پہلے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ علما میں فقہی اور مذہبی انقلاب کب سے شروع ہوا؟ اور چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں ان کی موت کے پیش خیمہ اور شدید آثار و علائم کے طور پر علماء میں کیا فقہی اور علمی بحثیں پیدا ہوئیں؟ اس خانہ جنگی کی داغ بیل کس طرح پڑی اور وہ کون سے راستے تھے جن سے یہ وبائی امراض مستقل زندگی لیکر مسلمانوں میں داخل ہو گئے

دوسرے مضمون میں حضرت شاہ ولی اللہ نے ان تمام اختلافی مسائل میں اپنی دینی

بصیرت اور فقہی، علمی مہارت کی بنا پر ایک ناقابلِ انکار نقطۂ عدل تلاش فرمایا ہے۔ اور اور بہت سے مختلف فیہ مسائل کا ذکر فرما کر ان کے فیصلے کی صورتیں متعین کی ہیں یہ مضمون مختصر ہونے کے باوجود اس قدر اہم ہے شاید ہی اس قسم کا دوسرا مقالہ پورے اسلامی اور دینی لٹریچر میں مل سکے۔

تیسرا مضمون "اسلام کا فلسفۂ عمران" عمرانیت اور فلسفۂ مدنیت کے اُن اہم حقائق پر پھیلا ہُوا ہے جو صرف اسلام کے خزانہ میں پائی جاتی ہیں اور دوسرے مذاہب اچھی زندگی کے ایسے اچھے قاعدوں اور طریقوں سے نابلد ہیں۔ پھر یہ موضوع وہ ہے جس پر صرف شاہ ولی اللہ صاحب کو دادِ کلام دینے کا حق حاصل ہے کہ شاہ صاحب ہر چھوٹی، بڑی چیز کی حقیقت پر غور کرنے کے عادی اور اُن تعلقات کو سمجھنے کے خوگر ہیں جو اس سطح ارضی پر پڑے ہوئے ایک بے جان ذرے کو ایک بڑی اور فلک بوس عمارت سے ایک بے حقیقت قطرہ کو ایک بحر بیکراں سے، اور درخت کو ایک ذرا سی پتی کو در پردہ باغ بھر سے ہے۔ یہ چیزیں وہ ہیں جو ہمارے دماغ کو اپیل نہیں کرتیں۔ مگر شاہ صاحب نے بحکم قرآن انہی میں غور و فکر فرما کر قدرت کے بعض عظیم الشان مصلحتوں کو سمجھا اور اُن رازہائے سربستہ کو پایا جن کے نہ پانے سے ملتیں کی ملتیں گمراہ ہوئیں اور قومیں کی قومیں بگڑ گئی ہیں یہ مضمون بتائے گا کہ یہ کارخانۂ عالم سراسر ایک راز ہے۔ اور یہاں کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز اپنی جگہ ایک معمہ جو ذوق ان کی زبان ہیں

نہ سمجھنے کا، نہ کہنے کا، نہ سمجھانے کا

نہیں بلکہ سمجھنے، کہنے اور سمجھانے کے قابل ہے۔ اور اسی کے سمجھنے، کہنے اور سمجھانے پر یہ موقوف ہے کہ ہم اپنی زندگی کی خوشحالی اور خوش خیالی کی کنجی ڈھونڈھیں۔

چوتھا مضمون اسلام کے قانونِ معیشت کی تشریح، اس کی روح اور اصول کی ترجمانی

کی تا ہے۔ اس موضوع پر اس زمانہ میں کئی اچھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر اُن سب کتابوں کا اصل ماخذ بھی حجۃ اللہ البالغہ کے ہی چند صفحات ہیں، باوجودیکہ عصرِ موجود کے کئی اچھے لکھنے والے اپنے زورِ قلم سے اس عنوان کے ہر پہلو پر روشنی ڈال چکے ہیں مگر شاہ صاحب کے یہ افکار بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور عمارت، تکمیل کی آخری حد پر پہنچ جانے کے باوجود اپنی بنیاد سے مستغنی نہیں ہو سکتی، اس لئے ہر اہلِ علم کے لئے اس مقام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

پانچواں مضمون بتاتا ہے کہ دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب کیا ہیں؟ شاہ صاحب نے چن چن کر اُن سب عیبوں کی نشاندہی کر دی ہے جس میں اگر ایک طرف ہمارا طبقۂ علماء بھی اپنی دینداری، ادعائے ہمہ دانی اور غرورِ علم کے باوجود مبتلا ہے تو دوسری طرف جہلا اور عوام بھی اسی قیدِ گیسو کے اسیر ہیں۔ یہ بڑا حکیمانہ مضمون ہے بلکہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے امراضِ مہلکہ کی ایک مرتب فہرست ہے جس کے آئینہ خانہ میں ہمیں اپنا سراپا بخوبی نظر آ سکتا ہے۔

بہت بڑی حق تلفی اور اخفائے حق ہوگا اگر ہم یہ عرض نہ کریں کہ امام ولی اللہ اکاڈمی کا مقصد اس کتاب کی اشاعت سے صرف کتب فروشی نہیں بلکہ اس نے ارادہ کیا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے افادات و افکار کا چراغ اس دورِ مادیت کے فانوس میں اس خوبی اور خوبصورتی سے رکھا جائے۔ کہ مادیت کے ان خارزاروں ہی میں روحانی برکات کے پھل اور پھول لہلہا اُٹھیں، اکاڈمی کا یہ ایک بڑا اور دیر طلب مقصد ہے۔ جو تدریجاً تکمیل کو پہنچ سکتا ہے، یہ کارکنانِ اکاڈمی کا ایک نفسیاتی کارنامہ ہے کہ اس نے عام طبائع کو شاہ صاحب کے افکار سے مانوس کرنے کے لئے موصوف کے افادات کی پہلی قسط اُن تمام ابتدائی خوبیوں کے ساتھ پیش کی ہے۔ جو ہر پڑھنے والے کے دل میں جہاں اپنے لئے ایک مستقل جگہ بنائے گی وہاں شاہ صاحب کے دوسرے افکار کے لئے بھی ذہنِ انسانی میں ایک گنجائش نکلتی آئے گی، مجھے

اُن روشن خیال اور دور اندیش نوجوانوں سے جو شاعرِ اسلام حضرت علامہ اقبال کی اسلامی شاعری سے متاثر ہیں ضروری یہ سفارش کرنی چاہئے کہ وہ شاہ صاحب کے ان تمام افکار کو ضرور پڑھیں کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعرانہ زبان و بیان سے جو میدان ہموار کیا ہے وہ میدان دین و سیاست کے انہی درباروں کو سجانے اور لگانے کے لئے بنایا گیا تھا یاد رہے کہ اقبال کی شاعری صرف ایک شاعری، صرف ایک تفریح، بہار کا صرف ایک استقبالیہ اور خزاں کا صرف ایک نوحہ نہیں، بلکہ وہ ایک نوائے عاشقانہ تھی جس کے پیچھے حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی عہ کے یہی افکار پوشیدہ تھے ۔

میرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

عہ اور دوسرے حکمائے اسلام ۔

اقبال کا تصوّرِ قلندر

عجمی افکار نے تصوفِ اسلام میں اتنا رسوخ حاصل کر لیا کہ حقیقت ہی بدل گئی ۔ جدوجہد کی جگہ تعطل، صبر و شکر کی جگہ ترکِ لذات اور اطمینان و سکینت کی جگہ مخبولیت نے لی۔ "قلندر" سے مراد وہ شخص سمجھا جانے لگا جو حقوقِ عباد تو ایک طرف حقوقِ نفس سے بھی بے نیاز رہے جو سر اور چہرہ منڈا ہوا کسی پہاڑ کی کھوہ میں چلہ کشی کرتا ہے ۔ حالانکہ بقول حافظ شیرازیؒ :-

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست — نہ ہر کہ سر بتراشد، قلندری داند

علامہ اقبالؒ نے جہاں اور مسخ شدہ حقائقِ اسلامی کو ان کے اصلی رنگ میں پیش فرمایا، وہیں ایک

اسلامی صوفیاء "قلندر" کے مقام کے بھی وضاحت فرمائی تعلیمات اقبال کی رو سے "تمکین" یا "رضا" قلندر کی پہلی صفت ہے۔ قلندر اپنی خودی کو اتنا ارفع کر چکا ہے کہ وہ خودیٔ مطلق کے عین تابع ہو جاتی ہے اسی وجہ سے زمانہ کے مدو جزر سے اس کے چہرۂ طمانیت پر رنج و الم کی ایک شکن بھی آنے نہیں پاتی۔ اس کے نزدیک ہر مصیبت پیمانِ محبت کی ایک آزمائش ہے، اسی لئے بجائے ملول ہونے کے وہ ان بلاؤں کو خوش آمدید کہتا ہے تاکہ ان سے گذر کر رضائے محبوب کو پالے۔ دوست کے ہاتھ سے ملی ہوئی چیز کا گلا اس کی ناقدر شناسی نہیں تو اور کیا ہے؟[1] پھر دوست بھی کیسا؟ جس کی آزمائشیں بھی نوازشوں ہی کے لئے، کیونکہ بعد انداز محبوبانہ بتا کر اور جتا کر آزما رہا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝

یہ تو ماسوا کا ذکر ہوا اُسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ وہ یہاں بھی "سم غم" سے دور رہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ جان جس کی عطا ہے، مصیبت بھی اسی کی فرستادہ ہے مال و دولت جس نے عاریتاً دی تھی، وہی واپس لے بھی رہا ہے پھر اس کا بھی یقین کہ یہ "لین" بھی دراصل کسی "دین" ہی کے لئے ہے [إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ][2] تو معشوق کی اس ادا کا کیوں نہ مسکراتے ہوئے استقبال کرے اسی لئے علامہ

علامہ نے فرمایا

دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی
غم رم نہ کر، سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

(بانگ درا)

اسی خیال کی تائید ابراہیم ادہم کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ "ہمارے سروں پر تین پردے ہیں۔ جب تک وہ دور نہیں ہوتے تب تک بندہ پر یقین ظاہر نہیں ہوتا۔

[1] ز دستِ دوست بنالیدن آمدی مستدی ستو قدرِ دوست نہ دانی کہ دوست داری جاں + [2] "اور ہم آزمائیں گے تم کو کسی قدر خوف، فاقہ، مال، جان اور پھلوں کی کمی سے، اور بشارت دیجئے ایسے صابروں کو" (ترجمہ) [3] "خرید لی ہیں اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال جنت کے عوض" (ترجمہ)

ہونا۔ (۱) موجود سے خوش ہونا (۲) مفقود پر غم کرنا (۳) تعریف سے خوش ہونا . . . پس جو کوئی موجود سے خوش ہوتا ہے وہ حریص ہے، اور جب مفقود پر رنج کرتا ہے تو غصہ کرنے والا ہے اور غصہ والے کو عذاب ہوتا ہے اور جب تعریف سے خوش ہوتا ہے تو تعجب کرتا ہے اور عجب عمل کو باطل کرتا ہے[1] غرض پتہ چلا کہ قلندر غم و خوشی کے جذبات سے برتر، تسلیم و رضا کی شان کا حامل ہوتا ہے۔

جب غم و خوشی کی نفی ہوئی تو تخویف و تحریص کا کیا محل؟ خوف کو اس سے کوسوں دور رہنا چاہئے کیونکہ خوف تو اس سوزش اندرونی کو کہتے ہیں جو آیندہ . . . رونما ہونے والی چیزوں کے پیش نظر پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ جس نے خوف کو جگہ دی وہ جدو زندگانی میں مات کھا جائے گا "راکب" ہونے کے بجائے "مرکب" بن جائے گا، پھر طوعاً و کرہاً اُسے زمانہ کا ساتھ دینا ہوگا، دل کچھ ہی کہے زبان پر وہی آئیگا۔ جو مطابقِ زمانہ ہوگا یعنی صدق و صفا سے ہٹ کر کذب و نفاق اس کا مسلک بن جائے گا جو قلندرانہ وصف کے بالکل برعکس ہے۔ قلندر کی زبان تو ہمیشہ دل کی رفیق ہوا کرتی ہے چاہے اس کے نتائج کتنے ہی مہیب ہوں۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق   یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

(ضرب کلیم)

درحقیقت خوف کا شائبہ بھی کیسے پیدا ہو، جب وہ جانتا ہے کہ اس کا رشتۂ محبت اس سے جڑ چکا جس کی فوجیں ارض و سما کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر یہ تصور کہ حالتِ درماندگی میں اس ذی شیوۂ دوستی ہوتا ہے اس میں یہ ایقان پیدا کر دیتا ہے کہ در اصل زمین و آسمان کی فوجیں ہر آن اسی کے ساتھ ہیں اب اگر کوئی شئے مخالف رنگ میں ظاہر بھی ہوتی ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس سے محض اس کی استقامت اور قوت جہاد کی آزمائش مقصود ہے۔ اسی لئے وہ بے سرو سامانی میں بھی لڑ پڑتا ہے موت

---

[1] احیاء العلوم جلد (۴) باب "فقر و زہد"۔

سامان خوف یوں فراہم نہیں کر سکتی کہ وہ جان چکا ہے کہ :-

"مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اُسے جذب کر سکے، یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویت و براہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو بردو سلام بن جائے، پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے آسمان و زمین میں یہ نہیں سما سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے، عدم بود کو کھا جاتا ہے، پستی بلندی میں سما جاتی ہے، مگر جو قوتِ جامع اضداد ہو۔ اور محلِ تمام تناقضات کی ہو اُسے کون جذب کر سکے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے"[1]

اس عرفان سے قلندر میں وہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زمانے کی رو میں بہہ جانے کے بجائے اس سے ٹکراتا اور بالآخر غالب آکر ہی رہتا ہے :-

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر (بالِ جبریل)

تخویف تو یوں ہٹ گئی تحریص کا طلسم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ عجمی راہب کی طرح قلندر ایسا تارکِ دنیا تو ہوتا نہیں کہ مال و دولت کا گذر ہی نہ ہو، جائز طریقوں اور شرعی رستوں سے دولت کے انبار لگ سکتے ہیں لیکن نہ تو اس سے اس کو محبت ہوتی ہے نہ اُسے اپنی عزت کا باعث سمجھتا ہے کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ "جس کو روپیہ عزت دیتا ہے اس کو خدا ذلیل کرتا ہے"[2] اسی وجہ سے وہ سب کچھ اس طرح لٹا دیتا ہے کہ گویا اس کا تھا ہی نہیں۔ چنانچہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ فرماتے ہیں :-

"باوجود ملک دو عالم خود را بینوا و مفلس داند و بہمت از دو کون برگذرد" ایسی حالت میں مال و دولت ملنے کی کیا خوشی اور نہ ملنے کا کیا غم! حقیقت یہ ہے کہ قلندر "عارف" ہوتا ہے اور عارف کا قلب تو انوارِ قدم کے ظہور کا محل ہوتا ہے، جب فانیات کو اس قلب کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو مضمحل

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۱۳۔ [2] امام حسینؑ کا قول ہے۔

اور ناچیز ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی جاذبیت اور فسوں کاری کا کیسے اثر ہو سکے اور جب فانی کا تاثر باقی نہ رہا تو پھر تحریص کے ہزار کمند بھی اس بے پروا روح کا شکار نہیں کر سکتے۔ نیز قلندر کے کانوں میں ہر آن یہ صدا گونجتی رہتی ہے "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ" (کیا اللہ کافی نہیں ہے اپنے بندہ کے لئے) بس اسی لئے وہ عاشق صادق، عزت و عظمت کی منزلیں ڈھاتا ہوا، مال و دولت کو ٹھکراتا ہوا زبان حال سے کہتا، اور کس شان استغنا کا اظہار کرتا ہے، "حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْل" (کافی ہے مجھ کو اللہ اور اچھا ذمہ دار) اُس کے پاس قوت کا مدار زر پر ہے نہ پستی کا انحصار بے زری پر، اس لئے ظاہر پرستوں اور مادی اسباب ہی پر تکیہ کرنے والوں کو جتاتا ہے۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری (بانگ درا)

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا — قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں

قلندری کو "من کی دنیا" حاصل ہوتی ہے، جہاں بقا کی دائمی ہوائیں چلتی رہتی ہیں، اُسے "تن کی دنیا" کی کیا پروا جس میں ہر آن فنا کے بگولے اُٹھتے رہتے ہیں، وہ متقی ہوتا ہے اس لئے "از بلائے خویش رستہ" اور "از بند خود جستہ" ہوتا ہے وہ اپنے آپ سے گزر کر دین کی سب سے کڑی ہجرت کر چکتا ہے[1] وہ اپنی خودی کو اتنا بلند کر چکتا ہے یا اس کی مرضی، مرضی مطلق میں اتنی فنا ہو چکتی ہے کہ پھر اس کا ہاتھ گویا خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور وہ اس سے کام کرتا ہے اس کی زبان گویا خدا کی زبان ہوتی ہے اور وہ اس سے بولتا ہے، اس کی آنکھ گویا خدا کی آنکھ ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے دیکھتا ہے۔[2]

---

[1] "متقی آنست کہ از بلائے خویش رستہ و از بند خود جستہ باشد" "و بداں کہ ہیچ ہجرت در دین عزیزتر ازاں نیست کہ کسے از خویش ہجرت بکند" مکتوبات شیخ شرف الدین یحیٰی منیریؒ۔

[2] جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے۔

اسی لئے اس کی ہر ہر حرکت سے وہ وہ معجز نمائیاں ہوتی ہیں کہ ظاہر بینوں کی عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ اس کی ایک نظر وہ سب کام کر گزرتی ہے جو کسی بادشاہ کی فوجیں باوجود تیغ و تفنگ کے کر نہیں سکتیں پھر نتائج کتنے مختلف، ایک کے اثرات روحانی تو دوسرے کے شیطانی خوب فرمایا حضرت اقبالؒ نے:۔

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری   آں ہمہ جذبۂ کلیم، ایں ہمہ سحر سامری

آں بہ نگاہ می کشد، ایں بہ سپاہ می کشد   آں ہمہ صلح و آشتی، ایں ہمہ جنگ داوری (جاوید نامہ)

اس مقام قلندریت کے لئے جس طرح زر کی کوئی اہمیت نہیں اسی طرح مجرد علم جو عرفان خودی کا باعث نہ ہو محض فضول ہے قلندر ایسے علم سے ہر وقت بچتا رہتا ہے جس سے دماغ "غزالان افکار کا مرغزار" بنا رہے اور جس سے بجز گمانوں کے لشکر کے کچھ ہاتھ نہ آئے۔ اس کا علم قلیل لیکن حقیقی و یقینی ہوتا ہے علم برائے علم اس کے نزدیک جہل ہے وہ تو علم برائے عمل کا قائل ہوتا ہے اسی لئے چاہے وہ "نغمہائے حجازی" سے معرا ہو مگر "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مفہوم اس کے ذہن سے اتر کر دل میں اور دل سے گزر کر رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہ شہر ہے قاروں لغت ہائے حجازی کا (بال جبریل)

اسی وجہ سے وہ پیکر عمل بن جاتا ہے اور اس کی زندگی مسلسل جہاد بن جاتی ہے اس کا فقر کردیوں پر شبخون مارتا ہے تو اس کے بوریے کی شکوہ سے سلاطین کے محلوں میں زلزلہ پڑ جاتا ہے گو وہ کم سخن ہوتا ہے لیکن اس کی ایک سانس ہزاروں انجمنوں کی گرمی کا باعث ہوتی ہے، اس کا جلال گوارا نہیں کر سکتا، کہ "آزریت" دیکھے اور "خلیل اللہی" نہ کرے سامری طلسم ہو اور عصائے کلیمی نہ چلائے یعنی نہ صرف وہ خود "صبغۃ اللہ" میں رنگ جاتا ہے بلکہ ساری دنیا کو اسی میں ڈبونا چاہتا ہے۔ اسی طرح ہر باطل رنگ کو مٹاتا چلا جاتا ہے اور زبان حال سے سناتا جاتا ہے:۔

رسم قلندری بیار، سد سکندری شکن   رسم کلیم تازہ کن، رونق ساحری شکن (جاوید نامہ)

غرض قلندر کی ایک انوکھی شان ہوتی ہے۔ کہ خرقہ پوش ہونے کے باوجود بادشاہوں سے خراج وصول کرتا ہے

بڑی بڑی سلطنتیں اس مردِ حق کی ہیبت سے کانپنے لگتی ہیں، بے سرو سامان ہونے کے باوجود آسمانوں پر کمندیں پھینکتا ہے، اس کے دلِ مومن میں زمان و مکان کے تمام تعینات گم ہوجاتے ہیں، اس کی نگاہ حقیقت شناس دنیا کے ہر ذرہ میں معشوقِ حقیقی کی ایک ایک ادا کو دیکھتی اور پہچانتی ہے۔ بزم کے قلندر کو دیکھو تو جمال ہی جمال ہے لیکن اسی کو "رزم" میں دیکھو تو سراپا جلال دکھائی دیتا ہے اسی نرالی آن بان کو اقبال کی زبانی سُنیے:۔

قلندراں کہ براہِ تو سخت می کوشند | زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند | بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
دریں جہاں کہ جمالے تو جلوہ ہا دارد | ز فرق تا بقدم دیدہ و دل و گوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروز رزم، خود آگاہ و تن فراموشند (اقبال نامہ)

یہ ہے اسلامی قلندر کی شان! کہاں یہ بندۂ حُر اور کہاں وہ بندۂ مجبور جو بارگاہِ حق سے دھتکارا گیا، جس کے ہاتھ مال سے ناآشنا اور جس کا دل نور سے بے بہرہ۔ نہ بادشاہی اس کے مال و دولت پر رشک کر سکے نہ شیطان ہی کو اس کا نور سلب کرنے کی فکر ہے جس کا شیخ گو جنیدؒ و بایزیدؒ کی باتیں سنائے لیکن جس کے قلب و نظر افرنگ زدہ ہو چکے ہوں:۔

بندۂ رد کردۂ مولاست او | مفلس و قلاش و بے پرواست او
نہ بکف مالے کہ سلطانے برد | نہ بدل نورے کہ شیطانے برد
شیخ او لردِ فرنگی را مرید | گرچہ گوید از مقامِ بایزید (پس چہ باید کرد)

ہے کوئی نسبت ایک اسلامی قلندر اور مغرب زدہ پیر یا عجمی راہب میں؟ ایک ہیں آفاق گم اور دوسرا آفاق میں مقید۔ فقط

(غلام محمد بی۔ اے دشتیاری)

نہ جانے مسلماں کو کیا ہو گیا ہے

(از جناب سید مرتضیٰ جعفری صاحب)

نہ جانے مسلمان کو کیا ہو گیا ہے
خدا کا پجاری بتوں میں گھرا ہے
نہ پاس نبی ہے نہ خوف خدا ہے
قرآن مبیں طاق میں رکھ دیا ہے

خدا کے لئے اب تو دیکھ اپنی حالت
مسلماں ہے تو رہ مسلمان کی صورت

خدا کا اگر خوف ہے دل میں تیرے
تو ڈرنا عبث ہے ترا ماسوا سے
تجھے یاد شاید نہیں اپنے وعدے
مگر تو نے سودا کیا تھا خدا سے

وہی جس میں کہ زندگی بیچدی تھی!
عوض جس کے پائی تھی مولا کی مرضی!

تجھے یاد روز ازل کا سبق تھا
زمانہ کا منہ تیری ہیبت سے فق تھا
عمل تیرا قرآن کا اک ورق تھا
تو تھا ساتھ حق کے ترے ساتھ حق تھا

نہ اپنی تھی تجھ کو نہ دنیا کی پروا
اگر تھی تو تھی صرف عقبیٰ کی پروا

اکل تیرا ازبس کہ نانِ جویں تھا   ن کہ محرک بعضو تشنہ
مگر ہاتھ سیف خدا کا امیں تھا
ترے سامنے کار ا تمامِ دیں تھا
ترا عزم بالجزم گردوں نشیں تھا

غرض تو نے ہر قصرِ باطل کو توڑا
نہ قیصر کو چھوڑا نہ کسریٰ کو چھوڑا

فضائے دو عالم پہ چھا جانے والے
زمانے سے توحید منوانے والے
لقائے محمدؐ پہ مٹ جانے والے
اخوت زمانے میں پھیلانے والے

پھر اک بار قرآن لیکر نکل آ
لقائے محمدؐ پہ قربان ہو جا

یہ کیا فرقہ بندی یہ کیا وطنیت ہے
ہوس جاہ کی غیر کی منقبت ہے
مسلمان ہیں بھائی وطن شش جہت ہے
کمائی تری توشۂ آخرت ہے

مسلماں کو ہے دین و ایماں سے مطلب
خدا سے محمدؐ سے قرآں سے مطلب

شاعر سے

(از مرزا عزیز لکھنانی)

سخن کی ہوتی جاتی ہے فضا اور — بدل کر تو بھی ہو جا ہمنوا اور
بڑی مشکل سے کروٹ اُس نے بدلی — خدا را اب نہ ملت کو سُلا اور
چلا ہے دور پیغامِ عمل کا — غزل خوانی ہی میں ڈوبا نہ جا اور

کئی شعبے ہیں اشغالِ سخن کے — قصیدہ اور غزل کے ماسوا اور
تجھے دولت سخن کی جس نے بخشی — سُنے جا اُس کی تعریف و ثنا اور
وہی ہے جس نے حسن و عشق بخشے — تو ہے کون اُس سے اچھا دلربا اور
یہ میں نے کہہ دیا کیا؟ اُس سے اچھا — نہیں، کوئی نہیں اُس کے سوا اور
وہ جانِ حسن و خوبی ہے وہی ہے — کوئی ہوگا، نہ اب ہے اور نہ تھا اور

ثنا لکھ پھر حبیبِ کبریا کی — ہے شغلِ شاعر اچھا اس سے کیا اور
سُنا، دیکھا، نہ پایا کامل ایسا — خدا کے عاشقوں کا رہنما اور
نمایاں اُس کی سیرت کر جہاں میں — نہیں اُس کے سوا شمس الہدیٰ اور
پھر اُس کے دوستوں کے کارنامے — بیاں کر، کیا ہے اچھا مشغلہ اور
کہیں صوفی کو لا خلوت سے باہر — کہیں مُلا کو غفلت سے جگا اور
سبق دے ایک ہو جانے کا ہم کو — نہیں کام اس سے بڑھ کر وقت کا اور
غرض اتنے ضروری کام ہیں یہ — کہ چھوڑا چاہیئے ہر مشغلہ اور
عزیز اشعار ہی لکھو جو فی الحال — نہیں ہے دردِ ملت کی دوا اور

ہندی نوجواں سے

نئے جہاں کے لئے کر مرے جواں تدبیر
بدلنے والی ہے تاریخ ہند کی تحریر
چڑھا ہی آتا ہے دشمن لئے ہوئے شمشیر
اٹھا لے تیر و کماں تو بھی کر نہ کچھ تاخیر

جہاں میں بس انہیں قوموں کا بول بالا ہے
جنہیں وطن کی محبت میں سب گوارا ہے

نیا نظام نئی صبح و شام پیدا کر
وطن پہ مٹ کے بقائے دوام پیدا کر

جہاں کو بخش نئے سر سے آرزوئے حیات
بڑوں کا نام ہو جس سے وہ نام پیدا کر

خاص ——————— کامل جونپوری

گیت

اس جگ کی ہر بات نرالی اور انوکھی ریت
جیت کو کتنے ہار ہیں پیارے ہار کو کتنے جیت

ادلے بدلے کی دنیا میں ادلے بدلے کا بیوپار
مطلب کے سب سنگی ساتھی مطلب کے سب میت

اس پاپی دنیا والوں سے میرا اتنا کہنا ہے
مفت میں اپنی جان گنوانی ہو تو کیجئے پیت

وقت برا جو آن پڑا ہے میرے بھائی کیا چنتا ہے
بیت ہی جائیں گے یہ دن بھی جیسے گئے سب بیت

میں نے اپنی رام کہانی جگ کو سنائی ہے کامل
چاہے کوئی رونا سمجھے اس کو چاہے گیت

کامل جونپوری

دو آتشہ

سر اقبال رحمہ اللہ

۱ خود را کنم سجودے دیر و حرم نمانده
ایں در عرب نمانده آں در عجم نمانده

۲ در برگِ لالہ و گل آں رنگ و نم نمانده
در نالہ ہائے مرغاں آں زیر و بم نمانده

۳ در کارگاہِ گیتی نقشِ نوی نہ بینم
شاید کہ نقشِ دیگر اندر عدم نمانده

۴ سیارہ ہائے گردوں بے ذوقِ انقلابے
شاید کہ روز و شب را توفیقِ رم نمانده

۵ بے منزل آرمیدند پا از طلب کشیدند
شاید کہ خاکیاں را در سینہ دم نمانده

۶ یا در بیاضِ امکاں یک برگِ سادہ نیست
یا خامۂ قضا را تابِ رقم نمانده

زبورِ عجم

(ترجمہ اردو)

میں خود کو کرتا ہوں سجدہ نہیں دیر و حرم باقی
حرم اندر عرب باقی نہ دیر اندر عجم باقی

نہیں باغِ جہاں کے برگ و گل میں رنگ و نم باقی
نہ مرغانِ چمن کے چہچہوں میں زیر و بم باقی!

جہاں کے کارخانے میں نظر تازہ نہیں آتا
نہیں شاید کوئی نقشِ دگر اندر عدم باقی

نہ ذوقِ انقلاب اندر ستارہ ہائے افلاکی
نہ روز و شب کی گردش میں تحمل بیش و کم باقی

طلب اُن میں نہیں باقی وہ بے منزل ہیں آسودہ
نہیں سینہ میں شاید خاکیوں کے کوئی دم باقی

نہیں ہے برگِ سادہ یا بیاضِ دہرِ امکاں میں
قضا کی کلک میں یا اب نہیں تابِ رقم باقی

(مولوی) غلام مصطفیٰ بی اے ایل ایل بی وکیل
(مزنگ لاہور)

قطعۂ تاریخ وفات علامہ سر اقبال رحمۃ اللہ علیہ

سوئے جنت ڈاکٹر اقبال رفت — در جوارِ رحمتِ متعال رفت
رفت از ما شاعرِ معجز بیاں — نازشِ اسلامیانِ حال رفت
سوز و سازِ زندگی آموختہ — قوم را و خود باستعجال رفت
ماند رنج و غم بعالم حسرتا — باغِ ملت از خزاں پامال رفت
گفت ہاتف بہرِ تاریخِ وصال
صاحبِ آفاق سر اقبال رفت

۱۳۵۷ھ

وله

از جہاں علامہ سر اقبال رفت — آفتابِ علم و حکمت در نہفت
قوم را رمزِ حیات آموختہ — صد ہزاراں درِّ معنی ہا بسفت
آں ادیب و فلسفی و شاعرے — ای دریغا در لحد خاموش خفت
از برائے سالِ ترحیلش خرد
ارتحالِ شاعرِ علامہ گفت

۱۳۵۷ھ

(مولوی غلام مصطفیٰ بی اے ایل ایل بی گیلانی)
(رکن مسلم لیگ)

"دینِ حق کی ہمہ گیری"

(ابوالبیان حماد)

معراجِ دینِ فطرت ہے نہ ایرانی نہ افغانی
اسے سونپی گئی ہے سارے عالم کی نگہبانی

وجود اُن کا نہ ہو کیوں باعثِ صد ننگ انسانی
نہیں ہیں آج جو وابستۂ دامانِ قرآنی

ہزاروں سال تک انسانیت کو خوں رلائیگی
متاعِ بے بہائے نفسِ انساں کی یہ ارزانی

عبث ہے جستجو امن و اماں کی دینِ باطل میں
کبھی تاریکیوں میں مل نہیں سکتی درخشانی

تماشائے جمالِ یار موسیٰ کس طرح کرتے
کہ اکثر ہوش کھو دیتی ہے جلووں کی فراوانی

سپہرِ اوج کا وہ بدرِ کامل ہو نہیں سکتا
نہ ہو جب تک اسیرِ چاہ و زنداں ماہِ کنعانی

نظامِ مملکت ہو یا نشاطِ خانقاہی ہو
جو روحِ دیں سے خالی ہو تو ہے یکسر ہوس رانی

کوئی ملت جہاں میں سربلندی پا نہیں سکتی
نہ دے جب تک ثبوتِ جذبۂ ایثار و قربانی

ملی ہے اتحادِ باہمی سے زندگی سب کو
تباہی خیز ہے اجزائے ملت کی پریشانی

پہنچکر عرش پر بھی آہ پھر خاموش لوٹ آئی
کہ قربِ دوست سے کچھ اور بڑھ جاتی ہے حیرانی

یہاں کانٹوں پہ چلنا ہے یہاں شعلوں میں جلنا ہے
تجھے اے دل رہِ حق میں ہے کیوں فکرِ تن آسانی

اسی باعث بُرا کہتے رہے اہلِ جہاں مجھ کو
کہ میں نے فاش کر ڈالے ہیں اسرارِ مسلمانی

سُنائیں کس طرح اے ہم صفیرانِ چمن تم کو
کہ اپنی داستانِ دردِ دل بے حد ہے طولانی

نہ جانے ان دنوں حماد کس عالم میں رہتا ہے
کہ دن اُس کے جنوں پرور ہیں راتیں اس کی دیوانی

اقبال رح

(از بشر افغانی)

جہانِ شاعری میں نُور برساتا ہُوا آیا !
فضائے حکمت و الہام پر چھاتا ہُوا آیا

بڑا احسان ہے اُردو پہ اس کے نطقِ شیریں کا
وہ فنِ شعر کی تکمیل فرماتا ہُوا آیا

مضامیں کی بہار رکھتا ہُوا اعلیٰ تخیل پر
نئی راہیں ادب کی سامنے لاتا ہُوا آیا

رضائے مردِ مومن کو کیا تقدیر کا ہمسر
فضاؤں میں خودی کے زمزمے گاتا ہُوا آیا

مسلماں کھو چکے تھے سوزِ دل تعلیمِ مغرب سے
انہیں پھر آتشِ رومیؒ سے گرماتا ہُوا آیا

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"
عمل کی خوبیاں ملت کو سمجھاتا ہُوا آیا

یقین کا ذوقِ زنجیرِ غلامی کاٹ دیتا ہے
غلاموں کو ہشی کی راہ دکھلاتا ہُوا آیا

دیارِ ہند میں گاتا ہُوا توحید کے نغمے
وہ مُلا کے صنم خانوں کو ٹھکراتا ہُوا آیا

ضرورت مردِ مومن کو نہیں اسبابِ دنیا کی
ہمیں فقر و غنا کے راز سمجھاتا ہُوا آیا

کہا اس نے زمانے سے مسلماں مٹ نہیں سکتا
ترانے سطوتِ اسلام کے گاتا ہُوا آیا

دیا "بانگِ درا" سے روح کو پیغامِ بیداری
وہ ملت کی گراں خوابی کا غم کھاتا ہُوا آیا

ازل میں دے دیا تھا "بالِ جبریلؑ" اس کو خالق نے
سحابِ لطف بن کر ہند پر چھاتا ہُوا آیا

بنا "ضربِ کلیمؑ" اس کے قلم سے حرف جو نکلا
وہ ہر فرعون کو "اعجاز" دکھلاتا ہُوا آیا

فرنگی کو دیا پیغام نوا یانِ مشرق سے
گلِ اسلام سے عالم کو مہکاتا ہُوا آیا

بنا جس علم کی ڈالی گئی تھی بزمِ یثرب میں
اسی تعلیم کو اقبالؒ پھیلاتا ہُوا آیا

ایوڈ ور ریاست بھوپال

علمائے کرام کا مستقبل ۔ علما کو کیا کرنا چاہئیے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام ۔ (ایک نقشۂ موازنہ) ۔ ۔ ۔ ۔ ۸ر

انتخاب غالب ۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب ۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندستانی مسلمان — سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات ۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال ۱۲ر

المنبہات — عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف ۔ ۴ر

اسلامی پارٹی کا آئین — مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے ۔ از مولانا عزیز ہندی ۔ ۳ر

ہیگل کا فلسفہ (فلسفۂ اضداد کی تشریح) ۔ از مولانا عزیز ہندی ۔ ۱۴ر

ہندوستانی مسلمان کا نصب العین کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۴ر

القول الجمیل (عربی) ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ ۴ر

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ۔ ۱۲ر

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ابوالقاسم رفیق دلاوری ۔ ۱۲ر

ملنے کا پتہ
اقبال اکیڈمی
۳۵۔ (الف) سرکلر روڈ، بیرون موچی گیٹ، لاہور

سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی

ہمارے ہندوستانی مسلمان—ولیم ہنٹر، ال-سی-ایس ...	۲۰/۲/-
اقبال پر ایک نظر—مرتبہ سید محمد شاہ، ایم-اے ...	۲/۱۲/-
تعلیمات اقبال—پروفیسر سلیم چشتی، بی-اے ...	۱/۸/-
شرح اسرار خودی—پروفیسر سلیم چشتی، بی-اے ...	۱/۸/-
اقبال اور پیام حریت—پروفیسر سلیم چشتی، بی-اے ...	-/۸/-
اسلامی پارٹی کا آئین—مولانا عزیز ہندی	۱/۸/-
ہیگل کا فلسفہ—مولانا عزیز ہندی	-/۴/-
اقبال کا تصور زمان و مکان—ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، ایم-اے	۱/۱۰/-
موت وحیات اقبال کے کلام میں—ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی	-/۳/-
تعلیم کا مسئلہ—ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، ایم-اے، پی-ایچ-ڈی	۱/۸/-
اقبال کے چند جواہر ریزے—خواجہ عبدالحمید، ایم-اے ...	-/۱۰/-
اشتراکیت اور اسلام—مولوی محمد مظہرالدین صدیقی، بی-اے	-/۶/-
محمد عبدہ—از چارلس ایڈمز مترجمہ مولوی مظہر الدین صدیقی	۱/-
علمائے کرام کا مستقبل—مولوی محمد مظہرالدین صدیقی ...	-/۸/-
حقیقت نفاق—مولانا صدرالدین اصلاحی ...	۱/۸/-
افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی—مولانا صدرالدین اصلاحی	۱/۸/-
معرکہ اسلام و جاہلیت از مولانا صدرالدین اصلاحی ...	۱/۸/-
دربار رسول کے فیصلے مترجمہ ابوالعرفان حکیم محمد عبد الرشید	۳/-/-
اقبال کا تصور خودی ڈاکٹر سید عابد حسین، ایم-اے، پی-ایچ-ڈی	-/۸/-
المنبہات (عربی)—حافظ ابن الحجر العسقلانی ...	۱/-
القول الجمیل (عربی)—حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ...	۱/۸/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں—از مودودی صاحب ...	۱/۸/-
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	۱/-/-
انتخاب غالب—از غالب	-/۶/-
روح اقبال—از ڈاکٹر یوسف حسین خان ایم-اے، پی-ایچ-ڈی	۵/۱۲/-
فلسفہ عجم—از ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ	۳/۲/-
فکر اقبال—مجموعہ مضامین	۳/-/-
آثار اقبال	۳/۱۲/-
کتب سماوی پر ایک نظر—از جناب ذوقی شاہ صاحب ...	۲/۱۲/-

اقبال اکیڈمی

۴-الف سرکلر روڈ، بیرون موچی دروازہ، لاہور

مطبوعہ ... [illegible]

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحبان محکمہ تعلیم برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ سندھ، ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

۱۹۴۵ء ۱۲ جلد ۱۰

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
اقبال

ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ
سید محمد شاہ ایم۔اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ۔ ۲/۸

شرح اسرارِ خودی۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے ۔ ۳/۸

تعلیماتِ اقبال۔ " " " " ۔ ۳/۸

اقبال اور پیامِ حریت۔ " " " ۔ ۱/۸

اقبال کا تصورِ زمان و مکان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۰/

موت و حیات اقبال کے کلام میں " " " ۔ ۱/۴

تعلیم کا مسئلہ۔ " " " ۔ ۳/۸

اقبال کے چند جواہر ریزے۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید ایم اے ۔ ۱۰/

یادِ اقبال۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار۔ ۳/۸

حقیقتِ نفاق۔ مرتبہ مولانا صدر الدین اصلاحی۔ ۳/۸

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ " " " ۔ ۳/۸

اسلام اور وطنیت۔ " " " ۔ ۳/۸

معرکۂ اسلام و جاہلیت۔ " " " ۔ ۳/۸

محمد عبدہٗ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات ۔ ۱۲/

اقبال اکیڈمی
۵۴۔ الف سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

ماہنامہ

پیغام حق

ظفر منزل - تاج پورہ - لاہور

عدد ۵	مئی ۱۹۴۵ء	جلد ۱۰

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ میں طبع کراکر دفتر رسالہ پیغام حق
ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

لاہور میں ایک بہت وسیع پیمانے پر کُل ہند اُردو کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں کی جارہی ہیں، جو ہر لحاظ سے مستحق تحسین و ستائش ہے۔ زبان کے سوال کو قومی تعمیر و ترقی کے معاملے میں جو اہمیت حاصل ہے، اُس کے پیشِ نظر اُردو کے بہی خواہوں کی ہر کوشش، دراصل تعمیرِ ملت ہی کی کوششوں کا دوسرا نام ہے۔ کوئی قوم اُس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتی جب تک اُس کا دماغ آزاد نہ ہو، اُس کا ذہن آزاد نہ ہو اور اُس کا فکر آزاد نہ ہو ——— اور ذہن و فکر کی آزادی کی سب سے پہلی سیڑھی یہ ہے کہ آدمی غیروں کی بدیسی زبان کا محتاج نہ ہو بلکہ اپنے ملک و وطن کی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ اس لیئے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کی غلامی کا آغاز دور، انگریزوں کی مسلح طاقت کے غلبے کی تاریخ سے شروع نہیں ہوتا، بلکہ اُس تاریخ سے شروع ہوتا ہے جب لارڈ میکالے کی اسکیم نے ہمارے منہ سے ہماری زبان اور ہمارے ذہن و دماغ سے ہمارے افکار و خیالات چھین کر ہمیں انگریزیت کے آگے سرنگوں کردیا۔ چنانچہ آج ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم خود اپنی زبان کو حقیر سمجھنے لگے ہیں اور ہمارے ہاں علم و فضل کا معیار اب یہ رہ گیا ہے کہ فلاں شخص انگریزی میں کتنی مہارت رکھتا ہے، حالانکہ یورپ کی اقوام کو اپنی زبان سے جو محبت ہوتی ہے اُس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ سان فرانسسکو کانفرنس میں فرانس، روس، امریکہ، چین اور بجز جنوبی امریکہ میں سے کسی ایک نے بھی دوسری قوم کی زبان میں بولنا پسند نہ کیا۔ چنانچہ جب تک اس کانفرنس میں ہر ایک کے لیئے اپنی اپنی زبان میں بولنے کا اصول تسلیم نہ کرلیا گیا، اس وقت تک اجلاس

ہی کاروائی کا آغاز نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں زبان کی اہمیت کی دوسری تازہ ترین مثال یہ ہے کہ جب امریکہ و برطانیہ کی فوجوں نے جرمنی پر قبضہ کیا تو جرمن عوام کے دماغ میں مغلوبیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ اعلان ہوا کہ تا حکم ثانی حکومت کی زبان انگریزی رہیگی۔ جرمنوں نے اس حکم کے خلاف بہت ہاتھ پاؤں مارے اور ہر ممکن کوشش سے اس ذلت و حقارت سے نجات حاصل کرنی چاہی مگر مغلوب و مفتوح ہونے کی وجہ سے اُن کی کوئی بات نہ سنی گئی۔

مزید براں جو لوگ یورپ سے واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ فرانس کا رہنے والا اگر انگریزی جانتا ہوگا، تب بھی اپنی تحریر و تقریر میں ہمیشہ فرانسیسی زبان ہی کو ترجیح دیگا۔ جرمنی اور فرانس کی سرحدیں بالکل ہی ملی ہوئی ہیں، لیکن قومی انفرادیت کے احساس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ملینگے جو ایک دوسرے کی زبان میں عالمانہ مہارت رکھنے کی کوشش کرتے ہوں۔

لیکن اسکے مقابلے میں ہندوستان کی بدنصیبی کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم نے اپنے قومی فخر و شان کا معیار ہی اُلٹ دیا ہے۔ مجبوری کی بات تو دوسری ہے، لیکن بغیر کسی مجبوری کے بھی آج ہم انگریزیت کی نقالی پر فخر کرتے ہیں اور اپنی زبان میں مہارت حاصل کرنے کو خود اپنی ہی نگاہ میں اپنے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ خدا مغفرت کرے علامہ اقبال کی کیا خوب فرما گئے ہیں۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

غور کیجیے کہ جب ہم اپنی زبان کو چھوڑ کر انگریزی بولتے ہیں، انگریزی لکھتے ہیں یا انگریزی پڑھتے ہیں تو ہم میں کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا احساس یہی ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے مقابلے میں انگریزی بولنے والی قوم بہت بلند و برتر ہے۔ بس یہی احساس دراصل غلامی کی جڑ ہے۔ آدمی طاقت سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا جتنا دوسرے کے احساس برتری سے مرعوب ہو کر مغلوب ہو جاتا ہے۔ بدنصیبی سے آج یہی ذہنی مرعوبیت ہندوستان پر چھائی ہوئی ہے، جو دراصل سب سے بڑی

مرعوبیت ہے، اسلئے جو لوگ ہندوستان کو آزاد و سربلند دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں کونسل کی نشستوں یا فرقہ وارانہ سمجھوتوں سے زیادہ اس بات پر زور دینا چاہیئے کہ ہم میں خود اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھنے کا جو جذبہ پیدا ہو گیا ہے وہ ختم ہو، اور ہم اپنی زبان پر اپنی تاریخ و روایات پر، اپنی تہذیب و معاشرت پر اور اپنے آداب بود و ماند پر اُسی طرح فخر کرنا سیکھیں جس طرح ایک آزاد قوم کا فرد کرتا ہے۔ پھر اس فخر کے لئے کسی ظاہری ٹیپ ٹاپ کی ضرورت نہیں بلکہ موجودہ بدحالی و بے سروسامانی میں بھی اگر ہم اپنے دل میں فخر و خودداری کی یہ شمع روشن کر لیں، تو رفتہ رفتہ ہمارے قومی اُفق کی ساری تاریکیاں روشنی میں تبدیل ہو جائینگی یہی وہ نصیحت ہے، جو اقبال مرحوم نے ایک بے سروسامان دہقان کو ان الفاظ میں کی ہے۔

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ　　اُس بندے کی دہقانی پر، سلطانی قربان!

اپنی خودی پہچان، او غافل افغان!

غرض ان اسباب کی بنا پر ہم اردو کی توسیع و اشاعت کی کوشش کو محض لسانی یا ادبی خدمت نہیں سمجھتے، بلکہ اُسے ایک بہت ٹھوس اور بنیادی قسم کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی خدمت قرار دیتے ہیں۔ اور اسی بنا پر ہم مذکورہ بالا اُردو کانفرنس منعقد کرنیوالوں کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اُن کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہونگی۔

لیکن اس سلسلے میں ایک چیز ہے جسے ہم پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں اُردو کے سلسلے میں سب سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ یہ کس کی زبان ہے اور کیسی زبان ہے۔ آج ہندو مسلم اختلافات کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہندو دوستوں کی طرف سے علانیہ یہ کہا جا رہا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ہندوؤں کی زبان ہندی ہے۔ پھر چونکہ ہندوستان میں اکثریت ہمارے ہندو دوستوں ہی کی ہے، اسلئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی اس بے بنیاد بات کو وہ منوا لیں گے یعنی ہندوستان سے اُردو کی جڑ بنیاد کھود کر اُسکی جگہ "شدھ ہندی" یا "سمپورنا نندی ہندی" کا بے ڈھنگا درخت نصب کر دینگے۔

ایسی صورت میں قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کے حامی ——— جن میں مسلمانوں کے علاوہ سر سپرو اور پنڈت کیفی کی قسم کے بہت سے نیک دل ہندو بھی شامل ہیں ——— بابو پرشوتم داس ٹنڈن جیسے تنگدل افراد کی کوششوں کی مدافعت میں کیا کر رہے ہیں ؟

زیادہ واضح لفظوں میں سوال کی نوعیت کو یوں سمجھئے کہ ——— کیا اُردو میں علمی ادبی کتابیں لکھنے، رسالے جاری کرنے اور کانفرنسیں منعقد کرکے تجاویز اور قراردادیں پاس کر دینے سے اُردو محفوظ ہو سکے گی یا اسکے لئے اس سے آگے بڑھکر کسی اور کوشش کی بھی ضرورت ہے ؟

اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ کسی زبان کے لئے کتابیں، رسالے اور جلسے یقیناً ضروری ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگ اس زبان کو اپنی زبان سمجھکر بولتے بھی ہوں۔ لیکن اگر کسی زبان کو بولنے والے نہ ہوں، تو پھر آپ ہی غور کیجئے کہ صرف رسالے، صرف کتابیں یا صرف جلسے کیا کر سکتے ہیں ؟

اب آیئے اس نقطۂ نظر سے اُردو کی حالت پر غور کریں۔ عام ہندوؤں کی موجودہ تنگ نظری کو دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سپرو اور پنڈت کیفی کی قسم کے لوگ، اب یادگار پارینہ ہوتے جا رہے ہیں اسلئے بظاہر اُردو کا مستقبل یہ نظر آتا ہے کہ جن علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی، وہاں سے اُردو کو جلاوطن ہونا پڑیگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یو۔پی، سی۔پی، بہار اور راجپوتانے میں اُردو کے گلے پر ٹنڈن جی کند چھری چلائے بغیر نہ رہینگے۔ اس چیز کے آثار آج بھی نظر آ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یو۔پی میں عام لوگوں کی زبان اُردو ہے، مگر چونکہ ہندو اب اس زبان کو چھوڑتے جا رہے ہیں، اسلئے اُردو کے رسائل و اخبارات اور کتابوں کی اشاعت وہاں ہندی کے مقابلے میں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اسکے مقابلے میں اُردو کی جو کچھ خدمت ہو رہی ہے، وہ پنجاب میں ہو رہی ہے۔ لاہور سے ہر سال اُردو کا جو لٹریچر شائع ہوتا ہے۔ اُسکا دسواں حصہ بھی یو۔پی

اور بہار سے نہیں نکلتا۔ اور جو کچھ نکلتا بھی ہے اُسکے نوّے فیصدی خریدار یو۔پی سے نہیں پنجاب سے ملتے ہیں۔ پنجاب آجکل اُردو لٹریچر کا سب سے بڑا مارکیٹ ہے۔ اسکے بعد ریاست حیدرآباد کا نمبر ہے۔ یعنی اگر پنجاب و حیدرآباد کو ہندوستان کے نقشے سے خارج کر دیا جائے تو اُردو رسائل واخبارات کی اشاعت برائے نام ہی رہ جائیگی۔

اُردو کے ساتھ پنجاب و حیدرآباد کی یہ محبت و عقیدت ہر لحاظ سے مستحقِ تحسین و ستائش ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا صرف اس سے کام چل جائیگا ۔۔۔۔ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ زبان کی ترقی کی بنیاد رسائل و اخبارات سے پہلے اِسی چیز پر قائم ہوتی ہے کہ لوگ اُسے اپنی زبان سمجھکر بولتے بھی ہیں یا نہیں ۔۔۔ اسلئے اُردو کے حامیوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کانفرنسوں اور کتابوں سے زیادہ اس بات کی دیکھ بھال کریں کہ اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس لحاظ سے قدرتاً پنجاب کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ یعنی اگر پنجاب کے غیور باشندے واقعی اُردو سے محبت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی جیسے ہندوؤں کی طرف سے اُردو کو بدیسی زبان قرار دیکر ختم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، اُسکا صحیح معنی میں مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلی ضرورت اسکی ہے کہ وہ اُس زبان کو یو۔پی یا بہار کی زبان سمجھنا چھوڑ دیں بلکہ اسے اپنی زبان سمجھیں۔ یعنی اس میں کتابیں لکھنے ہی کی کوشش نہ کریں بلکہ اسے روزمرہ کی بول چال میں بولنا شروع کریں۔

عام طور سے پنجاب میں یہ دستور ہے کہ ہم لکھتے تو ہیں اُردو لیکن ہمارے گھروں میں، دوستوں کی مجلسوں اور احباب کی محفلوں میں عموماً پنجابی بولی جاتی ہے۔ یہ چیز اگر باقی رہتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُردو کو اپنی زبان نہیں سمجھتے۔ اور جو زبان ہماری اپنی زبان نہ ہوگی، اُسے ترقی دینے کی کوشش میں ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بنابریں ہم مذکورہ بالا اُردو کانفرنس کے بانیوں سے سب سے پہلی گذارش یہ کریں گے کہ وہ پنجاب

میں اُردو کو عام لوگوں کی زبان بنانے کی کوشش کریں۔ اس کوشش کا سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ عام طور سے اس امر کی تبلیغ کی جائے کہ گھروں میں پورے بالالتزام اُردو میں بات چیت ہو تاکہ وہ اُردو کو مادری زبان کی حیثیت سے سیکھ سکیں اور آگے چل کر انہیں اُسکے بولنے میں تکلیف نہ ہو۔ اس وقت جو صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ بہت اچھی اُردو لکھنے والا پنجابی بھی اُردو بولنے میں تکلیف محسوس کرتا ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ اُسکے گھر میں روزمرہ جس زبان سے اُسے سابقہ پڑتا ہے وہ اُردو نہیں ہوتی۔

زبان کی یہ دوئی —— یعنی ہم لکھیں تو کوئی اور زبان میں اور بولیں کوئی اور —— ہماری ذہنی ترقی کے لئے سخت مضر ہے۔ اگر اُردو کو ہم گھروں میں نہیں بولتے تو اسکی حیثیت ایک بدیسی زبان کی سی ہو جاتی ہے اور پھر اس میں اور انگریزی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسلئے اگر ہم اپنی ذہنی ترقی کی رفتار کو روکنا نہیں چاہتے تو ہمیں دو باتوں میں سے ایک طے کرنی چاہیئے۔ یا تو ہم اُردو کو بالکل چھوڑ دیں اور اُسی زبان کو اپنائیں جسے ہم گھروں میں بولتے ہیں، اور یا پھر اُردو کو گھروں میں بھی بولیں اور کم از کم ایسی کوشش کریں کہ ہماری آئندہ نسلیں اُردو کو اپنی مادری زبان سمجھیں اور اُسے بولنے میں یہ محسوس نہ کریں کہ وہ اپنی نہیں کسی غیر کی زبان بول رہے ہیں۔

پنجاب کی اُردو کانفرنس ہو یا دہلی کی کل ہند انجمن ترقی اُردو، سب کے لئے پہلی غور طلب چیز یہ ہے کہ اُردو کا گھر متعین کریں لیکن اگر پنجاب کو اُردو کا گھر آپ نہیں بنا سکتے تو پھر اس زبان کی خدمت کا خیال بھی چھوڑ دیجئے۔ اسلئے کہ یو۔پی اور بہار کے اسّی نوّے فیصدی ہندوؤں سے تو یہ توقع فضول ہے کہ اب وہ اسے وہاں جینے دینگے۔ پھر اگر صورت حال یہ ہو جائے کہ جو زبان جہاں بولی جاتی ہے وہاں اُسکی موت یقینی ہو اور جہاں لکھی جاتی ہے، وہاں اُسکے بولنے والے نہ ہوں، تو ایسی زبان کے لئے کانفرنسیں کر کے فضول وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ غرض اس مختصر سی گزارش سے ہمارا مطلب

صرف یہ ہے کہ اب ترقی اُردو کے حامیوں کو اپنا نقطۂ نگاہ بدل دینا چاہیئے۔ اب اُنہیں صرف لٹریچر کی اشاعت کیطرف اپنی توجہ مرکوز نہ رکھنی چاہیے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ پنجاب کی قسم جن علاقوں میں اسے ادبی زبان قرار دیا گیا ہے، وہاں اُسے مادری زبان بھی بنایا جائے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ آج ایکدم نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ہم میں سے ہر ایک آیندہ نسل کے بچوں سے اُردو میں بات چیت کرنیکا التزام کرے تو بیس برس کے بعد نقشہ بالکل پلٹا ہوا ہوگا۔ آج پنجابیوں میں اُردو لکھنے کے باوجود ایک قسم کا احساس کمتری صرف اس لئے پایا جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبان اُنکی زبان نہیں، وہ اس پر اپنا حق نہیں سمجھتے ہیں، اور اس پر زور نہیں رکھتے، وہ قدم قدم پر "اہل زبان" کی سند ڈھونڈھتے ہیں۔ لیکن زبان کی ترقی سے قطع نظر، پنجابی غیرت و خودداری کی نظر سے بھی ہم اس محتاجی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اُردو کے "اہلِ زبان" نہیں ہیں، تو پھر ہم اُردو میں کیوں لکھیں اور کیوں بولیں؟ لیکن اگر ہم "اہلِ زبان" ہیں تو پھر ہم اپنے گھروں میں . . . . . اُردو کیوں (نہ) بولیں۔ آج بہت سے محاورے ایسے ہیں جو پنجاب میں بولے جاتے ہیں اور جنہیں اُردو کے موجودہ قواعد کی رو سے غلط کہا جاتا ہے۔ مثلاً مجھے سمجھ نہیں آتی۔ بجائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے وہاں جانا ہے۔ بجائے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔ اُس نے بڑا امنایا۔ بجائے۔ اُس نے بڑا مانا۔ میں اُس کو ملا۔ بجائے۔ میں اُس سے ملا۔ یا گال، اخبار اور تار وغیرہ کی قسم الفاظ کی جمع گالیں، اخباریں اور تاریں ـــــ وغیرہ وغیرہ

لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ یا تو پنجاب میں اُردو کو مادری زبان کی حیثیت سے بولا جانے لگے تاکہ خود ہمارے محاورے بھی دہلی اور لکھنؤ کی طرح سند ہو جائیں اور جو کچھ ہم بولتے ہیں اُس پر شرمندہ ہونے کی ضرورت ہمیں پیش نہ آئے، اور یا پھر ہم ایسی زبان میں لکھنا پڑھنا سب کچھ چھوڑ دیں۔ جسکی نسبت قدم قدم پر ہمیں اپنی بیکسی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

روح ۔ خدا ۔ اور آخرت

کیا انکا کوئی وجود ہے؟

(از ابوسعید بزمی)

یہ ایک بہت پرانا قول ہے کہ کائنات میں "مادہ" کے سوا اور کچھ نہیں۔ مادے ہی کی مختلف کیمیاوی امتزاجوں کا نام "ذی روح جسم" ہے اور کسی کیمیاوی امتزاج کے منتشر ہو جانے ہی کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بقول ہمارے ایک مشہور شاعر کے:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

پہلے فلسفیوں کی دسترس میں مادے کی مفرد یا بسیط شکلیں صرف چار تھیں جنھیں وہ "عنصر" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے چار عناصر ہی انکی رائے میں موجودات کے ہر جسم کی ترکیب میں شامل تھے اور ان عناصر کا ایک مخصوص قسم کے اعتدال کے ساتھ جمع ہو جانے ہی کا نام "زندگی" تھا۔

چار طبع مخالف بہم کرکش
چند روزے بوند باہم خوش

مادے کی مفرد یا بسیط شکل کو مذکورہ بالا چار عناصر میں محدود کر دینے کا تصور عرصے تک قائم رہا ہے لیکن پچھلی صدی میں سائنس نے جو نئی نئی تحقیقات کی ہیں، انھوں نے اس تصور کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

قدیم فلاسفہ پانی کو بسیط مانتے تھے لیکن آج کی تحقیق کی رو سے پانی بسیط نہیں مرکب ہے اور ہائیڈروجن اور آکسیجن کی دو گیسوں سے مل کر بنتا ہے۔ اسکے علاوہ جدید انکشافات نے بہت سے نئے بسیط عناصر بھی دریافت کئے ہیں جنکی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک اضافہ ہوتا رہیگا۔

سائنس کی ان تحقیقات نے "ذی روح جسم" کے ترکیب و امتزاج کے بارے میں بھی پرانے نظریئے کو بدل دیا ہے۔ آج علم الاغذیہ کا ماہر یہ نہیں مانتا کہ حیوانی جسم کی ترکیب سودا، صفرا، بلغم اور خون سے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، وہ بیسیوں مختلف اجزا کو اس "ترکیب جسمی" کا ذمے دار قرار دیتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی حکیم و فلسفی ایسا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ خود ان اجزاء کو اکٹھا کر کے، کوئی "ذی روح جسم" تیار کر سکتا ہے؟ اس کا جواب آج تک نفی میں ہی دیا جا رہا ہے۔ جس طرح عناصر کو چار کی تعداد میں محدود کر دینے والے فلاسفہ ان عناصر میں "جاندار اعتدال" پیدا کرنے کے قابل کبھی نہ ہو سکے تھے، اسی طرح آج کا ماہر سائنس بھی اس معاملے میں اپنی بے بسی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اگر زندگی فقط چند مفرد اجزاء کے امتزاج ہی کا نام ہے، تو جب ہم کو یہ مفرد اجزا معلوم ہو گئے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کا تناسب اور وزن کیا ہوتا ہے، تو پھر ہم خود ان کو باہم ملا کر ایک جسم حیوانی کیوں تیار نہیں کر سکتے؟ جب کسی جوارش، کسی معجون یا کسی خمیرے کے اجزاء ہمیں معلوم ہو جائیں اور ان اجزاء کے صحیح وزن کا علم بھی ہو جائے، تو ہم خود اس خمیرے یا معجون کو جب چاہیں بنا لیتے ہیں۔ پھر یہی صورت حیوانی جسم کے ساتھ کیوں نہیں ہوتی؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں: یا تو یہ کہ سائنس کے ماہروں نے ان اجسام کے اجزائے ترکیبی کی نسبت جو تحقیقات کی ہیں، وہ

ناقص ہیں، یعنی کچھ اجزاء اور ایسے باقی ہیں جنکا علم نہیں ہو سکا ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی جسم کو ذی روح بنانے کے لئے مادّی اجزاء کے علاوہ کسی اور "غیر مادّی جزو" کی ضرورت ہے۔

اوّل الذکر جواب کو ہمارا ماہر سائنس ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ کہتا ہے: آؤ اور میرے پاس کوئی جسم لاؤ، میں تمہیں خود تمہارے سامنے اُسکے اجزاء کی تحلیل کر کے ایک ایک جزو کو کھول کر رکھ دونگا جس کے بعد تمہیں یہ کہنے کی جرأت ہرگز نہ ہو سکے گی کہ اس جسم میں ان اجزاء کے سوا بھی کوئی جزو تھا۔ لیکن مشین کے کل پرزوں کو کھول کھول کے دکھا دینے والا یہ ماہر سائنس اس پر قادر نہیں ہے کہ ان اجزاء کو پھر سے جوڑ کر ویسی ہی مشین کھڑی کر کے رکھ دے۔ وہ یہ تو بتا دیتا ہے کہ ایک انسانی جسم میں لوہا، تانبا، سونا، چاندی اور کوئلے وغیرہ کے اجزاء کس کس مقدار میں ہوتے ہیں، لیکن اگر اسے آپ یہ اجزاء دیدیں تو وہ انہیں ملا کر کوئی انسانی جسم تیار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ اگر جسم انسانی میں، مادّی اجزاء کے سوا اور کوئی "غیر مادّی جزو" شامل نہیں ہے تو پھر ماہر سائنس بطور خود ان تمام اجزاء کو مرکب کر کے کوئی حیوانی جسم کیوں نہیں بنا سکتا؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ مادّے کے سوا کوئی اور وجود ایسا ضرور ہے جسے روح سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جسے قرآن کریم نے "امر ربی" کہا ہے۔

لیکن شاید ہمارے بعض اُس قسم کے مادّہ پرست دوستوں کے لئے مسئلے کی نوعیت ابھی بالکل صاف نہیں ہوئی۔ اسلئے آیئے ایک اور پہلو سے اس پر غور کریں —— آپ جانتے ہیں، ہر ذی روح میں ایک چیز ہوتی ہے جسے ارادہ کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جسے "احساس خودی" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اپنے وجود کے موجود ہونے کا احساس، یہ احساس کہ "میں ہوں" —— ایک چھوٹے سے چھوٹا کیڑا بھی یہ دونوں احساس رکھتا ہے۔ وہ ارادے کے

ساتھ کسی طرف حرکت کرتا ہے اور اپنے وجود کا احساس ہی اُسے ہر خطرے سے خود کو محفوظ کرنے کی
طرف ابھارتا ہے۔ آپ کسی کیڑے کو چھیڑ بیٹھئے، وہ بھاگے گا، کیوں؟ اسلئے کہ وہ اپنے وجود کو،
اپنے "میں" کو، اپنی "خودی" کو آپ کے حملے سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر آپ اُسے پکڑیں تو وہ تڑپے گا،
اور اگر کاٹ سکتا ہے تو کاٹے گا، کیوں؟ صرف اسلئے کہ اس طرح وہ آپکے حملے کا مقابلہ کرکے
اپنے "میں" کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ..... بتائیے یہ "ارادہ" اور یہ "میں" کہاں سے آیا؟ کیا وہ مادی اجزا
جن سے آپ ہر ذی روح جسم کو مرکب مانتے ہیں، اُن میں "ارادے" اور "میں" کا یہ عنصر پایا جاتا
تھا؟ اگر پایا جاتا تھا تو اس کا ثبوت کیا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک مٹی کا ذرہ یا لوہے کا ٹکڑا
نہ خطرے سے بھاگتا ہے اور نہ غذا کی طرف دوڑتا ہے؟ پھر یہ کیا بات ہے کہ مادی اجزا
میں تو ارادے اور خودی کی کیفیت تھی نہ تھی لیکن جب ان سے مرکب ہو کر ایک حیوانی جسم بنا تو
اس میں یہ چیز پیدا ہو گئی؟ اتنی بات ایک معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی مرکب چیز
میں صرف اُنہی اجزاء کی صفات پائی جائیں گی جن سے وہ مرکب ہے۔ سکنجبین میں سرکے اور شہد
ہی کا مزہ ہوگا۔ سیب کا مزہ تو اس میں نہیں آسکتا۔ اور اگر آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ
سیب کا کوئی جزو اس میں کسی طرح شامل ہو گیا ہے۔ فلسفے اور سائنس کا یہ مانا ہوا اصول ہے
کہ کسی مرکب چیز میں وہی صفات پائی جائیں گی جو اُسکے مفرد اجزاء میں تھیں۔ کوئی بالکل نئی اور
انوکھی صفت ترکیب کے بعد پیدا نہیں ہو سکتی۔ کھلی بات ہے کہ جو چیز یا جو صفت اجزاء میں نہیں ہے
وہ ان اجزاء کے مرکب میں کہاں سے آجائے گی۔

اس اصول کے پیش نظر اب ہم اپنے مذکورہ بالا سوال کو پھر دہراتے ہیں اور پوچھتے ہیں!
بتائیے "ارادہ" اور "احساس خودی" حیوانی اجسام میں کہاں سے آیا؟ یا تو یہ مانیئے کہ یہ دونوں

چیزیں مادّی اجزاء میں موجود تھیں، اور یا یہ تسلیم کیجیئے کہ ان کا تعلق مادّے سے نہیں بلکہ مادّے سے دور، کسی ایسی طاقت سے ہے جس کا علم ہم کو نہیں ـــــــــ اور اسی کو ہم "روح" یا "امرِ ربی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ مختلف اجزاء کے امتزاج سے کسی نئی کیفیت کا پیدا ہو جانا ناممکن نہیں ہے۔ ہم اسے مانتے ہیں۔ لیکن یہ نئی کیفیت، دراصل انہی اجزاء کی صفات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ چاول، شکر اور دودھ کو ملا کر کھائیے تو یقیناً ایک نئی کیفیت آپ محسوس کرینگے۔ لیکن اس نئی کیفیت کے اجزاءِ ترکیبی میں دراصل انہی تین عناصر کو دخل ہے۔ یعنی جب آپ اس کیفیت کی تحلیل کریں گے تو اس میں جو جو چیزیں آپ پائیں گے، وہ سب چاول، شکر اور دودھ میں ملیں گی۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ الگ الگ ان میں ان کا تناسب کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی "فرق" میں کوئی ایسی نئی چیز پیدا ہو جائے جو نہ تو چاول میں ہو، نہ شکر میں اور نہ دودھ میں۔

اب اسی اصول کے مطابق کسی ذی روح جسم کو لیجیئے۔ اور نہایت احتیاط کے ساتھ آج کل بہترین آلات کو لیکر کسی اعلیٰ سے اعلیٰ تجربہ خانے (لیبارٹری) میں اسکے اجزاء کی تحلیل کیجیئے آپ کو بہت سے اجزاء ملینگے لیکن کیا "ارادہ" اور "میں" کا جزو بھی آپ اس میں سے نکال سکینگے جب آپ نے ہر ہر مفرد چیز کو ٹٹول ٹٹول کے الگ کر دیا تو ہم پوچھتے ہیں کہ آخر اس جزو کو بھی ڈھونڈیئے جو "ارادے" اور "میں" کے احساس کا ذمّے دار ہے۔ لیکن آپ کی کیمیاوی تحلیل کا پورا فن اس جزو کو معلوم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یا تو آپ کا علم ناقص ہے یا "ارادہ" اور "میں" کا تعلق مادّے سے ہے ہی نہیں۔ آپ نے اپنے علم کی مدد سے مادّے کی تحلیل تو کر دی اور اس میں آپ کامیاب بھی ہو گئے لیکن جس چیز کا تعلق سرے سے مادّے سے تھا ہی نہیں، اس کی تحقیق کا تعلق بھی آپ کے علم سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے لفظوں میں، اسکے معنی یہ ہوئے کہ حیات، یا زندگی جس کیفیت کا نام ہے وہ صرف مادّی امتزاج کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے کسی ایسی غیر مادّی چیز کی مداخلت ضروری ہے جس کو دیکھنے سے ہمارا علم قاصر ہے، مگر جسکے وجود کو تسلیم کرنے پر ہم مجبور ہیں ——— اسی "غیر مادّی چیز" کو ہم روح یا "امر ربی" کہتے ہیں۔

اب آیئے ذرا نفسیات کے ماہروں کی طرف چلیں۔ انسانی دماغ کا یہ علم حال ہی کی پیداوار ہے۔ اسلیے آیئے ان سے بھی اس سلسلے میں کچھ باتیں کریں۔

سب سے پہلے تو ہم ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ بتایئے نفسیات کا موضوع کیا ہے یعنی آپ کس چیز سے بحث کرتے ہیں؟ اسکے جواب میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارا موضوع انسانی دماغ ہے۔ لیکن دماغ سے آپکا مطلب کیا ہے؟ کیا بھورے رنگ کا وہ مادّہ جو کھوپڑی کی ہڈیوں کے نیچے رکھا ہوا ہے؟

جی نہیں! ہمارا تعلق اس بھورے رنگ کے مادّے سے نہیں بلکہ اُن کیفیات سے ہے جو اس مادّے پر طاری ہوتی ہیں۔ یعنی ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس بھورے رنگ کے مادّے کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، ان میں خون کیسے دورہ کرتا ہے، ان کو غذا کہاں سے ملتی ہے، ان میں خلیے (CELLS) کتنے ہیں ——— بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ دماغ کام کیسے کرتا ہے، سوچتا کیسے ہے، الجھتا کیونکر ہے، جذبات میں کس طرح آتا ہے، مایوس کب ہوتا ہے اور امیدوں سے لبریز کس حالت میں ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن کم از کم اتنا تو بتایئے کہ انسانی دماغ کی ان کیفیات کا سرچشمہ کیا ہے؟ سرچشمے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ خون سے پیدا ہوتی ہیں، بلغم سے نکلتی ہیں، صفرا سے بنتی ہیں، سودا سے خارج ہوتی ہیں، یا غرض کسی مادّی جزو سے نکلتی ہیں؟

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا! سوال کو ذرا واضح کیجیے؟

ہمارے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی محبت کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ محبت کی کیفیت اس میں کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ آیا یہ کیفیت خون میں تھی، خون کے کسی ذرّے میں تھی، یا خون اور بلغم میں ملی جلی تھی، ہڈی میں تھی، ہڈی کے خاسنوں میں تھی، ہڈی کے گودے میں تھی، غرض کہاں تھی ——— ؟

نفسیات کے ماہر ہمارے سوال کو سُن کر ہنس پڑتے ہیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر کہتے ہیں ——— تمہارا سوال ہم سمجھ گئے۔ مگر اس کے جواب میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس پر غور کرنا ہمارا کام نہیں۔

تو پھر کس کا کام ہے ؟

عضویات کے ماہروں کا۔

لیکن عضویات کے ماہر تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف انسانی جسم کی ترکیب اور ساخت سے بحث کرتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ فلاں عمل فلاں حرکت سے ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ فلاں حرکت کیوں ہوتی ہے، کس کے حکم سے ہوتی ہے، دل پان کی شکل کا کیوں بنایا گیا، گول کیوں نہ بنایا گیا یا کسی اور شکل کا کیوں نہ بنایا گیا، ہم سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہم تو فقط یہ جانتے ہیں کہ جیسا جسم ہم کو ملا ہے، اس کے متعلق جتنی معلومات ممکن ہو سکتی ہیں، انہیں بتا دیتے ہیں۔ ہم مشین بنانے والے نہیں ہیں، بلکہ مشین کے کل پرزوں کی نوعیت اور حیثیت کو بتانے والے ہیں۔ اس لیئے یہ سوال جا کے مشین بنانے والے سے کیجئے کہ اُس نے فلاں فلاں اجزاء کہاں سے حاصل کیئے اور انہیں کس کس طرح بنایا۔

عضویات کے ماہروں کا یہ جواب سن کر ہم پھر نفسیات کے استادوں کے کمرے میں جاتے ہیں۔ وہ یہ جواب سُن کر مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں، بھائی سنو! دراصل یہ مسئلہ ہمارے

لئے بھی ناقابلِ حل ہے۔ ہماری حیثیت بھی وہی ہے جو عضویات کے ماہروں نے تمہیں بتائی۔ ہم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ دماغ فلاں فلاں چیزوں کا اثر کیسے قبول کرتا ہے اور فلاں فلاں حالات میں کس طرح کام کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کام کرنے اور اثر قبول کرنے کی یہ کیفیت اُس میں پیدا کہاں سے ہوئی۔ ہم دماغ سے نہیں "نفس" سے بحث کرتے ہیں اور نفس دراصل دماغ سے پیدا ہونے والی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس کی ماہیت کو ہم خود نہیں جانتے۔ ہم میں سے بعض مادّہ پرست یہ کہتے ہیں کہ یہ کیفیت، مادّی اجزاء کے امتزاج سے خود بخود بن جاتی ہے۔ مگر ہم اسے نہیں مان سکتے اسلئے کہ انسانی دماغ جن اجزاء سے مرکب ہے، اُن میں سے کسی ایک جزو میں بھی اُس کیفیت کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نہیں ملتا جسے ہم نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلئے ہم نفس کو ایک غیر مادّی چیز مانتے ہیں، یعنی نفس جس کیفیت کا نام ہے وہ دماغ کے بھورے خاکستری مادّے میں شامل نہیں بلکہ اُس سے صرف کام لیتی ہے۔ یہ بھورا خاکستری مادّہ دراصل نفس کا ہتھیار ہے، اُس کا اوزار ہے ایک وسیلہ و ذریعہ ہے جس سے وہ اپنا کام نکالتا ہے۔ لیکن خود وہ کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، کیسا ہے، کس رنگ کا ہے اور کہاں رہتا ہے؟ اسے ہم نہیں جانتے۔ مختصر طور پر نفس کو ایک نورانی ہالہ سمجھئے جو دماغ کے چاروں طرف محیط ہے۔ اور اس ہالے سے جو نورانی شعاعیں نکلتی ہیں، وہی دماغ میں حرکت و عمل پیدا کرتی ہیں۔

نفسیات کے ماہروں کے اس جواب کو سننے کے بعد اب اس حقیقت کے ماننے میں کوئی شک و شبہ مطلق نہیں رہتا کہ انسان، صرف مادّی عناصر کا نام ہرگز نہیں، بلکہ کسی ایسی غیر مادّی کیفیت کا نام ہے جسے خواہ "روح" سے تعبیر کیجئے، خواہ کسی اور لفظ سے۔ یہی روح دراصل وہ چیز ہے جسے آپ "میں" کہتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جسم، "میں" نہیں ہے۔ اگر جسم کو

"میں" مان جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی آدمی کے ہاتھ پانوں کاٹ ڈالے جائیں تو اُس کا "میں" ناقص رہ گیا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ واقعہ ایسا نہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ جسم میں نقص ضرور پیدا ہو گیا لیکن بہر حال آدمی تو وہی ہے۔ وہ خود بھی اس جسمانی نقص سے اپنے "میں" میں کوئی کمی نہیں پاتا۔ اور بدستور "میں" کہتا ہے ——— اسکے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ یہ "میں" جس کیفیت کا نام ہے اُس کا کوئی تعلق ہمارے مادّی جسم سے نہیں۔

روح کو مان لینے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ روح کا خالق کون ہے؟ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کائنات خود ہی اپنی خالق ہے اور جو کچھ تبدیلیاں ہم دیکھتے ہیں وہ صرف مادّے کے عمل اور ردِ عمل کا نام ہے، اُن سے بھی ہم وہی سوال کرینگے جو روح کے سلسلے میں ابھی کر آئے ہیں۔ یعنی یہ بتاؤ کہ "ارادہ و اختیار" کہاں سے آیا؟ یہ غور و فکر کرنے کی جو قوّت انسان میں ہے، وہ کہاں سے آئی؟ مختصر یہ کہ، نفسیات کے ماہرین جو کیفیات "نفس" میں بتاتے ہیں، وہ کہاں سے آئیں؟ یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کیفیتیں، مادّے سے پیدا نہیں ہوئیں۔ اسلئے اب ظاہر ہے کہ کسی غیر مادّی چیز سے ان کا تعلق ہے ——— اور یہی وہ غیر مادّی چیز ہے جسے اپنی کلّی اور مکمل شکل میں ہم خدا یا اسکے کسی مترادف لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا، ایک اندھی طاقت کا نام ہے، اُن سے ہم پوچھیں گے کہ تمہارے اندر یہ دیکھنے، سننے اور غور کرنے والی طاقت کہاں سے آئی؟ پھر اگر تم اپنے اندر "اندھی طاقت" کے علاوہ بھی کوئی طاقت رکھتے ہو تو اسی طاقت کے سرچشمے کا نام خدا ہے۔ اگر تم سنتے ہو، دیکھتے ہو، غور کرتے ہو، ارادہ کرتے ہو اور اسی قسم کی دوسری کیفیات رکھتے ہو تو ——— تمہیں ماننا پڑے گا کہ ان کیفیات کا ایک مکمل ترین اور خالص ترین سرچشمہ بھی ہونا چاہیے جہاں سے تم کو یہ چیزیں ملی ہیں ——— اور اسی سرچشمے کا نام "خدا" ہے۔

غرض عقل و منطق کے ہر پہلو سے ہم کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا کسی اندھی طاقت کا نام نہیں ہے بلکہ سمیع و بصیر، قادر و توانا اور حلیم و رحیم ذات کا نام ہے جس نے ارادہ کرکے دنیا کو پیدا کیا ہے اور جو ایک خالق کی طرح اسکی فنا پر قادر ہے۔ اُس نے یہ سب کچھ کسی مقصد کے بغیر بھی پیدا نہیں کیا ہے ورنہ اُس کی اُن بلند ترین و کامل ترین صفات پر حرف آتا ہے جن کا ایک ادنیٰ سا شمّہ انسان کو ملا ہے۔ پھر چونکہ یہ کائنات ایک مقصد رکھتی ہے، اسلیئے جزائے اعمال سے انکار کرنا کسی صورت سے ممکن نہیں۔ جزائے اعمال سے ہمارا مطلب وہ جزا ہے جو ابدی اور سرمدی طور پر روح کو حاصل ہو گی اور جو اس جسمانی زندگی کے ختم ہونے کے بعد شروع ہو گی۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو ہمارے صوفیا نے "عالمِ اصغر" کہہ کر ایک بہت ہی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔ انجیل کا یہ قول کہ "خدا نے آدمی کو اپنی شکل پر بنایا ہے" بھی انہی حقائق کی طرف رہنمائی کرتا ہے ——— ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آدمی خود اپنے اوپر غور کرے تو خود اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کیفیات کا پیدا کرنے والا کوئی خالق ہونا چاہیئے۔ اور اُس خالق کا انسان کے مقابلے میں اکمل و ارفع بھی ہونا ضروری ہے ——— دراصل یہی وہ نکتہ ہے جسے اقبالؒ کی زبان میں "خودی" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہی وہ خودی ہے جسے بلاشبہ خدا کی خدائی کی بے پناہ طاقتیں حاصل ہیں بشرطیکہ ہم اسے پہچانیں اور مادی بھول بھلیاں میں پڑ کر خالقِ کائنات سے اپنے تعلق کو بھول نہ جائیں۔

تعمیر ملّی کے بنیادی عناصر

(از خواجہ عبدالوحید)

مسلم لیگ کی ہر دلعزیزی:۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی نوے فیصدی اکثریت لیگ کی ہمنوا بن چکی ہے اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں اسلامی ہند کی کوئی تحریک مسلمانوں میں وہ ہر دلعزیزی حاصل نہیں کر سکی جو مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان کو حاصل ہو چکی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اس افسوسناک حقیقت کا اعتراف بھی ناگزیر ہے کہ اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر لینے کے باوجود مسلم لیگ آج تک، اپنے نصب العین کے حصول کی کوئی مؤثر عملی کوشش شروع نہیں کر سکی۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ حقیقت میں ابھی تک مسلم لیگ وہ قوت حاصل نہیں کر سکی جو حکومت برطانیہ کو اس کے مطالبات ماننے پر مجبور کر سکے۔ نہ اس کے اندر وہ جاذبیت پیدا ہو سکی ہے جو اس کے ماننے والے مسلمانوں کو کسی قسم کے ایثار یا قربانی پر آمادہ کر سکے۔

گذشتہ پچیس تیس برس کے زمانے میں اسلامی ہند کی سب سے عظیم الشان تحریکِ خلافت کی تحریک تھی۔ اس تحریک میں زیادہ سے زیادہ دس فیصدی مسلمانوں نے حصہ لیا ہوگا لیکن ان دس فیصدی مسلمانوں کے جذبۂ ایثار۔ شوقِ شہادت اور حبِ دین و ملت نے ملک کے طول و عرض میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ لیکن آج نوے فیصدی مسلمانوں کا جمِ غفیر نہ حکومتِ برطانیہ کو متأثر نہ ہندو قوم کو مرعوب اور نہ اپنے آپ کو آمادہ عمل و ایثار کر سکتا ہے۔ آخر اس کا باعث

کیا ہے ؟ مسلم لیگ کے ہر بہی خواہ کو اس سوال کا جواب سوچنا چاہیئے ۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم لیگ کے جھنڈے کے گرد مسلمان عوام کا ہجوم اس لئے نہیں ہوا کہ لیگ واقعی ایک فعال جماعت ہے۔ بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ حکمراں طاقت کی گذشتہ سو سال کی ناانصافیوں اور ہمسایہ قوم کی فطری تنگ نظری اور بنیا ذہنیت نے مسلمانوں میں ان دو خوفناک دشمنوں کے مقابلہ میں اکٹھا ہو جانیکا جذبہ پیدا کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ نہ مسلم لیگ کے سامنے کوئی عملی پروگرام تھا نہ عوام کے جذبات کی کسی طریق پر تربیت ہوئی تھی۔ اس لئے اس اجتماع عظیم سے کوئی مفید عملی نتیجہ مرتب نہ ہو سکا۔

لیگ ۔ کانگرس اور برطانیہ۔ آج ہم اس امر واقعہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ حکومت برطانیہ مسلم لیگ کے مطالبات منظور کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ کہ اگر کبھی کبھار برطانوی حلقوں سے مسلمانوں یا لیگ کے حق میں کوئی کلمۂ خیر بلند ہو جاتا ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ انہیں مسلمانوں یا لیگ سے ہمدردی ہے بلکہ اس لیئے کہ برطانوی حلقے مسلمانوں اور لیگ کے ساتھ تھوڑی سی زبانی ہمدردی کر کے دنیا کے سیاسی حلقوں کو ہندوؤں، کانگرس اور ہندوستان کی آزادی کے خلاف متأثر کر لیتے ہیں۔

کانگریسی "مظالم"۔ جب مسلم لیگ ہندو قوم یا کانگریس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے تو حکومت برطانیہ اس آواز کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیتی ہے اور دنیا والوں پر یہ واضح کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں سے نالاں ہیں۔ لیکن جہاں مسلم لیگ کے سٹیج سے حکومت برطانیہ کے خلاف کوئی ہلکی سے ہلکی آواز اٹھتی ہے۔ فی الفور برطانیہ کے وزیر اعظم سے لے کر لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ تک مسلم لیگ کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ جب مسلمانانِ ہند نے کانگریسی حکومت کے "مظالم" کا تذکرہ چھیڑا۔ تو حکومت برطانیہ نے کانگریس کے خلاف اس

احتجاج کو دنیا بھر میں بڑھا چڑھا کر نشر کیا۔ لیکن جب مسلم لیگ نے کانگریس کے خلاف برطانوی گورنروں گورنر جنرل اور حکومت کی امداد طلب کی تو حقارت آمیز انکار کر دیا گیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں پر ”مظالم“ توڑے تو اس وقت انگریز گورنروں کا قانونی اور اخلاقی فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کی اقلیت کا اپنے اپنے صوبوں میں تحفظ کرتے۔ تو پھر کیا کسی ایک انگریز گورنر نے بھی مسلمانوں کی فریاد سُنی؟ اور پھر کیا یہ بھی ایک افسوسناک واقعہ نہیں ہے کہ ”قائداعظم“ جب وائسرائے کے پاس کانگریسی وزارتوں کے ”مظالم“ کی شکایت لے کر گئے تو وہاں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا؟ اور آخر میں جب ہر طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ کانگریسی حکومتوں کے ”مظالم“ کی تحقیقات کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے تو وہاں سے بھی توہین آمیز جواب ملا؟

مقامِ غور ہے کہ کیوں مسلم لیگ کی آواز نہ انگریز گورنروں نے سُنی۔ نہ انگریز وائسرائے نے سُنی۔ نہ انگریزی حکومت نے سُنی۔ صرف اسلیئے کہ وہ سب جانتے تھے کہ مسلم لیگ کے ہمنوا اگرچہ دس کروڑ میں سے نو کروڑ مسلمان ضرور ہیں۔ لیکن درحقیقت لیگ کسی مؤثر عملی اقدام کی اہلیت نہیں رکھتی۔ ہندوستان کے نوے فیصدی مسلمانوں کی ہمنوائی کے باوجود مسلم لیگ کا کسی مؤثر عملی اقدام کی اہلیت نہ رکھنا باعثِ حیرت و استعجاب ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو حیرت و استعجاب کی کوئی وجہ نہیں۔

لیگ کے خاص و عام طبقے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کا باقتدار طبقہ بیشتر خود غرض افراد پر مشتمل ہے وہ جانفروشی کے بلند جذبہ سے عاری ہے اس میں اپنی آسائش راحت وجاہت اور دولت کو قربان کرنیکا مادہ نہیں۔ وہ اسلام کی تعلیم اور تمدن سے بے تعلق ہے۔ وہ حکومت کی راہ میں شدائد و محن برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ عوام تعلیم

سے بے بہرہ ہیں۔ ان کے جذبات کی خلوص و ایثار سے تربیت نہیں ہوئی۔ وہ اسلام کی گزشتہ عظمت سے ناواقف ہیں۔ ان میں حال کو سمجھنے اور مستقبل کو شاندار بنانے کی استعداد نہیں۔ وہ منظم۔ خاموش اور ٹھوس تعمیری کام کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ ان میں دینی حمیت اور ملی غیرت ناپید ہو چکی ہے۔ وہ سچ اور جھوٹ۔ ایمان اور نفاق۔ وفاشعاری اور غداری میں تمیز نہیں کر سکتے۔ غربت و افلاس نے انہیں کم ہمت اور بزدل بنا دیا ہے۔ ان کی زندگیوں میں التزام اور استقلال کے ساتھ کسی مقصود کے لئے جدوجہد کرنے کا رجحان قطعاً نہیں پایا جاتا۔ وہ ہنگاموں میں گویاں کھا سکتے ہیں۔ لیکن خاموش تعمیری کاموں میں کسی قائد کی قیادت میں کام کرنا نہیں جانتے۔ انہیں زبان کے دعووں اور دل کے جذبات کا عمل سے اظہار کرنا نہیں آتا۔ وہ جماعتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے مخلص راہنماؤں کی اطاعت کے عادی نہیں۔ اگر لیگ کو ایک باثر۔ فعال اور مقتدر جماعت بنانا مقصود ہے تو خیر خواہانِ لیگ کو مندرجہ ذیل امور کی امور کی توجہ کرنی چاہیے:۔

توسیع حلقۂ رکنیت:۔ سب سے پہلی چیز جو لیگ کے بہی خواہوں کی توجہ کی مستحق ہے یہ ہے کہ مسلم عوام جو زبانوں سے لیگ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں باقاعدہ طور پر لیگ کے زمرۂ رکنیت میں شامل کئے جائیں۔ دو آنہ سالانہ چندہ دیکر مسلم لیگ کا رکن بننا ہر مسلمان کے لیے ممکن ہونا چاہیئے۔ باقاعدہ طور پر جب ایک شخص کسی جماعت کا رکن بن جاتا ہے تو اُسے اس جماعت کے ساتھ ایک وابستگی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ اس جماعت کی کارگذاری میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر ملک کے طول و عرض میں شدید کوشش کر کے دس کروڑ میں سے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو لیگ کا رکن بنا لیا جائے تو اس طریق سے بغیر کسی قسم کی گدائی کے لیگ کے لیئے فی الفور ایک کروڑ روپیہ کا عظیم الشان فنڈ جمع ہو سکتا ہے۔ اسکے بغیر کوئی معتد بہ فنڈ جمع نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ آج تک باوجود بار بار کی اپیلوں کے صدر مسلم لیگ کی آواز پر اتنا روپیہ بھی جماعتِ لیگ جمع نہیں کر سکے۔ کہ لیگ کے مرکزی دفتر کے ضروری اخراجات کی کفالت ہو سکتی۔ بات دراصل وہی ہے کہ مسلمان عوام لیگ کے ساتھ زبانی اظہارِ ہمدردی کرنا جانتے ہیں۔ لیکن اس ہمدردی کا کوئی عملی ثبوت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگر وہ صدق دل سے اظہار ہمدردی کرنا چاہتے تو وہ لیگ کے چندہ دہندہ ارکان کی تعداد کروڑوں تک پہنچا کر ایک طرف اسکی مالی بنیادوں کو ہمیشہ کے لیے مستحکم کر دیتے اور دوسری طرف غیر مسلم دنیا پر یہ ثابت کر دیتے کہ واقعی ہندوستان کے مسلمانوں کی نوے فیصدی اکثریت مسلم لیگ کی پشت پر ہے۔

جسمانی و ذہنی تربیت:۔ اس کے بعد عامۃ المسلمین کی جسمانی تربیت کا مرحلہ ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہر مسلمان مرد اور عورت بچے اور جوان کو اپنی صحتِ جسمانی قائم رکھنے کے اصول و طریق سیکھنے چاہئیں اور ان پر التزام کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ اس لیئے کہ ایک تندرست جسم ہی میں صحیح دل و دماغ نشو و نما پا سکتے ہیں۔ جسم کی صلاحیت پر بہت سے مفید انسانی اوصاف کی ترقی اور نشوونما منحصر ہوتی ہے۔ جو جسم کمزور ہوگا۔ وہ دشمنوں سے اپنا بچاؤ صحیح طور پر نہ کر سکیگا۔

اس سلسلے میں یہ امر ہر عورت کے ذہن نشیں ہونا چاہیئے کہ آئندہ نسلوں کی صلاحیت بیشتر ماؤں کی اچھی صحت پر منحصر ہے۔

جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت کا سلسلہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ذہنی تربیت تعلیم کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اور اسکے لیئے لکھنا پڑھنا ناگزیر ہے۔ لہذا اس سلسلہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا جوان اردو زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھے۔

بنیادی حقائق:۔ پھر ہر مسلمان کو زندگی کے وہ اصول و حقائق ذہن نشین کرائے جانے چاہئیں جن کے بغیر انسان کشمکش حیات میں حصہ لینے کے قابل نہیں بن سکتا۔ ان میں سے چند

اہم امور حسب ذیل ہیں۔

اسلام کے اصولوں سے واقفیت:۔ ہر مسلمان مرد۔ عورت۔ بچے۔ جوان اور بوڑھے کو اسلام کے اصولوں سے پورا پورا واقف ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ اہتمام کیا جائے کہ ہر شخص کلمۂ توحید کے الفاظ و معانی و مفہوم کو سمجھنے لگے۔ توحید کا عقیدہ ہر مسلمان کے دل و دماغ میں ایسا راسخ ہونا چاہیئے کہ اس کے بعد دنیا کی کسی قہرمانی طاقت کا خوف اُسے مرعوب کر سکے اس سلسلے میں اصلاح عقائد بڑی ضروری چیز ہے۔ سب سے اول ہر مسلمان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ایمان اور اسلام کا مفہوم کیا ہے۔ ہر شخص کو یہ جان لینا چاہیئے کہ کسی کا مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا یا مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے آپ کو مسلمان لکھانا اُسے مسلمان نہیں بنا دیتا۔ اور نہ ہی اپنی زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو اس طرح تسلیم کرنا کہ اس کے مقابلہ میں کسی بڑی سے بڑی دنیوی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا جائے ایمان ہے۔ خداوند تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو تمام اقتدارِ اعلیٰ سونپتا ہے۔ اور اب اس کی زندگی اسی حاکمِ اعلیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں بسر ہوگی۔ ایمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے عہد کا نام ہے اور اس عہد کو عملی طور پر پورا کرنا اسلام ہے۔ اسلام کے معنی ہی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اور جو شخص خدا کو خدا مان کر اس کا مطیع و فرمانبردار نہیں وہ خدا کے نزدیک کسی انعام و رحمت کا مستحق نہیں۔

غرضیکہ اسلام اور ایمان کوئی ایسی چیزیں نہیں جنکا تعلق محض زبان کے اقرار تک محدود ہو۔ قرآنِ حکیم بار بار پکار کر کہہ رہا ہے کہ زبان کا دعوٰی کوئی چیز نہیں جب تک اسکے ساتھ عمل کی تائید نہ ہو۔

حیات بعد الموت: موجودہ زمانہ میں ایک اوسط درجہ کا ہندوستانی مسلمان حیات بعد الموت کے عقیدے کی اہمیت کو بالکل محسوس نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کی نگاہ زندگی کے مسائل پر مادہ پرستانہ انداز میں پڑتی ہے۔ ان کے نزدیک مالی منفعت اور مادی جاہ و ثروت، عیش و عشرت اور مادی لذت جیسی چیزیں ہیں، خواہ شرعاً ناجائز طریقوں ہی سے وہ حاصل کی گئی ہوں۔ آخرت پر ایمان نہ رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اصول اور صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح، اعمال کے مقابلہ میں عاجلہ کو ترجیح دینے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول بلند اخلاقی شخصیت جماعت کے بجائے مفاد پرست گروہ بن کر رہ گیا ہے۔ اب ان کا اخلاقی اعتبار ابن الوقتی اور مطلب پرست قوم کی طرح مصلحت پر ٹکا ہوا رہ گیا ہے جس کے سامنے کوئی
اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔

اس اخلاقی تنزل و انحطاط سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر مسلمان اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ (۱) حیات (۲) کرہ ارضی کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ اس کا سلسلہ ایک اور صورت میں موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کر لینے کے
بعد ایک مسلمان کے لئے اس زندگی کی پرواز بدل جائیگی۔

ہر مسلمان مرد و عورت کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جانی چاہیئے کہ وہ جماعت کا ایک جزو ہے اور جماعت کی مجموعی سلامتی میں ہی فرد کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔ ہر مسلمان کو یہ چاہیئے کہ زندگی کے ہر مسئلہ پر اجتماعی نقطہ نگاہ سے غور کرنے کا عادی بن جائے۔ اس کا ذاتی مفاد جماعتی مفاد کے تحت ہو۔ وہ کسی حال میں بھی قومی فائدہ پر ذاتی فائدہ کو ترجیح نہ دے۔ اس کے ساتھ ہی نظام اجتماعی کا بھی فرض ہے کہ وہ فرد کے حقوق کا تحفظ کرے۔ چونکہ جماعت افراد سے بنتی ہے اس لئے افراد کے صالح ہونے پر نظام اجتماعی کا صالح ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اس لئے افراد کی تربیت

کا ایسا اہتمام ہونا چاہیئے کہ وہ جماعت کے مفید اور صالح اجزاء بن سکیں۔ فرد و ملت کے باہمی تعلق پر ہر مسلمان کا فکر واضح ہونا چاہیئے ہر فرد کو اچھی طرح احساس دلایا جانا چاہیے کہ فرد کے صالح ہونے پر جماعت کی سلامتی اور جماعت کے مضبوط ہونے پر فرد کی سلامتی کا دارو مدار ہے۔ اس سلسلے میں علامہ سر محمد اقبال مرحوم کی مثنویوں اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کا درس عام طور پر جاری ہونا چاہیئے

اسلام کے شاندار ماضی سے واقفیت:۔ دنیا کے ہر ملک میں تاریخ کو تعلیم کا ایک اہم جزو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیئے کہ قومی سیرۃ کی تعمیر تاریخ کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہے مسلمانوں کے پاس تاریخ کا ایک بہت ہی شاندار ذخیرہ موجود ہے۔ اور ہر مسلمان کے لیئے اس سے مستفید ہونا ممکن ہے۔ آج اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ عامۃ المسلمین کو اسلام کی شاندار تاریخی روایات سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ ان کے آباؤ اجداد نے دنیا میں نسلِ انسانی کے لیئے کیسی کیسی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تہذیب و تمدن۔ علوم و فنون۔ نیک عملی اور عدل و انصاف کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں نے گذشتہ زمانے میں جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اُن سے آج ہر مسلمان کو واقف ہونا چاہیئے کہ اسلام کی جس تعلیم پر عمل پیرا ہو کر قرونِ اولےٰ کے مسلمانوں نے اسلام کی گذشتہ تاریخ کو شاندار بنایا تھا۔ اسی تعلیم پر عمل کرنے سے مسلمان اپنے مستقبل کو بھی درخشاں کر سکتے ہیں

موجودہ حالت کا صحیح احساس:۔ اس کے ساتھ ہر مسلمان کو دنیائے اسلام کی بالعموم اور مسلمانانِ ہند کی بالخصوص موجودہ سیاسی عمرانی۔ اقتصادی اور اخلاقی زبوں حالی کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے مسلمانوں کو اپنی زبوں حالی اور ہمسایہ قوموں کی ترقی ...... سے جو خطرات لاحق ہیں ان کا احساس ہر مسلمان کو ہونا چاہیئے۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کس طرح انہیں کمزور بے دست و پا۔ مفلس اور محروم بنا دیا گیا ہے۔ ہر مسلمان کو اس بات کا پورا پورا احساس ہو کہ غلامی

نے اس کی فطرت کو کتنا پست اور قرضہ کی مصیبتوں اور اقتصادی بدحالی نے مسلمانوں کی قومی سیرت کو کس قدر افسوسناک حد تک اخلاقِ عالیہ سے محروم کر رکھا ہے۔ تجارت اور صنعت و حرفت کے میدان میں مسلمان ہندوستان کی دوسری اقوام سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اسلامی پردہ کے ترک صنفی بے راہروی اور مردوں اور عورتوں کے غیر ضروری اختلاط نے بداخلاقی کو کس قدر حد تک قوم کے اندر جاری و ساری کر دیا ہے۔

مستقبل کو روشن بنانیکا شوق :- ہر مسلمان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہو جانی چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل شاندار ہو۔ اسلامیانِ ہند میں سے ایک ایک فرد کے یہ چیز ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ وہ اپنا مستقبل خوشگوار بنا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے لئے صحیح جذبہ اپنے دل میں پیدا کرے جس سرزمین پر اس کے آباؤ اجداد نے سات آٹھ سو برس تک شاندار طریق سے حکومت کی اس پر پھر سے اسلام کے قانون۔ تہذیب۔ اور تمدن کو جاری کرنے کا شوقِ بے پایاں ہر دل میں نیا ولولہ اور ہر دست و بازو میں نئی طاقت پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنا مستقبل بہتر بنانے کی فکر میں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنا مستقبل روشن بنائیں۔

نصب العین کا تعین :- مستقبل کے متعلق کوئی عملی پروگرام نہیں بن سکتا جب تک کسی جماعت کے پیشِ زندگی کا کوئی نصب العین متعین نہ ہو۔ اس وقت مسلمانانِ ہند اپنے لئے ایک نصب العین متعین کر چکے ہیں۔ جسے "پاکستان" کا نام دیا گیا ہے اب انہیں چاہیئے کہ اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے ہر دم اس نصب العین کا احساس قائم رکھیں۔ ان کی زندگی کی تمام جدوجہد اس نصب العین کے حصول کی کوشش میں جاری رہنی چاہیئے زندگی کا نصب العین حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے حصول کی عملی کوشش نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش اور خواہش نہ کرتے۔ اگرچہ پاکستان کا نصب العین

حقیقت میں مسلمانان ہند کی تمام مصیبتوں کا واحد علاج ہے تو اسکے لئے انتہائی کدوکاوش اور اور جانفروشی ناگزیر ہوگی۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کے حصول کی راہ میں ہر طرح کے ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

خود اعتمادی اور استغنا عن الاغیار :- ہندوستان کے ہر مسلمان کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ جانی چاہیئے کہ "پاکستان" کے حصول کی راہ میں اسے اغیار سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ خواہ وہ اغیار انگریز ہوں یا ہندو۔ یا سکھ۔ پاکستان کا قیام خود مسلمانوں ہی کی کوششوں سے ممکن ہوگا۔ اس مقصد کیلیئے انہیں نہ انگریز کے "انصاف" پہ بھروسہ کرنا چاہیئے نہ ہندو کی "رواداری" پر۔ اس کام کیلیئے مسلمانوں کو اپنے دست و بازو میں ہمت پیدا کرنی ہوگی۔ اس راہ میں طرح طرح کی تکالیف اور مصائب کا سامنا ہوگا۔ مسلمانوں کو ان سب کے برداشت کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ قدم قدم پر ان کی راہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی اور ان رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹانے کا فرض خود انہیں ہی انجام دینا ہوگا۔

تمسک بالاسباب :- پھر یہ بات بھی ہر مسلمان کو ذہن نشین کر دینی چاہیئے کہ "پاکستان" جیسا عظیم الشان مقصد باتیں بنانے یا قرار دادیں پاس کرنے یا خداوندان لندن کو تاریں بھیجنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن حکیم اس دنیا کو عالم اسباب بتاتا ہے۔ یہاں ہر بات کے لیئے ایک طریقہ، ایک قانون، ایک سنت جاری ہے۔ جب تک اس مقررہ قانون یا طریقہ یا سنت پر عمل نہ کیا جائے کوئی کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن حکیم میں ایک مقام پر یہ اعلان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دشمنوں کو مبتلائے عذاب کیا جائیگا۔ لیکن یہ عذاب خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر نازل ہوگا۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ خود تو گھروں کی چار دیواریوں میں مشغول عیش و نشاط یا مصروف آہ و زاری ہوں اور میدان جنگ میں ان کے دشمنوں کیساتھ

اللہ تعالیٰ کے فرشتے لڑتے ہوں۔ پاکستان کا قیام اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک مسلمان اس کے لئے خود سرگرم عمل نہ ہونگے اس وقت البتہ خدا کی مدد یقیناً ان کے شامل حال ہوگی

ملت کے ہر طبقے کا تعمیر ملی میں حصہ: قومیں جب بنتی یا بگڑتی ہیں تو ان کے تمام طبقے بنتے یا بگڑتے ہیں۔ دس کروڑ مسلمانوں میں سے چند گنتی کے افراد کا ایثار و قربانی کر لینا قوم کی فلاح کا موجب نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں اسلام کا تحفظ اس صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کا ہر طبقہ امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل تعمیر ملی میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لے۔

دولت کا صحیح مصرف: مسلمانوں میں امیر طبقہ اپنی دولت کو کسی ایسے کام میں نہیں لگاتا جس کا فائدہ قوم کو پہنچے۔ قومی ترقی کیلئے دولت کا صحیح مصرف ناگزیر ہے مسلمان امراء کو چاہیے کہ بجائے بنکوں میں روپیہ جمع کرنے کے اسے تجارت میں اور صنعت و حرفت کے ایسے اداروں میں لگائیں جن سے ایک طرف خود ان کے اپنے سرمایہ میں اضافہ ہو اور دوسری طرف قوم کو ان کے سرمائے سے فائدہ حاصل ہو۔ اگر ایک دولت مند مسلمان ایسا کارخانہ قائم کرے جس میں ایکہزار آدمی کام کرتے ہوں تو جہاں وہ خود لاکھوں روپیہ کمائیگا وہاں تقریباً دس ہزار مسلمانوں کی روزی کا سامان بھی مہیا ہو جائیگا۔ اگر وہ چاہے تو اپنے کارخانے میں کام کرنے والوں کو صحیح نصب العین کی تعلیم بھی دے سکتا ہے۔

اسلام اور تمدن اسلام کی محبت: پاکستان کا نصب العین اس لیے وضع کیا گیا ہے کہ مشترک حکومت میں مسلمان، اسلام اور تمدن اسلام کو محفوظ نہیں سمجھتے۔ اس لیے ایک ایسی آزاد حکومت کا نقشہ مرتب کرنا ضروری ٹھہرا جس میں اسلام اور تمدن اسلام قائم و برقرار رہ سکیں لیکن تاحال خود مسلمان، اسلام، اس کی تعلیم اور اس کے تمدن سے ناواقفیت رکھتے ہیں نہ اسکے ساتھ کوئی شغف۔ مسلمان ایک طرف تو زبانوں سے اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر

مشترک قومی حکومت میں شامل ہو گئے تو اس حکومت کا قانون اسلام کے قانون پر حاوی ہو گا۔ لیکن خود وہ دنیا کی حقیر چیزوں کے لیے اسلام کے قانون کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں وہ تمدنِ اسلام کے تحفظ کو نہایت ضروری قرار دیتے ہیں لیکن عملاً انہیں اسلام کے تمدن کی بہ نسبت غیروں کے تمدن سے زیادہ شغف ہے اور اپنی تعلیم، معاشرت، زبان الغرض ہر چیز میں غیر اسلامی شعار کو اختیار کر چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اسلام اور تمدنِ اسلام کے "خطرے" کا ڈھول پیٹتے پھریں۔ ہر اس مسلمان کے دل میں جو پاکستان کا حامی ہے اسلام کی محبت اور تمدنِ اسلام سے شغف بدرجہ اتم موجود ہونا چاہیے۔ ایسا مسلمان کسی حال میں بھی اسلامی شعار کو چھوڑ کر غیر اسلامی شعار اختیار نہیں کر سکتا ایسے مسلمان کو اسلام کی تعلیم سے دلچسپی اسکی روایات سے شغف اور اسکے کارناموں پر فخر ہوتا ہے۔ اس معیار پر ہمیں اپنے آپ کا امتحان کرنا چاہیے۔

منافقین کے فتنوں کی روک تھام: کوئی قوم دنیا میں پنپ نہیں سکتی اگر اس کے اندر ایسے جراثیم موجود ہوں جو اندر ہی اندر اسکی جڑیں کھوکھلی کر سکتے ہیں۔ تعمیری کام کے ساتھ ساتھ ایسے عناصر کی تخریب بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اپنے نظامِ مجموعی سے چن چن کر ان تمام غداروں کو خارج کر دینا چاہیے جو دشمنانِ اسلام کے ساتھ ساز باز کرنے والے ہیں۔ جو ایسے پست فطرت انسان کے نام اور اعمال کا قوم کے سامنے اعلان ہو جانا چاہیے جو مسلمان کے بھیس میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ قوم کا اجتماعی ماحول ایسا بن جانا چاہیے کہ اس میں منافق چھپے نہ رہ سکیں۔ اور ایک ایسا ضمیر وجود میں آ جانا چاہیے جو منافقت اور غداری کو پھلنے پھولنے نہ دیں۔ حضرت امام ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] میں سے ہر ایک کو حسب [illegible] کو

مرعوب کرتا ہے اور مخذول وہ ہے جو اپنی کمزوریوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر جماعت میں پست ہمتی پیدا کرے۔ لہٰذا اپنے حلقے کو ایسے لوگوں سے بھی پاک کرنا چاہیئے۔

انقلاب کا پیش خیمہ ۔ دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا جب تک قلوب و اذہان پہلے سے اس کے لیے تیار نہ ہو چکے ہوں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں کوئی ایسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی اگر مذکورہ بالا بنیادی حقائق ان کے دلوں اور دماغوں میں راسخ نہ ہو جائیں۔ اس میں تعجیل عملی طور پر ممکن نہیں۔ یہ کام دنوں کا نہیں بلکہ برسوں کا ہے، نہایت اطمینان اور استقلال کے ساتھ ان بنیادی خیالات کو قوم کے تمام طبقوں میں پھیلانے کی طویل اور مسلسل کوشش کرنے کے بعد ہی قوم اس قابل بن سکتی ہے کہ اسے کسی انقلاب انگیز عملی تحریک چلانے پر آمادہ کیا جا سکے۔ آج جبکہ ان حقائق سے مسلمان بالعموم بے خبر اور ناواقف ہیں خطرے کا کوئی الارم انہیں آمادۂ عمل نہیں کر سکتا۔ واللہ المستعان ۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ۔

پیغام حق کا اقبال نمبر ۔ اگرچہ پیغام حق کا ہر پرچہ اقبال نمبر ہے مگر اب تک اس پرچہ کا کوئی سالانہ یا غیر معمولی نمبر پرچہ اقبال نمبر کے نام سے نہیں نکالا گیا تھا۔ اب بڑی جد و جہد سے کچھ مضامین جو نہایت درجہ بلند ہیں حاصل کر لئے گئے ہیں اور انشاء اللہ العزیز ماہ نومبر و دسمبر سنہ ۴۲ء کا پرچہ اقبال نمبر کے نام سے شائع ہوگا۔ کتابت شروع کرا دی گئی ہے اور تصاویر حاصل کی جا رہی ہیں۔ پرچہ کی عام قیمت دو روپے ہوگی۔ اور ضخامت تین سو صفحات بلکہ اس سے بھی کچھ زائد۔ خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں پرچہ دیا جائیگا اور دوسرے حضرات کو دو روپے ۔ کاغذ کی قلت کی وجہ سے صرف اتنا ہی پرچہ چھپیگا جتنے خریدار ہونگے۔ لہٰذا اقبالیات کا شوق رکھنے والے حضرات کو چاہیئے کہ وہ ابھی سے اپنے نام گرامی خریداروں میں لکھوا دیں۔ منیجر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاجپورہ ۔ لاہور

اُردو شاعری گل و بلبل کی شاعری ہے

عکّاسی و مصوّری اس میں نایاب ہے

(از "حق پسند")

کسی قوم کا غلام ہونا ایسی عجیب زہر ہے جس سے سیاست ہی نہیں قوم کی پوری زندگی اس بری طرح متاثر ہوتی ہے کہ آورد ہی صحیح اُٹھتا ہے:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

ہمارے سیاسی لیڈر کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مفلسی، ہماری غلامی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں مفلسی سے بحث نہیں۔ علم و ادب سے بحث ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی راج کے نمائندوں نے ہمارے علم و ادب پر کوئی ہاتھ صاف نہیں کیا اسلیئے کہ شاعری اور ادب پر نہ تو کوئی پابندیاں کبھی عائد ہوئیں اور نہ کبھی کسی نے ہمیں کسی خاص طریقے پر سوچنے کا پابند کیا بلکہ نہ ہی کبھی ہم سے یہ کہا گیا کہ فلاں طریقے سے سوچنا چھوڑ دو۔ مگر اسکے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہم نے گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے عہد غلامی میں ٹھیک اُسی طرح سوچنا شروع کر دیا ہے جس طرح ہمارے آقا ہم سے سوچوانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اس وقت اُردو شاعری کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ اُردو شاعری کے متعلق آج کل یہ اعتراض ایک مسلّم اعتراض بن چکا ہے کہ — بھلا اس کا اور انگریزی شاعری کا کیا مقابلہ۔ اُردو میں گل و بلبل کی شاعری کے سوا اور کیا رکھا ہے عکاسی و مصوری کا تو اس میں نام بھی نہیں شیکسپیئر اور ملٹن کے کسی ایک شعر کا جواب بھی اُردو کی

پوری شاعری نہیں دے سکتی۔ بھلا کہیں اُردو میں کیٹس کی نائٹ انگیل (بلبل) یا شیلے کے اسکائی لارک، (چنڈول) کی سی نظمیں مل سکتی ہیں؟ خیال آرائی تو ملے گی مگر مبالغے کے ساتھ لیکن حقیقت نگاری مفقود ہے۔ کسی منظر کا صحیح نقشہ اُردو شاعر نہیں کھینچ سکتا۔

تاہم اس اعتراض کو پیش کرنے کے بعد ایک ادائے تبسم کے ساتھ بعد میں یہ امید افزا جملے بھی کہے جاتے ہیں کہ ۔۔۔ مگر اب انگریزی کے اثر سے یہ صورت حال رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ اب جو نئے شاعر پیدا ہو رہے ہیں، وہ پرانی ڈگر سے ہٹ کر انگریزی کی تقلید میں شاعری کا صحیح حق ادا کر رہے ہیں۔

گویا ہمارے معترضوں کا مطلب یہ ہے کہ اُردو شاعری میں واقعہ نگاری، اور حقیقت نگاری کی قسم کا عنصر انگریزی پڑھنے کے بعد شامل ہوا ہے۔ اس سے قبل کے شعرا اس سے ناواقف محض تھے۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ یعنی کیا ہمارا یہ تصور واقعی حقیقت پر مبنی ہے یا یہ بھی نتیجہ ہے ہماری اس غلامی کا جو جسموں سے کہیں زیادہ ذہنوں کو اپنی گرفت میں لیا کرتی ہے ۔۔۔؟

آئیے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں!

شمالی ہند میں، انگریزی سے واقف ہونے کا زمانہ زیادہ سے زیادہ غدر ۵۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اگر دو چار شد بُد جاننے والوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو حد سے حد انیسویں صدی کے رُبع ثانی سے اس عہد کو شروع کر دیجئے ۔۔۔ یعنی تخمیناً ۱۸۵۰ء کے بعد سے۔ یعنی آج سے کوئی سو سال قبل۔ یاد رہے کہ علی گڑھ کالج کی تحریک اور مسلمانوں کو انگریزی پڑھانے کی ترغیب کا زمانہ اسکے بیس پچیس سال بعد آتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے معترضوں کے مذکورہ بالا قول کے مطابق ۱۸۵۰ء سے قبل کی شاعری کو واقعہ نگاری، مصوری اور مناظرِ قدرت کی عکاسی و تصویر کشی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

اسکے جواب میں ہم سب سے پہلے تو "بوستانِ خیال" کا نام پیش کرینگے۔ جسکا سنہ تالیف سنہ ۱۱۶۰ ہجری ہے۔ یعنی آج سے ۲۰۴ سال قبل۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اُردو زبان پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اسکے ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے جس میں ایک اندھیری رات میں لق و دق بیابان کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

وہ صحرائے وحشت فزا لق و دق — کہ اُڑتے تھے شیروں کے دل کے ورق
کہوں کیا میں اس مینہ کے شدت کی بات — کٹاری تھی بوندی کی ہر بوند ساتھ
پھر اس پر سنو تم اندھیرے کا حال — نہ تھی شمع واں غیر چشم غزال
وہ تنہائی و وحشت و بے کسی — مجھے اپنے احوال پر تھی ہنسی
صدا رعد کی شدتِ گرد و باد — قیامت کے دن کی دلاتی تھی یاد
گزرتا تھا ہر آن دل پر یقیں — مگر صدر کا حکم ہے آج ہیں
نہ اس شب میں تھا روشنی کا نشاں — نہ کچھ تھا ستاروں کا وہم و گماں
ہوا جمع یک جا خدا کا غضب — کہ صورت پکڑ نام پایا تھا شب
چراغ اس اندھیرے میں پاوے کہاں — چمکنا بھی برق کا تھا وہاں
سیہ شب میں بجلی چمکتی تھی یوں — نظر چشم دلبر میں چمکے ہے جیوں
شبِ مرگ یا جان کی کال تھی — درازی میں ہر ہر گھڑی سال تھی

اس کے بعد دو سہیلیوں کے باہم چہلیں کرنے کی تصویر بھی ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے:

نپٹ بے حجابی سے ملنے لگے — ہنسی سا تو جوں پھول کھلنے لگے
کبھی سر کو لا دیں مرے منھ کے پاس — کہ پہنچے ہر اک طرح زلفوں کی باس
کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں — کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں

دوپٹا مرا اوڑھ کر لیٹ جائیں کبھی شال اپنی مرے تئیں اوڑھائیں
کہوں کیا کہ کیا کیا کئے مجھ سے چھند کہ دل اس کا ہوئے ہر اک طرح بند

لیکن یہ زبان، اردو کی بہت ابتدائی شکل ہے۔ اردو کا اصل شباب در اصل میر و سودا کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ ہجری میں ہوا ہے۔ یعنی آج سے ۱۴۴ سال پہلے۔ اسلئے ان کی یا اُن کے زمانے کی نسبت یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ انگریزیت سے ذرہ برابر بھی متاثر ہوا ہوگا۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اب آپ کے سامنے ان کی ایک مثنوی "شعلہ عشق" سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

محبوب کے فراق میں درد و غم کی جو نفسیاتی کیفیت نوجوانوں پر طاری ہوتی ہے، اس کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے ۔

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا
جگر غم میں یکلخت خوں ہوگیا رُکا دل کہ آخر جنوں ہوگیا
گئے ہوش و صبر اسکے یکبار گی طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
کبھو یاں کبھو واں بحالِ خراب وہی بے قراری وہی اضطراب
ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کچھ اپنے بد و نیک کی سُدھ نہیں نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں
کبھو جا کے صحرا سے لاویں اُسے کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے
کبھو خاک ملتا ہے منھ پر کھڑا کہیں ہے خرابے میں بے سُدھ پڑا

عشق کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اُسکی اک نئی ہے چال
دل میں جاکر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
خار خار دلِ غریباں ہے — انتظار بلا نصیباں ہے

اب ایک منظر ملاحظہ فرمائیے۔ ایک نوجوان کسی کوٹھے کی کھڑکی سے ایک حسین لڑکی کو دیکھتا ہے۔

ایک دن بے کلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اک نظر اس کی — پھر نہ آئی اسے خبر اس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی — تاب و طاقت نے بیوفائی کی
بسترِ خاک پر گرا وہ زار — درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

اب آیئے آپ کو بڑھاپے کی حالت کی تصویر، الفاظ میں سنائیں:

جوانی گئی موسمِ شیب ہے — شہود ایک دو روز کو غیب ہے
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام — مزا کچھ نہیں، ہو چکی صبح شام
بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے — ہر اک عضو چلنے کو طیار ہے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے — سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
صد افسوس لطفِ سماعت نہیں — صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغِ جگر دے گیا | قدِ خم زمیں کی طرف اے گیا
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی | سفیدی مرے مُو سے سحر ہو گئی
کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق | جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پاؤں چلتے بچھلتے رہے | تو دیکھو گے ہم ہاتھ ملتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم | یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور | وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور
لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ | در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
شکن جلد میں دل میں افسردگی | غریزی حرارت میں افسردگی
برودت بہت جسم میں آ گئی | مزاجی تھی گرمی سو ٹھنڈا گئی
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا | لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

میر تقی میر کے ان اشعار کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ کہنا لا حاصل سمجھتے ہیں۔ اہلِ ذوق خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں جذبات نگاری و حقیقت نویسی کہاں تک ہے اور کہاں تک نہیں۔ اسی زمانے کی ایک اور مثنوی "اسرار محبت" ہے جو نواب محبت خاں کی لکھی ہوئی ہے اور اس کا سنہ تحریر ۱۲۱۱ھ ہجری ہے ـــ گویا آج سے ۱۷۰ سال قبل یعنی ہم نے انگریزی دانی کا جو عہد اوپر مقرر کیا ہے اُس سے ۳۷ سال پہلے لکھی گئی ہے۔ اس میں ہجر و فراق کی حقیقت نقشہ کھینچتے ہوئے، شاعر کہتا ہے:

جنونِ عشق جب ہوتا زیادہ | نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
کبھی بکھرے پر کر زلفیں پریشاں | گریباں چاک کرتی تا بہ داماں
کبھی پھیلا کے دونوں پاؤں اک بار | زمیں پر بیٹھ جاتی ہو کے ناچار

کبھی گھبرا کے اُٹھ کر واں سے چلتی اٹھا کر خاک اپنے مُنھ پہ ملتی
غرض دشوار تھا آرام پانا کبھی اُٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا کبھی اٹھنا کبھی غش کھا کے گرنا
کبھی سر پیٹ لینا گاہ رونا کبھی بیزار آپ اپنے سے ہونا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
اسے جب کوئی سمجھانے کو آتا تو بہ روتی کہ بس جی ڈوب جاتا
کبھی چپ اور کبھی رو رو بلکتی بسانِ موج سر دے دے پٹکتی

لیکن اب آئیے، ہم اپنے ادب پر پورا پورا فخر کرتے ہوئے ایک صدائے چیلنج کے ساتھ آپ کے سامنے ایک ایسے شاعر کا ذکر کرتے ہیں جسکے مقابلے میں عکاسی و مصوری کے لحاظ سے ہمارے نزدیک شیکسپیر اور ملٹن بھی ہیچ ہیں۔ آپ سمجھے ہمارا اشارہ کس شاعر کی طرف ہے؟ ہمارا اشارہ ہے میر حسن کی طرف ہے جنکی مثنوی "سحرالبیان" اُردو شاعری کی جان ہے۔

نوجوان شہزادی کے "ایامِ غم" کی تصویر ملاحظہ ہو:

خفا زندگانی سے ہونے لگی بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
کہا گر کسی نے کہ "بی بی چلو" تو اٹھنا اسے کہہ کے "ہاں جی چلو"
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

جو پانی پلانا تو پینا اُسے غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے
زباں پر تو باتیں وے دل اُداس پراگندہ وحشت سے ہوش و حواس
نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
جو ستی ہے دو دن کی تو ہے وہی جو کنگھی نہیں ہے تو یونہی سہی
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سبھاؤ کہ بگڑے سے دونا ہو اُن کا بناؤ

اب آئیے دو سو سال پہلے کے ایک ایسے نوجوان کی تصویر آپ کو دکھلائیں جو دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا ہے:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں اُمنگوں کے دن
گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
تمامی کی سنجاف جلوہ کناں کہ جوں عکس مہ زیب آبِ رواں
طرحدار اک سر پہ پہینا سجا تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
جواہر کا تکمہ گلے میں بندھا ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کا ڈھلکن زمرد کی ہڑ ہے لٹک جس کی زیبندہ دستار پر
اک الماس کی ہاتھ انگشتری سراسر حنا دست و پا میں لگی
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل ہے جوانی کی شب اور سماں بر محل

عمارت کا ایک نقشہ ملاحظہ ہو۔

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار / دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا / کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر / کہ مہ کا بندھا جس میں تارِ نظر
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال / نگہ کو وہاں سے گذر نا محال
سنہری مغرّق چھتیں ساریاں / وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
دیئے ہر طرف آئینے جو لگا / گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش اسکا ستھرا کہ بس / بڑھے جسکے آگے نہ پائے ہوس
رہیں لخلخے اس میں روشن مدام / معطر شب و روز جس سے مشام

مثنوی سحرالبیان کے یہ دو تین نمونے محض مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش ہیں۔ یہ مثنوی ۱۱۹۹ ہجری کی تصنیف ہے یعنی آج سے ۱۹۵ سال قبل کی ــــ مذکورہ بالا نمونۂ کلام پیش کر دینے کے بعد ان پر تبصرہ کرنے کی ضرورت غالباً نہیں، اہلِ ذوق خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کونسا جوہر پنہاں ہے۔

اس کے بعد ۱۲۳۶ ہجری میں مومن کی مشہور مثنوی "قولِ غمیں" کے کچھ اشعار سنیئے۔
دو محبت کرنے والے دلوں کی آخری ملاقات کا نقشہ دیکھئے:-

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی / کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
ملکے حیرت زدگانِ بے کس / دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خوں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم / حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تابِ کلام / پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو / مفت کس واسطے جی کھوتے ہو

اب تم اوروں سے لگاؤ جیو جی   نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو   رنج و اندوہ جو ہو تو ہم کو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے   رنج و اندوہ ہماری خو ہے
تم رہو خوش کسی جاناں کیسا تھا   تم چلے حسرت و حرماں کیسا تھا
کام دل رنج و بلا کو سونپا   تم کو تو ہم نے خدا کو سونپا

مومن کی ایک اور مثنوی "قصۂ غم" (مصنفہ ۱۲۳۵ ہجری) میں عشق و محبت کی جرأت رندانہ کا ایک منظر دیکھئے:-

وہ ہاتھ کا دم بدم جھٹکنا   وہ تیکھے پن سے کودے پٹکنا
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا   وہ ہو کے بتنگ کاٹ کھانا
ہرجائی کی چٹکیاں وہ لینی   آزردہ ہو گالیاں وہ دینی
وہ جی سے بہ تنگ ہونے لگنا   کچھ بس نہ چلا تو رونے لگنا

میر حسن کی مثنوی کے بعد ہم دوسرا قابل فخر نام پنڈت دیا شنکر نسیم کا لیں گے جن کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کو لافانی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۵۴ھ ہجری میں لکھ کر تمام ہوئی تھی۔ یعنی آج سے ایک سو دس سال قبل۔

بکاؤلی غائب ہے۔ اتفاق سے راجہ کو ایک رات اُس کا خیال آجاتا ہے۔ اب دیکھئے اس وقت کا نقشہ:

اک شب راجہ تھا محفل آرا   یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے   شہزادی بکاؤلی کدھر ہے
منہ دیکھ کے ایک مسکرائی   آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک　　چتون کو ملا کے رہ گئی ایک

آخری دو شعروں میں جو تصویر کھینچی گئی ہے، کیا اُس کے محاسن پر ہمارے کسی تبصرے کی ضرورت ہے۔

بکاؤلی کے باغ سے پھول غائب ہے۔ اس چوری کی خبر سننے پر حیرت و پریشانی کا منظر ملاحظہ ہو:

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی　　پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے　　کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے!
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل؟　　جھنجھلائی کہ کوئی دے گیا جُل!
ہاتھ اس پہ اگر نہیں پڑا ہے　　بُو ہو کے تو گل نہیں اڑا ہے
تھرّائیں خواصیں صورتِ بید　　ایک ایک سے پوچھنے لگیں بھید
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟　　بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟
شبنم کے سوا چُرانے والا　　اوپر کا تھا کون آنے والا؟
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس　　غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا　　پُتلی وہی چشمِ حوض کا تھا
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں　　اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
اُڑ یا وہ صبا ہوا نہ بتلا　　خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا

پھول کی چوری کا راز کھل جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بکاؤلی کا دل بھی چوری ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں جذبات کی جو کیفیت ہو سکتی ہے اُسے الفاظ کے لباس میں دیکھئے۔ بکاؤلی کہتی ہے۔

تو باغ ارم سے لے گیا گل ؛ تو مجھ سی پری کو دے گیا جل
تجھ کو ترے باپ سے ملایا ؛ مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا ؛ ؛
جو جو اسرار تھے نہانی ؛ سب تجھ سے سُنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ؛ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
اب تک ہیں وہ خارجی کے جی میں ؛ بہتر ہے کہ مصلحت اسی میں
آئے گا تو در گزر کروں گی ؛ ورنہ میں بہت سا شر کروں گی
کانٹوں میں اگر نہ ہو اُلجھنا ؛ تھوڑا لطف بہت سمجھنا

میر وزیر صبا نے ۱۲۶۴ سنہ ہجری میں ایک مثنوی "صیدیہ" کے نام سے لکھی تھی۔ اُس میں ایک جگہ لب دریا پر بسنے والی ایک بستی کا منظر دیکھیے۔

عجب ایک بستی لب آب تھی ؛ کہ جو بات تھی اُس کی نایاب تھی
جسے دیکھیے حسن میں وہ پری ؛ وہ صورت کہ دیکھا کیے آدمی
لٹک، چلبلاہٹ، شرارت، اُمنگ ؛ دمکتا وہ کندن سا چہروں کا رنگ
وہ چھوٹے بڑے گیسوئے عنبریں ؛ کمندیں لیے غارت نقد دیں
وہ بھیگے ہوئے تھے گلزار کے ؛ اور اُن پر ڈوپٹے وہ زرتار کے
وہ باتیں جو سنیے تو کیا بات ہے ؛ وہ چالیں کہ کبک دری مات ہے
وہ دریا کا عالم وہ جنگل کا روپ ؛ وہ دھانوں کے کھیتوں پہ بدلی کی دھوپ

آفتاب الدولہ قلق کی مثنوی "طلسم الفت" میں ایک جگہ ایک رومانی باغ کی رومانی مالنوں کا منظر دیکھیے اور انگریزی کے مشہور شاعر کولرج (COLRIDGE) کی مشہور نظم "قبلا خاں" کو پیش نظر رکھیے۔

مانگیں چار پانچ سو کم سن ۔۔۔ پیاری پیاری او افشاں کے دن
چوٹیاں تو ہی گندھی ہوئی صاف ۔۔۔ جلوہ گر رنگ رنگ کے موباف
غارت ہوش پاؤں میں چھاگل ۔۔۔ کنٹھ گورے پہ خوشنما ہیکل ہائے
پینگے اطلس کے پاؤں میں پُر زر ۔۔۔ سہرے پاٹک جڑاؤ سب زیور
سیلے کھڑ پیاں مرصّع کار ۔۔۔ شغل آرائش چمن ہر بار

میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے بعد تیسرا نام اس سلسلے میں نواب مرزا شوق کا بڑے فخر کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ مثنوی "زہر عشق" اور مثنوی "بہار عشق" وغیرہ عکاسی و مصوری کے لحاظ سے ـــــ اتنی بلند ہیں کہ آپ انہیں دنیا کی ہر زبان کے ذخیرہ ادب کے مقابلے میں پورے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ایک بازاری عورت دعوے عشق کی ہنسی اڑاتی ہے۔

ارے لا میں کہوں سبب کیا ہے ۔۔۔ ارے تو ہی نواب مرزا ہے
ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف ۔۔۔ سُن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف
بے وفائی میں دل جلاتے ہیں ۔۔۔ تو تو شہر بھر پھنساتے ہیں
جعلسازی یہ تجھ کو ہو نہ گر آئی ۔۔۔ ایک کو سانپ دوسرے کو بڑھائی
وہ بھی ہو نگوڑے سودائی ۔۔۔ موا پھر دیکھو کیسا سودائی ہائے
کس کے عاشق بنے ہو کیسی چاہ ۔۔۔ میں کہاں تم کہاں معاذ اللہ
اک ذرا ہنس کے مجھ سے منہ بنواؤ ۔۔۔ کہے چھانٹی مجھ بھوکی سے کہہ دو
ساتھ سوئیں گے اپنے یاروں کے ۔۔۔ بیٹھے کی بھی آئی مسند داروں کی ہائے

مردوا موئے نوج اس گت کا — جیسے دھونسا نگوڑا نوبت کا
سن کے یہ جیتی بیٹی نے اس سے کہا — اب تو یہ نوبت ہوئی ہماری بجا
بولی چپ رہیئے منہ کی کھائیے گا — اک ذرا سینک کر بجائیے گا ؎
ہوش کی اپنے کچھ دوا کیجے ؎ — مجھ سے ناحق نہ جو چلا کیجے ؎

اب آئیے ایک مہ جبین حسینہ کا نظارہ آپ کو کرائیں :-

حسن یوسف بھی اس کے آگے ماند — چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
جلوۂ حسن رشکِ شعلۂ طور — چشم بد دور آنکھیں موتی چور
رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال — رگِ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال
سینہ ہی کہ وہ دانت رشکِ گہر — جانِ عاشق نثار ہو جس پر ؎
قد میں آثار سب قیامت کے — گوری گردن میں طوق منت کے
رخ پہ گرمی سے وہ عرق کم کم — جس طرح گل پہ قطرۂ شبنم
عکسِ رخ موتیوں کے دانوں میں — بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
آڑی ہیکل گلے میں ڈالے ہوئے — پیاری پیاری جبیں نکالے ہوئے
رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی ؎ ؎ — چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی ؎
پائینچے ناز سے جو اس نے اٹھائے — جیسے پکارا ہے شہ کمر کو بچائے

وہ دیکھئے کون آرہا ہے؟ ایک صدی پہلے کے رئیسانہ محل کی کوئی خادمہ شاید؟

اتنے میں گھر سے نکلی اک عورت — سانولا رنگ چلبلی مورت
لال نیفا ازار بند پڑا ؎ ؎ — گچھا اک کنجیوں کا اس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھل کھلاتی ہوئی — آنکھ ایک ایک سے ملاتی ہوئی

چھاتی چو بند سینہ زوری میں — پھول رکھے ہوئے کٹوری میں
حسن کے دن، جوانی زوروں پر — رات کی باسی مہندی پوروں پر
دھیان اک اک سے بدگمانی کا — ستیاناس ہو جوانی کا ! ! !
پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر ناؤ — ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولھے پر
اپنے سائے سے بھی بھڑکتی ہے — بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر — پھبتیاں کس رہی ہے اک اک پر
جھڑکی اک اک کا منہ چڑاتی ہے — ہنس دیتی ہے، لوٹی جاتی ہے
چوٹی لپٹی ہے باسی ہاروں سے — لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے

اب ذرا نظر ہٹائیے اور دیکھئے وہ کون مست شباب عفیفہ لجاتی ہوئی آ رہی ہے۔ ذرا منظر دیکھیے:

منہ دوپٹے سے ڈھانپتی اتری — خوف کے مارے کانپتی اتری
نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا — سر پہ آنچل الٹ کے ڈال لیا
سب حیا سے بدن چرائے ہوئے — پائنچے ناز سے اٹھائے ہوئے
چال اٹکھیلیوں سے چلتی آئی — دل کو پاؤں کے نیچے ملتی آئی
گھنگھرو جوتی کے چھم چھماتے تھے — ہاں نہیں ہاں اور یہ طرفے تھے
پانی پانی جو دل تھا سینے میں — جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں
کچھ رکاوٹ تھی کچھ لگاوٹ تھی — کچھ حقیقت تھی کچھ بناوٹ تھی

لیکن ابھی آپ کو ان سب مناظر سے بڑھ کر ایک منظر دیکھنا باقی ہے۔ وہ دیکھئے دو محبت کرنے والے دل ہمیشہ کیلئے جدا ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ حسینہ کی آنکھوں

میں آنسوؤں اور روحانی ہر کہا گیا ہمیشہ کیلئے سورہے کا تہیہ کر چکی ہے۔ کیوں؟ اسی داستان کو تو وہ اپنے نوجوان عاشق سے بیان کر رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے:-

اقربا ہو گئے مرے آگاہ تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں پھر کیونکر یہ انتہا کریں؟
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے استخواں تک بھی اُنکے خاک ہوئے
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے یہی دنیا کا کارخانہ ہے
بوئے اُلفت تمام پھیلی ہے باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے
ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو بجولیوں میں بہلانا یا مری قبر پہ چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دُور ہم جو مر جائیں تیری جان سے دُور
عمر یونہی گذر نہ پائے گی ڈھونڈے کس کو جائے گی
میرے مرنے کی جب خبر پانا یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا

جمع ہولیں سب اقربا جس دم / رکھنا اُس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم / ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی / دُور پہنچے گی میری رسوائی
طعنہ زن ہونگے سب غریب امیر / قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں / آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیئے گا / بند اپنی زبان رکھیئے گا
اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا / ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے / سب میں رُسوا نہ کیجیے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے / تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے / تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
آکے رو لینا میری قبر کے پاس / تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا / قبر میری گلے لگا لینا
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر / پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جاتا / پھول تربت پہ دو چڑھا جاتا
دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال / خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں توام ہے / کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ / ہے کسی جا صدائے نالۂ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں / زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو / آج دل کھول کر گلے مل لو

حشر تک پھر یہ ہو گی بات کہاں ! ہم کہاں ، تم کہاں ، یہ رات کہاں !
ہم تو اُٹھتے ہیں اس مکاں سے کل اب تو جاتے ہیں اس مکان سے کل
یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں پان کل کے لئے لگاتے جائیں
ہو چکا آج جو کرھتا ہونا ؛ کل بسائیں گے قبر کا کونا ؛
چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن ؛ اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

ان اشعار میں جو جذبات نگاری ہے ، واقعات کی جو صحیح عکاسی ہے اور تصویر کشی کا جو کمال ہے اُس میں کوئی نقص بھی تم نکال سکتے ہو ؟ کیا شاعری کے اس ٹکڑے کو یورپ و امریکہ کے ذخیرۂ ادب کے مقابلے میں پیش کرتے ہوئے ہمیں کسی شرم کی ضرورت ہے ؟ کیا ان اشعار کے بعد بھی کسی زبان کی شاعری پر صرف گل و بلبل کی شاعری کا الزام لگایا جا سکتا ہے ؟ کیا اس منظر کشی اور جذبات نگاری کو دیکھنے کے بعد بھی آپ اس الزام کو صحیح سمجھ سکتے ہیں کہ اُردو شاعری کا دامن جذبات نگاری اور واقعات کی صحیح تصویر کشی سے خالی ہے ؟

غالباً بحث کو صاف کرنے کے لئے یہ چند نمونے بالکل کافی ہیں ۔ لیکن ذیل میں دو ایک مثالیں اور سن لیجئے ۔

جنگل کے سناٹے میں گرمی کی شدت جو آفت ڈھاتی ہے ، اُسکی تصویر دیکھیئے :-

فصل گرمی کی اور وہ جنگل ؛ دھوپ کے مارے ہو گیا بے کل
ہر طرف تھا غضب کا سناٹا بن پڑا سائیں سائیں کرتا تھا
چلتی تھی لُو زمین تپتی تھی ؛ روح گھبراتی تھی تڑپتی تھی ؛
دونوں تلووں میں پڑ گئے چھالے کانٹے چبھتے تھے جس طرح بھالے
گرم لو تن کو بھونے دیتی تھی ؛ بھاڑ کی طرح گرم رہتی تھی ؛

کہیں اُڑتا ہوا بگولا تھا
کسی جانب مدار پھولا تھا
راہ کانٹوں نے ہر طرف گھیری
سوکھی سوکھی لگی تھی جھڑبیری
جھاڑ کانٹوں کے تھے ببول کہیں
کوئی پتا نہ جن میں پھول کہیں

(ماخوذ از "حجابِ زناں" مصنفہ ظہیر)

شوہر کی جدائی میں بیوی کا نقشہ دیکھئے:-

جب سے دولھا جدا ہوا اُس کا
جینے سے دل خفا ہوا اُس کا
کوئی کھانا اُسے نہ بھاتا تھا
بات کرنا بھی خوش نہ آتا تھا
مسّی مہندی بھی ترک کی اُس نے
کنگھی چوٹی بھی چھوڑ دی اُس نے
ہنسے بولے کسی سے کیا ممکن
نہ بدلتی تھی کپڑے دس دس دن
رنگ چہرے کا زرد آنکھیں لال
میلے کپڑے چکٹے سر کے بال

ان چند مثالوں کو پیش کرنے کے بعد غالباً اب ہمیں مذکورہ بالا اعتراض پر اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!

یہ تمام مثالیں ہم نے اُس زمانے کے شعراء کے کلام سے نقل کی ہیں جو انگریز کے عہد سے پہلے گذرے ہیں اور جن کے گرد و پیش میں انگریزیت کا کوسوں کہیں اثر نہ تھا کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کا کلام کسی حیثیت سے بھی اُس شاعری سے فروتر ہے جس میں شیکسپیر اور بائرن کو پیش کیا جاتا ہے ——— ؟

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے!

پاکستان کی حقیقت

(از خانصاحب چوہدری عبدالکریم صاحب صدر سول مسلم لیگ لاہور)

ایک تقریر جو "یوم پاکستان" کے موقعہ پر شاہی مسجد لاہور میں ہوئی

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرات! آج یہاں ہم یوم پاکستان منانے کے لیئے جمع ہوئے ہیں۔ یوم پاکستان منانے کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ ہم نے اپنے دلوں میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہی ہماری تمام مصیبتوں کا واحد حل ہے۔ اسی سے ہماری سیاسی، اقتصادی اور عمرانی مشکلات رفع ہوں گی۔ ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ پاکستان بنا کر رہینگے۔ یہاں ہندوستان کے شمال مغرب میں جہاں ہم مسلمان اکثریت میں آباد ہیں ہم ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کرنیکا تہیہ کر چکے ہیں آج ہم ایک بار پھر اپنے اُن عزائم کا دنیا کے سامنے اعلان کرتے ہیں۔

لیکن حضرات! اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے دارالاسباب بنایا ہے۔ یہاں ہر ایک کام مقررہ طریقے سے ہو سکتا ہے۔ خود خدائے قادر و توانا کی کارفرمائی ایک قانون کے مطابق ہوتی ہے جسے اس نے خود ہی وضع فرمایا ہے اور جس قانون کو قرآن حکیم میں سنۃ اللہ کہا گیا ہے۔

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے قانون میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہ ملیگا۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا۔ اور تم قانونِ الٰہی میں کسی قسم کا ہیر پھیر نہ پاؤ گے۔

اگر ہم پاکستان بنانے کا اعلان کافی نہیں سمجھتے بلکہ پاکستان کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں تو آئیے چند لمحوں کیلئے اس امر پر غور کریں کہ ایک ایسی اہم شئے کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔

فراہمی سامان کی ضرورت :- حضرات! اس عالمِ اسباب میں خدائے واحد و قدوس کا جو قانون جاری و ساری ہے وہ ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان اگر دنیا میں اپنی حفاظت چاہتے ہیں تو اس حفاظت کا سروسامان اُنہیں خود اپنے ہاتھوں سے مہیا کرنا ہوگا۔ قرآنِ پاک میں مسلمانوں کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ اُن کے دشمن ہلاک و تباہ ہو جائینگے۔ لیکن حضرات! ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے اللہ تعالیٰ اُن کے دشمنوں کو ہلاک و تباہ کرے گا۔ ایسا کبھی ہوا نہ ہوگا کہ مسلمان اپنے گھروں کی چار دیواریوں کے اندر بند ہو کر نالہ و زاری کر رہے ہوں اور میدانِ کارزار میں ان کے دشمنوں سے اللہ کے فرشتے لڑتے ہوں۔ یاد رکھئے کہ یہ خدائے واحد کا قانون ہے اور خدا کا قانون بدلا نہیں کرتا۔

پاکستان کیا ہے؟ :- پاکستان کیا ہے؟ ایک ایسی آزاد اسلامی ریاست جس میں مسلمان اپنے مذہب۔ اپنے تمدن۔ اپنی تہذیب کو زندہ رکھ سکیں۔ جس میں ان کی روحانی اور مادی ترقی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ جہاں مسلمانوں کو اپنے خدا سے تعلق قائم کرنے میں کوئی روک پیش نہ آئے۔ جہاں رہ کر وہ اپنی زندگیاں اسلام کے راستے پر مصروف رکھ سکیں۔ حضرات! غور کیجئے کہ اس قسم کی معیاری اسٹیٹ کن لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔

آزاد۔ صالح۔ اسلامی حکومت ایک انعام ہے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو دنیا میں عطا ہوتا ہے۔ مسلمان دُنیا میں اپنی زندگی کا مقصد عظیم الشان حکومتیں بنانا۔ رفیع المرتبت عمارتیں تعمیر کرنا وسیع الاثر منڈیاں قائم کرنا نہیں بتاتے۔ ان کی زندگی کا مقصد قرآن بتاتا ہے۔ دُنیا میں نیکی کی نشر و اشاعت اور بدی کی روک تھام ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران)۔ یعنی اے مسلمانو تم ایک بہترین گروہ ہو جو اپنے عیش و آرام کے لئے نہیں بلکہ خلقِ خدا کی

ری کے لیے پیدا کئے گئے ہو۔ تمہارا کام نیکی پھیلانا اور برائی کی روک تھام کرنا ہے۔

خدا کا وعدہ :- اس بلند مقصد کو حاصل کرنے کی اگر مسلمان ایماندارانہ کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں بطور انعام خلافت یعنی آزادی ۔ حکومت ۔ غلبہ ۔ عزت سب کچھ عطا ہوگا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (ترجمہ: اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے اے مسلمانو تم سے ان لوگوں کے ساتھ جو واقعی صاحب ایمان ہیں اور اس کے علاوہ نیکوکار بھی ہیں کہ انھیں دنیا میں خلافت عطا فرمائیگا۔ اسی طرح جیسے تم سے پہلے بھی اس قسم کے لوگوں کو خلافت عطا ہوئی تھی)۔

اور پھر اس انعام کے حاصل ہو جانے کے بعد مسلمان عیش و عشرت میں مستغرق نہیں ہو جاتے بلکہ اپنے اس فرض کی ادائیگی میں معروف رہتے ہیں جس فرض کو تندہی اور اخلاص سے ادا کرنے کا انعام انہیں حکومت کی شکل میں دیا گیا تھا۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۴۱) (یعنی یہ اللہ کے مقبول بندے ایسے ہیں کہ جب ہم انہیں دنیا میں تمکن عطا کریں تو یہ نمازیں پڑھتے ہیں خیرات و صدقات میں منہمک رہتے ہیں یہ نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں)

غرضیکہ۔ حضرات! ہم کبھی پاکستان بنانا چاہتے ہیں تو اس کا یہ طریقہ نہیں کہ کبھی کبھی جلسوں میں اپنی اس آرزو کا اپنی زبانوں سے اظہار کر دیا کریں بلکہ اس کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ ہم اپنے آپ کو خدائے قہار کے فرمانبردار بندے بنالیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو دنیا کی حکومتیں اور طاقتیں ہمارا راستہ نہ روک سکیں گی۔

حضرات! یاد رکھیے کہ ایک خدا سے تعلق توڑ کر کروڑوں خداؤں کی خدائی تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ اس ایک در بندۂ خدا کے در سے منہ موڑ کر انسان کو در در کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ آج اگر ہم خدا کے

واحد سے اپنا تعلق قائم کریں تو ہم کسی دنیوی حکومت یا ہمسایہ قوم کے محتاج نہ رہیں گے اور اگر ہم یہ نہیں کر سکتے تو کبھی ہمیں انگریز کے دروازے پر دستِ سوال دراز کرنا پڑے گا اور کبھی ہندو کی گود میں گرنا ہوگا۔

نیکو کاری کیا ہے؟ :- اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیکوکاری کیا ہے؟ اس سوال کے حل کرنے میں بھی قرآن حکیم ہماری پوری پوری رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ نیکوکاری یہ ہے کہ انسان اپنی تمام زندگی کو اسلام یا قرآن کے تابع بنائے۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ سیاسیات سے متعلق ہو یا اقتصادیات سے۔ معاشرت سے تعلق رکھتا ہو یا قانون سے۔ اسلام کا قانون کارفرما ہو۔ جب تک یہ کیفیت انسان اپنے اوپر طاری نہ کرے وہ نیکوکار نہیں کہلا سکتا۔ اسی لئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۱۶۳)

خدا کی تنبیہہ :- لیکن اگر زبانوں پر کچھ اور ہے اور دلوں میں کچھ اور اگر زبانوں پر خدا و رسول کا نام ہے اور دلوں میں محبت مارکس اور سٹالن کے لئے ہے۔ ہاتھ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور دل ماسکو کی طرف۔ نام مسلمانوں کے سے ہیں لیکن زندگی لندن اور پیرس کے عشرت کدوں کی سی ہے۔ تو یاد رکھئے کہ اس دورُخی پالیسی کا نتیجہ دُنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں عذابِ الٰہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ قرآن حکیم ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہتا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرہ - ۸۵) (کیا تم کتاب الٰہی کی بعض چیزوں کو ماننا اور چیزوں کا انکار کرنا چاہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو یاد رکھو کہ اس قسم کی دورُخی پالیسی رکھنے والے اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہونگے

اور قیامت کے روز بھی بتلائے عذاب)

تاریخ سے سبق :- پھر نیکوکاری کا وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا جب تک قوم تمام کی تمام اسلام کے قانون کی پابند نہ بن جائے۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (یعنی اللہ کی رسی کو سب کے سب ملکر مضبوطی یکساتھ تھامے رہو)

قرآن حکیم کے اس ارشاد میں یہ اشارہ ہے کہ کوئی قوم محض اس لئے دُنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی کہ اس کے چند افراد مخلص اور ایماندار ہیں۔ کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ تمام کی تمام قوم ایماندار، مخلص اور صاحبِ عمل ہو۔ مسلم لیگ کے قائدِ اعظم کا اخلاص دس کروڑ مسلمانوں کی غداری کے اثر کو زائل نہیں کر سکتا اور تین آدمیوں کی مجلس عمل بے عمل قوم کو دنیا میں عزت و سربلندی نہیں دلا سکتی۔ یہاں ہر مسلمان کو مخلص اور ہر مدعی ایمان کو باعمل بننا پڑیگا۔ یاد رکھئے کہ بداعمال قوموں کو چند افراد کی روحانی طاقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ کیا قرآن حکیم میں متعدد ایسی امتوں کا ذکر نہیں آیا جو انبیاء کرام علیہم السلام کی موجودگی میں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دی گئیں۔ اور کیا خود مسلمانوں کو اُحُد کے میدان میں ناکامی و شکست کا سامنا نہیں ہوا۔ اس لیئے کہ انہوں نے خدا اور رسول کی نافرمانی کی۔ حالانکہ اس وقت افضل الانبیاءُ خاتم النبیین محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس میدان میں موجود تھے۔ پھر اگر اُحُد کے میدان میں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے باوجود مسلمان اپنی نافرمانی کے نتائج طبعی سے نہ بچ سکے تو قائدِ اعظم کا اخلاص ایک بے عمل، خود غرض اور خدا سے باغی قوم کو تباہی و بربادی سے کیسے بچا سکتا ہے۔

مسلمان کا امتحان :- حضرات! آیئے اب ذرا اس امر پر بھی غور کریں کہ وہ نیک عملی کس نوعیت کی ہے جس کا نتیجہ قرآن کی رو سے حکومت کی صورت میں نکلنا چاہیئے۔ آج

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دس بیس یا سو دو سو مسلمان امیروں کی جماعت سال میں دو چار مرتبہ مل کو بیٹھ جائے۔ چند قرار دادیں منظور کرے اور پاکستان قائم ہو جائیگا۔ یعنی مسلمانوں کی ہر قسم کی مصیبتوں کا واحد علاج ہو جائیگا۔ لیکن دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ (البقرہ ۲۱۴)

(مسلمانو! کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے ساتھ ابھی تک وہ معاملہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ آچکا ہے۔ ان لوگوں کو تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں اور ان کو جھٹکے دیئے گئے اس حد تک کہ اس زمانہ کے پیغمبر اور اُن کے ایمان دار ساتھی چلا اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔ تو ایسے لوگوں کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اللہ کی مدد آیا ہی چاہتی ہے۔)

اب حضرات! اس نقشے کو سامنے رکھئے اور اپنی حالت پر غور کیجئے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرے۔ ہمارے اموال میں سے ایک پیسہ بھی صرف نہ ہو۔ ہمارے وقت عزیز کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو۔ ہم بدستور اپنی اپنی ذاتی مصروفیات میں مشغول رہیں۔ ہم قیمتی قالینوں۔ صوفوں اور ایوانوں میں زندگیاں بسر کرتے رہیں اور ہمیں پاکستان مل جائے۔

پھر دیکھئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ مسلمانو تمہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کیا جائیگا۔ تمہیں نقصان جان و مال بھی ہوگا۔ تمہاری کھیتیاں اور باغات بھی تباہ ہونگے۔ اور پھر ان آزمائشوں میں جو لوگ پورے صبر و استقلال سے ثابت قدم رہیں گے، ان کے لیئے اللہ کی رحمتیں وقف ہونگی۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ

وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (البقرہ۔ ۱۵۵-۱۵۷)

اور یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ اگر ہم آج قیام دین و ملت کے راستہ میں تکالیف و مصائب اُٹھاتے ہیں تو کل ان کے عوض میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزادی اور حکومت ملتی ہے۔ اگر آج ہم اس راہ میں جان دیدیتے ہیں تو اس کے عوض میں ہمیں ہمیشگی کی زندگی و عزت ملجاتی ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (البقرہ) یعنی جو لوگ دین و ملت کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردیں انہیں مُردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں۔ اگرچہ تم ان کی زندگی کی حقیقتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرات! ہمیں ایک لمحہ کیلئے بھی یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ملّتِ اسلامیہ کا قیام اپنے زورِ بازو ہی سے ہوسکتا ہے۔ زندگی کی کش مکش میں وہی قوم زندہ و سلامت رہ سکتی ہے جو اپنی حفاظت کا سروسامان خود مہیا کرتی ہے ایسے ہی لوگوں کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر فرض کرلیا ہے۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

خدا کا وعدہ کن کے ساتھ ہے؟ حضرات! قرآن حکیم کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام کا تمام پڑھ جایئے کسی ایک مقام پر بھی انعام یا مدد یا کامیابی کا وعدہ ایسے لوگوں کے ساتھ نہیں ملیگا جو ہاتھ پر ہاتھ رکھ بیٹھے رہنا چاہتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے اور مسلمانوں کے دشمنوں سے مدد کے طالب ہیں جنکے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے خوف کی جگہ دُنیاوی حکومتوں کا خوف

بھرا ہے۔ جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں بلکہ دُنیا کی دلچسپیوں کی محبت بھری ہوئی ہے
جو آرام و آسائش کو جدوجہد اور تکلیف و محنت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو میدانِ جنگ سے دور رہ
کر صوفوں اور قالینوں پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

حضرات! خوب یاد رکھئے کہ اگر ہم مسلمانانِ ہند اپنے دست و بازو میں طاقت پیدا نہیں
کرتے اگر ہم اپنی زندگیوں کو اسلامی زندگیاں نہیں بنانا چاہتے تو گورنروں کے اختیاراتِ خصوصی
حقوق کے قانونی تحفظات۔ غیر ملکی حکمرانوں کے شرمندۂ وفا نہ ہونے والے وعدے غیروں کا بخشا
ہوا پاکستان اور ہمسایہ قوموں کی طرف سے دیئے ہوئے پروانہ ہائے انصاف و ہمدردی کوئی
چیز ہمیں تباہی و بربادی سے نہیں بچا سکتی۔ ہمارے لئے وہی پاکستان اکسیر ثابت ہوگا جسے
ہم خدا کے فضل و کرم اور اپنی ہمت سے قائم کریں۔

نہیں تجھکو تاریخ سے آگہی کیا   خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدے نہ جس کو وہ اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

پاکستان کس طرح قائم ہوگا؟ پاکستان بنے گا تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے
بنے گا اور مسلمان اسی وقت پاکستان بنا سکیں گے جب وہ اسلامی زندگی اختیار کریں گے۔ اگر
ہم مسلمانانِ ہند کا نصب العین پاکستان ہے اور یقیناً ہے تو یہ عظیم الشان نصب العین عیاش طبع
کارکنوں۔ خود غرض سرمایہ داروں۔ غیر ملکی حکومتوں کے ایجنٹوں اور اسلام کے غداروں کے ہاتھ
حاصل نہیں ہوگا بلکہ مخلص جفاکش اور خدا سے ڈرنے والے اور جان پر کھیل جانے والے مسلمانوں کی
وجہد سے حاصل ہوگا۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ۔

تنقید و تبصرہ

حقیقتِ نفاق:۔ مولفہ مولوی صدر الدین اصلاحی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ سرورق دیدہ زیب۔ طباعت اور کاغذ عمدہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈیمی ۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور۔ تبصرہ از ابن الانور سید محمد ازہر شاہ صاحب قیصر۔ کشمیری دیوبند۔

کفر اور نفاق کی دو اہم قوتیں ابتداء سے اسلام کے مقابلہ پر رہی ہیں لیکن نفاق نے کفر سے بدرجہا زائد اسلام کو نقصان پہنچایا ہے اور اب تک پہنچا رہا ہے، اسمیں کوئی شک نہیں کہ کفر اور اسلام آپس میں ایک ایسا تضاد و تخالف رکھتے ہیں کہ کسی وقت ان دونوں کا باہم مل بیٹھنا، کسی مصلحت سے ان دونوں کا ایک دوسرے کی مخالفت میں ہلکا ہوجانا اور کسی مجبوری سے ان دونوں کا ایک دوسرے کی حاکمیت کا قبول کرنا پہلے بھی ناممکن اور آئندہ بھی رہیگا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کفر اور اسلام کی یہ ساری مخالفت بالکل کھلی ہوئی ایک چیز ہے جس نے اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر اخفاء و ابہام کے کسی پوشیدہ بست سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کی سعی نہیں کی، اسلام نے ہمیشہ یہ جتایا ہے کہ یہ کفر ہے اور یہ ضلالت کفر میں مبتلا اقوام و افراد ہیں جن سے کسی وقت بھی برا تعاون و اتحاد ممکن و مناسب نہیں اور اسی طرح اسلام بھی ہمیشہ غیر مشتبہ شکل میں کفر کے سامنے رہا ہے اور کفر نے بھی کبھی یہ پہچاننے میں غلطی کی کہ یہ میرا، میرے اقتدار اور میری حاکمیت کا دشمن ہے اور اسکا مقصد بجز اسکے اسنے مجھے ارفع اور عزت و وجاہت کے تختِ طاؤس سے مجھے نیچے اتار پھینکنے کے کچھ نہیں! لیکن نفاق کا معاملہ اس سے الگ اور اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت سنگین ہے نفاق چونکہ نام ہی ساتھ رہکر اور قریب سے قریب ہوکر دھوکہ دینے سے تکلیفیں پہنچانے اور دوستوں کی شکل میں دشمنی کرنیکا نام ہے اسلئے ابتداء سے منافقین کا یہ عمل رہا ہے کہ انھوں نے زبان سے

السلام، اسلام کے فلک رس نعرے بلند کئے، وہ اسلام کی حمایت میں باتیں بنانے اور واہی تباہی بکنے سے کبھی نہیں چوکے، قدم قدم پر پیغمبر برحق اور دوسرے علمبرداران اسلام کو انہوں نے اپنی جاں نثاری کا یقین دلایا لیکن ضرورت کے ہر موقعہ پر انہوں نے اسلام سے غداری کی۔ اندر اندر جماعت اسلامی میں تفرقہ اندازی کی سعی کرتے رہے اور اسلام کے سارے جماعتی راز اسکی قوت نافذہ میں دخیل کار ہو کر پلتے رہے اور محض حب جاہ و مال کیلئے انہیں اہل کفر تک پہنچایا، ظاہر ہے کہ اندرخانہ مخالفتوں کا اٹھنے والا یہ سیلاب باہر سے آئے ہوئے موج در موج طوفان سے زیادہ خطرناک تھا، آستین میں بیٹھ کر ڈسنے والے اس افعی کا زہر سامنے آ کر کاٹ کھانے کا ارادہ کرنیوالے ناگ سے زیادہ مہلک اور زیادہ تکلیف دہ تھا، جس آدمی کے متعلق ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ یہ ہمارا دشمن ہے اور اسکی تمام جہد حیات کا نقطۂ آخر ہماری مخالفت و مناقشت ہے تو اس سے تو ہم بچنے لگتے ہیں اور اس سے بچنا حالات و معاملات کے لحاظ سے ہمارے لئے آسان بھی ہوتا ہے لیکن جو شخص خالص دوستی کے لباس میں ہم سے دشمنی کر رہا ہو، اسکی دشمنانہ سازشوں پر ہمیں علم ہی کب ہے کہ ہم اسکی مدافعت اور تحفظ کی کوئی تدبیر کر سکیں گے، اسلام کو شروع سے اس قسم کے منافقین سے واسطہ پڑا اور ہر وقت اندرون سلطنت کی بڑی بڑی مہمات، اور ممالک غیر پر لشکر کشی کے اہم امور میں ان سے نقصان پہنچے، کبھی انہوں نے مسلمان بنکر دین اور عقیدہ کی بیخ کنی کیلئے اندر اندر ہی سرنگیں بچھا دیں، کبھی ساری سلطنت میں عام بغاوت و مخالفت کے ایک فتنۂ عظیم کو ہوا دینے لگے، کبھی انہوں نے خود شارع علیہ السلام والصلوٰۃ پر کہ جنکی ذات خوبیوں اور خوبصورتیوں کا ایسا مینار تھی کہ جو اہل عالم کی ہدایت و رہنمائی کیلئے بر سر راہ نصب کیا گیا تھا۔ طرح طرح کی نکتہ چینی کی اور مجمع اسلام میں انہیں نامقبول بنانیکا فتنہ اٹھایا، وہ چپ بھی ہوتے تو کسی مقصد سے اور بولتے بھی تو دشمنی کے زبردست جذبہ اور ارادہ کے ساتھ، قرآن میں جا بجا ان منافقین کے حالات بیان کئے گئے ہیں، کہیں منافقین کو دار آخرت کی ہولناک سزاؤں کی وعید سنائی گئی ہے، کہیں انہیں بصورت دوستی یہ ہولناک دشمنی کرنے پر متنبہ کیا گیا ہے، کہیں انکی کچھ علامات و صفات مذکور ہیں۔ کہیں مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ ان منافقین کے ساتھ معاشرت و تمدن میں کیا طریقہ اختیار کریں، ان سے کس طرح کا سلوک کیا جائے انکی

خاموش فتنہ پردازیوں کی کیسے روک تھام ہو۔ کیسے ان سے دور رہا جائے اور کیونکر انکی چھپی ہوئی عداوتوں کو سب مسلمانوں پر بے نقاب کیا جائے۔

"حقیقت نفاق" بہ مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی جنکا تعارف اُنکی کتاب "حقیقت نفاق" کے ناشر (مولانا سید محمد شاہ ایم۔اے) نے اس طرح کرایا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جب پٹھانکوٹ کے نزدیک دارالاسلام کی بنیاد ڈالی گئی تو اس وقت ادارہ ترجمان القرآن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا قلمی معاون ایک نوعمر نوجوان تھا۔ جس نے حال ہی میں سرائے میر کے مدرسۃ الاصلاح سے سند فضیلت حاصل کی تھی۔ یہ نوجوان علوم دینی اور تاریخ اسلام کا بصیرت افروز مطالعہ کر چکا تھا اور اب اسلام اور اہلِ اسلام کی خدمت کیلئے بیتاب تھا، زبان اور قلم پر اسکا اچھا اختیار تھا، اس نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور انہوں نے بخوشی اسکو منظور کر کے اس نوجوان کو ادارہ ترجمان القرآن میں مضمون نگار کی حیثیت سے شامل کر لیا۔"
نوجوان موصوف کی یہ خدمت سزاوارِ تحسین و توصیف ہے کہ آپ نے کلامِ الٰہی کے وسیع اور گہرے مطالعہ کی قوت سے کلامِ پاک میں جا بجا مذکور منافقین سے متعلق ان سب مضامین کو اپنی تفصیلی اور توضیحی تقریروں کے ... تصنیف کی ایک سلکِ گوہر میں پرو دیا ہے۔ مولوی صاحب کا فکر چونکہ اس زمانہ کے پیدا شدہ سارے فتنوں اور جماعت اسلامی کے اندر اور باہر پائے جانے والے اُن تمام عیبوں کا بخوبی احساس کرتا ہے جن سے اسلام کی قوتِ مؤثرہ ہر روز مضمحل ہوتی جا رہی ہے اور حالت اسقدر خراب ہے کہ احیاء دین کی بڑی سے بڑی ہر کوشش رائیگاں اور حفاظت مذہب کا ہر ولولہ بے سود ہے نیز انکے قلم کو ایک علمی مسئلہ کے سارے غبار آلود اطراف وجوانب کو واضح کر دینے کی مہارت بھی ہے اسلئے انہوں نے ۲۰۰ صفحہ کی ایک مختصر اور حسین کتاب میں نفاق کے ہر ... پہلو پر جیسے قریب میں یا دور کہیں جا کر نفاق سے کوئی تعلق ہوتا ہے روشنی ڈالی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ ... مقصد سے لکھی اور چھاپی جانیوالی ایک بے اثر اور بے ثمر کتاب نہیں بلکہ ایک بہت اہم مذہبی خدمت ہے ... ہر مسلمان کو مومن اور منافق میں فرق کرنے کی صلاحیت حاصل ہوگی، مومن اپنی صفات و علامات کے ...

گروہ منافقین سے الگ پہچانے اور شمار کئے جا سکیں گے اور منافق اپنی باطن کی تمام کجی اور اپنے ضمیر کی ساری قوتوں اور توانائیوں کے ساتھ دور سے مشہور و معروف ہوں گے اور گویا اس فریضۂ ملی اور خدمت دینی کی پھر سے تجدید ہو گی کہ منافق کو ہم جان پہچان کر اپنے سے الگ کر دیں۔ احیائے دین الٰہی کی تحریکات میں یہ فتنہ کالم اندر ہی اندر جو رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے وہ ختم کر دی جائیں، ہمارے لباس میں ہمارے ساتھ ہو کر یہ ہمارے مقاصد کو جو پے در پے نقصان پہنچا رہا ہے، ان سب کا میاب استیصال ہو سکے، اور سچے مسلمان چاہے وہ اپنی تعداد میں کتنے ہی کم اور شمار میں کتنے ہی قلیل کیوں نہ ہوں اپنے دلوں، ارادوں اور جذبوں کی یکجائی کے ساتھ اوپر ابھر آئیں۔ اس کتاب میں پانچ باب بہ ترتیب ذیل ہیں۔

(۱) نفاق کی حقیقت (۲) منافقین کی اقسام (۳) علاماتِ نفاق (۴) ایک ضروری احتیاط (۵) منافقین کے بارہ میں شریعت کے احکام۔ پہلے باب میں مصنف نے قرآن کے الفاظ میں نفاق کی حقیقت بیان کی ہے اور بعض اہل علم کی اس عام غلط فہمی کی تردید کی ہے جو انہیں لفظ نفاق اور منافق کی حقیقت، اسکے محرکات، اسکے مصالح اور مظاہر پر پوری ہو گئی ہے، اس خیال کے اہل علم کہتے ہیں کہ عہد نبوت کے بعد دنیا میں منافقین کا وجود نہیں رہا۔ اب یا تو کوئی شخص کافر ہو سکتا ہے یا مسلمان، کسی کے منافق ہونے کا نہ اب کوئی موقعہ ہے اور نہ ضرورت وعلت، ابتدائے اسلام میں اکثر منافقین اسلئے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ ایک دورِ کشمکش تھا، جب اسلام کی طاقت مکمل نہ تھی اور نہ روئے زمین پر اسکی سلطنتیں منتشر ہوئی۔ اسلئے اکثر لوگ دامانِ اسلام میں آجانے کے بعد بھی کفار کے غلبہ و اثر سے ڈرتے تھے اور ان کے جور و تشدد سے بچنے کا ان کے پاس اسکے سوا کوئی تدبیر ممکن نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے پاس آتے تھے تو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے اور کفار سے ملتے تھے تو خود کو ساتھ بگوش کفر بتاتے تھے اور بعینہ یہی حالت حلقۂ کفر میں بھی تھی کہ کہ اسکا سارا نظام بھی زیر و زبر تھا اور یکسوئی اور وابستگی اس پر بھی چھے رہ ہر شخص کیلئے مشکل تھا کفر کے مقابلہ میں اسلام کی پوری طاقت بر سر پیکار تھی مگر مصنف نے اس غلط فہمی کی یہ صحیح تردید کی ہے کہ وہ اگر ان خاص اہلِ علم حضرات کی یہ دلیل بغیر رد و قدح کے تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ منافق کی یہ خاص قسم اب نہیں پائی جا سکتی یعنی اس خاص مقصد اور مصلحت کی بنا پر اب کوئی شخص منافقت نہیں کر سکتا، اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اب نفاق کسی شکل میں موجود نہیں یا منافق

کی اگر ایک قسم اور منافقت کی اگر ایک علت نہیں تو اسکے سوا بہت سی اقسام و علل اب بھی موجود ہیں جو ملت مسلم کی تباہی و بربادی کا کام جو ملت اسلام کی تباہی و بربادی کا کام نہایت ہوشیاری سے انجام دے رہے ہیں۔ دوسرے باب میں مصنف نے گذشتہ اور موجودہ ان بارہ قسموں کے منافقین کی الگ الگ تفصیل بیان کی ہے جنکی قرآن مجید نے نشاندہی کی ہے اور کھول کھول کر ان سب علامتوں کو بیان کیا گیا ہے جو ان منافقین میں پائی جاتی ہیں، یہ منافق بارہ قسم کے ہیں۔ (۱) بناوٹی مسلمان (۲) دشمنان اسلام کے جاسوس (۳) مذہبی گروہ بندی کرنیوالے (۴) نسلی اور وطنی افتراق پیدا کرنیوالے (۵) مطلب پرست اور دو رنگے لوگ (۶) مسلمانوں کے حقوق سے فائدہ اُٹھانیوالے (۷) دین و شریعت کا مذاق اُڑانیوالے (۸) جھوٹی شہرت کے حریص (۹) مسلمان ڈر سے اظہار ایمان کرنیوالے (۱۰) ضعفا (۱۱) دو رخے لوگ (۱۲) منافقین کی ایک اور قسم۔ کتاب کے اس سب سے بڑے اور اہم باب کے مطالعہ سے عبرت ہوتی ہے کہ بدقسمتی سے ایسے بہت سے عیب جو اپنی شدت کے لحاظ سے درجۂ منافقت میں شامل ہیں۔ غیر شعوری طور پر ہم اُن مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئے ہیں جو عقیدہ و عمل کے اعتبار سے کسی ایک ایسی غلطی کو جان بوجھ کر اختیار کرنے پر تیار نہیں جو دائرۂ اسلام سے باہر نکلی ہوئی ہو لیکن چونکہ کوئی ہمارا صحیح رہبر نہیں۔ کوئی ایسا مشیر کار نہیں جو ہماری غلطی پر گرفت کرے۔ ہمارے عیب پر ہمیں ریکو ٹوکے۔ اسلئے بالکل بے ارادہ یہ عیب ہم میں موجود ہیں۔ کتاب کے حصۂ زیر نظر میں عام مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کا بھی بڑا سامان موجود ہے۔ جسے مصنف نے اپنی زبان و بیان کی خوش سلیقگی سے بہت مؤثر بنا دیا ہے۔ منافقین کی ان اقسام کی پوری تفصیل بیان کرنیکے بعد تیسرے باب میں اُن تمام علامات نفاق کو حرفاً حرفاً قرآن سے نقل کیا گیا ہے جو چھوٹے اور بڑے، سخت اور نرم قسم کے منافقین میں پائے جاتے ہیں، یہ ساری علامات ۶۷ ہیں اور صفحات قرآن سے چن چن کر ان سبکو ایک جگہ جمع کرنا بڑی محنت و دماغ سوزی کا کام ہے، چوتھے باب میں مصنف نے ایک اہم چیز کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ کہ یہ علامات نفاق اکثر و بیشتر حالات میں اپنی بدشعوری اور بے علمی کے باعث مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی ان مسلمانوں اور منافقین میں کچھ فرق رہتا ہے اور وہ یہ کہ ایک مسلمان جب گناہ کرتا ہے تو جہالت کی بنا پر یا کسی فوری جذبۂ نفسانی سے مغلوب ہو کر نہ کہ سوچ سمجھکر، دوسری بات کہ ارتکاب گناہ کے بعد فوراً ہی

اس کا ضمیر مضطرب ہو جاتا ہے، ناگواری کے شدید احساس سے اس کا حال متغیر ہوتا ہے، خدائے ذوالجلال کی صفت عدل اس کے سامنے مجسم ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے اس کی جبین ایمانی پر عرق انفعال کے قطرے نمودار ہو جاتے ہیں اور وہ بغیر کسی توقف کے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے اور خدا سے مغفرت کا طالب ہوتا ہے اور آئندہ کیلئے اپنی اصلاح کر لیتا ہے،

تیسری بات جسے اس دوسری بات کا ہی پہلو کہنا چاہیے یہ کہ وہ اپنے کسی بُرے عمل پر قصداً جما نہیں رہتا یعنی یہ نہیں ہوتا کہ وہ مسلسل اُس برائی کو کئے جائے۔ اور اُسے ترک کرنے کی سعی نہ کرے اور اس کا قلب اس پر نفرت نہ کرتا ہو۔

پانچویں باب میں مصنف نے منافقین کو ان کے نفاق کے مختلف مدارج و مراتب کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم کرکے بتایا ہے کہ شدید قسم کے منافقین کیساتھ اللہ میاں اپنے یہاں کیا معاملہ کریں گے اور مسلمان اپنی سوسائٹی میں اُن سے کیا برتاؤ برتیں گے۔ درمیانہ درجہ کے منافقین کی یہاں اور وہاں کیا سزا ہے اور ان کے بارے میں قرآن کے کیا کیا احکامات ہیں۔ تیسری قسم کے منافقین اس دنیا اور اس عالم میں کس سلوک کے مستحق ہیں، یہ سب عبرت انگیز و نصیحت آمیز امور پوری تفصیل سے بیان کرکے مصنف نے منافقین کیلئے یہ موقعہ بہم پہنچایا ہے کہ وہ ان پوشیدہ اور مخفی راہوں سے اسلام پر حملہ آور ہونے کے ارادوں سے باز آکر جہنم کے اُس عذاب الیم سے اپنے آپکو بچائیں جسکی شدت و بے پناہی کا انسان مقابلہ نہیں کرسکتا اور جس سے گلو خلاصی کی کوئی تدبیر ممکن نہیں، نہ اُس عذاب کے وقت اپنے پرائے کام آئینگے اور نہ دوست اور عزیز ساتھ دینگے۔ اس وقت کفر کی پیشانی شوکت تمہاری مدد پر آئے گی اور نہ تمہارے یہ مال و دولت تمہارے ساتھی بن سکیں گے۔ قرآن نے خود خبر دی ہے۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ بیشک منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہونگے۔ اور حبطت اعمالهم فاصبحوا خاسرين۔ ان منافقوں کے تمام اعمال ضائع ہوگئے اور وہ سراسر گھاٹے میں ہیں۔

علمائے کرام کا مستقبل علما کو کیا کرنا چاہیئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام ۔ (ایک دلنشین موازنہ) " " " " ۔ ۸ر

انتخاب غالب ۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب ۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندی مسلمان	سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات ۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال	۱۲ر
المنبہات	عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف	۴ر
اسلامی پارٹی کا آئین	مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے ۔ از مولانا عزیز ہندی	۸ر

ہیگل کا فلسفہ (فلسفہ اضداد کی تشریح) ۔ از مولانا عزیز ہندی ۔ ۴ر

ہندوستان میں مسلمان کا نصب کیا ہے ۔ " " " ۔ ۴ر

القول الجمیل (عربی) ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ ۴ر

تقویۃ الایمان (اردو) ۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ۔ ۸ر

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ۔ ابوالقاسم رفیق دلاوری ۔ ۸ر

پیغامِ حق

ظفر منزل تاج پورہ - لاہور

جلد ۱۰ | جون ۱۹۴۵ء | عدد ۶

فہرست مضامین

سخنہائے گفتنی

مضامین کا جو مجموعہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ اگرچہ عنوانات کے لحاظ سے متعدد مضامین پر مشتمل ہے لیکن حقیقت میں یہ سب ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اسلام کی وہ حقیقی روح آپ کے سامنے آجائے گی جو بدنصیبی سے مغرب کی نام نہاد مادی ترقیوں کی بنا پر خود مسلمانوں کی نظر سے بھی اوجھل ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ان مضامین کے مصنف، ملک کے ایک ممتاز و قابلِ قدر عالم صوفی منش حضرت ذوقی شاہ صاحب ہیں آپ چونکہ علوم عربیہ کے علاوہ انگریزی سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں، اس لئے اُس زہر کی بہترین تحلیل کر سکتے ہیں جو یورپ کے مستشرقین کی طرف سے اسلام کے چشمہ صافی میں شامل کیا جارہا ہے اور جسے عام مسلمانوں کی نگاہیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔

اس سلسلۂ مضامین کے پہلے دو ابواب میں اُس بنیادی عقیدے کو عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جو اسلام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ "ظل و نور" کے عنوان سے آپ نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں خالق کائنات کا تعلق کائنات سے کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مضمون میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ خالق کائنات کن کن واسطوں سے افرادِ کائنات سے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ وحی، الہام اور ارتقاء کے نام سے اسلامی دنیا میں جو اصطلاحیں بولی جاتی ہیں، اُن کی محققانہ تشریح اس مقالے میں کی گئی ہے جس کے پڑھنے سے آنکھوں کے سامنے خدا کی عظمت و

کبریائی کا وہ صیح نقشہ آجاتا ہے جو اسلامی عقاید کی بنیاد ہے اور جس پر صحیح معنی میں ایمان رکھنا انسان کو ملکوتی بلندیوں تک پہنچا سکتا ہے۔

اس کے بعد آسٹریا کے ایک مشہور نومسلم جرمن بیرن عمر الف نے اسلام و اسلامیات سے متعلق جن خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے انہیں تنقید صحیحہ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازاں انگلستان کے پروفیسر نکلسن کے اُن خیالات کا جائزہ اسلامی روشنی میں لیا گیا ہے جو موصوف نے اسلامی تصوف کے سلسلے میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ذوقی صاحب چونکہ مستشرقین یورپ کے معیار علم اور معیار فکر دونوں سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے انہوں نے بیرن عمر الف اور پروفیسر نکلسن کے افکار و خیالات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ دراصل یورپ کے تمام مستشرقین کی صحیح حیثیت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

اگرچہ اصول تو یہی ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی لیکن دُنیا کی بدنصیبی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ عام لوگوں کی ظاہر بیں آنکھیں ہمیشہ ہر چمکنے والی چیز ہی کو سونا سمجھنے لگتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کی ظاہری چمک دمک سے ہمارے اہل علم تک کی آنکھیں اتنی خیرہ ہو چکی ہیں کہ وہ مستشرقین یورپ کے نام سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے قلم سے جو کچھ نکل جاتا ہے اُس پر کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن ذوقی صاحب کے مضامین کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نام نہاد فاضلانِ اسلام صرف تعصب و تنگ نظری ہی کا شکار نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی ان کا معیار بہت گرا ہوا ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کی تشریح یورپ کے مروجہ حال نظریات کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

آج کل عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ رواداری و عالی ظرفی کے لحاظ سے یورپ کے مصنفین بہت بلند ہیں اور اس کے ثبوت میں اُن خیالات و افکار کو پیش کیا جاتا ہے جو غیر مسیحی مذاہب کے متعلق یہ لوگ پیش

کرتے ہیں لیکن حقیقت شناس نگاہیں جانتی ہیں کہ یہ چیز صرف فریب نظر سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ حاصل یہ ہے کہ آج مذہبی لحاظ سے اہل یورپ کو مسیحی کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام وہ ضرور لیتے ہیں اور انجیل کو کتاب مقدس بھی مانتے ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہ چیز محض ایک ظاہری رسم سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ورنہ حقیقت میں مسیحی تعلیمات کا کوئی ادنیٰ سا اثر بھی ان کی زندگی کے کسی شعبہ پر نہیں ہے۔ اصلاح مذہب کی لوتھری تحریک کے بعد سے انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب نے یورپ کی سیاست و معیشت اور معاشرت و تمدن کو جس نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے اُسکے بعد اُسے مسیحی سمجھنا خود کو ایک بہت بڑے مغالطے میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ اب تو یورپ کا مذہب دراصل چند افکار پریشاں کے سوا اور کچھ نہیں۔ البتہ ان افکار پریشاں کی بنیاد اس مادی ماحول کی نظر فریب ترقیوں پر رکھی گئی ہیں جن کا مظاہرہ یورپ کے چپے چپے پر نظر آتا ہے۔ اس لئے کسی مذہبی معاملے میں اگر یورپ کے کسی آدمی کو غیر مسیحی انداز بیان اختیار کرتا دیکھیں تو اس کا مطلب رواداری و روشن خیالی ہرگز نہیں ہے بلکہ اسی طرح اگر اسلام یا کسی دوسرے مذہب کے کسی شعبے کے متعلق اُس کے قلم سے کوئی اچھی رائے آپ کی نظر سے گزر جائے تو اس کا بھی کوئی تعلق فراخدلی و وسعت قلبی سے نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہی اُس پریشانی افکار کا جس کے سامنے حقیقت کا جلوہ مربوط و منظم شکل میں ہے ہی نہیں۔ اس لئے کبھی تو یہ کسی چیز کی حمایت کر دیتے ہیں اور کبھی مخالفت۔ البتہ بنیاد ان افکار کی مادیت ہی پر قائم ہوتی ہے اسی بنیاد پر ندوی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے کہ اگرچہ ظاہر میں آجکل کے متمدن یورپ میں اور عہد جاہلیت کے کفر پسند عربوں میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں کے خیالات آج بھی ایک ہی اثر سے متاثر ہیں۔ فرق صرف الفاظ کا ہے۔ وہ لوگ جس چیز کو سحر یا جادو کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی کو آج کل ہپناٹزم یا مسمریزم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

غرض یہ مضامین دراصل ایسے مستقل خیالات و افکار کا مجموعہ ہیں جو آپ کے سامنے نہ صرف اسلام کو صحیح رنگ میں پیش کرتے ہیں بلکہ اسلام کے اُن مدعیان دوستی افراد کو بھی بے نقاب کرتے ہیں جو اسلام کو غیر اسلامی رنگ میں پیش کر کے اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

ظل و نور

انسان جب اپنے اصلی رنگ میں بولتا ہے تو اپنی ہی بولی بولتا ہے، ہر فن میں کلام کرنے والا جب اپنے فن میں کلام کرتا ہے تو اسی زبان میں مقید رہتا ہے جو اس فن کے لئے مختص ہے۔ ایک معمولی شخص معمولی طور پر یہی کہیگا کہ "زید کو اس وقت تیز بخار ہے" مگر ایک ڈاکٹر جب اپنی زبان میں بات کریگا تو یوں کہیگا کہ زید کا ٹمپریچر اس وقت ایک سو پانچ ہے۔ الفاظ بظاہر مختلف مگر باطن ہم معنی ہیں اگر فرق ہے تو بس اسی قدر کہ پہلے فقرہ میں اجمال ہے اور دوسرے میں کسی قدر تفصیل۔

ایک دوست کے اصرار پر میں بھی اس وقت "ظل و نور" کے متعلق صوفیانہ رنگ میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تصوف کے مضامین کا حق تصوف ہی کی زبان کچھ ادا کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین میرے اس مضمون کو چیستان سے زیادہ وقعت نہ دیں لیکن غور و خوض کرنے والی طبیعتیں یقیناً اس سے محظوظ ہوں گی اور پانے والی بات کو پائیں گی۔

ظہور کائنات سے قبل ایک زمانہ تھا جس پر نہ زمانہ کا اطلاق ہوتا تھا نہ وقت کا۔ اس وقت نہ زمان تھا نہ مکان۔ نہ ازل نہ ابد۔ نہ تحت نہ فوق نہ ارکان تھے نہ عناصر۔ صرف ذات مطلق تھی اور کچھ نہ تھا۔ کَانَ اللّٰهُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَهٗ شَیْئًا۔

تخلیق کائنات کی جب پو پھٹی، ظہور کائنات کا جب آفتاب طلوع ہوا، تو جملہ اشیاء عدم سے وجود میں آئیں۔ اشیاء کو ظلمت عدمی سے نور وجود کی جانب لانے کا ہی نام تخلیق ہے۔ صوفیا کرام کی اصطلاح میں جملہ ظہورات و تعینات کو، وجود اضافی کو جو اعیان ممکنات تعینات کے ساتھ ظاہر

ہوتا ہے معدومات ظاہرہ کو جو انوارِ الٰہی کی چمک سے ظہور پکڑتے ہیں ظلّ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور
نور وہ روشنی وہ چمک وہ قوت، وہ قدرت ہے جس سے یہ معدومات وجود میں آکر ظاہر ہوتے ہیں۔ نور
ایک اسم ہے اسماء الٰہی میں سے جو تقریباً مترادف ہے اسم الظاہر کے احکامِ ممکنات جو در اصل معدومات
سے ہیں اسم نور سے ظاہر ہوئے۔ اس ظہور کو وجودِ اضافی اور وجودِ خارجی کہتے ہیں۔ یہ اضافی یا خارجی
وجود معدومات میں ظلمتِ عدمی ہے۔ وہ نور جو صورِ معدومات میں ظاہر ہوا ظلّ ہے۔ کیونکہ موہوم ہے
اور منقول ہے اور فی نفسہا معدومات کی عدمیت ہے۔ تو گویا جن معدومات کا ظہور ہوا وہ بھی ظلّ
ہیں اور جس نور کے سبب ان کا ظہور ہوا وہ نور بھی ظلّ ہے۔

عالم کو حق تعالیٰ سے وہی نسبت ہے جو سایہ کو اس شخص سے ہے جس کا کہ وہ سایہ ہے۔ عالم جس
پر کہ غیرِ حق کا اطلاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ظلّ ہے یہ ظلِّ الٰہی جیسے کہ عالم کہتے ہیں اعیانِ ممکنات میں
ظاہر اور ممتد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ فرقان میں فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ
کیا تو نے اپنے رب کی طرف نظر نہیں کی کہ اس نے وجودِ اضافی کو ممکنات پر کس طرح پھیلایا؟ وَلَوْ شَاءَ
لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا اور اگر وہ چاہے تو اس کو ساکن کر دے۔ یعنی وجودِ اضافی کو اپنی ذات میں بالفعل سے
بالقوۃ کر دے۔ گویا حق تعالیٰ کی ہستی ایسی نہیں کہ جب وہ ممکنات میں تجلی فرما دے تب ظاہر ہوا اور تجلی
نہ فرمانے کی صورت میں مثل ممکنات کے ہو جاوے جن کا کوئی عین ہی وجود میں ظاہر نہیں۔ ثُمَّ
جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا۔ پھر ہم نے اس سایہ پر آفتاب کو دلیل و رہنما بنایا۔ آفتاب سے
ظلّ نمائی ظہور میں نہ آتی تو آفتاب کی روشنی کو کوئی نہ پہچانتا۔ اگر آفتاب ایک ہی حالت پر قائم رہتا
اور صبح و شام نہ ہوتی اور سایہ کی طوالت میں کمی بیشی نہ واقع ہوتی رہتی تو نہ کسی کو نور کا شعور ہوتا نہ
کوئی اس نور کو آفتاب سے نسبت دیتا۔ گویا آفتاب کے نور سے سایہ پہچانا جاتا ہے۔ اور سایہ
سے آفتاب کا نور۔ وہ آفتاب اسم نور ہے جس سے وجودِ ظلمی کی شناخت ہوتی ہے۔ ثُمَّ

قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا۔ پھر ہم اس کو اپنی طرف تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ کرکے لیتے ہیں۔ یہ اس لیئے کہ وہ اسی کا ظل ہے اور اسی کی طرف جملہ امور پلٹتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر چیز کی اصل ہے پس جملہ تعینات باعتبار ہویت حق کے حق تعالےٰ ہی کا وجود ہے اور باعتبار صورتوں کے اختلاف کے وہ سب تعینات اعیان ممکنات ہیں جس طرح صورتوں کے اختلاف سے ظل کا نام اس سے دور نہیں ہوسکتا اسی طرح اس اختلاف کی بناء پر عالم اور غیر حق کے نام بھی اس سے دور نہیں ہوسکتے۔

جب عالم ایک ظل یا مجموعہ ظلال ہے تو عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ظلی وہمی، خیالی، اور اعتباری ہے حقیقت سے ناواقف خیال کرتا ہے کہ عالم حق تعالےٰ سے خارج ایک شئے زائد ہے نیز یہ کہ عالم قائم بنفسہ ہے، حالانکہ دراصل ایسا نہیں۔ سایہ کو اصل سے جو اتصال ہے اس کا ٹوٹنا محال ہے۔ کوئی چیز سایہ کو اصل سے جدا نہیں کرسکتی۔ ہر شخص اپنے عین کو پہچاننے کی کوشش کرے تو اسے معلوم ہوجائیگا کہ وہ کون ہے؟ اس کی ہویت کیا ہے؟ کس اعتبار سے اس پر کون سا اسم صادق آتا ہے؟ جہت حق اس کی کونسی ہے اور جہت خلق کونسی؟ اس معرفت کی کمی و بیشی پر عارفوں کی بصیرت کی کمی و بیشی کا تفاوت ہے۔ اس کمی و بیشی کی مثال یہ ہے کہ ایک آئینہ خانہ متصور کرو جس میں بیشمار چھوٹے اور بڑے سیدھے اور ٹیڑھے صاف اور دھندلے، سپید اور رنگ برنگ کے آئینے لگے ہوئے ہیں جن پر ایک ہی رنگ کی روشنی پھینکی جارہی ہے۔ دیکھنے والے کی نگاہ میں آئینہ کی رنگت اور صورت کے مطابق وہ روشنی بھی رنگ و صورت اختیار کرلیتی ہے۔ حالانکہ اس روشنی کا اصلی رنگ و صورت وہ نہیں۔ چھوٹے آئینے میں چھوٹی اور بڑے آئینہ میں بڑی صورت نظر آتی ہے۔ سیدھے میں سیدھی اور ٹیڑھے میں ٹیڑھی۔ صاف آئینہ میں صاف اور دھندلے میں دھندلی نظر آتی ہے۔ اسی طرح جو بندہ بوجہ اپنی صفائی کے حق تعالےٰ کے ساتھ زیادہ متحقق ہوجاتا ہے اس میں حق تعالےٰ کے مظاہر زیادتی کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ حق تعالےٰ ان کے لئے سمع و بصر و کلام اور کل قویٰ و جوارح بن جاتا ہے

لیکن باوجود اس قرب واتصال کے بندہ ظل ہی رہتا ہے۔ یہ بندہ بوجہ اپنی صفائی کے ایک ایسا شیشہ ہوتا ہے کہ اسے ظل نوری کہتے ہیں۔ ہر شخص بوجہ ظل ہونے کے محض خیال ہوتا ہے اور اس بندہ کے جملہ مدرکات اور یہ تمام موجودات جس پر غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے خیال در خیال ہے۔ وجود حق باعتبار اپنی ذات و عینیت کے اللہ ہی ہے نہ کہ باعتبار اسماء کے جن میں کثرت ہے۔ ہستی میں احدیت ہے اور خیال میں کثرت جو کثرت میں قائم رہا وہ عالم میں اسماء الٰہیہ اور اسماء کونیہ کا قرین رہا۔ اور جو احدیت پر قائم رہا اسے اس ذات اقدس کی معیت حاصل ہوئی جو غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔ یہ استغناء اسماء سے بھی ہے۔ اور مسمیات سے بھی۔ اللہ تعالیٰ کی وہ احدیت جو باعتبار اسماء الٰہیہ کے ہے۔ احدیت الکثرت کہلاتی ہے۔ اور وہ احدیت جو ان اسماء سے مستغنی ہونے کی جہت سے ہے، احدیت عینی کہلاتی ہے۔ ان دونوں جہتوں پر اسم احد کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظلال ہی کی بدولت اور ظلال کے داہنے بائیں کروٹیں لینے کے سبب سے بندہ کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور بندہ پہچاننے لگتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ سے اور حق تعالیٰ کو اس سے کیا نسبت ہے؟ ماسوائے کیوں فقر و ناداری و نیستی سے متصف ہے اور حقیقت الٰہیہ کی جانب اسے کیونکر احتیاج کلی ہے؟ اور حق تعالیٰ کے لوگوں اور عالموں سے مستغنی ہونے کی کیا حقیقت ہے؟

عالم اللہ کا محتاج ہے بسبب اسماء الٰہیہ کے۔ اور اسماء الٰہی وہ اسماء ہیں جن کے تحت میں عالم کے لوگ اور عالم کی چیزیں باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں یا عین ذات حق تعالیٰ کی محتاج ہیں کیونکہ ہمارے اسماء یا ہماری ذات بھی اللہ ہی کے اسماء ہیں۔ اور ہمارے اعیان نفس الامر میں اسی کے ظل ہیں۔ اور اس کے غیر نہیں۔ باعتبار حقیقت کے وہ ہماری ہویت ہے لیکن باعتبار تقید کے وہ ہماری ہویت نہیں۔ لہٰذا وہ مِنْ وجہٍ بندہ کی ہویت ہے اور من وجہٍ بندہ کی ہویت نہیں۔

اب ذرا آیت نور کی بھی سیر فرما لیجئے جس کو اس مضمون سے قوی تعلق ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِهٖ	اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے
كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ	نور کی مثال مانند طاق کے ہے۔ جس کے بیچ میں
زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ	چراغ ہو۔ وہ چراغ شیشہ کی قندیل میں ہے شیشہ
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ	کی وہ قندیل گویا کہ تارہ ہے چمکتا ہوا۔ روشن کیا
لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا	جاتا ہے وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت سے
يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰى	جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ نزدیک ہے کہ تیل اس کا روشن
نُوْرٍ ط يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط وَ	ہو جاوے۔ اگرچہ نہ لگے اس کو آگ۔ نور پر نور ہے
يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰهُ	اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی جانب ہدایت فرماتا
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (النور ع ۵)	ہے۔ اور بیان فرماتا ہے مثالیں واسطے لوگوں کے

اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

سموات سے یہاں ارواح مراد ہیں اور ارض سے اجساد۔ مشکوٰۃ جسم انسانی ہے۔ مصباح روح ہے جو مثل چراغ کے روشن اور روشن کنندہ ہے۔ زجاجہ قلب عبد ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے نور وجود سے آسمانوں اور زمین کا اشراق فرمایا بعد اس کے کہ جو حجابات اس کے اور ان کے درمیان تھے انہیں وہ اٹھا چکا تھا۔ حجابات کے اٹھا دینے سے یہ مراد ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ ان میں ہے ان میں اللہ تعالےٰ نے اپنا نور قبول کرنے کی صلاحیت پیدا فرمادی جس طرح کہ آئینہ میں صیقل کر دینے سے صورتوں کے قبول کرنے کی آئینہ میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کے نور کے اس عالم میں ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ روح انسانی بدن انسانی میں مصباح یعنے روح ہے۔ یہ روح قلب یعنے زجاجہ میں ہے۔ شجرۃ مبارکہ سے نفس انسانی مراد ہے انواع واقسام کے فیوض قبول کرنے کی قابلیت۔ لاشرقیۃ سے اشارہ ہے عالم مجردات کی جانب

نیز یہ اشارہ بھی ہے کہ اس میں کمالات بالفعل ہیں۔ اور لا غربیہ سے مراد ہے کہ وہ اجسام کثیفہ،
ظلمانیہ میں سے نہیں۔ یکاد زیتہا سے یہ مراد ہے کہ اس میں خود ہی چمک اٹھنے کی استعداد موجود ہے۔
ولو لم تمسسہ نار یعنی حرارت غریزہ کا روح انسانی کے ساتھ کوئی مدبرانہ تعلق نہ ہو۔ نور علیٰ نور سے
وہ نور مراد ہے۔ جو اس نور انسانی کے مافوق ہے اور وہ نور الٰہی ہے۔ یھدی اللہ لنورہ من یشآء
اللہ تعالٰے ہی جسے چاہتا ہے اس نور کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔
ویضرب اللہ الامثال للناس۔ یہ صرف مثالیں ہیں جو لوگوں کے لئے اس غرض سے بیان کی گئی ہیں
کہ حقیقت حال تک پہنچنے میں لوگوں کو ذرا مدد ملے ورنہ حقیقت تو ان سے ماورئی ہے۔ واللہ
بکل شئ علیم۔ اور ہر قسم اور چیز کے پورے پورے علوم یعنی جمیع علوم ظاہری و باطنی کا خزانہ حق
تعالٰے ہی کے پاس ہے۔ وہ اس میں سے جتنا جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

القاء-الہام-وحی

ہر وہ چیز جو بطریق استدلال حاصل نہ کی گئی ہو بلکہ قلب سالک پر حق تعالیٰ کی جانب سے یقین کامل کے ساتھ وارد ہوئی ہو القاء ہے یا الہام ہے یا وحی ہے۔

ابتداءً سالک کے قلب پر خطرات رحمانی وارد ہوتے ہیں۔ انتہا میں جاکر حق تعالیٰ سے مکالمت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت کو القاء اور انتہائی حالت کو الہام اور وحی کہتے ہیں۔ وحی چونکہ القاء و الہام کی انتہائی اور کامل ترین صورت کا نام ہے اس لئے اس لفظ کا استعمال کبھی کبھی القاء و الہام کے معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ بلکہ دل میں وسوسہ ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال کر دیا جاتا ہے۔ وسوسہ ڈالنے والا خواہ کوئی بھی ہو۔ مثلاً حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ (۶:۱۱۲)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے کچھ آدمی اور کچھ جن جنمیں سے بعض بعض کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

لیکن اس مضمون میں وساوس شیطانی سے بحث نہیں بلکہ اس القاء و الہام اور ان خطرات رحمانی سے بحث ہے جو حق تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر وارد ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کو الہام ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوتی ہے۔ الہام حق تعالیٰ کی جانب سے بندہ پر بلا کسی فرشتہ کی وساطت کے اس جہت سے فائز ہوتا ہے جو حق تعالیٰ

کہ ہر موجود کے ساتھ ہے وَ لِکُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا [اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے کہ وہ منہ پھیرتا ہے اس کی طرف (۲: ۱۴۸)] سے اسی جہت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے۔ وحی فرشتہ کے واسطے سے ہوتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث قدسی کو وحی و قرآن نہیں کہتے۔ وحی کشف شہودی و معنوی دونوں ہے۔ الہام صرف کشف معنوی ہے۔ وحی مخصوص بہ نبوت ہے، ظاہر سے متعلق ہے۔ اور تبلیغ کے ساتھ مشروط ہے۔ الہام ولایت کے ساتھ مخصوص ہے اور تبلیغ کے ساتھ مشروط نہیں۔

یہ اجمال کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے جو حسب ذیل ہے۔

حق تعالےٰ کا تعلق کائنات کیساتھ اس نوع کا نہیں جس نوع کا تعلق کا ایک گھڑی ساز یا گھڑی رکھنے والے کا گھڑی کے ساتھ ہوتا ہے۔ گھڑی ساز گھڑی کے کل پرزوں کو بناتا ہے درست کرتا ہے اور انہیں ترتیب دیکر گھڑی کو چلا دیتا ہے یا گھڑی رکھنے والا رات دن میں ایک بار گھڑی کو کوک دیتا ہے۔ اور چوبیس گھنٹے کے لئے اس سے فراغت پالیتا ہے۔ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اور دوسرے دن تک اپنی رفتار قائم رکھنے کے لئے اپنے مالک کے چابی دینے یا گھڑی ساز کی نگرانی کی محتاج نہیں ہوتی۔ حق تعالےٰ کو کائنات کے ساتھ اس قسم کا تعلق نہیں۔ بلکہ کائنات اپنے ابداع اور اپنی تخلیق کے بعد بھی اپنے قیام کے لئے ہر لمحہ اور ہر ساعت حق تعالےٰ کی توجہ کی محتاج رہتی ہے ایک لمحہ کے لئے نظر حق اس کی جانب سے ہٹ جائے تو ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے۔ حق تعالےٰ ہر وقت کائنات کی جانب متوجہ رہتا ہے۔ اس متوجہ رہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذات وصفات سے کائنات پر متوجہ رہتا ہے۔ صفات میں ایک بہت بڑی صفت صفت کلام بھی ہے جس سے حق تعالےٰ اپنی مخلوق کی جانب ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی کوئی صفت کسی وقت بھی معطل نہیں رہتی۔ وہ اپنی مخلوق کے ہر فرد سے اس فرد کی استعداد کے مطابق ہمکلام ہوتا رہتا ہے

کسی کو براہ راست ہمکلامی کا شرف عطا فرماتا ہے جیسے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا یعنی اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السّلام سے خوب گفتگو کی۔ کسی سے وحی کے ذریعہ کلام فرماتا ہے کسی سے ہمکلامی کی یہ شان ظاہر فرماتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ اس کے دل میں جو چاہتا ہے القاء فرماتا ہے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السّلام کی والدہ کے دل میں القاء فرمایا تھا۔ نیز عیسےٰ علیہ السّلام کی والدہ کے دل میں القاء فرمایا تھا۔ کسی سے مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ یعنے پردہ کے پیچھے سے کلام فرماتا ہے کسی کے دل میں براہ راست یعنی بلا وساطت فرشتہ جو چاہتا ہے القاء فرماتا ہے۔ جیسے شہد کی مکھی کو القاء ہوتا ہے اور اس القاء کو بھی وحی سے تعبیر فرمایا جاتا ہے چنانچہ حق تعالےٰ فرماتا ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (اور وحی فرمائی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف) کسی سے بذریعہ خواب و رویائے صالحہ باتیں ہوتی ہیں غرض کہ ہمکلامی کی جتنی شانیں اور جتنے ذرائع ہیں خواہ وہ القاء کے نام سے موسوم ہوں۔ خواہ الہام کے نام سے خواہ کسی اور نام سے وہ سب حقیقت وحی ہی کی مختلف اقسام یا مختلف فروع ہیں یا صرف قوت اور کمزوری یا کشف و حجاب کے اختلافات سے مختلف اسماء سے وہ مختلف ذوع موسوم ہیں۔ اور سب سے زیادہ واضح طریقہ ہمکلامی کا وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تو اس وحی اصطلاحی کی صحیح تعریف حسب ذیل ہوگی۔

"وحی کلام الٰہی ہے جو عالم غیب سے عالم شہادت کی جانب بذریعہ ایک مقرب فرشتہ کے جنہیں جبرئیل (علیہ السّلام) کہتے ہیں۔ رسولوں کے پاس پہونچایا جاتا ہے"

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا	اور نہیں طاقت کسی بشر میں یہ کہ کلام کرے ساتھ اس کے
وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ	اس سے اللہ مگر بذریعہ وحی کے یا پردہ کے پیچھے سے
فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ	یا کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے پس وہ اسکے حکم

عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ
تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ
وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ
مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ
لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝
(الشوریٰ۔ رکوع ۵)

سے وہ چاہتا ہے جو میں ڈالدیوے تحقیق وہ بلند
مرتبہ حکمت والا ہے اور اسی طرح وحی کی ہم نے طرف
آپ کے (اے محمد) روح کو ساتھ حکم اپنے کے نہ جانتے
تھے آپ کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان ولیکن کیا ہے
ہم نے اس کو نور۔ ہدایت کرتے ہیں ہم ساتھ اس کے
جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے اور تحقیق آپ
البتہ ہدایت کرتے ہیں۔ طرف سیدھی راہ کے۔

بلحاظ ضعف وقوت اور بلحاظ زیادہ واضح اور کم واضح ہونے کے وحی کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ سب سے زیادہ قوی اور اکمل ہے اس مرتبہ میں علوم غیب اللہ کی طرف سے رسول کی عقل پر ظاہر کئے جاتے ہیں اور رسول کے نفس میں ان علوم کو اس طرح منقش کیا جاتا ہے کہ رسول انہیں اپنے دل میں یاد رکھ سکے اور دوسروں کے سامنے بیان بھی کر سکے۔

اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالےٰ بلا واسطہ کلام کرے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حق تعالےٰ فرماتا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (اور اللہ تعالےٰ نے موسیٰ سے خوب گفتگو کی) اور ہمارے حضور کے متعلق فرماتا ہے فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کرنی تھی وہ کر دی) اسے وحی صریح کہتے ہیں۔

وحی کے پہلے مرتبہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کلمات مقررہ اور عبارات معینہ کے ساتھ نازل ہوں اور حروف وصورت رسول کے کانوں تک پہنچا دیں اور معانی ان کے قلب میں القاء کریں۔

یہ دونوں صورتیں انبیاء کے لئے مخصوص ہیں۔

دوسرا مرتبہ جو پہلے مرتبہ کے مقابلہ میں کمزور اور کمتر درجہ کا ہے یہ ہے کہ کلام الٰہی اس نفس تک پہنچ جائے جو اس کلام کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو جیسے کہ موسٰے علیہ السّلام کی والدہ کے دل میں اللہ تعالٰے نے یہ بات ڈال دی کہ وہ موسٰی علیہ السلام کو دودھ پلا کر صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں۔ اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰٓی ۙ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ ۝ [جس وقت کہ وحی ڈالی ہم نے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے اب یہ کہ ڈال دے اس کو بیچ صندوق کے پس ڈال دے اس کو بیچ دریا کے (طٰہٰ۔ ع۲)]

اس وحی خفی اور تعلیم سری کے القاء نے ان کی والدہ کے نفس کو خواب جہالت سے بیدار کر دیا اور ان کا دل اپنے بیٹے کے متعلق تردد اور دشمنوں کے خوف سے مامون ہو گیا۔ اسی نوع کی وحی عیسٰی علیہ السّلام کی والدہ حضرت مریم کو بھی ہوئی تھی جبکہ درخت کے نیچے سے ان کو آواز آئی کہ غمگین مت ہو۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّکِ تَحْتَکِ سَرِیًّا۔ [پس پکارا اس کو (یعنی مریم کو) اس (درخت) کے نیچے سے کہ غم مت کھا تحقیق تیرے پروردگار نے تیرے نیچے چشمہ کر دیا ہے۔ (مریم ع۲)]

یقینی امر ہے کہ موسٰی علیہ السّلام کی والدہ اور عیسٰی علیہ السّلام کی والدہ پیغمبر نہ تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی کا یہ مرتبہ جسے القاء اور الہام کہتے ہیں حق تعالٰے نے ان لوگوں کیلئے بھی رکھا ہے جو نبی یا رسول نہیں خضر علیہ السّلام کو علم لدنی کی تعلیم ہوئی جن کی بابت حق تعالٰی فرماتا ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (اور ہم نے ان کو اپنے خاص علم میں سے تعلیم کیا (الکھف ع۹)) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔ اِنَّ لِلّٰهِ فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ عِبَادٌ مُحَدَّثُوْنَ وَاِنَّمَا رَاٰی بَعْضُ صَحَابِهٖ۔ یعنی بیشک ہر امت کے اندر اللہ تعالٰے کے ایسے بندے ہیں

جن سے اللہ تعالےٰ ہمکلام ہوتا ہے پھر آپ نے اپنے بعض اصحاب کی جانب اشارہ فرمایا بعض روایات کی رو سے حضرت عمرؓ کی جانب اشارہ فرمایا۔

تیسرا مرتبہ وحی کا جو دوسرے مرتبہ سے بھی ضعیف تر ہے یہ ہے کہ حق تعالےٰ نفوس کو ان کاموں کی تعلیم فرماتا ہے جو ان نفوس کے مقاصد سے متعلق ہیں۔ اور وہ نفوس اس وحی کے سبب سے ان صنایع و بدایع کا استخراج کرتے ہیں جو ان کی قوت اور استعداد کے اندر ہیں۔ جیسے مکڑی کا جالا بُنا۔ ریشم کے کیڑے کا ریشم تیار کرنا۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اِنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (وحی کی تیرے رب نے طرف شہد کی مکھی کے کہ پہاڑوں میں اپنا گھر بنا (النحل۔ ع ۹)

مکھی پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا۔ نہ اللہ تعالےٰ نے حروف و صوت سے اسے خطاب فرمایا۔ بلکہ اس میں ایک بات کی استعداد پیدا کر کے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنی استعداد کو جنبش میں لائے اور اپنا کام کرے۔

نفوس ناطقہ جب ایک حد تک کمالاتِ معنوی حاصل کر لیتے ہیں۔ طبیعت کی کدورتوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ خواہشات کی قیود سے آزاد اور بشریت کے مقتضیات سے برتر ہو جاتے ہیں تو فطرتًا ان کی توجہ عالم سفلی سے ہٹ کر عالم علوی کی جانب مائل ہوتی ہے۔ خصائل ملکوتی کا ان پر غلبہ اور علوم آسمانی کی تحصیل کا شوق انہیں دامنگیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کی ہمنشینی کا انہیں شرف حاصل ہوتا ہے اور اس ہمنشینی سے وہ راحت پاتے ہیں۔ ان ہی ملائکہ کے واسطہ سے خوش قسمت نفوس کو کلام الٰہی سننے کی دولت نصیب ہوتی ہے اور صحبت ملائکہ کے اثرات سے متاثر ہو کر وحی کی مختلف شاخوں اور عالم قدس کے مختلف پھول پتوں اور علوم غیب کے مختلف پھلوں سے وہ شکم سیر ہوتے ہیں۔

علم کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ظاہری اور باطنی ظاہری طریقہ تو وہی معمولی طالب علم کا طریقہ ہے جو بہت عام ہے۔ اور باطنی طریقہ مراقبہ اور تفکر کا ہے۔ مراقبہ اسے کہتے ہیں۔ کہ دل کو دوسرے خیالات سے ہٹا کر ایک ہی خیال پر جما دیا جائے۔ اور اسی خیال کے اندر فکر میں منہمک ہو جائے۔ اور تفکر یہ ہے کہ نفس ان علوم کو جو کہ اپنے سے مخفی ہیں۔ مدت اور حیلہ اور آلہ کے ساتھ تلاش کرے۔ ایک تیسری چیز اور ہے۔ جسے حدس کہتے ہیں۔ تفکر اور حدس میں یہ فرق ہے کہ تفکر میں تو غور و خوض سے اور بصیرت پر زور دے کر کوئی بات معلوم کی جاتی ہے۔ لیکن حدس میں بغیر سوچے سمجھے اور بلا غور و خوض اور بغیر آلہ یا حیلہ کے دفعتاً ایک بات قلب میں القاء ہو جاتی ہے۔ صاحب حدس یک بیک غیب کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور یکبارگی علم مطلوبہ اس پر منکشف ہونے لگتا ہے۔ بغیر اس کے کہ عرصہ گذرے اور بغیر اس کے کہ وہ ریاضت میں مشغول ہو۔ حدس بمقابلہ فکر کے نفوس کاملہ سے اقرب ہے۔ حدس سے فراست پیدا ہوتی ہے۔ اور فکر سے کیاست۔ کیاست اس زیرکی و دانائی کو کہتے ہیں جس کا تعلق دماغ سے ہے۔ اور فراست اللہ کا اک نور ہے جس سے مومن دیکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ یہی فراست ہے جو حدس سے پیدا ہوتی ہے۔ حدس ہی الہام کا زینہ ہے۔ اور نبوت زینہ ہے وحی کا۔

جب نفس انسانی حدس کی قوت سے عالم بالا کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ اور علوم غیبیہ کے انوار اس پر چمکنا شروع ہوتے ہیں۔ تو ان علوم کا اظہار اس پر رمز کے حجاب اور استعارہ و ابہام کے پردوں کی آڑ میں ہوتا ہے۔ پھر اگر نفس میں اتنی قوت نہیں کہ حالت بیداری میں بھی ظہور کا متحمل ہو سکے تو یہ جلوے اسے خواب میں دکھلائے جاتے ہیں۔ اور غیب کے اسرار عالم رویا

کی صورتوں اور شکلوں اور مثالوں میں متمثل کر کے اس پر منکشف کئے جاتے ہیں۔

عالم رویا کے ذریعہ انکشاف حاصل کرنے کا مرتبہ الہام سے بھی کمتر ہے۔ الہام کا مرتبہ فرشتہ کے نازل ہونے سے جسے وحی کہتے ہیں۔ اور وحی کا مرتبہ صریح مکالمہ سے جسے وحیٔ صریح کہتے ہیں کمتر ہے۔ اسرار غیب کے ظہور کی انتہائی شان صریح مکالمہ کی شکل میں اولوالعزم رسولوں کے لئے مختص ہے۔ وحی انبیاء میں سے رسولوں کے لئے مختص ہے۔ وحی فی المنام یعنی خواب میں وحی ہونا محض انبیاء کے لئے ہے۔ الہام کی دولت سے اولیاء اللہ نوازے جاتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کے نفوس ظاہرہ جب اپنے عنصری قالبوں کی قید سے رہائی پاکر آسمان مکاشفہ کی بلندیوں پر پرواز فرماتے ہیں تو اللہ تعالےٰ ان سے ان کے مقام معاد میں خطاب صریح کے ساتھ کلام فرماتا ہے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مامن عبد الّا ویکلمہ ربہ لیس بین العبد والرب ترجمان ولا واسطۃ (متفق علیہ) یعنی ہر ایک مومن بندے سے خداوند تعالےٰ کلام فرمادیگا۔ اور اس وقت خدا اور مومن بندے کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا نہ کوئی واسطہ۔

القاء اور الہام میں کسب کو کسی قدر دخل ہے۔ مگر وحی میں کسب کو مطلق دخل نہیں۔ ریاضت اور مجاہدہ سے یہ دولت ہاتھ نہیں آتی جس طرح نبوت محنت و مجاہدے سے حاصل نہیں ہوتی۔ وحی بھی کوشش انسانی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ الہام کے ذریعہ صرف معانی کا انکشاف ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعہ معانی کا بھی انکشاف ہوتا ہے اور کشائف تنزیلات کا بھی اور نزول روح القدس یعنی جبرئیل کا بھی۔ روح القدس اور جبرئیل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جبرئیل میں لطافت کا جب غلبہ ہوتا ہے تو وہ روح القدس ہو جاتے ہیں اور جب ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ مکشوف ہو سکیں تو وہ جبرئیل ہو جاتے ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے تو روح القدس

یا روح الامین معانی کو رسول کے قلب میں منقش کرتے ہیں۔ اور الفاظ و عبارت کو جبرئیل رسول کے کان میں القاء کرتے ہیں۔ پھر مسموع اور معقول کان اور دل کی راہ سے ذات رسول میں مجتمع ہو جاتے ہیں، اور رسول کی زبان و توجہ ان دونوں کے فیضان میں مصروف ہو جاتی ہے

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعرء ع)

روح الامین نے (یعنی جبرئیل نے) اپنی شان لطافت سے اس کو تمہارے قلب پر نازل کیا ہے تاکہ تم عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہو، اس کو عربی زبان میں جو سب زبانوں میں روشن اور مبین ہے نازل کیا ہے۔

انبیا وحی کی قوت سے ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جن چیزوں کو اولیاء اللہ الہام کی قوت سے نہیں دیکھ سکتے۔ انبیاء کلمات وحی کو اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ معانی کو دل میں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ الہام میں سوائے انکشافِ معنیٔ مجردۂ مخفیہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

قرآن مجید اور جرمنی

ترجمہ تقریر بیرن عمر رالف ایرن فلس

آسٹریا کے نومسلم امیر عمر رالف ایرن فلس حال ہی میں ہندوستان تشریف لا چکے ہیں۔ ان سیاحت کے دوران میں چند روز ان کا قیام حیدر آباد میں بھی رہا۔ انہوں نے مجلس تحریک قرآنی کی استدعا پر ایک تقریر عنوان مندرجہ بالا پر کی تھی۔ جسے عموماً پسند کیا گیا مولوی سید شریف الحسن صاحب بی۔اے نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ جناب ذوقی شاہ صاحب کے حواشی بھی ہیں جن میں انہوں نے بیرن عمر کے بعض خیالات کی اصلاح فرمائی ہے۔ ذیل میں وہ تقریر معہ حواشی درج کی جاتی ہے)۔

جرمنی اپنی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے والا ہے۔ موجودہ سیاسی اور ذہنی حالات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں جرمنی کو جو مصیبتیں اور تمدنی شکستیں اٹھانی پڑیں ان سے جرمنی کی قوتوں کو بالکل نقصان نہ پہنچ سکا۔ فنا کرنا تو درکنار یہ مشکلات ان قوتوں کو کمزور تک نہ کر سکیں۔

جرمنی میں سرعت کے ساتھ جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سے ایک اجنبی شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ جرمن قوم کی اخلاقی اور قومی قوتیں بالکل زائل ہو چکی ہیں لیکن حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے اُس قوم کی ذہنیت زندگی کی نئی حالتوں اور نئے نئے نصب العین تلاش کرنے میں بہت مضبوط ہے۔ دیانت دار اور اخلاص پسند واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ زندگی کے پرانے اصول اور نصب العین ایک ایسی یورپین قوم کو ہرگز مطمئن نہیں کر سکتے جو حقیقتہً متمدن ہے اور ہمیشہ نئے اصولوں کو کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔

آج کل جرمنی میں دو جماعتیں ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ ان میں سے ایک تو بالکل بین الاقوامی خیال کی ہے اور وہ اس خیال کی بھی تائید کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ فوجی قوت سے اپنی حفاظت کی جائے دوسری جماعت خالص قومیت کی حامی ہے اور وہ فوجی قوت اور جنگ کی مخالف نہیں ہے اگرچہ یہ امر یقینی ہے کہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ دونوں فریق اپنے اپنے خیالات میں ترمیم کر لیں گے لیکن ان دونوں میں سے کسی میں بھی روحانیت نہیں ہے کہ اسکی روشنی میں وہ انسان کے ذاتی اور ذہنی نصب العین متعین کر سکیں۔ ہاں البتہ چند اصول ایسے ہیں جو پوری قوم کی بھلائی یا متفرق جماعتوں کی بہبود میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انفرادی اور قومی قوتوں کا ارتقا کسی نہ کسی نئے نصب العین یا مدارِ حیات کی بنا پر ہوا ہے۔

اس لئے یہ امر غالب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید جیسی لبریز ہدایت کتاب جس میں سوشل مشکلات کے حل کے ساتھ ساتھ انفرادی قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایات بھی موجود ہیں۔ جرمنی کے لئے موجودہ حالت میں بے نظیر مددگار ثابت ہو گی۔ میرا یہ خیال بالکل قرین قیاس معلوم ہوگا اگر ہم اس واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کا موجودہ زوال قرآنی تعلیمات سے

بے خبری کی وجہ سے ہے نہ کہ قرآنی تعلیمات کی وجہ سے جیسا کہ کسی زمانہ میں باور کیا جاتا تھا۔
اپنے اس خیال کی تائید میں میں حیدرآباد کی مثال پیش کرتا ہوں جہاں ۹۵ فیصدی ہندو آبادی اور ایک بہت ہی مختصر سی مسلمان آبادی کے درمیان پورا پورا اتحاد اور رواداریانہ تعلق قائم ہے یہاں قرآن شریف کے دو بنیادی قواعد پر عمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ ملک اس قدر خوش و خرم ہے۔ سب سے پہلے تعلیم و تعلم کا چرچا ہے جس میں اس ملک کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔
مجھے سر اکبر حیدری کے اس لیکچر کو جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیا تھا سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ قرآن کی ہدایات کے مطابق تعلیم و تعلم میں منہمک رہنے کا جذبہ تھا جس نے اس خوبصورت جامعہ کے قیام میں رہنمائی کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اس مشہور سیاسی مدبر سے گفتگو کر کے یہ محسوس کیا ہے کہ قرآن کے اصول رواداری پر عمل پیرا ہونے اور پیغمبر علم کی تعلیم کی خوبیوں کو سمجھنے کا شوق اس ملک کے لوگوں پر اس قدر غالب ہے کہ وہ سب سے پہلے بنی نوع انسان کی فلاح اور ریاست کی بہبود مدنظر رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی اپنی قوم کی بھلائی دیکھتے ہیں۔

میں نے اعلیحضرت نظام دکن سے شرف ملاقات حاصل کیا وہ اسلامی سادگی اور متانت اخلاق کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ملاقات سے میرے اوپر ایک ایسا اثر ہوا جو کبھی نہ مٹے گا۔ میں اعلیحضرت کے سب سے بڑے صاحبزادے سے بھی ملا جو ولیعہد ہیں اور صدر اعظم سے بھی ملاقات کی جو ایک سچے ہندو کی طرح اسی اخلاص و انہماک سے تمام ملک کی خدمت کرتے ہیں۔
ان سب سے مل کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرا مذکورہ بالا خیال بالکل صحیح ہے۔
آج ممالک اسلامیہ محض اس بنا پر مبتلائے ادبار ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی ہے۔ جہاں جہاں اور جن جن ممالک میں قرآن کے ان دو بنیادی قواعد تعلیم اور رواداری پر صحیح معنی میں

عمل ہو رہا ہے، وہ ممالک ترقی کر رہے ہیں یہیں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جرمنی کا جوش تجسس ان خزائن حکمت کو نظر انداز نہیں کرے گا جن سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔

لیکن مشرقیوں نے ابتک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی ان سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہوگا۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ جرمنی میں قرآن مجید کا رسما کوئی احترام نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت بالکل تاریخی ہے اور وہ علم السنہ میں مدد دینے والی ایک کتاب سمجھی جاتی ہے قطع نظر اس کے اگر ہم اس کی مذہبی حیثیت معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اگر کوئی انقلابی کتاب نہیں سمجھی جاتی تو ایک بالکل نرالی کتاب ضرور سمجھی جاتی ہے صرف یہی واقعہ اس امر پر کافی روشنی ڈالتا ہے کہ وہ لوگ جو جرمنی میں قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات قرآن کے متعلق کس قدر غیر رسمی اور غیر قدامت پسند ہیں ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ مشرقی اور مغربی طرز تخیل طریق تجسس اور اصول حیات میں بین فرق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ہماری مقدس کتاب پر ایک مغربی نگاہ پڑے گی تو قرآن کے نئے معانی اور اسکو سمجھنے کے نئے اصول پیدا ہو جائینگے اور میرے خیال میں یہ کسی صورت سے مضر نہ ہوگا بلکہ خداوند کریم کی طرف سے ایک رحمت ہوگی کیونکہ قرآن مقدس ہم کو بتاتا ہے کہ یہ بات انسانی سرشت میں داخل ہے کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو اور پھر خود ہی تحریف کر کے ان حیرت انگیز حقائق کا غلط استعمال کرے جو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے انسان تک پہونچائے ہیں اس لئے انسان کو اس امر کی ضرورت رہتی ہے کہ اس کی زندگی میں تازہ روح پھونکی جاتی رہے اور ازلی صداقتوں کے لئے تجدید جستجو جاری رکھی جائے۔

زمانہ کے ساتھ انسان کی ذہنی اور جسمانی حالت بدلتی رہتی ہے۔ قدیم عربی ایرانی، ترکی، اور ہندوستانی روایات اپنے زمانہ کے لحاظ سے حقائق ازلی کی بہترین تفسیریں تھیں لیکن جسطرح

سمندر کو انسان کے بنائے ہوئے ایک کوزے میں بھر دینا غیر ممکن ہے اسی طرح قرآن کے حقائق و معارف اور ان خوبیوں کو جو قرآن میں پوشیدہ ہیں ایک ہی انسانی ارتقائی دور میں سمجھ لینا بھی ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے رہنے سہنے اور سوچنے کے طریقوں کو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جرمنی کے قابل اور مذہبی آدمی قرآن کو جس طرح سمجھیں گے۔ وہ اُن تمام اُصول و مبانی سے مختلف ہوگا جن پر اسلامی روایات قائم ہوئی تھیں۔ پھر بھی اسلامی تہذیب کے قدیم مشہور رہنماؤں اور موجودہ یورپ کی نوخیز اسلامی تہذیب کے سربرآوردہ ارکان کے درمیان ایک قوی رشتہ قائم رہیگا۔ یہ بالکل فطری امر ہے کیونکہ یورپ کو اسلامی تعلیم دینے کا بیڑا اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ قدامت پسند حصّہ یعنی ہندوستان نے اُٹھایا ہے۔

اس لئے کہ میں یقین کرتا ہوں کہ آج کل جرمنی اور دوسرے ممالک مغربی کے روحانی اور دماغی قابلیت رکھنے والے جو حضرات قرآن شریف کے مطالعہ میں منہمک ہیں ان کی کوششوں کا نہایت ہی دلپذیر نتیجہ یہ ہوگا کہ از سر نو قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے گا۔

اگر ہم اس بات کا یقین کرلیں کہ مشرق اپنے مذکورہ بالا مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔ تو سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے دماغ پر قرآنی تعلیمات میں سب سے زیادہ کونسی چیز اثر کرے گی؟

جرمن زبان بولنے والے ایک آسٹرین کی حیثیت سے میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ کم سے کم یورپ کا وہ حصّہ جو جرمن بولتا ہے سب سے زیادہ قرآن کی اس تعلیم کی شگفتگی اور قابل عمل ہونے سے متاثر ہوگا جو وہ ہماری روح اور جسم کے ارتقاء کے مابین اتحاد پیدا کرنے کے بارے میں دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یسوع مسیح کی حیرت انگیز تعلیم کہ حقیقتاً خدائی سلطنت تمہارے ہی درمیان ہے، وہی خیال ادا کرتی ہے جو قرآن کے وہ الفاظ ادا کرتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہم سے ہماری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن بدقسمتی سے عیسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ کو یہ مفہوم پہنا دیا گیا کہ خدا مانند انسان کے ہے جس کا مسکن آسمانوں کے اوپر ہے اگرچہ وہ انسان سے زیادہ شاندار اور مہربان خدا بھی ہے اور باپ بھی۔ بخلاف اس کے قرآنی تعلیم نہیں بدلی۔ بلکہ مختلف ادوار ارتقائی میں مختلف اور عارضی معانی بیان کئے گئے ہیں غرض بالآخر وہ لوگ جو خلوص کے ساتھ اس کے معانی کی تلاش میں کوشاں ہیں ان کو ان الفاظ کا صحیح مفہوم یاد آ جائے گا۔ یہی خیال کو اسلام کے احکام میں مدنظر رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عبادت کو لے لیجئے کہ قرآن مجید نے عبادت کے ساتھ حضور قلب کو کس درجہ اہمیت دی ہے۔ جس سے انسانی عمل اور انسانی تہذیب اور انسانی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایک نئی روح سرایت کر جاتی ہے۔ یورپ نے اپنی سائنس دانی کے زور سے فطرت کی بیرونی قوتوں پر حکومت کرنی سیکھ لی ہے۔ اس طرح انسانی قوت حد سے بڑھ کر ناقابل مقابلہ ہو گئی ہے۔ لیکن ان بیرونی قوتوں کے ارتقاء کے زمانہ میں انسان کی اصلی خوشی نے کچھ بھی ترقی نہیں کی محض قوتوں کے حاصل ہو جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان قوتوں کا مالک ان کو اچھے اور مفید مصرف میں لائیگا۔ ایک مالی جس کو دو بیلوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا پانی کھینچیں اگر اس کو دو وحشی بیل دے دیئے جائیں جن کو وہ قابو میں نہیں لا سکتا اور وہ اپنی لڑائی سے اس کے باغ کے تمام پھولوں اور پودوں کو پامال کر ڈالیں، تو اس کو کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اگر وہ مالی ان کو رام کر لے تو وہی بیل اس کے لئے بہت فائدہ مند ہو جائیں گے۔ اس مثال سے آپ خود اندازہ کریں گے کہ یورپ میں اور خاصکر جرمنی میں ان قوتوں کی کیا حالت ہے جو انسانی قبضہ میں تو ہیں۔ لیکن انکا استعمال مواقع پر

نہیں کیا جاتا۔ ہماری روح کی اندرونی اصلاح ہی ہماری روح اور ہماری زندگی کے مابین خوشگوار رابطہ پیدا کرسکتی ہے۔ اگر یہ خوشگوار رابطہ قائم ہوجائے تو ہماری موجودہ مشکلات سب کی سب آج ہی حل ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ موجودہ مشکلات صرف معاشی ہی نہیں ہیں بلکہ موجودہ تہذیب اور اسکے نظام کی پیدا کردہ ہیں ۔

علاوہ اس عام حکم کے قرآن شریف میں صاف طور پر اپنی اجتماعی زندگی کو تعمیر کرنے کے قوانین بتاتا ہے۔ وہ تخیلی اشتراکیت کی طرح انفرادی عمل کی خوبیوں کو نظرانداز نہیں کرتا۔ کیا خوب بات ہے کہ بالشویک گورنمنٹ بھی عملاً اس قیمتی قوت کو نظرانداز نہیں کرسکی ۔ جو انفرادی جوش عمل کا باعث ہوتی ہے ۔ بخلاف اسکے قرآن کا صاف حکم یہ ہے کہ وہ لوگ جو دولت مند ہیں اور جو زیادہ دماغی قابلیت رکھتے ہیں اور جو جسمانی قوت میں زیادہ ہیں ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی جو مالی یا ذہنی یا جسمانی اعتبار سے غریب اور کمزور ہیں مدد کریں اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنے غریب بھائیوں کی ترقی اور اصلاح کے ذمہ دار ہیں۔ اس بارے میں جو اہم احکام ہیں ان کو ہر مسلمان جانتا ہے اور میں اس جگہ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر قرآنی تعلیمات کو جرمنی تک پہونچا دیا گیا تو کیا وہ ان پر اس سے بہتر طریقے سے عمل پیرا ہوسکیگا جیساکہ آج کل بعض اسلامی ممالک میں عمل ہو رہا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ جرمنی ہمیشہ ہر کام کو پوری طرح انجام دینے کا خوگر رہا ہے بس اسلام موجودہ زمانے کی سوشل مشکلات پر حاوی ہونے میں ضرور معاون ثابت ہوگا ۔

اسلام میں عورت کی حیثیت قرآن کی سچی تعلیم کے موافق اس سے بہت زیادہ اچھی ہے جو یورپ نے اس کو دی ہے یہ بات دوسری ہے کہ مقامی رسم و رواج اور رومی اور ایرانی اثرات کی بنا پر اور قرآنی حکم کو مختلف طور پر سمجھنے کی وجہ سے پردے کی رسم معاشرت میں داخل کرلی گئی ہے میں

یہاں پر ایک آسٹرین نومسلم لیڈی بیرونس لطیفہ اے وہسل کی رائے بیان کرتا ہوں۔ وہ لکھتی ہیں۔ کہ قرآن شریف کی رو سے جو معاشی اور طلاق کے حقوق عورت کو حاصل ہوئے ہیں وہ ان حقوق سے اچھے ہیں اور عورتوں کے لئے مفید ہیں جو قبل جنگ یورپ کے قوانین نے عورت کو دیئے تھے اور جو بعض بعض ممالک میں اب تک رائج ہیں۔ مشرقی ممالک میں جو عمل قرآنی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے وہ دوسرا سوال ہے اور اس کو یہاں بحث میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب قرآن کی عملی تعلیم کا تیسرا سب سے زیادہ اہم حصہ قومی مسئلہ کا حل ہے جو حیرت انگیز طور پر کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن نے مختلف مسلم اقوام کو آپس میں منافرت کرنے سے منع کیا ہے بلکہ وہ غیر مسلم افراد اور اقوام سے بھی دل آزارانہ برتاؤ کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اس پر بھی بس نہیں۔ مذہبی معاملہ میں قرآن نے صرف جبر واکراہ ہی کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہم مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ان بے شمار پیغمبروں کو بھی مانیں جو ہمارے پیغمبر صلعم سے قبل ہر ملک اور ہر قوم میں مبعوث ہو چکے ہیں۔ چاہے وہ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ بدھ ہوں یا کرشنا یا چین کے لاؤسی ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی صحیح رواداری کا حیرت انگیز خیال ایک ایسا اطمینان بخش پیغام تھا جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اسلام بنی نوع انسان کے لئے ایک رحمت ہونے والا ہے صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسرے پیغمبروں کے پیروؤں کے لئے بھی۔

ان شاندار اور سب سے زیادہ اہم تعلیمات کے علاوہ قرآن ہماری پوشاک۔ ہمارے فرنیچر اور ہماری تعمیرات کے بارے میں ایک ایسا نیا طریق زندگی بتاتا ہے۔ جو اچھی طرح منظم ہے۔ سادہ ہے اور فطرت سے بالکل قریب ہے۔ یہ تقریر بہت طویل ہو جائے گی اگر میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کروں کہ مشرق میں جو پوشاک اور دیگر رسوم رائج ہیں ان کی قرآن کس طرح مخالفت کرتا ہے اور کس طرح سادے اور تھوڑے کپڑے پہننے پر زور دیتا ہے جو جنوبی ممالک کی آب وہوا

کے عین مطابق ہے کیونکہ ان مقامات میں زیادہ کپڑے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جاتے ہیں
لیکن جیسا میں نے کہا جرمن قرآن کے سمجھنے میں ان روایات کا ہرگز تتبع نہ کریں گے جو مشرق
میں رائج ہیں بلکہ حقیقی قرآن ہی کی پیروی کریں گے میں یہاں بیان کردینا چاہتا ہوں کہ موجودہ
انقلاب نے جرمنی میں ایسے رجحانات پیدا کردیئے ہیں جن کی وجہ سے جرمنی کے موجودہ طرز تعمیر
اور فرنیچر اور پرانے عربی طرز میں مماثلت پیدا ہوگئی ہے (۴) ۔

جہاں حالات اس امر کے موافق ہیں کہ جرمن قوم قرآنی تعلیم سے فائدہ اٹھائے وہاں اس
امر کے امکانات بھی بہت کم ہیں کہ ان تعلیمات کو جرمنی تک پہنچایا جائے۔

اب تک قرآن شریف کے جرمنی میں متعدد ترجمے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے
جس کو کسی مسلمان اور جرمن زبان کے ماہر نے کیا ہو۔ اب تک جو ترجمے ہوئے ہیں وہ علم الالسنہ
کے ماہرین نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھ کر کئے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو اس کی مذہبی تعلیمات اور اسکے
حقائق پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ عربی متن کی خوبیاں ترجمہ میں ظاہر کر
سکیں صرف ترجمہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ ترجمہ میں اصل
کی خوبی اور روح ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ تاکہ پڑھنے والے کے دل پر پورا اثر ہو۔ اس مقصد کو حاصل
کرنے کے لئے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے قرآن کا ترجمہ جرمنی زبان میں شروع کردیا ہے
ہمارے دوست مولٰنا صدرالدین جو یہاں موجود ہیں اس کام کو ڈاکٹر منصور پی ایچ ڈی کی مدد
سے کر رہے ہیں میں ترجمہ پر زبان کو بہتر کرنے کی غرض سے نظرثانی کروں گا۔ یہ مقدس کام اس امر کا
مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس میں مدد دے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سچا مسلمان اسلام کی ترقی میں
مدد دینے سے حتی الوسع پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اس اسلام کو مدد دینے سے جو ہم سب کو اس قدر عزیز
اور پیارا ہے۔

بیرن عمر کی تقریر پر خیالات

پرانی چیزوں سے بلا وجہ بیزاری اور نئی چیزوں کے اشتیاق میں بلا ضرورت بے چینی طفلانہ ناعاقبت اندیشی کا خاصہ ہے جس قوم کو تمدن و ترقی اور اعلٰے تعلیم و تربیت اور عقل و فراست کا دعوٰے ہو اسے اس طفلانہ ذوق سے دور رہنا چاہیئے اصل چیز تلاش حق ہے اس تلاش میں جدت و قدامت کے امتیاز کو کوئی دخل نہیں قدامت سے نفرت اور جدت سے رغبت یا اس کے برعکس کا تلاش حق پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیئے۔ علاوہ بریں انسانی نصب العین میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔ وہ نصب العین جو ماضی میں کچھ اور تھا حال میں کچھ اور ہے اور مستقبل میں کچھ اور ہو جائیگا، سچا انسانی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ محدود جماعتوں کا نصب العین حالات متعددہ میں عارضی اور وقتی ہونا اور حالات کے بدل جانے پر اس کا متغیر ہو جانا اور بات ہے مگر جملہ بنی نوع انسان کے لئے سچا حقیقی اور مستقل نصب العین کسی تغیر کو قبول نہیں کرتا یورپ اگر اپنا نصب العین بدلنے کا مشتاق رہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یورپ کو ابھی تک صحیح نصب العین نصیب ہی نہیں ہوا۔ اور یہ حالات موجودہ سے ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس تلاش میں جن علوم کو بیشتر دخل ہے ان سے یورپ بڑی حد تک نا آشنا ہے۔ قوانین قدرت کے متعلق جزوی و فروعی معلومات کے حصول میں محققین یورپ نے جو سعی بلیغ کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور کوئی عقلمند اور منصف مزاج شخص اس حیرت انگیز ترقی سے انکار نہیں کر سکتا جو دنیائے سے میدان مغرب کو اس وقت تک حاصل ہوئی ہے۔ مگر باوجود ان جملہ

ترقیات کے امور نامعلوم کی بابت ان ممالک میں جو تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ اتنی وسیع ہے کہ موجودہ علمی فتوحات کو اس جہل سے کوئی مناسبت ہی نہیں جہل کی اس شب تاریک میں سائنٹفک کامیابیوں کے جو جگنوں چمک رہے ہیں اوہ باوجود اپنی چمک کے اس تاریکی کو دور نہ کر سکے۔ اہل یورپ کو خود اعتراف ہے کہ ان کے علوم ابھی ناقص ہیں ترقی کی گنجایش بہت کچھ باقی ہے۔ قدم قدم پر جدید انکشافات قبل کے مسلمات اور نظریوں کو درہم برہم کردیا کرتے ہیں مگر یہ انکشاف ختم نہیں ہوتے کسی منزل پر آکر رکتے نہیں۔ ہم کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیتے کہ معلومات کے انتہائی نقطہ پر ہم پہنچ گئے۔ ہماری موجودہ تحقیقات پر ہم کو یہ اعتماد نہیں ہونے دیتے کہ کل یہ تحقیقات غلط ثابت نہ ہوسکے گی۔ علم کی پیمایش آسان ہے مگر جہل کی پیمایش نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کے علم کو اس کے جہل سے کیا مناسبت ہے۔ یہ سب کچھ صرف ان علوم کی بابت ہے جو مادیات و مشاہدات و تجربات سے متعلق ہیں۔ روحانیات اور امور فوق المادۃ و مابعد الطبیعات میں یورپ کی موجودہ معلومات کو ہم بلاخوف تردید بمنزلہ صفر کے قرار دے سکتے ہیں۔ جبکہ کائنات کے متعلق جو کہ انسان کی جولانگاہ ہے اور انسان کے متعلق جو کہ اس زمین پر حق تعالےٰ کا خلیفہ ہے یورپ کا علم اس قدر کم اور جہل اس قدر زیادہ ہے تو مستقل انسانی نصب العین کے متعلق یورپ کیونکر کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ حقائق اشیاء اور حقائق انسانی کے کما حقہٗ انکشاف سے قبل کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بے بضاعتی اور کوتاہ علمی کے باوجود محض اپنے نت نئے خیالات خام کی بناء پر انسان جیسی اہم ہستی کے لئے اپنی طرف سے کوئی نصب العین قرار دیدے۔ اور اپنے تلون کے تحت میں آئے دن اسے بدلتا رہے +

قطع نظر امور مندرجہ بالا کے انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے خلیفہ خود مختار نہیں ہوتا بلکہ جس نے خلافت عطا فرمائی ہے اس کے ماتحت ہوتا ہے وہ اپنے لئے کسی دستور العمل کے قرار دینے یا نصب العین کے متعین کرنے کا کیونکر مجاز ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے نصب العین تو وہی مقرر کر سکتا ہے جو اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا رب، اس کا ہادی ہے جس نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور حق خلافت ادا کرنے کی اسے استعداد بخشی انسان کا فرض ہے کہ کلام الٰہی سے دریافت کرے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے لئے کیا نصب العین مقرر فرمایا ہے۔ پھر اس کا فرض ہے کہ احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگی اپنے خیالات اپنی امنگوں اور اپنی روش کو ڈھالے نہ یہ کہ اپنی دماغی روشنی سے ہدایت الٰہی کے انوار کو مندلا کرنے کی کوشش ناکام میں مصروف رہے قرآن" نعوذ باللہ" بازیچۂ اطفال نہیں کہ یورپ اپنی طفلانہ جدت پسندی کے شوق میں آئے دن نئے نئے نصب العین قرار دے اور تغیر پسندی کے ذوق میں مطالب قرآنی کو حسب دلخواہ الٹتا پلٹتا رہے۔ غلام کا یہ کام نہیں کہ اپنے لئے خود خدمت تجویز کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے اشارہ پر چلے۔

قرآن کلام الٰہی ہے کلام مجموعہ ہوتا ہے الفاظ و معانی کا اگرچہ قرآن میں الفاظ و معانی کے ماورا کچھ اور بھی ہے مگر اس موقعہ پر ہمیں صرف الفاظ و معانی ہی سے بحث ہے وحی کے ذریعہ جس طرح الفاظ قرآنی رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوئے اسی طرح ان الفاظ کے صحیح معنی بھی حضور سرور کائنات کے قلب پر وارد ہوئے (مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے مضمون " الفاظ - الہام - وحی جو اسی اشاعت میں دوسری جگہ شائع ہو رہا ہے) ان معانی سے ہٹ کر الفاظ قرآنی کی کوئی جدید تفسیر (خواہ وہ تفسیر مستشرقین نے کی ہو یا مغربیوں نے، علماء مصر و شام نے کی ہو یا محققین جرمنی نے) کلام الٰہی کی صحیح تفسیر

نہ ہوگی بلکہ ان لوگوں کی اپنی دماغی و ذہنی کیفیات کی تفسیر ہوگی قرآن کو صحیح معنی سے ہٹا دینے کی کوشش تحریف کی کوشش ہے جس میں کسی کو کامیابی نہیں ہو سکتی

اس میں شک نہیں کہ ابتدائے کائنات سے لیکر اس وقت تک انسانی دماغ پر مختلف ارتقائی دور گذرے اور دماغی صلاحیت بتدریج ترقی کرتی چلی آئی مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ترقی اپنے انتہائی نقطہ پر اب سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل پہنچ چکی۔ اب جو کچھ نظر آرہا ہے اور اس زمانے میں فہم وادراک کی جو نمائش ہو رہی ہے اور سیرت و عمل کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے وہ اسی انتہائی دورِ ترقی کی ایک انحطاطی اور زوالی کیفیت ہے۔

انسانی ترقی کے ہر دور میں پیغمبر مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کی استعداد کو ملحوظ رکھ کر مناسب وقت تعلیم دی۔ وہ تعلیم چند افراد و اقوام تک محدود اور وقت معین تک مخصوص رہی۔ ارتقائی تغیرات کی مناسبت سے تعلیم میں فروعی تغیرات پیدا ہوتے گئے۔ ان مناسب وقت تغیرات کو عمل میں لانے کی غرض سے ہر ملک اور ہر زبان میں نئے نئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے حتیٰ کہ حکمت الٰہی کے تحت میں یہ ترقی جب اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچی تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے جو ہادی کافۃ الناس تھے جن کی تعلیمات جملہ انبیاء ماقبل کی تعلیمات پر مشتمل تھیں جن کا دین جملہ ادیان سابقہ کا ناسخ قرار پایا، جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جن پر وہ قرآن نازل فرمایا گیا جس کی حفاظت کا حق تعالیٰ نے خود ذمہ اٹھایا اور جس میں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی مہر لگا دی گئی۔ دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور قیامت تک اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ و تغیر و تبدل کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کوئی عقلمند شخص اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ افضل الناس سید البشر امام انبیاء خاتم المرسلین محبوب حق محمد مصطفےٰ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا نعوذ باللہ قرآن کے معنی صحیح طور پر نہ سمجھ سکے یا اصحاب رسول جن کو رسول خدا نے خود بہ نفس نفیس قرآن کی تعلیم دی مفہوم قرآن سے صحیح طور پر آگاہ نہ ہو سکے۔ اور اب ساڑھے تیرہ سو برس بعد وہ جرمنی جن کی غلطی کی بدولت دنیا کا بڑا حصہ ایک عالمگیر جنگ کی سخت تباہ کن آگ میں بقول یورپ ہی کے حال میں کود چکا ہے۔ جو اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں اور بقول بیرن عمر کے اپنی حیات میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے۔ اور زندگی کے جدید اصولوں کی تلاش میں ہے یعنی بہ الفاظ دیگر وہ جرمنی جس نے ابتک ایک ناکام اور نامراد زندگی بسر کی ہے قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم از سر نو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا!

بیرن عمر کا خیال ہے کہ "مشرقیوں نے اب تک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہوگا"! مگر یہ خیال بجز اسکے کہ مغربی شیخی بازی کا ایک نمونہ ہو کسی اہمیت کا مستحق نہیں حقائق منقلب نہیں ہوتے۔ دین شاعری نہیں جس میں مشرق و مغرب کے طبائع کا اختلاف موثر ہو جس طرح ریاضی اور ریاضی کے نتائج سائینٹفک معلومات اور اسکے حاصل میں مشرقی و مغربی طبائع کے اختلاف کو دخل نہیں جس طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک آگ جلانے والی اور پانی آگ بجھانے والا ثابت ہے اسی طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک حقائق الہی و حقائق کونی یکساں ہوں گے۔ خواہ دونوں کے تخیل اصول تجسس طرز استدلال اور روش زندگی میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو کیا جرمنی قرآن مجید کے ساتھ بھی وہ سلوک کرنا چاہتا ہے جو عیسائی دنیا نے بائبل کے ساتھ کیا؟ لیکن ہم پیشین گوئی کئے دیتے ہیں کہ خواہ جرمنی کے باشندے ہوں یا کہیں اور کے،

اس کوشش میں کسی کو بھی کامیابی نہ ہو گی۔ کیونکہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی ضمانت قرآن کے الفاظ و معانی دونوں پر شامل ہے۔ نہ لفظی تحریف میں کسی کو کامیابی ہوگی نہ معنوی تحریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشین گوئی فرما چکے ہیں کہ لَا یَزَالُ طائفۃ من امتی علی الحق ظاھرین لا یضرھم من خالفھم حتیٰ یاتی امر اللہ (میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ کھلم کھلا حق پر رہیگا - ان لوگوں کا مخالف ان کو ضرر نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ آجاوے امر اللہ کا یعنی قیامت)۔

اسلامی رواداری کے ثبوت میں بیرن صاحب دوسرے پیغمبروں پر ایمان لانے کے متعلق اسلامی ہدایات کو جو پیش کرتے ہیں اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ شاید اسلامی رواداری کے صحیح مفہوم سے ابھی تک آگاہ نہیں ہوئے تقریر مندرجہ بالا میں انگریزی لفظ (TOLERATION) کا ترجمہ "رواداری" کیا گیا ہے کسی خلاف طبع امر یا مخالف چیز کی برداشت کو (TOLERATION) کہتے ہیں۔ دیگر انبیاء کا وجود اور ان کی تعلیمات نہ اسلام کے مخالف ہیں نہ طبائع اسلامی کے خلاف۔ موافق چیزوں کے ساتھ موافقت کو (TOLERATION) نہیں کہتے۔

اس سلسلہ میں ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ دیگر انبیاء پر ایمان لانے کے یہ معنی نہیں کہ جو غلط تعلیمات ان انبیاء سے غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہیں ان کو بھی مان لیا جائے۔ مثلاً ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق مانتا ہے مگر کوئی مسلمان تثلیث کو تسلیم کرنے، اور اہل تثلیث کو اہل حق کہنے، اور تثلیث کی تعلیم کو عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لئے ازروئے اسلام آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اسلامی رواداری کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہہ دیا جائے۔ مومن کو کافر اور کافر کو مومن سمجھ لیا جائے۔ صالح اور فاسق میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن ایک بالکل دوسری چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صراط المستقیم وہی ہے جس کی

تعلیم قرآن پاک میں فرمائی گئی ہے۔ ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ ہمارے سب دوست بسلسلے کے تمام ہماری اس دنیا کے سب رہنے بسنے والے اس صراط المستقیم پر چلیں اور فائدہ اٹھائیں۔ اس دنیا میں بھی سرسبز ہوں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں۔ ہم ہر ممکن تدبیر اور کوشش کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ کہ ایسا ہو اور سب ایک ہو جائیں مگر باوجود ان تمام جائز خواہشات کے ہم کسی کو بجبر مسلمان کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جبر و خوف کے تحت مسلمان بن جانے سے کوئی سچا مسلمان نہیں بن سکتا۔ اور جب تک کوئی دل سے اور برضا و رغبت اسلام قبول نہ کرے آخرت کے فوائد سے وہ محروم رہیگا۔ اغیار کو بجبر مسلمان نہ بنانے کے یہ معنی نہ سمجھ لئے جائیں کہ ایمان غیر از اسلام کی حقانیت کے بھی ہم نعوذ باللہ قائل ہیں۔

اس سے اگر کوئی نتیجہ نکالا بھی جا سکتا ہے۔ تو بس یہی کہ مغربی ترقی کرتے کرتے اب اس منزل پر پہنچا ہے جس پر عرب صدیوں قبل پہنچ چکے تھے۔ طرز تعمیر اور فرنیچر وغیرہ میں تو صدیوں قبل کے عربوں سے مماثلت پر فخر کیا جاتا ہے۔ لیکن تفسیر قرآن کے باب میں ان عربوں سے گریز اور جدت کی تلاش کیا عجیب و غریب ذہنیت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دانشمندان یورپ ابھی تک اسی محدود دنیا کے چکر میں مقید ہیں۔ مذہب کو صرف دنیوی معیار ہی سے پرکھتے ہیں۔ اسلام کے صرف دنیوی مفاد ہی کو ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالے نے انسان کو ایک وسیع تر اور بالاتر میدان میں ترقی کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیوی مفاد تو محض ضمنی اور درمیانی اور عارضی چیزیں ہیں سچا مذہب انسان کی سفلی اور علوی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ دونوں میدانوں میں ترقی کی شاہ راہ کو کھولتا ہے۔ دنیوی سرسبزی کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اور آخرت کی نجات کا سامان بھی مہیا کرتا ہے ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ دونوں میدانوں میں کامیابی حاصل کرنا انسان کا فرض ہے یورپ ابھی تک صرف ایک ہی میدان میں ترقی کرنے کا متمنی

نظر آتا ہے۔ دوسرے میدانوں سے بالکل غافل ہے حالانکہ کامل ترقی وہی ہے جس میں ہر پہلو کا اس پہلو کی اہمیت کی مناسبت سے خیال رکھا جائے اگر انسان اپنے کسی ایک عضو کو نشوونما دیتے بہت زیادہ قوی کرے مگر بقیہ اعضا کو بیکار و معطل رکھکر بالکل ہی کمزور اور مردہ بنا دے تو عضو قوی کی قوت کے باوجود اس شخص کو کوئی پورا انسان بھی نہ کہیگا چہ جائے کہ ترقی یافتہ انسان اُسے سمجھے۔ یورپ کی ایک محدود دائرہ میں ترقی اس کے لئے کافی نہیں۔ کہ اسے صحیح معنوں میں ترقی یافتہ ——————— کہا جائے۔ یورپ کی ان شدید خامیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجود اپنی حیرت انگیز سائنٹیفک ترقیوں کے وہ دنیا میں امن وعافیت و مسرتِ حقیقی پھیلانے میں کامیاب نہ ہوسکا جس کا یرن عمر کو بھی اعتراف ہے۔ یورپ کی یہ خامیاں اسی صورت میں دور ہوسکتی ہیں۔ جبکہ یورپ قرآن مجید کو اسی طور پر سمجھنے کی کوشش کرے جس طور پر اصحاب رسول نے اسے سمجھا اور قرآن پر اس طریقہ سے عمل کرے جس طریقہ سے اس برگزیدہ جماعت نے اس پر عمل کیا۔ اگر یورپ نے بہت جلد ایسا نہ کیا اور اپنے ہی جہل مرکب پر اڑا رہا تو نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ ارباب عقل و فہم پر ظاہر ہے +

تصوف اسلام ڈاکٹر نکلسن کی نگاہ میں

دی لیگیسی آف اسلام (The Legacy of Islam) یعنی ورثہ اسلامیہ
مؤلفہ سر ٹامس آرنلڈ (آنجہانی) اور مسٹر الفریڈ گیلوم (Alfred Guillaume)
ایک حال کی تالیف ہے۔ جو انگلستان کے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے حال میں شائع
ہوئی ہے اس کتاب میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر یورپین نگاہ سے نظر ڈالی
گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اسلام کا یورپ پر کیا اثر پڑا۔ مختلف ابواب مختلف مستشرقین
یورپ کے قلم سے نکلے ہیں جس شخص کو جس مضمون کے ساتھ زیادہ مناسبت تھی اس
نے اسی مضمون پر قلم اٹھایا اور مؤلفین نے ان مضامین کو کتاب کی صورت میں ترتیب
دیکر ایک دیباچہ کا اضافہ کر دیا۔ اس کتاب میں "تصوف" پر بھی ایک باب ہے۔ جو مسٹر
آر۔ اے۔ نکلسن کا لکھا ہوا ہے۔ مسٹر نکلسن کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں
اور فارسی و عربی میں اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ تصوف کی کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر سکیں
چنانچہ ان کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہوں
نے مسائل تصوف کے سمجھنے میں اپنی دماغی قابلیت کو بھی پوری قوت سے صرف کر دیا ہے
مگر تصوف ان چیزوں میں سے نہیں جو محض مطالعہ کتب سے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ جب
تک روحانیت سے کسی شخص میں فطری مناسبت نہ ہو اور تصوف کے عملی پہلو سے وہ
کیفی اور جذبی آگاہی حاصل نہ کرے اس فن لطیف کی باریکیاں کما حقہ اس کی سمجھ میں نہیں

ہ سکتیں۔

اسلامی مسائل پر مستشرقین یورپ کی بیشتر تحریریں دیکھنے کے بعد مندرجہ ذیل نتائج میں سے کسی ایک نتیجہ پر لازمی طور پر آنا پڑتا ہے۔

(۱) باوجود علم وفضل کے لمبے چوڑے دعوؤں کے ان لوگوں میں اب تک صحیح اسلام کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔

(۲) یا یہ لوگ دیدہ و دانستہ اسلام کو بدنما بنا کر پبلک کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) یا پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ لوگ اسلام کا مطالعہ تحقیق حق کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ جاسوس بن کر دشمنی کی نگاہ اس پر ڈالتے ہیں۔ اور اسے توڑ موڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

یہ لوگ غلط مبادیات سے ابتدا کرتے ہیں اور غلط نتائج پر آتے ہیں۔ اسلام کو غلط معیار سے پرکھتے ہیں اور خود اپنی ہی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جس نگاہ سے وہ فلسفہ کو دیکھنے کے عادی ہیں اسی نگاہ سے مذہب کو بھی دیکھتے ہیں حالانکہ فلسفہ اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں فلسفہ کوشش انسانی کا نتیجہ ہے۔ مذہب حق تعالٰے کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ محدود انسانی معلومات، ناقص انسانی تجربوں، کوتاہ نظر ضعیف البصر اور خام عقل کے تنگ و تاریک اور ناہموار میدان میں استدلال کے لنگڑے چوبین کی گردشوں پر فلسفہ کے وجود کا انحصار ہے۔ اور وحی الہی کی ہدایت بخش روشنی پر مذہب کا دارومدار ہے دونوں چیزیں مختلف برتاؤ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مگر جس قوم نے وحی الہی ہی کو ابھی تک نہ سمجھا ہو اور جس کی علمی روشنی خالق و مخلوق کے صحیح تعلقات باہمی کی جانب رہنمائی کرنے میں ظلمت کا حکم رکھتی ہو اس قوم کے افراد اپنی ہی روش پر قائم رہ کر ایک سچے مذہب کے متعلق صحیح اصول

پر کامیابی کے ساتھ تحقیقات نہیں کر سکتے۔ فِی قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ

ایک بڑی غلطی جس میں یہ لوگ اکثر الجھا کرتے ہیں یہ ہے کہ اسلام کو وہ ایک جدید مذہب سمجھتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مذہب کا بانی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ اجمالاً اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اسلام نہایت قدیم مذہب ہے جس مذہب کی اشاعت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے کی وہ اسلام تھا اور اسی مذہب کی اشاعت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کی۔ از آدم تا این دم جملہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں اصولاً کوئی اختلاف نہیں۔ صرف فروعی اختلافات ہیں۔ جو ضرورت وقت اور مصلحت الٰہی پر مبنی ہیں۔ عقاید اصول کے تحت میں آتے ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ انبیاء مرسلین حق کی تعلیمات کے اثرات سے نہ حکمائے یونان محروم رہے نہ رہبان عیسوی نہ جوگیان ہند۔ اس حقیقت سے دیگر اقوام کے محققین بھی ناآشنا نہیں۔ چنانچہ الفریڈ ویبر اپنی کتاب تاریخ فلسفہ کے صفحہ ۱۶۴-۱۶۵ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"وسیع الخیال اصحاب غور و فکر مثلاً ماڈریٹس (Moderatus) نکومیکس Numcni ns اور نیومینیس Nicho macu موسیٰ علیہ السلام کو یہودی افلاطون اور افلاطون کو یونانی موسیٰ کہنا پسند کرتے تھے"

پھر صفحہ ۱۸۲ پر وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"کوئی شخص افلاطون اور عیسائیت میں بعض مماثلتوں کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا ان مماثلتوں میں سے بعض اتنی قریبی اور ملتی جلتی ہیں کہ ان میں ذرا سا بھی اختلاف نظر نہیں آتا۔ ان مماثلتوں کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے جو بکثرت محققین یکجہتی سے اس امر پر متفق ہیں کہ افلاطون کا ماخذ عبارات کتب عہد عتیق ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں نے حق میں اپنی طرف سے باطل کی بھی آمیزش کر لی، یقیناً ان میں ظنیات کو شامل کر لیا۔ سچی تعلیمات کی اصلی صورت کو اپنی غلطیوں سے بگاڑ دیا۔ حق کو باطل کی آمیزش سے دور کرنے ہی کے لئے اور اصلی تعلیمات کی تکمیل کی غرض سے ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں اور فقہائے سلف کے افعال و اقوال میں کہیں کہیں صوری مشابہت یا معنوی مماثلت نظر آ جائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ اسلام میں کوئی غیر اسلامی چیز بھی آکر شامل ہوئی ہے۔ حق بات کہیں بھی ہو مومن کی ملکیت ہے۔ کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پروفیسر نکلسن اپنے مضمون میں جا بجا اپنی قیاسی کھینچ تان سے جو یہ بیان کرتے چلے گئے ہیں کہ مسلمان صوفیا نے فلاں زمانے میں خیال فلاں گروہ سے اخذ کیا یہ ان کی نادانی سادہ لوحی، اور یورپین ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ کی طرح مذہب بھی امتداد زمانہ سے اپنے متبعین کی قابلیت اور تجربوں کے ساتھ اپنی صفات ذاتی میں ترقی کرتا چلا آتا ہے۔

ایک اور بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر اپنے زمانے میں اپنی امت کو تعلیم اس طریقہ سے دیتا ہے جسے آجکل انگریزی اصطلاح میں ڈائرکٹ میتھڈ (Direct Method) کہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نبی نے خود وضو کر کے بتلا دیا کہ وضو اس طرح کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کر بتلا دی کہ نماز یوں پڑھتے ہیں۔ لوگ ان باتوں کو بہت آسانی سے حاصل کرتے ہیں اور اس حصول میں انہیں نہ کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے نہ وہ اصطلاحات کے محتاج ہوتے ہیں، مگر بعد کے زمانوں میں ان امور کی وضاحت کے لئے اصطلاحات وضع کرنے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کتابوں کے لکھنے کی بھی۔ زمانہ جس قدر قرن اول سے بعد اختیار کرتا جاتا ہے۔ اسی قدر اصطلاحات اور تصانیف میں وضاحت کی بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ پہلے زبان وجود میں آتی ہے بعد میں اس کی صرف و نحو لکھی جاتی ہے۔ اور تصانیف طلبا کی قابلیت کے لحاظ سے مختلف انداز سے بیان کی جاتی ہے

یہی سبب ہے کہ عموماً متقدمین کی تصانیف تصوف میں اجمال اور متاخرین کی تصانیف میں تفصیل پائی جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کچھ متاخرین نے لکھا ہے وہ اصل چیز میں اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ بلکہ ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق اپنے زمانے کے لوگوں کی ذہنیت اور استعداد کو مدنظر رکھ کر اصلی چیز ہی کو حسن وضاحت اور صفائی اور عمدگی سے ہو سکتا ہے۔ بیان کرتا ہے۔ امام غزالیؒ نے اگر تصوف کو اس انداز سے بیان کیا کہ جو لوگ پہلے اس سے منحرف تھے اور اس کے دلدادہ ہو گئے تو یہ امام غزالیؒ کے انداز بیان کی خوبی ہے۔ نہ یہ کہ انہوں نے نعوذ باللہ اپنی طرف سے تصوف یا اسلام کی صورت کو بدل دیا ہو۔ قرآن شریف کی کتابت میں پہلے اعراب نہ دیئے جاتے تھے۔ بعد میں ضرورت مقتضی ہوئی کہ اعراب دیئے جائیں۔ اس سے اگر کوئی یورپ والا یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن میں زیر زبر پیش کا بعد میں اضافہ ہوا تو یہ بات اس کی انتہا درجہ کی نادانی پر دلالت کرے گی۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی لغزشیں پروفیسر نکلسن سے بھی سرزد ہوئی ہیں۔

اس کتاب کا نام "ورثہ اسلامیہ" بھی اہل یورپ کی اسلام کے متعلق ذہنیت کا پتہ دیتا ہے الحمد للہ کہ اسلام مردہ نہیں کوئی مسلمان اس کتاب کو لکھتا تو اس کا نام

"زندہ اسلام کے زندہ اثرات"

رکھتا اور وہ کتاب بفضلہ تعالےٰ ان عیوب سے بھی پاک ہوتی جو اس انگریزی کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ کاش کوئی صاحب اس کا ترجمہ کر کے حواشی ہی کے ذریعہ سے ان عیوب کو دور کر دیں۔

تصوّف

زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ میں انڈرہل کی کتاب مسٹسزم (Mysticism) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس کے ابتدائی صفحات پر میری نظر سے دو مقولے گزرے۔ ایک تو جرمنی کے زمانہ وسطیٰ کے ایک روحانی شخص کا تھا اور دوسرا انگلستان کے ایک مصنف جس کا حالیہ ہی میں انتقال ہُوا ہے۔ ان مقولوں کو دیکھ کر مجھے معاً یہ خیال گذرا کہ میں ان دونوں سے ملتے جُلتے مسلمانوں کے مقولے بھی پیش کر سکتا ہوں[1]۔ ایکہارٹ (جرمنی) کا مقولہ یہ ہے کہ "مخلوق جو کہ ہستی محض ہے انا کے استعمال کی مجاز نہیں اور یہ لفظ صرف خدا ہی استعمال کر سکتا ہے"۔ اس مقولہ نے میرے دل میں اس یاد کو تازہ کر دیا کہ ساڑھے تین سو سال قبل بغداد میں ابوالنصر سراج نے توحید کی تعریف کے سلسلہ میں بیان کیا تھا کہ "سوائے خدا کے کسی کی مجال نہیں کہ انا کہے کیونکہ انائے حقیقی خدا ہی کو سزاوار ہے"۔ اور ایڈورڈ کارپنٹر (انگلستان) کا مقولہ یہ ہے کہ "اس مشاہدہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جملہ حواس مل کر ایک حس بن گئی"۔ اس مقولہ نے میری رہنمائی مصر کے شاعر اور ولی ابن الفارض (۱۲۳۵ء) کے ان اشعار کی جانب کی جن کا مطلب یہ ہے کہ "میری آنکھ بولتی تھی اور میری زبان دیکھتی تھی۔ میرے کان باتیں کرتے تھے۔ اور میرے ہاتھ سنتے تھے۔ جس وقت کہ میرا کان

---

[1] پروفیسر نکلسن نے تو یہاں تصوف کی تعریف بیان کرتے ہیں۔ نہ کسی اور طریقہ سے سمجھاتے ہیں کہ تصوف کسے کہتے ہیں۔ ابتدا ہی سے ان کی نظر مختلف اقوام کے مقولوں کی مماثلتوں پر ہوتی ہے۔ اور انہیں مماثلتوں کو آگے چل کر وہ شہادتیں قرار دینے لگتے ہیں۔ (ذوقی)

آنکھ بنا ہوا تھا اور سب کچھ دیکھتا تھا۔ میری آنکھ کان بنی ہوئی تھی اور گیت سن رہی تھی اس کا منشا یہ ہے کہ مشاہدۂ خاص میں اس کے تمام حواس متفق تھے۔ اور ایک ہی کام کر رہے تھے۔

یہ ایک توارد ہے جو بادی النظر میں شہادت کا حکم رکھتا ہے کیفیات روحانی اور بصیرت عرفانی میں مغرب اب بھی اسلام سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ از منۂ متوسط میں جب کہ مسلمانوں کے فلسفہ اور علوم کی شعاعیں ان کے اندلسی مرکز سے نکل کر عیسوی یورپ پر پڑ رہی تھیں اور وہاں روشنی پھیلا رہی تھیں یورپ نے جو کچھ مسلمانوں سے سیکھا اور حاصل کیا اس کی تفصیل ابھی تک دریافت طلب ہے مگر اس میں شک نہیں کہ سیکھا بہت کچھ۔ حیرت کی بات ہو گی اگر اسلامی تصوف کے اثر سے ٹامس ایکوناس، ایکہارٹ، اور ڈانٹے جیسے لوگ بچے ہوں۔ کیونکہ تصوف کی مشترکہ زمانۂ وسطیٰ میں عیسویت اور اسلام باہم بہت متصل تھے۔ یہ واقعہ تاریخ پر مبنی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔ اس سے اس امر کا پتہ چل جائیگا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک اور مسلمان ارباب روحانیت کے خیالات اور طریقوں میں اس درجہ مماثلت ہے کہ دونوں ایک ہی سی روحانی ذہنیت کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیتھولک چرچ نے تو اپنی ان روایات کو قائم رکھا۔ مگر تیرھویں صدی عیسوی کے بعد اسلام میں روحانیت نے اس مذہب جدید کے فلسفہ کی جانب رُخ کیا جو متشرع لوگوں کی نگاہ میں مذہب حقیقی سے بالکل مختلف ہے۔

دوسری صدی ہجری کے اختتام کے قریب (دسنہ ۸۱۶ء) ہم کو عراق میں لفظ صوفی سے سابقہ پڑتا ہے جس نام سے کہ بعد میں روحانی مسلمان پہچانے جانے لگے۔ اس کا صوف سے مشتق ہونا جو کہ عیسائی راہبوں کا لباس تھا منجملہ ان علامات کے ہے جو کہ اس جانب رہنمائی کرتی ہیں۔ ماخذ کے مشکل سوال پر یہاں بحث نہیں ہو سکتی ہم پہلے اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ تصوف کی اصل اسلام

ہے۔ صوفیوں کا یہ دعوےٰ کہ انہوں نے تصوف کو پیغمبر سے اخذ کیا قابل وقعت ہے۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو پیغمبر کی شخصیت کے متعلق صحیح حالات لے کر ہم تک پہنچی ہے۔ اور اس میں رہبانیت اور اسرار مذہب کے عناصر دیگر عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔ رہبانیت کے عناصر پر صوفیا نے پیغمبر صاحب سے بھی زیادہ زور دیا ہے۔ اور زیادہ گہرے معنی پہنائے ہیں۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تصوف نے قرآن سے کچھ نہیں لیا۔ مسلمان جو کہ اپنی کتاب مقدس کا ہمیشہ سے بڑا احترام کرتے چلے آئے ہیں اور بچپن ہی میں اسے حفظ کر لیتے ہیں۔ اور بڑے غور و خوض سے اس کی تلاوت کرتے ہیں اور تمام انسانی علوم کے حصول کی اسے کنجی سمجھتے ہیں، اس خیال کی کسی طرح تائید نہیں کر سکتے اور تاریخی اعتبار سے یہ بات ہے بھی غلط۔ گو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے الہیات کے متعلق اصولاً ظاہری یا باطنی تعلیم باقاعدہ اور واضح طور پر نہیں دی[1] قرآن میں دونوں کے لئے (یعنی ظاہری اور باطنی تعلیم کے لئے) خام مسالہ موجود ہے۔ خدا کے متعلق پیغمبر صاحب کے بیانات بیشتر جذبات اور کمتر غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اور ان بیانات میں بظاہر کوئی صوری تطبیق نہیں[2]۔ متکلمین اسلام نے اپنے عقائد میں اللہ تعالےٰ کے رفیع الدرجات اور برتر ہونے کو داخل کیا مگر صوفیا نے اتباع رسول میں اپنے عقائد میں اللہ کے رفیع الدرجات اور برتر ہونے کے ساتھ اس کے جاری اور ساری (حاضر و ناظر) ہونے

---

[1] برین عقل و دانش بباید گریست۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الہیات کے متعلق جتنی اچھی اور جتنی مکمل تعلیم دی ہے اس سے بہتر نہ کسی اور نے دی نہ کوئی اور دے سکتا ہے۔ (ذوقی)

[2] خدا کے متعلق نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بیانات نہ جذبات پر مبنی ہیں۔ نہ غور و خوض پر بلکہ وحی الٰہی کا نتیجہ ہیں۔ جو کہ سائنٹیفک تحقیقات سے ماوراء ہے بیانات مذکورہ میں اہل حجاب کے نزدیک باہم تطبیق صوری کا بظاہر نہ ہونا کوئی تعجب بخش امر نہیں اللہ تعالےٰ جامع اضداد ہے اور اسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا جس نگاہ سے ایک انسان کو دیکھا جاتا ہے۔ وہ لا محدود ہے اور ہمہ اقسام کے تقیدات سے پاک۔ ذوقی۔

کو بھی شامل کرلیا اور گو موخرالذکر امر کی جانب قرآن میں اشارات ہیں مگر وہ اشارات اس درجہ واضح اور نمایاں نہیں جتنا کہ صوفی انہیں واضح اور نمایاں اور اہم قرار دیتے ہیں ۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - هُوَ	اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا (النور ع ۱)
الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ	وہی اول، وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن (الحدید ع ۱)
لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ	نہیں ہے کوئی الٰہ مگر ہر چیز ہالک ہے مگر ذات اس کی (القصص ع ۹)
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ۔	اور پھونک دی میں نے اس کے روح اپنی (الحجر ع ۳)
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق ع)	اور البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو کچھ کہ خطرہ اس کے دل میں گزرتا ہے۔ ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ	پس جس طرف تم منہ کرو وہیں اللہ کا منہ ہے (البقرہ ع ۱)
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۔	اور جس کو اللہ نور نہ عطا فرمائے اس کے لئے کہیں نور نہیں (النور ع ۵)

آیات مندرجہ بالا میں تخیلاتِ تصوف یقیناً موجود ہیں اور صوفیائے متقدمین کے لئے قرآن صرف خدا کا کلام ہی نہیں بلکہ خدا سے قرب حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ بھی ہے۔ کثرت عبادت اور قرآن پر بالعموم بہیئت مجموعی اور بالخصوص سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورۂ النجم کی پہلی اٹھارہ پر اسرار آیات جو کہ معراج سے متعلق ہیں غور و خوض کرنے اور مراقب رہنے سے اُن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مشاہدات کو خود حاصل کرنے کی کوششیں کی ہیں ۔

اب زمانی اور مکانی حالات پر بھی ذرا نظر ڈال دیکھو جس سیاسی انقلاب نے دارالسلطنت کو

دمشق سے بغداد کی طرف منتقل کیا۔ اس نے اسلام کو ایک قدیم تر تمدن سے بھی متصل اور متصادم کر دیا اور گو بالآخر اسلامی غلبہ نے اجنبی خیالات کو مٹا دیا مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس نوعیت کے مقابلوں میں غلبۂ کامل کبھی نہیں حاصل ہوتا۔ ہمارے زیر بحث اس وقت وہ عالمگیر تحریک ہے جو ان ممالک میں پھیل گئی تھی۔ جہاں مسلمان مذہبی مباحثوں اور مناظروں میں عیسائیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کے ساتھ رات دن مصروف رہتے تھے۔ اور جہاں محکوم قومیں جو کہ نو مسلم تھیں اپنے جدید اختیار کردہ مذہب کو اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش میں بعض مرتبہ صدق دلی کے ساتھ اپنی پرانی محبوب اقوال اور رسموں کی تائید میں تعلیم رسالت سے مصالحہ فراہم کر لیتی تھیں صوفیوں کو قرآن کے باطنی پہلوؤں کا مطالعہ کنندہ تسلیم کرنا درست ہے۔ مگر میرے خیال میں تصوف کو محض قرآن ہی کی تعلیم کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں بنننۂ کے بعد تصوف نے یونانی فلسفہ کو   کرنا شروع کر دیا۔ اور اب تک جو تاریخی شہادت مہیا ہو سکی ہے۔ اس سے اسی جانب اشارہ پایا جاتا ہے کہ تصوف کا ماخذ اور اس کی ابتدائی نشو نما عیسائی رہبان اور یونانی باطنیوں کے اثرات سے متعلق ہے۔ ہم اچھی طرح یقین کر سکتے ہیں کہ عیسائی راہب کی شکل و صورت سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خوب آشنا ہونگے۔ اور اس شکل و صورت نے آپ کے متبعین کے لئے ایک نمونہ پیش کیا ہوگا۔ جس کے مطابق وہ لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہوں گے[1] یہ مشہور کلمات کہ لا رہبانیۃ فی الاسلام جو کہ آپ سے منسوب کر دیئے گئے ہیں درحقیقت زمانۂ مابعد کا ایک انحراف ہے جو عیسائی تخیل کے خلاف کیا گیا ہے۔ اور عیسائی اثرات کے اس وقت کے غلبہ کا ایک ثبوت ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبر صاحب نے

---

[1] "ہوگا" اور "ہونگے" کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے اور ان ظنیات کی بنا پر پروفیسر صاحب کے استدلال کو ملاحظہ فرمایئے۔ (ذوقی)

قرآن میں رہبانیت کو جس میں کہ ترک دنیا بھی شامل ہے۔ منع فرمایا ہے مگر سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۷ کی تفسیر جو کہ تیسری صدی ہجری کے آخر تک تسلیم کی گئی ہے۔ یہ ہے کہ آپ نے رہبانیت کا حکم اس حیثیت سے فرمایا کہ وہ خدا کی مقررہ کردہ ہے اور مذمت کا مستحق انہی کو قرار دیا جنہوں نے اس کو بگاڑ دیا۔[1]

ابتدائی زمانہ کا اسلامی تصوف آنے والے عذاب الیم کی دہشت اور خوف، روزے اور گریہ زہد اور تقوٰی اور مناجاتوں کا ایک آتش خانہ تھا جس میں اس تصوف کی پرورش ہوتی تھی کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ہوتے ہوئے خدا کی عبادت دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے کرنا چونکہ خدا کے ساتھ ایک اور معبود کو شامل کر لینا ہے۔ یعنی غیر اللہ سے محبت یا خوف کو دل میں جگہ دے لینا ہے اس لئے صوفی صرف خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہے جسے توکل کہتے ہیں اور خدا ہی کی رضامندی سے خوش ہوتا ہے جسے رضا کہتے ہیں۔ مگر یہ نزول فصیل نہیں، معبودان (باطل) سے علیحدگی کا لازمی نتیجہ معبود برحق سے کامل لگاؤ ہے۔ اور تصوف کی زبان میں اس کامل لگاؤ کو واصل حق ہونا کہتے ہیں۔

---

[1] یہاں تو پروفیسر صاحب نے غضب ہی کر دیا۔ اول تو قرآن میں جو احکام آئے ہیں وہ پیغمبر صاحب کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ دوسرے جس آیت کی رو سے رہبانیت کو پروفیسر صاحب حکم الٰہی کے مطابق قرار دیتے ہیں یہ ہے

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا	اور رہبانیت انہوں نے (یعنی نصاریٰ نے) اپنی طرف سے
ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ۔ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا	نکالی تھی ہم نے سے ان پر نہ لکھا تھا (یعنی ہم نے انہیں اسکا
فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ	حکم نہ دیا تھا۔ مگر جب انہوں نے خود اسے) اللہ کی رضامندی
مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۔ (الحدید ع ۴)	کی تلاش میں (اختیار کیا تھا تو احکام حق ادا کرنے کی رعایت

ملحوظ رکھنی چاہیئے تھی مگر) انہوں نے رعایت نہ کی اس کی جیسا کہ حق تھا رعایت کرنے کا پس دیا ہم نے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے ان میں سے ثواب ان کا اور بہت ان میں سے فاسق ہیں۔

اس آیت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رہبانیت کا حکم خدا کی طرف سے نہ تھا۔ بلکہ ایک بدعت تھی جو کہ خود نصاریٰ نے ایجاد کی تھی اور پھر بھی اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ (باقی)

اور یہ دراصل عشق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس پر سارے مذہبی اور اخلاقی تصوف کا دار و مدار ہے۔ ہمارے (یعنی یورپ کے مستند مصنفین نے اس خیال کو سب سے پہلے جن کے کلام میں وضاحت کے ساتھ اور نمایاں طور پر پایا ایک وہ ولیہ ہیں۔ جو رابعہ بصریہ کے نام سے موسوم ہیں۔ (۳۵۳ ء) وہ ایک لونڈی تھیں جن کے والدین کی بابت کوئی علم نہیں[1] معلوم نہیں کہ جو اشعار ان سے منسوب ہیں وہ ان کے ہیں بھی یا نہیں۔ مگر ان اشعار میں ایک صوفی کا نصب العین ان قلبی کیفیات کو قرار دیا گیا ہے جو محبوب کے تصور سے دل میں برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ:-

"دو وجوہ ہیں جن سے مجھے تیری محبت ہے۔ ایک ذاتی وجہ اور دوسری وجہ یہ کہ تو مستحق ہے اس کا کہ تجھ سے محبت کی جائے۔ خودغرضانہ محبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں مگر میرا ہر خیال تیری محبت سے سرشار ہے!!

سب سے زیادہ خاص محبت تو وہ ہے جس میں تو میری نگاہِ پرستش کے سامنے نقاب اٹھا دے نہ۔ اس میں میری کوئی تعریف ہے نہ اس میں بلکہ ہر بات میں قابلِ تعریف تو ہی ہے[2]"

---

[1] حضرت رابعہ بصریہ کے تفصیلی حالات اور کم سنی میں انکے والدین کے فوت ہو جانے کے واقعات حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے اپنی مشہور کتاب تذکرۃ اولیا میں درج فرمائے ہیں۔ (ذوقی)

[2] تعجب ہے کہ بقول پروفیسر نکلسن مصنفین یورپ کو یہ خیال سب سے پہلے حضرت رابعہ بصریہؒ کے کلام میں نظر آیا اور قرآن پاک کی اس آیت پر نگاہ نہ پڑی: ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔ اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اللہ سے اشد درجہ کی محبت یعنی عشق رکھتے ہیں۔ اس آیت کی رو سے ایمان کا دار و مدار ہی عشق الٰہی پر ہے۔ پھر یحبھم و یحبونہ اور قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔ اور اس نوعیت کی دیگر آیات کو نہ دیکھا اور محبت الٰہی کو اسلام میں اجنبی چیز کہدیا۔ جن لوگوں کی قرآن دانی کا یہ حال ہو انہیں اسلامی مسائل پر قلم اٹھانے کی جرأت کیونکر ہوتی ہے! (ذوقی)

یہ عقیدہ کہ وصول الی اللہ رحمت حق ہی پر موقوف ہے قرآن میں تو بہت کھینچ تان سے پایا جاتا
ہے مگر مشکوک یا جعلی احادیث نبوی میں بہت زیادہ واضح ہے۔ مثلاً خدا فرماتا ہے میرا بندہ
میرے قریب آتا ہے؟ افعال نیک سے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب
میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں ہوتا ہوں اس کا کان تاکہ مجھ سے سُنے اور اس کی آنکھ تاکہ مجھ سے
دیکھے اور اس کی زبان تاکہ میرے ذریعہ بات کرے اور اس کا ہاتھ تاکہ میرے ذریعہ گرفت کرے۔[1]
کثرت ذکر الٰہی سے صوفیا اپنے سلوک کو شروع کرکے معرفت تک پہنچتے ہیں اور معرفت کی
یہ تعریف کی گئی ہے کہ دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرکے مراتب توحید کو معلوم کیا جائے۔ اس باطنی
زندگی کی تشریح جو کہ تجربہ پر مبنی ہو سب سے پہلے بصرہ کے حارث محاسبی (سنہ ھ) نے بیان
کی۔ ان کی تصنیف رعایہ لحقوق اللہ جس کا ایک ہی قلمی نسخہ باقی ہے اور اکسفورڈ میں ابتک
موجود ہے۔ نزاکت خیال اور جدت کا پتہ دیتا ہے۔ مگر اس میں موسوی اور عیسوی ماخذ سے بہت

---

[1] جس حدیث کی جانب بیان اشارہ ہے اس کی صحیح عبارت حسب ذیل ہے:-
وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر
به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها وان سالنی لاعطینه ولئن استعاذنی لاعیذنه بجوده بجا
ترجمہ:- اور ہمیشہ رہتا ہے بندہ میرا نزدیکی ڈھونڈھتا طرف میرے ساتھ نوافل کے یہاں تک کہ دوست رکھتا ہوں میں
اس کو اور جس وقت کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو پس ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی کہ سنتا ہے ساتھ اس کے اور
بینائی اس کی کہ دیکھتا ہے ساتھ اس کے اور ہاتھ اس کا کہ پکڑتا ہے ساتھ اس کے اور پاؤں اس کا کہ چلتا ہے ساتھ
اس کے اور اگر مانگتا ہے مجھ سے یہ بندہ البتہ دیتا ہوں میں اس کو اور اگر پناہ پکڑتا ہے ساتھ میرے البتہ پناہ
دیتا ہوں میں اس کو۔
نکلسن صاحب کے نزدیک یہ حدیث مشکوک یا جعلی ہو تو ہو۔ ان کے نزدیک تو نعوذ باللہ قرآن بھی مشکوک
یا جعلی ہے۔ مگر مسلمانوں کے نزدیک یہ حدیث نہایت صحیح ہے۔
(ذوقی)

کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ بقول مصنفین مابعد طریقت مشتمل ہے۔ مقامات و احوال پر۔ پہلا مقام توبہ کا ہے۔ اس کے بعد اور مقامات کا سلسلہ آتا ہے مثلاً ترک، زہد، توکل ہر مقام آنے والے مقام کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے تفصیل میں اختلاف ہے مگر اجمال و عمومیت میں کوئی اختلاف نہیں۔ سالک کا سبق یہ ہوتا ہے کہ افعال قلب کا زیادہ خیال رکھے۔ بہ نسبت افعال جوارح کے نیت کو عمل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دے، اور احکام شریعت کی تعمیل کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ ان احکام میں بالا تر حقائق کی جانب اشارات و ہدایات ہیں۔ باوجود اسکے کہ ان اصولوں میں قانون شکنی کی جانب میلان ہے ان کا اثر مسلمان فقہا پر اور غزالی (۱۱۱۱ء) جیسے زبردست عالم الٰہیات پر اور سعدی جیسے ماہر اخلاقیات پر غالب رہا ہے۔ صوفیوں پر یہ الزام تو نہیں آسکتا کہ انہیں اپنی جان کے ساتھ محبت رہی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بعض اوقات انہوں نے محبت الٰہی کی خاطر اپنے خارج از جماعت ہمسایوں کو بالخصوص ضرر پہنچایا۔ مگر آخر میں جا کر ان کے توحید کے تخیل نے ان کے لئے اس بات کو ناممکن کر دیا کہ وہ خدا سے تو محبت کریں۔ مگر خدا کی مخلوق سے محبت نہ کریں۔

تیسری صدی ہجری کے صوفیوں نے اس باطنی مذہب کی مکمل طور پر علمی و عملی بنیاد ڈالیں۔ ذوالنون مصری نے اسلام میں معرفت کے تخیل کو داخل کیا اور اس معرفت کا مفہوم یہ ہے کہ بخلاف استدلال اور روایات کے ذریعہ علم حاصل کرنے کے کیف و حال کے ذریعہ علم حاصل کیا جائے جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے خدا کو کیسے جانا تو جواب دیا کہ "عرفت ربی بربی۔ یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے رب ہی کے ذریعہ سے پہچانا۔ ادرش ڈیونیسیس (Dionysius) کے ان کا یہی مقولہ ہے کہ "۔ خدا برعکس ہے ہر اس چیز کے جو کہ تمہارے خیال میں آسکتی ہو؟

ⁱ پروفیسر نکلسن کو ہیلال ص ۹، التباس ۲۰۲ ۔ ایسے موقعوں پر صوفیائے کرام لفظ "برعکس" نہیں استعمال کرتے بلکہ "ماورا"
باقی صفحہ پر

اور ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ :- "فنا کا جس قدر عرفان حاصل ہوتا جاتا ہے اسی قدر بندہ خدا میں فنا ہوتا جاتا ہے"۔ اس زمانہ کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ اشارات و اصطلاحات کا استعمال زیادتی کے ساتھ شروع ہو چلا اور ان علوم کو خواص کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ اور نجس کانوں[۱] سے محفوظ رکھا گیا۔ ایران کے ابویزید یعنی بایزید بسطامی نے فنا کے عقیدہ کا اضافہ کیا ہے کہ اس میں وہ ہندوستان والوں کے اس فلسفیانہ عقیدہ سے متاثر ہوئے ہوں کہ ہر چیز کی جڑ ایک ہی ہے۔ اس کے بعد ہی فنا کا اشتقاقی لازمہ بقا بھی شامل عقائد کر دیا گیا[۲]۔ توحید خاص تک پہنچنے میں ہر چیز کی نفی کرتے چلے جانے کی انتہائی کوشش نے بقول بایزید ہی ان پر سے حجاب اٹھا دیا۔ زمانہ مابعد میں ایرانی صوفیوں کے نزدیک بایزید نے وہ اہمیت حاصل کی کہ ان کے شطحیات مثل "سبحانی" اور عالم رویا میں ان کے حصول معراج کے قصے بیان کرنے سے صوفی تھکتے ہی نہیں۔ بعض اقوال جو بایزید سے منسوب کئے جاتے ہیں یہ ہیں۔

"اللہ کی ساری مخلوق احوال کے تحت میں ہے۔ مگر عارف ان احوال سے مغلوب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے آثار سب مٹ جاتے ہیں۔ اس کی ذات کسی اور کی ذات میں، اور اس کی صفات کسی اور کی صفات میں فنا ہو جاتی ہیں"۔

حاشیہ بقیہ صفحہ ۵۰:- "برتر" یا اسی نوعیت کے دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مصرعہ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ وز ہرچہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم۔ مصرعہ جو قرآنی تعلیم لیس کمثلہ شئ کے بالکل مطابق ہے (ذوقی)

[۱] یہاں بھی پہلے "نجس کانوں" کے یہ الفاظ صحیح طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ "نا اہلوں کے کانوں سے"۔ (ذوقی)

[۲] "فنا" اور "بقا" کے مسائل عقائد سے تعلق نہیں رکھتے۔ نہ فنا و بقا عقائد میں شامل ہیں۔ بلکہ یہ صرف اصطلاحات ہیں جو عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کے نتائج بیان کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔

[۳] حضرت بایزید بسطامی کو ہر چیز کی جڑ ایک ہونے کے متعلق ہندوستان والوں کے کسی فلسفیانہ عقیدہ سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیہ الی اللہ مرجعکم جمیعا۔ ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے (ذوقی)

"تیس برس ہوئے کہ خدائے برتر میرا آئینہ تھا۔ اب میں خود اپنا آئینہ ہوں یعنی جو کہ میں تھا وہ اب نہیں رہا کیونکہ "میں" اور "خدا" (کے الفاظ) توحید الٰہی کی نفی کرتے ہیں۔ چونکہ میں اب نہیں رہا خدائے برتر اب اپنا آپ ہی آئینہ ہے میں کہتا ہوں کہ میں آئینہ ہوں۔ کیونکہ وہ حقیقتاً خدا ہے۔ جو میری زبان سے گفتگو کرتا ہے اور میں درمیان سے اٹھ گیا ہوں"۔

میں بایزیدی سے اس طرح نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ پھر میں نے معلوم کیا کہ عاشق و معشوق و عشق ایک ہیں۔ کیونکہ عالم توحید میں سب ایک ہیں"۔

بایزید اہل سکر کے محبوب پیشوا ہیں۔ برعکس اس کے اہل صحو جنید بغدادی کے متبع ہیں جن کا نظریۂ وصل ان کے شاگرد حلاج نے بیباکانہ حقیقت کے رنگ میں عملاً دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔[1] جب حلاج زندقہ کے سنگین الزام میں گرفتار کئے گئے۔ تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوئی اگر جنید نے ان سے برأت کا اظہار کیا ان کی کتاب الطواسین میں جو عقاید بیان کئے گئے ہیں وہ قطع نظر انا الحق کے بھی جو کہ ان عقائد کا اشتعال انگیز خلاصہ ہے مسلمانوں کو مشتعل کر دینے کے لئے کافی ہیں مگر وہ عقائد اس درجہ انوکھے، عمیق اور تاریخی اہمیت رکھنے والے ہیں کہ ان کے اہم اجزاء کا خاکہ

---

[1] حسین منصور حلاج اٹھارہ سال کی عمر میں تستر آئے اور دو برس حضرت عبداللہ تستری کی صحبت میں رہے پھر آپ بغر تستر سے گئے اور ڈیڑھ برس حضرت عمرو بن عثمان مکی کی صحبت میں رہے یہاں حضرت یعقوب اقطع نے اپنی صاحبزادی کا عقد آپ کے ساتھ فرما دیا۔ جب حضرت عمرو بن عثمان مکی آپ سے ناراض ہو گئے تو آپ بغداد گئے اور حضرت جنید بغدادی سے آپ نے عمرو بن عثمان کی کی ناراضی کا سبب بیان کیا۔ حضرت جنید بغدادی نے آپ کو خلوت اور سکوت کی تعلیم فرمائی۔ چند روز بعد آپ حجاز چلے گئے اور ایک سال وہاں قیام کر کے واپس بغداد آئے اور حضرت جنید بغدادی سے کوئی سوال کیا جس کا جواب آپ نے نہ دیا۔ اور فرمایا کہ تو بہت جلد لکڑی کا سر سرخ کرے گا یعنی سولی پر چڑھے گا۔ اس بات پر منصور حلاج ناراض ہو گئے اور تستر چلے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے۔ ان واقعات کی بنا پر پروفیسر نکلسن کا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت جنید بغدادی کے "نظریہ" وصل کا اظہار بیباکی کے ساتھ حلاج نے کیا اور حضرت جنید نے اپنی جان بچانے کی غرض سے حلاج کی گرفتاری پر حلاج سے برأت کا اظہار کر دیا۔

کھینچنے اور ان کے چند پہلوؤں کی جانب توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ صورت حال یہاں ممکن ہو سکی ہے۔ کیونکہ پروفیسر میگنن (Prof Massignon) نے حلاج کے اوراق پریشان کا پتہ چلا کر ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

بقول حلاج کے خدا نے جو کہ حقیقتاً عشق ہے انسان کو اپنی صورت پر اس غایت سے پیدا کیا کہ بندہ صرف خدا ہی سے محبت کرے، اپنے اندر روحانی انقلاب پیدا کر کے خدا کے عکس کو اپنے میں مشاہدہ کرے اور رضائے الٰہی اور فطرت کا تابع ہو کر واصل بالحق ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس وصل کا حلاج ذکر کرتے ہیں اور جس کا انہیں خود تجربہ ہوا وہ حلولیوں کے ہمہ اوست سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ گو مسلم اور یورپین مصنفین نے ایسا کہا ہے۔ حلاج نے اپنے اظہار مطلب کی غرض سے حلول کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ اس کے ہم مذہبوں کے ذہن میں مظہریت کے عیسائی عقیدہ سے ملتبس ہو گئی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حلاج نے جہاں تک کہ ان کی ذات کا تعلق ہے اس اصطلاح کو اس معنی میں استعمال کیا ہو مگر ان کے دوسرے عجیب و غریب اقوال ایسے ہیں جن کی رو سے مسلمان صوفیا میں انہیں سب سے زیادہ قریب روح مسیح سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک واصل باللہ کا مرتبہ پیغمبر سے جو کہ خلق کے ساتھ مشغول رہتا ہے بڑھا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا اعلیٰ نمونہ محمد (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے پیش نہیں کیا بلکہ عیسیٰ (علیہ السلام) نے پیش کیا جو کہ برگزیدہ انسانیت کا نمونہ تھے اور ہستی حق میں اپنے ظاہر و باطن سے فنا ہو کر مظہر حق و نمائندہ الٰہی بن گئے تھے[1]۔ حق تعالےٰ ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور وہ خالق سے ظاہر ہوتے تھے۔ ۱۰

[1] نہ معلوم حلاج نے کیا لکھا اور پروفیسر میگنن یا نکلسن نے کیا سمجھا کیونکہ حلاج کی اصلی تحریر اس وقت نہیں ملتی۔ تاہم ضرور ہے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں بڑوں بڑوں سے غلطی ہوئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ پیغمبر میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت حق یعنی وہ جہت جس سے وہ حق تعالےٰ سے متصل ہوتا ہے یا حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور استفاضہ کرتا ہے اور دوسری جہت خلق یعنی وہ جہت جس سے وہ خلق سے متصل ہوتا ہے یا خلق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور افاضہ کرتا ہے۔ (ا. ا. ق. محشی)

حقیقتہ الحقائق ان پر محیط تھا۔ مزید برآں پروفیسر میگنن (Massignon ۱۰۲) کے قول کے موجب حلاج کا تخیل وصل یہ ہے کہ بندہ واصل بارکن ہو جائے اور یہ لفظ "کن" قرآن میں ولادت مسیح اور قیامت سے متعلق لیا گیا ہے۔[۵] اس نوع کا وصل احکامات الٰہی کی صحیح تفہیم اور شدید پابندی پر موقوف ہے۔ اس نوع کی تفہیم اور پابندی کے مستقلاً حصول کے بعد صوفی کی روح میں خدا کی روح آجاتی ہے۔ جو کہ امر رب (قرآن سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۵) کا کرشمہ ہے پھر اسکے بعد بندہ کا ہر فعل خدا کا فعل ہوتا ہے۔ حلاج نے سبق پڑھا تھا۔ کہ تقدیس کی تکمیل بغیر مصائب، اور ذاتی قربانی کے حاصل نہیں ہوتی۔ اس سبق میں پختگی کا ثبوت دینے میں بھی انہوں نے کوتاہی نہ کی۔ ۹۲۲ء میں انہیں دار پر کھینچا گیا جب انہیں صلیب کے پاس لایا گیا اور انہوں نے صلیب کی میخوں کو دیکھا تو لوگوں کی جانب رخ کر کے ایک دعا مانگی جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

" اور اے خدا! یہ لوگ جو مجھے قتل کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں تیرے ہی مذہب کی پرجوش حمایت اور تیری ہی خوشنودی کے حصول کی تمنا میں آئے ہیں۔ تو انہوں معاف فرما دے اور ان پر اپنی رحمت نازل فرما۔ کیونکہ اگر تو نے ان پر وہ بات ظاہر کر دی ہوتی۔ جو بات کہ تو نے مجھ پر ظاہر کی ہے۔ تو وہ اس کام کو نہ کرتے جس کام انہوں نے کیا اور اگر تو نے مجھ سے وہ بات پوشیدہ رکھی ہوتی جو بات کہ تو نے ان سے پوشیدہ رکھی تو میں ان شدید مصائب

(بقیہ ص ۵۳) ہو کر خلق کی اصلاح کرتا ہے اور جو فیضان جہت اول کے ذریعہ اس نے حاصل کیا وہ خلق کو پہنچاتا ہے۔ جہت اول کو فضیلت دی جاتی ہے۔ جہت ثانی پر کیونکہ توجہ الی الحق افضل ہے توجہ الی الخلق سے۔ توجہ الی الحق کو ولایت اور توجہ الی الخلق کو نبوت کہتے ہیں۔ ہر پیغمبر میں ولایت اور نبوت کا اجتماع لازمی ہے۔ اور اس کی ذاتی ولایت کو اس کی ذاتی نبوت پر فضیلت ہے۔ جب صوفیا کی تحریروں میں اس نوع کی عبارت پائی جاتی ہے۔ کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ کہ ہر نبی کی ولایت کو اس کی نبوت پر شرف حاصل ہے۔ ورنہ یوں تو ہر نبی کو ہر ایسے ولی پر جو کہ جو نبی نہ ہو ہر اعتبار سے فضیلت حاصل ہے اور نبی آخر الزماں کو تمام انبیا پر ہر لحاظ سے فضیلت کلی حاصل ہے۔ (ذوقی)

[۵] اصل انگریزی کتاب میں عبارت کا یہ حصہ نہایت مہمل ہے۔ لفظ "کن" تو پوری کائنات کی ہر چیز کی تخلیق سے متعلق ہے۔ ولادت مسیح اور قیامت کی تخصیص کے کیا معنی۔ (ذوقی)

میں مبتلا نہ ہو۔ تیری شان عظیم ہے۔ تو جو چاہے ارادہ فرمائے اور جو چاہے کرے
تجھے سب زیب دیتا ہے۔"

اسلام میں لوگوں کے اعمال پر حکم لگایا جاتا ہے۔ اور جمہور کے خلاف عقائد کسی کے دل میں پیدا ہونے کی روک تھام عام طور پر سزاؤں کے ذریعہ سے نہیں کی جاتی۔ صوفیاء کے عقاید خواہ ظاہر شریعت سے کتنے ہی گراں ہوں۔ جب تک کہ صوفی اپنے دوسرے مسلمان ساتھیوں کی طرح عبادت کئے چلا جاتا ہے اسے کوئی شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ حلاج ارکان مذہب کی پابندی میں بہت سخت تھا اور اس نے ان ادنیٰ منزلوں کی کبھی تحقیر نہیں کی۔ گو انہیں کبھی سراہا بھی نہیں جن کے ذریعہ سے انسان کو خلوص طلب اور عبدیت (جو کہ حقیقت مذہب ہے) کی بلندی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ یہ اکثر صوفیا کی روش رہی ہے اور دو آقاؤں کی خدمت کرنے کی یہی صورت بہترین بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حلاج کا میلان اپنے ضمیر کا ساتھ دینے پر حد سے بڑھا ہوا تھا۔ فقہا اور حکومت اسلامی کے اقتدار کے مقابلہ میں اس نے اپنے ذاتی اقتدار کو پیش کر دیا جو باعتبار ولی و اہل حق ہونے کے اس نے براہ راست خدا سے اخذ کیا تھا۔ وہ مثل جنید کے صاحب نظریہ ہی نہ تھا بلکہ قرامطہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کا بھی اس پر شبہ کیا گیا تھا۔ اور اس نے اپنے عقائد کی تعلیم مومن و کافر کو یکساں طور پر دینی شروع کر دی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی تائید میں اس نے اپنی کرامتیں دکھلا دکھلا کر لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان وجوہ سے اس کے خلاف ٹھیک فتویٰ ہوا۔ اس کا قصور یہ تھا جیسا کہ صوفیائے متاخرین کہتے ہیں کہ اس نے ربوبیت کا راز فاش کر دیا۔ بلکہ اس پر الزام یہ

یہ تھا۔ کہ اس نے اپنے اندر کی آواز پر عمل کر کے ایک ایسی حقیقت کو ظاہر کر دیا ....

.... اور اس پر زور دیتا تھا

جس سے مذہبی، سیاسی اور تمدنی شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا۔ دوسرے صوفیوں پر بھی وہ

حقیقت منکشف ہوئی مگر حلاج اسی حقیقت کی خاطر جیا اور اسی کی خاطر مر گیا۔ یہی سبب ہے کہ حلاج کے کلام میں جس میں کہ اس نے وصل محبوب کی تمنا کی ہے اور اپنی تسلیم ورضا کا اظہار کیا ہے جذبۂ الفت اور تاثیر کا وہ رنگ ہے جو صوفیا کے کلام میں کمیاب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"کہ میرے اور تیرے درمیان "میں" کا حائل ہونا مجھے سخت تکلیف دیتا ہے۔ اپنی مہربانی سے "اس میں" کو درمیان سے نکال دے۔"

"میں وہ ہوں اور وہ میں ہے ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں بستی ہیں اگر تو نے مجھے دیکھا تو گویا تو نے اُسے دیکھا اور اگر تو نے اُسے دیکھا تو تو نے ہم دونوں کو دیکھ لیا۔"

یہاں ضمناً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان خیالات کا ظاہر کرنے والا یونانی فلسفیوں کا سا "ہمہ اوست" کہنے والا (Pantheist) نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو جیلی (یعنی حضرت عبدالکریم جیلی رح) نے ان توحیدی الفاظ میں ظاہر کیا ہے :۔ "ہم ایک ہی روح ہیں۔ جو دو جسموں میں بستے ہیں۔" اور جلال الدین رومی کہتے ہیں کہ :۔ کس مسرت کی وہ ساعت ہے جبکہ ہم دونوں یعنی تو اور میں ایک ہی محل میں بیٹھے ہوں جسم دو ہیں۔ صورتیں دو ہوں۔ مگر روح تیری اور میری ایک ہی ہو۔"

حلاج کا بعض اوقات معنی خاص کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ میں خدا ہو گیا ہوں اور ساتھ ہی اسکے خدا کے منزہ و برتر و رفیع الدرجات ہونے پر بھی پوری قوت سے زور دینا ایسے شخص کو تعجب میں نہیں ڈال سکتا جس کا کہنا یہ ہو کہ بادی النظر میں منطقی محالات تصوف میں جا کر حقائق ثانیہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ حلاج کے ابتدائی اصول حلاج کے بعد زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے تاہم ذہنیت مابعد کے لئے وہ بنیاد بن گئے۔ مثال کے طور پر انسان کامل کے متعلق اس تخیل کو جو ابن عربی کی تصانیف اور تصوف کی فارسی شاعری میں اس قدر غالب ہے۔ مگر ان چیزوں کے مطالعہ سے حلاج کی خصوصیات

کا پتہ نہیں چلتا نہ اُس کی اس ذاتی مصیبت کا حال معلوم ہوتا ہے جس کی جانب اس نے اس مشہور
اور بہت ہی مستعمل شعر میں اشارہ کیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حلاج کی وفات کے بعد کی صدی اگرچہ دیگر اعتبارات سے استقدر تاریخ خیز ثابت
نہیں ہوئی تاہم اس دور میں تصوف پر باقاعدہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مثلاً ابو النصر سراج
کی کتاب اللمع اور ابو طالب مکی کی قوت القلوب جن کے ذریعہ بہت قیمتی معلومات جن کا ماخذ ضائع
ہو چکا ہے محفوظ چلی آرہی ہیں۔ اس زمانہ میں تصوف نے فلسفہ یونانی کے بڑھتے ہوئے اثر سے
متاثر ہو کر اسلام سے ہٹنا اور یونانی فلسفیوں کے ہمہ اوست (Pan. theism) اور شریعت
سے آزادی اور بالخصوص عقیدۂ صدور (Ema...nation) کی جانب بڑھنا شروع کیا اِسکی
بین مثال ابرانی صوفی ابو سعید ۹۶۷ء۔۱۰۴۹ء کے سوانح اور کلام میں ملتی ہے۔ بعض اعتبارات سے ان
کی تعلیم قابل تعریف ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ:۔

" سچا ولی لوگوں میں آتا جاتا رہتا ہے۔ اُن کے ساتھ کھاتا پیتا ہے سوتا جاگتا ہے
بازاروں میں جا کر خرید و فروخت کرتا ہے شادی بیاہ کرتا ہے خلق سے ملا جلا رہتا ہے۔
مگر باوجود ان تمام باتوں کے اللہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھولتا"

انہوں نے تمام مخلوق کو "خالق کی آنکھ" سے دیکھا اور فیاضی اور شفقت کے برتاؤ کو سعدبہ
اہمیت دی کہ ان کے نزدیک خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں کہ ایک مسلمان کا دل خوش
کر دیا جائے انہوں نے شریعت سے ولی کے تعلق کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اسکا مقابلہ حلاج
کے اقوال و افعال سے کیا جائے تو بلحاظ معنی و بلحاظ عمل بہت فرق معلوم ہوگا۔ حلاج نے حتی الوسع

پابندی شرع کی پوری کوشش کی یہاں تک کہ اسے اس لائحہ عمل معرکہ سے سابقہ پڑا جیسے تعمیل شریعت کا مقابلہ ان احکام کی تعمیل سے تھا جو وہ حاکم برتر کی جانب سے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا برعکس اس کے ابوسعید کے نزدیک شریعت کی پابندی اُنکے لیئے تو لازمی ہے جو درمیانی منازل میں ہوں لیکن اُنکے لیے غیر ضروری ہے جو مقصود تک رسائی پا چکے ہیں۔ اُن کے نزدیک وصول الی اللہ کبھی یا باری باری سے ہونے کی چیز نہیں بلکہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا وہ ایک مستقل اور دائمی نتیجہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مریدوں کو حج کعبہ سے منع کر دیا تھا۔ اور خانہ کعبہ کو حقارت سے ایک پتھر کا مکان کہا تھا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اذان سن کر انہوں نے اپنا رقص درویشی موقوف نہ کیا اور کہا کہ "ہماری یہی نماز ہے" یہ واقعات حرفاً حرفاً صحیح نہ بھی ہوں تب بھی یہ نمونے کا کام دیتے ہیں۔ مشہور رسالہ قشیریہ میں جو ۱۰۴۶ء میں تصنیف ہوا تھا قدیم طرز کے متبع سنت صوفیوں کے زہد و تقوی کا مقابلہ مصنف نے اپنے زمانہ کے صوفیوں کی بے شرعی اور منافقت سے کیا ہے اس زمانہ کے بھی تیس سال بعد صاحب کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ ان کے ہمعصروں نے شہوت کا نام شریعت، توہمات لایعنی کا الہام نفسانیت و بہیمیت کا نام عشق الہی، بدعت کا نام فقر، شبہات کا نام تصفیہ قلب، اور مذہب اصلی سے انکار کا نام ترک و تجرید رکھ لیا ہے۔ جب کہ اولیا اور ان کے بے شمار معتقدین و متبعین کی جماعت تاریخ دنیائے اسلامی کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھی علماء کے گروہ میں تنازعات باہمی پھیل رہے تھے اور یا تو محض کوتاہ فہمی اور تعصب سے قرآن کے الفاظ ظاہری کے ساتھ چپٹے ہوئے تھے یا فروعات فقہ میں الجھ رہے تھے یا خشک عقل کی روشنی میں اصول عقاید کے تجزیہ در پے تھے اور مذہب کو حقیقتاً مذہب بنانے والی باتوں سے جو کہ مذہب کی جان ہیں سرعت کے ساتھ بے تعلق ہوتے جاتے تھے بہت سے جوشیلے مسلمان اس وقت اپنے دل میں یہ سوال کرتے ہوں گے کہ یہ حالات کبتک قائم رہیں گے

اور کوئی ایسی صورت بھی ممکن ہے جو مذہب کی اصلیت کو تو قائم رکھے مگر لوگوں میں پھوٹ نہ پڑنے دے۔ اس سوال کا جواب ایک ایسے شخص کے درمیان میں آ جانے سے مل گیا جو اسلام کے سب سے بڑے لوگوں میں سے ہے اور جس کا نام ابو حامد غزالی ہے (۱۰۵۸ء–۱۱۱۱ء) اور جو زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں ابو ہامٹ (ABUHAMET) اور الغزل (Algazel) کے نام سے مشہور ہے

غزالی کے صوفی بننے کا قصہ جو انہوں نے خود قلمبند کیا ہے اپنے طرز کی ایک نہایت ہی عالمانہ تحریر ہے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہو گا کہ وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں شکی طبیعت کے تھے تصوف کے مشاہدات نے اُن کے اس مرض کا ازالہ کر دیا فلسفہ اور علم کلام میں ان کے تجربے نے انہیں اطمینان دلا دیا کہ ان علوم سے اطمینان پیدا کرنے والی روشنی مفقود ہے۔ دیگر فرقوں کی تعلیمات سے بھی مطلب برآری نہ ہو سکی۔ تب انہوں نے اس تصوف کی جانب توجہ کی جو حارث محاسبی اور تیسری صدی کے صوفیائے اکابر نے فن لکھ گئے تھے اور اسی سے ان پر حقیقت منکشف ہو گئی وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جو امور صوفیا کے لئے مختص ہیں وہ کتابوں کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ حال اور کیف اور اندرونی انقلابات ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں یعنی بالحاظ دیگر صوفیوں کی روش اختیار کرنے اور ان کے سے اعمال پر کاربند ہونے سے وہ باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کی نجات خطرہ میں ہے۔ دنیا کی شان و شوکت حاصل کرنے کا انہیں بہت اچھا موقع تھا۔ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے میں انہیں سخت کشمکش سے سابقہ پڑا اس کشمکش میں ان کی صحت تک خراب ہو گئی۔ مگر بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور مثل اس شخص کے جسے مصائب شدید نے گھیر لی ہو دوسرا سہارا انہیں ملتا انہوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈ لی۔ انکی عمر چالیس برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انہوں نے بغداد اس قصد سے ترک کر دیا کہ پھر کبھی وہاں واپس نہ ہوں گے۔

۱؎ مگر ہم پروفیسر نکلسن صاحب صرف کتابوں کے مطالعہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں وہ بصیرت پیدا ہو گئی کہ صوفیا کے اقوال و افعال پر صحیح تنقید کر سکیں (ذوقی)

حاصل یہ کہ حقیقت صوفیا ہی کے پاس نکلی اور اس حقیقت کے متعلق غزالی کے ذاتی تجربوں اور ان کی تصانیف بالخصوص احیاء العلوم نے ان لوگوں میں بھی جو کہ اس وقت تک تصوف کے خلاف تھے تصوف کی موافقت میں ایک جوش عظیم پیدا کر دیا، اس زمانے کے بعد سے صوفیا بھی قطعی طور سے اسلام میں داخل سمجھے جانے لگے۔ کیونکہ غزالی اور ان کے بعد بکثرت مسلمانوں کے نزدیک جو انکشافات اولیاء اللہ کو ہوتے ہیں وہ پیغمبروں کے انکشافات ہی کی تائید میں ہوتے ہیں اور پیغمبروں کے انکشافات سرچشمہ ہیں جملہ علوم حقائق کے۔ مگر ساتھ ہی اسکے غزالی اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ ولایت ماخوذ ہے نبوت سے[1] اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور ان کے احکامات کی ظاہری و باطنی تعمیل سب پر فرض ہے اور گو غزالی کا یہ عقیدہ کہ روح ایک آئینہ ہے جسمیں قدسی چنگاری سے روشنی پیدا کی گئی ہے اور جسمیں اللہ کی ذات و صفات منعکس ہیں زیادہ دلیر صوفیوں کو خلاف شرع جسارتوں پر ابھار سکتا ہے مگر غزالی اپنی ذات سے خطرہ سے محفوظ ہے شاید انکے دل میں جو خیالات مخفی ہوں وہ ان خیالات سے بڑھے ہوئے ہوں جن کا انہوں نے اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے۔ گو انہوں نے مشکوٰۃ الانوار میں اس قسم کے فقرے بھی لکھے ہیں کہ: "اللہ آفتاب ہے اور آفتاب کے علاوہ جو کچھ ہے وہ آفتاب ہی کی روشنی ہے"۔ مگر اسلام میں یونانی ہمہ اوستی (Pantheistic) زبان کے استعمال سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس زبان کا استعمال کرنے والا بھی یونانی ہمہ دستی (Pantheistic) ہو۔ غزالی کبھی کبھی توحید کے مسئلہ کو انتہائی حد تک لیجاتے ہیں مگر ساتھ ساتھ وہ اس کے اعادہ سے بھی نہیں چوکتے کہ خدا خالق ہے جس نے محض اپنے ارادہ سے کائنات کی تخلیق فرمائی۔

---

[1] دراصل ایک نبی کی نبوت اسکی ولایت سے ماخوذ ہوتی ہے اور دوسرے اولیاء کی ولایت اس نبی کی نبوت سے ماخوذ ہوتی ہے جس کے وہ زیر قدم ہیں اور محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم مجموعہ ہیں جملہ انبیا کی نبوت و ولایت کی نسبتوں کا (زدتی)

تصوف کا ان پر جتنا بڑا احسان تھا۔ اس کا حق بھی انہوں نے پوری طرح ادا کر دیا۔ اکثر صوفیا کا بھی خیال ہے اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کہ غزالی اتنے زیادہ صوفی نہ تھے جتنے کہ وہ وسیع الخیال مسلمان تھے اور انکے سچے زہد و تقویٰ اور اخلاقی بلندی اور سنت پر استحکام نے انہیں اسلام میں راسخ کر دیا تھا۔ اور گو اس بات کو وہ لوگ نہ مانیں مگر بات یہ ہے کہ انکی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی نے انہیں پختہ بنا دیا تھا۔ تصوف کو مذہب اصلی بنا دینے میں تو انکو اتنی زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور یہ امر مشکل بھی تھا۔ مگر اصلی مذہب کو تصوف بنا لینے میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی انہوں نے اس تحریک میں قدامت پسند لوگوں کی ایک قوی جماعت کو گھسیٹ لیا اور اس جماعت نے اس طوفانی دور میں جو کہ آنے والا تھا بڑی روک تھام کی۔ مگر اسکے بعد اس تحریک کو چلانے والی قوت ایک دوسری جانب سے آنی شروع ہوئی اور جن خیالات نے اب ہجوم کیا اور اس تحریک کو بڑھایا اور تائید کیلئے تسلط پا لیا وہ غزالی کے خیالات سے مختلف تھے۔ فرقہائے جدید کے متبعین یہ سوال اس واقعہ پر پردہ نہیں ڈال سکتے کہ ان کا روحانی وطن مکہ نہیں بلکہ اتھنس اور اسکندریہ[1] ہے۔

تصوف کی تاریخ میں غزالی کا رشتہ تھا جو اس عبادت کے برعکس ہے جو خوف و حکومت کے تحت کی جاتی ہے اور رشتہ الفت کے ساتھ۔ انہوں نے ان الہیات کو شامل کر لیا جو قدرے قرآن سے ماخوذ تھیں اور قدرے ارسطو اور اشراقین یا نو فلاطونیوں Neo-Platonism سے جوں جوں اسلام کا تسلط کمزور ہوتا گیا خارجی عناصر قوت پکڑتے گئے حتیٰ کہ بربادی خلافت نے ان خارجی عناصر کو میدان کا پورا مالک بنا دیا نتیجہ فلسفہ ہمہ اوست یونانی (Pantheistic Philosophy) کی صورت میں برآمد ہوا۔ جو اب سات سو برس کے بعد بھی اسلامی دنیا کے بڑے

---

[1] مگر امام غزالیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ عملی تصوف نے ان میں پختگی پیدا کی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی تو ان میں پہلے تھی مگر سکون نہ آتا تھا میرا تمہیدی نوٹ ملاحظہ ہو۔ (ذوقی)

حصّہ پر حکمران ہے اور جب جلال الدین رومی حافظ اور دیگر ایرانی صوفی شعرا نے بیان کر کے لوگوں کو گرویدہ بنا لیا ہے گو یہ لوگ اس ملک کے اصلی مصنف اور ابتدائی موجد ابن العربی (۱۱۶۵ء - ۱۲۴۰ء) کی تصانیف کو سمجھ نہ سکیں۔ ان امور کے متعلق کچھ کہنے سے قبل آؤ ذرا ہم اس زمانہ کی دوسری خصوصیت پر بھی غور کر لیں۔ بارھویں صدی (عیسوی) میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی اس وسیع تحریک و تنظیم کا آغاز ہوا جو زمانہ وسطی کی عیسائی دنیا کے راہبوں کے سلسلوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس سے قبل مشہور مشائخ اپنے مریدوں کو اپنے پاس جمع کرتے تھے اور مریدین کی یہ جماعتیں بعض اوقات خانقاہوں میں سکونت اختیار کرتی تھیں مگر ان مختلف تعلیمگاہوں میں کسی قسم کا ربط باہمی نہ ہوتا تھا۔ اور یہ خانقاہیں جلد یا بدیر بند ہو جایا کرتی تھیں۔ طالبوں کی مفت تعلیم پانے والی ان جماعتوں کے بجائے جن میں شیخ کی ذاتی توجہ سے فیضان پہنچایا جاتا تھا۔ اب سلسلے قائم ہو گئے۔ ہر سلسلہ میں اولیا کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے جو پیغمبر صاحب سے شروع ہو کر بانی سلسلہ پر ختم ہوتی ہے ان مختلف سلاسل میں دستور العمل بھی مختلف ہوتا ہے، اصول بھی مختلف ہوتے ہیں اور شریعت کی جانب میلان میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ داخل سلسلہ ہونے کے لئے بالعموم تجرد کی شرط نہیں ہوتی البتہ گو ان سلسلوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں مگر زیادتی کے ساتھ بالخصوص غربا ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ ہر نیک و بد ان لوگوں کا دوسروں پر بڑا اثر ہے بعض یورپین معترضین نظری ہمہ اوست

Theoretical Pantheism

اور عملی بداخلاقی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر مشرقی طبائع کو ان متبدیانہ تطبیقات کے تحت میں نہیں لایا جا سکتا۔ صوفیوں کا ہمہ اوست عملی زندگی میں خدا کی ہستی اور خدا کے احکام کی تعمیل کی ضرورت پر مشتمل ہے گو اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام میں مستند مسلمات اصولی نہ ہونے کی بنا پر صوفیوں کو ایک آزادی حاصل ہے جس کا ان میں سے اکثر غلط استعمال کرتے ہیں۔

محی الدین ابن عربی جو گروہ صوفیا میں پرواز تخیل کے سب سے بڑے استاد ہیں ملک اندلس

کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ء میں دمشق میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کا فلسفہ کائنات ضخیم ضخیم مجلدات میں موجود ہے جن میں مشہور ترین تصانیف فتوحات مکیہ و فصوص الحکم ہیں۔ ان تصانیف کا بڑا حصہ ادق اور ظنی ہے تاہم ان کا مطالعہ کرنے والوں میں سے کوئی شخص بھی مصنف کی دماغی اور تخیلی قوت پر حیرت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا گو بعض لوگوں (مثلاً عبدالکریم جیلی ۱۴۱۰ء) نے ان ہی باتوں کو زیادہ وضاحت اور زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل خاکہ میں مختصر چند اہم نکات پیش کر دیا جاتا ہے۔

ابن العربی پکے موحد ہیں اور انکے مسلک کو وحدت الوجود کا جو نام دیا گیا ہے وہ صحیح طور پر اس مسلک کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جملہ اشیاء بطور جوہر خیالی پہلے سے علم الٰہی میں موجود تھا زمین سے یہ اشیاء نکلیں اور وہیں مراجعت کریں گی نفی محض سے خلقت وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ کائنات ظہور ہے اس کا جو باطناً خدا ہے۔ ہر چیز کسی صفت الٰہی کا مظہر ہے اور انسان عالم صغیر ہے جس میں جملہ اسماء وصفات کا اجتماع ہے اور صرف انسان ہی میں خدا پوری طرح اپنے سے باخبر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ جس میں کہ ناسٹک (Gnosticism) اشراقیت (Neo-Platonism) عیسائیت اور دیگر مخارج سے اجزاء کو لے کر شامل کیا گیا ہے ابن العربی کے مسلک میں نہایت مرکزی حیثیت رکھتا[1]

۱؎ اس کا کیا ثبوت ہے کہ محی الدین ابن عربی رح نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا وہ ظنیات اور پرواز تخیل کے تحت میں ہے! کیا نہیں اس کا بھی ثبوت ہے کہ کشف والہام پروفیسر نکلسن کے فہم سے بالاتر امور ہیں؟ کیا جو چیز پروفیسر صاحب کی عقل ماوراء ہو اس کا وجود ہی محال ہے؟ ابن عربی رح کی تحریریں بھی پروفیسر صاحب کے فہم سے بہت ارفع ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون میں ان تحریروں کا خلاصہ بالکل غلط دیا ہے اور ابن عربی رح کی تحریروں کی باریکیوں کو وہ بالکل نہیں سمجھتے (ذوقی)

کئے ہوئے تھے یہ لب لباب ہے اصول تخلیق کائنات کا الہیت کو ایک تنے خارجی قرار دیکر اسکی انسانی تخیل میں ظاہر کیا گیا ہے جس کا پہلا جسدی اوتار آدم ہے۔ انسان کامل خدا کی صورت وفطرت کا نمونہ ہے اور رحمت الٰہی اور تنظیم کائنات کے درمیان واسطہ ہے جسکے ذریعہ سے دنیا زندہ اور قائم رکھی جاتی ہے۔ اور لازمی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدرجہ اتم انسان کامل ہیں ابن العربی سے بہت پہلے ہی ، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی کی قدامت کا عقیدہ تسلیم کیا جا چکا ہے سب سے پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی سمجھا جاتا ہے کہ نور محمدی ہے جو آدم میں آیا اور نسلاً بعد نسلٍ تمام پیغمبروں میں ہوتا ہوا بالآخر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صورت میں ظاہر ہوا اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ان سے علی اور ائمہ اہل بیت میں منتقل ہوا مگر صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ یہ نور جملہ اولیاء میں ساری ہے۔

ابن العربی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دراصل حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ یہ وہ فقرہ ہے جیسا کہ (Logos) نے اصول یا کلمہ تخلیق کائنات (امرکن) کے بیان کرنے اور ارسطو کے "عقل فعال" کی جانب اشارہ کرنے میں استعمال کیا ہے۔ اس حیثیت سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تخلیق کائنات کے لئے واسطہ بنے اور اس دنیا میں خدا کے خلیفہ بنے اور قطب بنے جن پر اس دنیا کا قیام منحصر ہے اور جن کے لئے یہ دنیا بنائی گئی اور تنہا وسیلہ بنے جملہ الہامات ربانی کا کیونکہ آپ پیغمبر تھے جب کہ آدم مٹی تھے۔ یہ سینٹ پال اور مصنف انجیل چہارم کے اقوال متعلق بہ مسیح کی کچھ آواز بازگشت سی معلوم ہوتی ہے ممکن کہ کسی حد تک ایسا ہو بھی۔ بہر نوع ابن العربی عیسائیت کے ساتھ ایک خاص قسم کی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور لفظ کلمہ کا استعمال مسیح و محمد (علیہما السلام) دونوں کیلئے کرتے ہیں گو فرق

... سچے ظنیات اور پرواز خیل سے یہاں پروفیسر صاحب کام لے رہے ہیں یا حضرت ابن عربی؟ جو صرف مماثلت ناقص مماثلت جزوی سے، خدا کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ محض مماثلت کلی سے بھی اس امر پہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا (مترجم)

ان دو ہی میں اسے عقیدہ نہیں کرتے۔ خالص توحید کی تصوف تقریباً لازمی طور پہ یا فلسفہ ہمہ اوست
Pantheism کی جانب رہنمائی کرتا ہے یا اولیاء پرستی کی جانب یا جیسا کہ اسلام میں پیش
یا دونوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے یا اولیاء پرستی کی جانب یا جیسا کہ اسلام میں پیش آیا۔ دونوں
کی جانب خالص فطرت الٰہی سے قطع نظر کرکے توجہ شخصی کے لئے حد نظر صرف پیغمبر یا اولیاء ہی تک
پہنچ کر رہ جاتی ہے جن میں سے اور جن کی وساطت سے خدا اپنے کو ظاہر کرتا ہے۔ تخلیق کائنات کے
متعلق ان اسلامی اصول کلی کے وجود میں آنے کا سبب اس مذہبی جوش کی تسکین کی ضرورت معلوم
ہوتی ہے۔ جو توحید الٰہی میں فرق آنے دینا گوارا نہیں کرتی۔ مسیحیت نے تشخیص الٰہی میں جو تفریق کی ہے
اس کو چھوڑ کر یہاں تفریق حیثیات سے کام لیا گیا ہے۔ انسان کامل دنیا میں خدا کا مظہر ہے۔ دنیا محمد
(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صوفیانہ عبادت اکثر ان الفاظ میں ادا کرتی ہے جنہیں رسول کی خدا کی شان
میں گستاخی قرار دیتے۔ "نور محمدی کا ظہور نہ ہوتا تو زمین پر کسی اسرار کا اظہار نہ ہوتا۔ نہ کوئی چشمہ جاری ہوتا
نہ کوئی دریا بہتا" صوفی انہیں "اللہ کا محبوب" کہتے ہیں اور وہ اللہ کے عطیات کو ان لوگوں پر تقسیم کرتے
ہیں جو ان سے محبت اور رابطہ روحانی رکھیں۔

ابن عربی کے نزدیک پیغمبر اولیاء کا احترام ان بکثرت عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے جن کے ذریعہ
خدا اپنا اظہار فرماتا ہے بقول انکے سچے صوفی کے لیے خدا ہر مذہب میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔
"میرے دل میں ہر صورت سما سکتی ہے۔ میرے دل میں دیر کے لئے بھی گنجائش ہے۔ اور بتوں کیلئے

۱۔ مجھے جب لفظ "عملاً" کی استثناء کو وہ صرف ان دو ہی میں عقیدہ نہیں کرتے تو تخصیص ہی کیا ہوئی پروفیسر صاحب کو اس کھینچ تان کی
کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق سمجھتا ہے دل سے اور سچے مذہب عیسوی کے ساتھ نہ کہ بگڑا ہوا مسیحیت
کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ابن عربیؒ کو اگر سچی عیسویت کے ساتھ ہمدردی تھی تو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی
کوئی مسلمان خواہ وہ صوفی ہو یا غیر صوفی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت نہیں کرتا۔ ہاں آپکا احترام آپ سے محبت ہر مسلمان کا
فرض ہے عبادت و احترام میں فرق ہے۔ ہر عبادت محبت و احترام ہے مگر ہر محبت و احترام عبادت نہیں ہوا ماں باپ سے محبت بھی کرتا
اور احترام بھی۔ یہ محبت و احترام عبادت نہیں۔ پروفیسر نکلسن یہاں بھی مسلمانوں کو کس نگاہ سے دیکھا ہے۔ (رفیق)

بھی۔ وہ آہووں کی چراگاہ ہے۔ اور پاکبازوں کا کعبہ۔ توریت کی تختیاں بھی اس میں ہیں۔ اور قرآن بھی عشق میرا مذہب ہے اس کے اونٹ جہاں چاہیں چریں مگر میں تو اپنے سچے عقیدہ ہی پر قائم ہوں"

مذہب والوں کا خدا موفیوں کے خدا کے مقابلہ میں محدود ہے۔ بدیں وجہ اپنے ہی مسلک کے لوگوں کی تعریف اور غیر مسلک والوں کی مذمت جہالت اور نا انصافی ہے۔ لا مذہب اور بت پرست بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کی صورت پر پیدا کئے گئے ہیں اور ایسے بندے ہمدردی کے زیادہ مستحق ہیں گو شریعت ان کے لئے سزائے موت ہی کیوں نہ تجویز کرے۔ بلحاظ اسکے کہ روح ہستی حق کا ایک پہلو ہے۔ ابن العربی نتیجہ نکالتے ہیں کہ افعال انسانی خود مختارانہ ہیں مگر ان کے مسلک میں اس اختیار کے عام فہم معنی نہیں۔ خدا خود افعال کا صدور بمقتضائے فطرت الٰہی فرماتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی لامحدود صفات سے لامحدود آثار مترتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نور و ظلمت نیکی اور بدی اور دیگر اضداد کا ظہور بھی یقینی ہے اور ان اضداد کے بغیر علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ چونکہ شر محض کا وجود ہی نہیں، دوزخ ایک عارضی چیز ہے جس سے دوزخی بالآخر نجات پا جائینگے۔

ابن العربی کی تصنیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اسپینوزا (Sponiza) کی یاد دل میں لاتی ہیں۔ مگر اس نتیجہ پر آنا ذرا مخدوش ہوگا کہ اندلسی یہودی کو اندلسی مسلم کے خیالات پر آگاہی تھی کیوں کہ اندلسی یہودی کی باطنی تفسیر توریت کے مبالغوں نے اس امر کو مخفی کر دیا ہے۔ کہ وہ خود بھی ایک سنجیدہ اور جدت پسند غور و خوض کرنے والا شخص تھا۔ تاہم ابن العربی نے زمانہ متوسط کے بعض عیسائی علماء کو ضرور متاثر کیا اور جیسا کہ پروفیسر اسین پیلیوز (Professor Asian Palacios) نے حال ہی میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے ان کے دوزخ جنت اور عالم بالا کے نقشوں میں جو خصوصیات تھیں۔ ان کو دانتے (Dante) نے اپنی تحریروں میں اس قدر مقابلتاً بیان کیا ہے کہ اسے محض توارد قرار دینا دشوار ہو گیا ہے عوالم سفلی، افلاک نجوم، دوائر روحانی، مرکز نور قدسی

کے گرد ملائک کے حلقے اور تثلیث کی جانب اشارہ کرنے والے دو نشانات جو ڈانٹے (Dante)
نے بیان کئے ہیں۔ وہ بجنسہ وہی ہیں جو ابن العربی نے بیان کئے ہیں۔ ڈانٹے (Dante)
بیان کرتا ہے کہ جیسے جیسے وہ جنت کے بلند سے بلند تر مقامات پر چڑھتا گیا۔ اس کی محبوبہ کے حسن و
جمال میں اضافہ ہوتا گیا جسے دیکھ کر ڈانٹے کی بصیرت تیز ہوتی گئی اور عشق قوی ہوتا گیا۔ یہی خیال
ابن العربی کی نظم میں بھی موجود ہے جو انہوں نے ڈانٹے سے تقریباً ایک صدی قبل ترجمان الاشواق
(نمبر ۱۴) میں لکھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ محبوب کی ملاقات سے مجھ میں وہ باتیں پیدا ہوگئیں جو پہلے
وہم میں بھی نہ آتی تھیں۔ کیونکہ میں نے ایسی صورت دیکھی جس کا حسن و جمال ہر ملاقات کے ساتھ ترقی
کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ایسے عشق سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ جو محبوب کی حسن افزائی کے ساتھ برابر
ترقی کرتا چلا جاتا ہو۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن العربی کی بھی ایک محبوبہ تھی۔ جو مکین ایک
کی حسین اور شائستہ بیٹی تھی اور نظام کے نام سے موسوم تھی۔ اس کے عشق میں انہوں نے جو
صوفیانہ غزلیں کہی تھیں ان کا جب چرچا شروع ہوا اور ان سے بدنامی ہونے لگی تب انہوں نے
ان غزلیات پر ایک شرح لکھی تاکہ معترضین کو یقین ہو جائے کہ وہ لوگ غلطی پر تھے۔ اسی طرح
ڈانٹے نے بھی کانوِتو (Convito) میں ان اسرارِ باطنی کی طرح لکھنے کا قصد ظاہر کیا ہے
جو اس کے چودہ عشقیہ گیتوں کی تہ میں مخفی ہیں۔ ان گیتوں کو اس نے کسی قبل کے زمانہ میں تصنیف کیا
تھا۔ اور ان کے مضامین سے یہ غلط خیال پھیل گیا تھا۔ کہ یہ اشعار خالص اور پاک محبت سے
نہیں بلکہ شہوانی محبت سے متعلق ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ان دونوں میں کلی اور جزوی مماثلت
اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ صرف ایک ہی نتیجہ پر آنا ممکن ہے۔ اسلامی خصوصیات مثلاً معراج
اور حیات بعد الممات کا عام اور فلسفیانہ تخیل مسلمان محدثین اور فارابی۔ بوعلی سینا، غزالی اور
ابن عربی جیسے مصنفین کے ذریعہ مشترکہ علمی ذخیروں میں داخل ہو کر تیرھویں صدی عیسوی کے

بہترین دماغوں تک یقیناً پہنچا ہوگا۔ سپین اور سسلی کے عرب فاتحوں نے وہی فیضان مفتوحین پر کیا جو ایران اور شام کے یونانی تمدن سے خود انہوں نے حاصل کیا تھا۔ گو مفتوحین پر اس فیضان کا اثر نسبتاً کمزوری ہی کے ساتھ کیوں نہ پڑا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں اس قبولیت تاثرات کی بین شہادت کا ملنا اگر بیشتر دشوار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے جب دو قومیں روزمرہ کی زندگی میں باہم مل جل کر رہتی ہیں اور یہ میل جول طویل مدت تک قائم رہتا ہے، تو دونوں قوموں کی ذہنیت کا باہم ایک دوسرے سے متاثر ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس کا تفصیلی ذکر تحریروں میں محفوظ رہ سکے۔

آؤ اب مشرق پر بھی نگاہ ڈالیں جہاں ایرانی تصوف کا عہد زرین شروع ہو چکا تھا۔ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح وحشی مغلوں کے ایشیا پر سیلاب سے تباہی، بربادی، بدحواسی، مصیبت اور بدنظمی کا جب دور ختم ہوا تو تصوف میں چمک پیدا ہوئی۔ افراد کی طرح اقوام بھی مصائب طویلہ کے بعد تسکین حالت کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ایران بھی بوجہ اسکے کہ کثرت تکان سے اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اپنی آسایش و راحت کے لئے ان لوگوں کی جانب مائل ہو گیا جو ایک طرف تو ان چیزوں کو پیش کر رہے تھے۔ جو اپنے فقدان کے باعث زیادہ قیمتی ہو گئی تھیں۔ مثلاً حسن انتظام، امن، انصاف، امور منفعت عامہ، تمدن خوبیاں، اور وہ مراسم و روایات جن پر قومی تنظیم کا دارومدار ہے۔ اور دوسری طرف سلامتی و مسرت ابدی کے وہ صوفیانہ نقشے پیش کر رہے تھے۔ جو اہل صفا ہی کو میسر آسکتے ہیں۔ جن کے نزدیک عالم ارواح ہی حقیقی اور دائمی چیز ہے۔ ان نقشوں کا کھینچنا صوفی شعرا ہی کا کام تھا۔ اور جس خوبی سے انہوں نے اس کام کو انجام دیا۔ اس نے تصوف کی فارسی شاعری کو ان ممالک میں بھی مشہور کر دیا جن میں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔

ان فلسفوں کی عقلی بنیاد ابن العربی نے مہیا کی۔ ہم دیکھیں گے کہ ان کے اثر کی بدولت تصوف کو قلب و ضمیر سے اتنا تعلق نہ رہا جتنا کہ پرواز عقلی اور فلسفہ ظنی سے اس کا تعلق ہو گیا۔ اور یہ بات صوفیائے متقدمین کے اخلاقی اور مذہبی جذبات سے بیگانہ ہے۔ اب مستند ولی وہ نہیں رہا۔ جس نے خود کو دعاؤں اور مناجاتوں سے طلب کیا ہو اور ریاضت شدید کے بعد فنائیت کا جام پی کر محض ناقابل اظہار فضل ربی سے اسے پایا ہو بلکہ اب مستند ولی وہ ہے جو عارف کامل ہو واقف رموز خفی و جلی ہو۔ انسان کامل ہو، خدا سے عینیت رکھتا ہو یا اس کا "امر کن" ہو اور یہ کہتا ہو کہ ؎

من آن روز بودم کہ اسما نبود — نشان از وجود مسمیٰ نہ بود
زمین گشت اسم و مسمیٰ پدید — در آں روز کا ینجا من و ما نبود

اس نوعیت کی شاعری کی خصوصیات پر غور کرنے سے قبل اس فلسفیانہ نظریہ کو بیان کر دینا مناسب ہے جو کہ اس کی بنیاد ہے۔

صرف ذات خدا ہی کا وجود ہے۔ اس کی صفات اس سے اعتباری غیریت رکھتی ہیں مگر حقیقتاً اس سے جدا نہیں۔ صفات الٰہی کے مجموعہ کو ہم کائنات کہتے ہیں۔ اور کائنات متغیر ہوتی رہتی ہے، اور اس میں اللہ اپنا اظہار فرماتا ہے۔ کائنات کو بقدر اس ظہور ہی کے حقیقت میں حصہ ہے۔ جو چیزیں کہ نظر آتی ہیں اپنا ذاتی وجود نہیں رکھتیں بلکہ ذات مطلق کے پرتو کی وجہ سے وجود اعتباری اختیار کر لیتی ہیں۔ نظام عالم میں مرتبہ انسانی کے متعلق اوپر تفصیل کی گئی ہے۔ عالم ارواح اور عالم اجسام کا اس میں اجتماع ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے اور کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جسم ظہور کی جانب اس کے خلاف عدمی ہے۔ چونکہ تقیید جسمانی نے اسے گرفتار کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا سے جدا سمجھتا ہے۔ یہ نظری مغالطہ کو فہم و براہین کے

مطابق ہے مگر فلسفۂ تصوف کے اس پہلے اصول کے خلاف ہے کہ جملہ ہستی اور جملہ افعال قدرت الٰہی کا مظہر ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف صوفیائے اہل کشف کو ہو سکتا ہے اور وہ اپنے خود شرل تک اپنے ہی اشارات و اصطلاحات کی مدد سے پہنچا سکتے ہیں جیسی عشقیہ شاعری میں ان باتوں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے وہ ان امور کو جن تک عقل کی رسائی نہیں نہایت خوبی سے ذہن نشین کر دیا کرتی ہے۔ علاوہ بریں جذبات عشق کو ان کیفیات و احوال صوفیا سے بہت مشابہت ہے جو معرفت و ولایت سے متعلق ہیں۔ دور ما قبل میں ان کیفیات کو پیدا کرنے کے لئے تلاوت قرآن سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر بہت جلد یہ کام ان عشقیہ نظموں سے لیا جانے لگا جنہیں ابتدا میں تصوف سے کوئی لگاؤ نہ تھا کبھی مزامیر کے ساتھ اور کبھی بلا مزامیر اس نوع کی غزلیں حال پیدا کرنے کے لئے بکثرت گائی جانے لگیں بعض صورتوں میں غزلیں اس مقصد کے لئے تصنیف بھی کی جاتیں ان شعراء کا منشاء صرف یہی نہیں ہوتا کہ اپنے کلام میں حقائق کا اظہار کریں بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ [illegible] کوشش بھی کرتے ہیں کہ ایک ایسا حسین و جمیل تخیل پیش کریں جو لامحدود اور ناقابل اظہار حقیقت کی جانب رہنمائی کرے۔ اور روح میں عالم بالا سے ایک مناسبت پیدا کر کے اسے انتہائی انکشافات روحانی کے لئے تیار کرے۔ مندرجہ مثالوں میں سے پہلی مثال ابن الفارض کے عربی دیوان سے لی گئی ہے اور دوسری مثال جلال الدین رومی کی فارسی غزل کا ایک حصہ ہے۔

(۱) "میں ہی اپنے محبوب کے ساتھ تنہا تھا جبکہ ہم دونوں میں خاص راز و نیاز جاری تھے میری مرضی کے مطابق مجھ پر تجلیات خاص ہوتی تھیں اور مجھ کو نوازا جاتا تھا شہرت لامحدود میں گم تھا اس کے حسن اور اس کی شان کے درمیان مسرت خاموش کے ساتھ میں متحیر کھڑا رہتا تھا میری روح پر کیفیات کی آمد و رفت ہوتی تھی جا سکے

ذرع زیبا میں جملہ دلفریبیاں اور ادائیں مجتمع تھیں ۔ اور کامل حسن و جمال جھلک رہا تھا ۔ جسے دیکھ کر میں پکار اٹھا تھا ۔ کہ لا الہ الا ہو العلی العظیم (ابن الفارض)

(۲) آقا سے پوچھو یہ کونسا مکان ہے جس میں سے مسلسل مست نغموں کی آواز آرہی ہے ۔ اگر یہ کعبہ ہے تو اس صورت بت کے کیا معنی ؟ اور اگر یہ عبادت گاہ مجوس ہے تو اس نور آب (؟) کے کیا معنی ؟ اس مکان میں ایک ایسا خزانہ ہے جو اس تنگ کائنات میں سما نہیں سکتا ۔ یہ مکان اور یہ آقا نظر فریبی کر رہے ہیں ۔ اس مکان کو ہاتھ نہ لگانا کیونکہ یہ ایک طلسم ہے آقا سے بات نہ کرنا کیونکہ وہ مست ہے اس مکان کا کوڑا کرکٹ مشک و عطریات ہیں ۔ اس کی چھت اور اس کے دروازے اشعار اور نغمے ہیں جسے اس مکان میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا وہ سلطان جہاں اور سلیمان وقت ہے ۔

اے آقا ! اس کی چھت سے اپنا سر ایک بار نیچا کر کیونکہ تیرا چہرہ نصیبہ وری کی علامت ہے مثل آئینہ کے تیری صورت میری روح میں اتر آئی ۔ تیری زلفوں کی نوکیں میرے دل میں مثل شانہ کے چبھ گئی ہیں ۔ یہ آقا مثل زہرہ اور قمر کے ہے اور آسمانوں کا مالک ہے یہ مکان عشق کا مکان ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا

(مولانا رومی)

یہ غزلیات زمان اور مکان کی حدود سے تجاوز کر کے مستی کی وہ بلندی اختیار کرتی ہیں ۔ جہاں سے ہر چیز پر ایک مجموعی نظر پڑتی ہے ۔

فارسی شاعری کی دوسری قسم افسانہ ہائے عشق کی حکایات سے متعلق ہے ۔ اس نوع کی شاعری کو نظامی (۱۲۰۳ء) نے کمال پر پہنچایا ۔ اس کے ذریعہ سے اس نے دود فرانس کا نقشہ

خوب کھینچا جا سکتا ہے۔ جو سلوک الی اللہ میں سطح پر گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت بڑی کہانیاں مثل لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا کے صوفیانہ رنگ میں بیان کی گئیں۔

تیسری قسم ان کثیر التعداد نظموں کی ہے جن کی غایت محض تعلیمی ہے۔ ان کی ابتدائی صورت صرف منظوم ہدایات و نصائح ہیں۔ جن کو مختصر کہانیوں اور واقعات سے مشرح کر دیا گیا ہے مثلاً حدیقۃ الحقائق جیسے سنائی غزنوی نے لکھا ہے۔ یا پھر وہ نظمیں ہیں جن میں مقامات سلوک کا ذکر تشبیہ و استعارات کی مدد سے کیا گیا ہے ان دونوں اقسام کی شاعری نے نہایت تیزی کے ساتھ انتہائی ترقی حاصل کی۔ اوّل الذکر شاعری کی ترقی یافتہ صورت مثنوی جلال الدین رومی ہے اور موخر الذکر شاعری کی ترقی یافتہ صورت فرید الدین عطار کی منطق الطیر ہے۔ اس نظم میں ان طیور کا قصہ ہے جو ہُدہُد کی رہنمائی میں سیمرغ یعنی اپنے پراسرار بادشاہ کی تلاش میں نکلے۔ ان طیور نے اپنی طلب میں سات وادیاں طے کیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) طلب (۲) عشق۔ (۳) معرفت (۴) استغنا، (۵) توحید۔ (۶) حیرت (۷) فقر و فنا۔ ان وادیوں کے طے کرنے کے بعد تیس طیور جو بچ رہے تھے جب پیش ہوئے تو ان پر منکشف ہوا۔ کہ وہ خود ہی سیمرغ ہیں اور سیمرغ کوئی چیز نہیں مگر وہی تیس پرندے:

کشف ایں سر نوے در خواستند ... حالِ مائی و منی در خواستند

بے زبان آمد ازاں حضرت خطاب ... کے بود ایں ذرہ چوں آں آفتاب

ہر کہ آید خویش را بیند درو ... جان و تن ہم پیش را بیند درو (عطار)

شاعر کا منشا غالباً جیلی کے اس دلچسپ مقولے سے سمجھ میں آجائیگا جس میں انہوں نے عیسائیوں پر اعتراض کیا ہے کہ ان لوگوں نے ظہور الٰہی کو صرف مسیح میں محدود کر دیا۔ خدا فرماتا ہے کہ میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اور یہاں آدم سے مراد بنی نوع انسان کا ہر فرد ہے۔ جو لوگ خدا کو انسان کے آئینہ

میں دیکھتے ہیں ان کو معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے۔ اس عرفان کا ایک جزو ہی عیسائیوں کے ہاتھ آیا ہے۔ اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق ان کا عقیدہ آخرکار ان کی اس وقت رہنمائی کرے گا۔ جب کہ اصل چیزیں اپنی اصلیت میں ان پر منکشف ہوں گی اور جب انہیں یہ انکشاف ہوگا کہ انسان مثل آئینوں کے ہیں جو آمنے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر آئینہ میں وہ نظر آتا ہے جو سب آئینوں میں ہے۔ لہٰذا وہ خدا کو اپنے میں دیکھیں گے اور اقرار کریں گے کہ خدا ایک ہے "

کیونکہ قواعد کے پابند نہیں اس لئے عارف مذہب اور لامذہبی سے برتر ہے" مگر متبذل قسم کے صوفیوں کو مستثنیٰ کرکے اوروں کے نزدیک اسکے یہ معنی نہیں کہ لامذہبی اور بداخلاقی کی اس مقولہ سے انہیں اجازت مل گئی ہو۔ ولی صادق شریعت کی پابندی کرتا ہے۔ نہ بوجہ اسکے کہ وہ اسکے مجبور ہے بلکہ بوجہ اسکے کہ وہ اپنے آپ کو خدا سے واصل محسوس کرتا ہے۔ تکمیل اصلیت میں دونوں چیزیں شامل ہیں۔ ظہور بھی اور بطون بھی، وحدت بھی اور کثرت بھی، حقیقت بھی اور شریعت بھی۔ خلق سے علیحدگی کافی نہیں تاوقتیکہ خالق کی ہدایت میں داخل ہو کر مخلوق میں خالق کے ظہور کا بھی ساتھ نہ دیا جائے۔ فنا سے گزر کر بقا میں پہنچنا انسان کامل کی علامت ہے۔ ایسا شخص سیر الی اللہ ہی پر بس نہیں کرتا سیر فی اللہ اور سیر مع اللہ میں مصروف ہوتا ہے۔ یعنی واصل باللہ ہونے کے بعد وہ خدا کے ساتھ عالم شہادت کی جانب لوٹتا ہے، اپنی ہدایت کی جانب رجوع ہوتا ہے۔ اور کثرت میں وحدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس نزول میں شریعت اس کا لباس ظاہری اور طریقت اس کی روش باطنی ہوتی ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو حقیقت کی تعلیم دیتا ہے اور خود شریعت پر پوری طرح کاربند رہتا ہے ؎

شریعت را شعار خویش سازد　　　طریقت را وساد خویشتن سازد

قطع نظر امور نظر کے مسلمانوں میں اکابر اولیاء جنہیں سے بکثرت رہنمائے خلق تھے خوب سمجھتے تھے

کہ جس نے ادنیٰ امور پر دسترس حاصل نہ کی ہو اس پر اعلیٰ امور کا انکشاف ہو۔ [illegible] کی تعلیم ہے۔ سینٹ پال کی طرح وہ اس امتیاز کو مدنظر رکھتے تھے کہ ایک گروہ کی پرورش کے لئے دودھ کی ضرورت ہے اور دوسرے گروہ کی پرورش کے لئے قوی گوشت کی۔ اس تو ہمہ اوست" کا اصول انہیں اس قابل بنا دیتا ہے۔ کہ وہ اللہ کے متعلق قرآنی تخیل کی بنیاد ہمہ اوست (Pantheistic Philosophy) سے تطبیق دے سکیں اور اخلاقیات کا ایسا مبدء مہیا پیش کر دیں جس کا انتہائی اصول یہ ہو کہ شر محض کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

ایرانی تصوف کا لب لباب عام فہم پیرایہ میں مثنوی معنوی مولانا جلال الدین رومی میں درج ہے مولانا درویشوں کے سلسلہ مولویہ کے بانی ہیں۔ آپ کا انتقال قونیہ میں ۱۲۷۳ء میں ہوا۔ اس مثنوی کو "فارسی کا قرآن" کہا گیا ہے۔ اور اس کے مصنف کا دعوے ہے کہ اس میں تعلیم پیغمبر کا مغز بیان کر دیا گیا ہے۔ جو شخص سرسری طور پر اس تصنیف کی ادھر ادھر سے ورق گردانی کرے گا۔ وہ دیکھے گا کہ اس کی تعلیمات میں جا بجا حکایات، واقعات، افسانے، کہانیاں، اور روایات جو شامل کی گئی ہیں۔ وہ زمانہ وسطیٰ کے مذہبی خیالات اور مذہبی زندگی پر محیط ہیں۔ غزلیات میں تو مولانا کی صوفیانہ نگاہ سوائے خدا کے کسی اور چیز پر نہیں جاتی مگر مثنوی میں انہوں نے ایک ایسے مبلغ اور پر جوش معلم کی شان اختیار کی ہے۔ جو ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہو جنہوں نے خدا تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ساری تعلیم کا نچوڑ افتتاحی اشعار میں دے دیا گیا ہے جن میں نے کو جو مولویہ سلسلہ کے درویشوں کا مقدس باجہ ہے۔ روح کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس روح پر خدا سے فراق کا مسلط ہو جانا بیان کیا گیا ہے۔ ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند ‌ ‌ از جدائیہا شکایت میکند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ‌ ‌ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق
ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

اس نظم کے متعلق خوب بات کہی گئی ہے کہ "مذہبی تخیل کو عشق کی رنگینی سے رنگین اور پاکیزہ بنانے کی یہ ایک کوشش ہے"۔ بقول جلال الدین کے وہ مذہب جو دلائل پر مبنی ہو اور ثبوت نقلی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ہو اتنا ہی بیکار ہے۔ جتنا کہ وہ مذہب جو رسم و رواج اور قدامت پرستی پر مبنی ہو۔ عشق ہر راز داں جانتا ہے اور ثبوت کا محتاج نہیں۔ شیطان کی جانب سے منطق ہے اور آدم کی جانب سے عشق"۔

خدا کی نگاہ میں سمیات اور فرقہ بندیوں کی کوئی وقعت نہیں۔ خدا نہ مسجد میں رہتا ہے، نہ گرجا میں، نہ مندر میں، وہ پاک اور ستھرے دل میں رہتا ہے۔ اصل چیز پوری اخلاقی کایا پلٹ ہے جو ایمان کامل اور عاجزانہ دعاؤں سے حاصل ہوتی ہے۔ جلال الدین کو خدا کی اچھائی اور انسان کی گنہگاری کا پورا یقین ہے۔ اس لئے وہ خالق کی طرف شر کی اضافت کے قائل نہیں۔ بلکہ مخلوق کی طرف اس کی اضافت کے قائل ہیں۔ خدا کا اپنے کمال کو ظاہر کرنا خوبی ہے جس طرح کہ ایک مصور خوشنما اور بدنما دونوں چیزوں کی تصویر کھینچنے میں اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے۔ نہ کہ اپنی بدنمائی کا۔ مگر مثنوی نے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ کہ جملہ اشیاء میں جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہیں۔ ایک ربط باہمی اور تناسب موجود ہے۔ جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ ہر انفرادی شر منفعت عامہ کے حق میں خیر ہے۔ تاہم اس ایرانی صوفی نے خودی کے خلاف مرتے دم تک جنگ جاری رکھنے پر بہت زور دیا ہے۔ خودی کو "سات دروازے والی دوزخ" اور تمام عیوب کی ماں قرار دیا ہے۔ جو عیب لوگوں کو دوسروں میں نظر آتا ہے۔ وہ دراصل ان ہی کے عیوب کا پرتو ہے۔ "جو خرابیاں تم دوسروں میں دیکھتے ہو وہ سب تمہاری ہی ہیں۔ جو ضرب تم دوسروں

پر لگاتے ہو وہ تم ہی کو لگتی ہے۔ تمہیں اپنے عیوب صاف نظر نہیں آتے ورنہ تم اپنے سے بڑی نفرت کرتے!

اس شاعر نے شہوت اور بدکرداریوں کے متعلق اس خوبی، اس وقت اور اسی صداقت سے اس نظم میں طول طویل کلام کیا ہے۔ کہ بعض اوقات مترجم کو اس کا ترجمہ کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ جبریوں کے مقابلے میں وہ زور دیتے ہیں کہ ہمارے افعال اگرچہ خدائی قوتوں کا نتیجہ ہیں تاہم ہمارے ہی اختیار سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم خدا کو ان کا ذمہ دار قرار دیں اگر گنہگاروں کو ارتکاب گناہ میں اپنی مجبوری کا احساس ہے تو وہ اس جبر کے تحت میں اتنی مستعدی کے ساتھ کیوں آجاتے ہیں۔ اور بعد میں وہ شرمندہ کیوں ہوتے ہیں۔ اور اپنے خطاکار ہونے کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ مگر یہ اس مسئلہ کا قطعی اور آخری حل نہیں۔ کمال عشق کے بغیر اور ارادۂ انسانی کو ارادہ ہی کے تحت میں لائے بغیر کمال آزادی محال ہے۔

لفظ جبرم عشق را بے صبر کرد آنکہ عاشق نیست حبس جبر کرد
ایں معیت با من است این جبر نیست ایں تجلی مہ است ایں ابر نیست
گر بود ایں جبر، جبر عام نیست جبر آں امارۂ خود کام نیست

جو اخلاقی رنگ مثنوی پر غالب ہے وہ مثنوی کے ان فلسفیانہ حصوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں مبنی واحد کا حیات کے مختلف طبقات میں ظہور فرمانا بیان کیا گیا ہے۔ اس ظہور کا خلاصہ روح کا وہ ارتقاء ہے جس میں عقل کل کا تنزل عالم مادہ میں ہوا اور معدنیات، نباتات، حیوانات میں سے گذر کر عقل انسانی میں اظہار ہوا۔ پھر امتحانات ہوئے۔ سزائیں ملیں۔ عالم ملکوت میں عروج ہوا اور لوح فانی نشو و نما ہوتے ہوتے اس اطلاق میں وصل ہوا جس کا وہ آئینہ ہے اور یہ کھل گیا۔ کہ احساس فراق صرف ایک خواب تھا ؎

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — وز جمادی در نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد — در جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد

جز ہمیں میلے کہ دارد سوئے آں — خاص در وقت بہار و ضمیراں

ہمچو میل کودکاں با مادراں — سرِ میل خود نداند در میاں

ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

عقلہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحول کردنی ست

تا رہد زیں عقل پر حرص و طلب — صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد ز پیش — کے گذارندش در آں نسیانِ خویش

باز ازاں خوابش بہ بیداری کشند — کہ کند بر حالت خود ریش خند

گنجایش نہیں کہ اس عظیم الشان اور ہمہ گیر کتاب منظوم کے زائد اقتباسات یہاں درج کئے جائیں۔ ایرانی تصوف کا اصلی رنگ اس خوبی اور قوت کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس کی کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی، اگرچہ اس کتاب کے عالمانہ رنگ، طوالت، اور اشکال پسندی کے اول سے آخر تک بالالتزام کم لوگ اُسے پڑھتے ہیں۔ اس کے مصنف کو دنیا سے جدید کی جھلک بھی حاصل ہوئی ہے۔ اور غزالی کے مقابلہ میں وسیع الخیالی بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیونکہ غزالی کا مذہبی رنگ زمانہ وسطیٰ کے روشن خیال علماء کے مذہبی رنگ سے ملتا جلتا ہے۔ صوفی کی فطرت میں ایک پرواز ہوتی ہے۔ اور فقیہہ کا کام اس بڑھیا کی نقالی ہے۔ جس نے شاہی باز کے ہاتھ آجانے پر اس کے پر اور پنجے تراش دیئے تھے۔ اسلام میں اس نوعیت کی سزائیں دینا مشکل ہے۔ صوفیوں نے اسلام میں عقیدہ کہ اس معاملہ میں جائز حد تک ترقی کی صوفیوں

کی اس ترقی سے جو آزادی حاصل ہوئی وہ بالآخر فریقین کے علمائے خدمت ہوئی مذہبی
کے اصل جھگڑوں میں اس نے منصفانہ روش اختیار کی اور باہمی رواداری کو ترقی دی۔ بعض
رومن کیتھولک مصنفین اس آزادی کی طرف جن امراض کو منسوب کرتے ہیں۔ وہ امراض کم از کم ان
معالجات سے کسی طرح بد تر نہیں جو یورپ کی مذہبی حکومتیں ایام گذشتہ میں کام میں لا چکی
ہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں صوفیوں نے بھی اپنی تعلیمات کے بعض اندیشہ ناک نتائج سے محفوظ
رہنے کے لئے رفتہ رفتہ ایک ایسی تنظیم قائم کر لی جس کے تحت میں کاملین کے اشارات کی تعمیل
ماتحتوں پر لازمی قرار پا گئی۔ اس تنظیم نے ایک مذہبی حکومت کی صورت اختیار کر لی جس کے
اراکین پوشیدہ اور ظاہر اولیا رہتے ہیں۔ اور ایک قطب ان کا افسر اعلیٰ ہے۔ صوفیوں کے
عقیدہ کی رو سے دنیا کی روحانی حکومت اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ اس جماعت کی
ذمہ داری اس بنا پر اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ کہ عملاً ہر صوفی کی تعلیم ایک شیخ کے ہاتھ
میں ہوتی ہے جس شخص نے اپنی تعلیم آپ ہی کی ہو وہ اس سلسلہ سے خارج سمجھا جاتا ہے۔
مگر نگران کا نگران کون ہو؟ اولیاء کی خوبیوں سے مجھے بحث نہیں۔ مگر رسمی یا خود ساختہ ذاتی
اخلاق یا اس دنیا کی کسی اور چیز کا ایسے لوگوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ جو جو اپنے اوپر آپ ہی
اثر ڈالنے کے طریقوں (Auto Hypnotic Methods) سے اپنی کیفیت
کو بڑھاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس حد تک الہام رسیدہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اپنی شخصیت
کو خدا میں گم تصور کرنے لگتے ہیں۔ بجائے اسکے کہ ان لوگوں کو معمولی معیار سے جانچا جائے۔
جو کہ ایک فضول بات ہے تو ہم غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر آئیں کہ اپنے نصب العین میں
یا جیسا کہ وہ کہتے ہیں حقیقت میں ان کا سچا انہماک گناہوں کے انبوہ کثیر کو صاف کر دیتا ہے
اور تو ہم اس بات کو بھی تسلیم کر لیں گے کہ اپنی تلاش میں اگرچہ وہ مقصود تک نہیں پہنچے

[illegible] سکتا تھا اس سے پاکیزہ تر مذہب اور اعلیٰ تر اخلاق تک
پہنچنا [illegible] ہو گی۔ ؎

آر۔ اے۔ نکلسن۔

؎ افسوس ہے کہ پروفیسر نکلسن نے اس مضمون میں نہ اسلام کے متعلق پختہ صحیح معلومات کا ثبوت دیا نہ تصوف کے متعلق جو شخص ان دونوں چیزوں سے پوری طرح واقف نہ ہو اس کی رائے ان کے متعلق یا آگاہی کی بابت معتبر نہیں۔ امور مذہبی میں سطحیات پر فلسفیانہ نگاہ ڈال کر نفسیات میں الجھنا اور قیاسی نتائج پر آ کر اٹکل کرنا محققانہ شان سے بعید ہے۔ ایک زمانہ جب کہ یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ مسمرزم اور ہپناٹزم پر اعتبار نہ کرتے تھے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اب تک یورپ میں جماعت کثیر ان چیزوں کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ صرف ایک جماعت قلیل ہے۔ جو ان سے کسی قدر شغف رکھنے لگی ہے۔ مگر اب تماشا یہ ہے کہ وحی و الہام کے متعلق ہر وہ بات جو ان یورپیوں کے شاگردوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مسمرزم یا ہپناٹزم یا ہپناٹزم کی کوئی قسم قرار دے دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ قرار دینے والے مسمرزم کے جاننے اور سمجھنے والے ہوں یا نہ ہوں۔ ان لوگوں کے نزدیک وحی الٰہی بھی نعوذ باللہ بباعث ہپناٹزم ہے اور انبیائے کرام کے احوال و کیفیات بھی وہی نوعیت رکھتے ہیں۔ لیکن ایک فلسفی جو اپنے کمرے میں بند ہو کر اپنے تخیلات میں گم ہو جاتا ہے۔ اور [illegible] کی کڑی ملانا شروع کر دیتا ہے یا ایک سائنس دان جو [illegible] ([illegible]) میں مقید ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور [illegible] بلکہ [illegible] میں مستغرق رہتا ہے۔ وہ اپنے انقلاب تخیل کے کسی دور میں جا کر [illegible] ہپناٹزم نہیں [illegible] جماعت کے [illegible] حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے پر آپ کے جن کلمات [illegible] [illegible]

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

- ہمارے ہندوستانی مسلمان ۔ از ولیم ہنٹر، آئی سی ایس
- اقبال پر ایک نظر ۔ مرتبہ سید محمد شاہ ایم ۔ اے
- تعلیمات اقبال ۔ پروفیسر سلیم چشتی ۔ بی ۔ اے
- شرح اسرار خودی ۔
- اقبال اور پیام حیات ۔
- اسلامی پارٹی کا آئین ۔ از مولانا عزیز ہندی
- ہیگل کا فلسفہ
- اقبال کا تصور زمان و مکان ۔ از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی
- موت و حیات اقبال کے کلام میں ۔
- تعلیم کا مسئلہ
- اقبال کے چند جواہر ریزے ۔ از خواجہ عبد الحمید ایم ۔ اے
- اشتراکیت اور اسلام ۔ از مولوی محمد مظہر الدین صدیقی ۔ بی ۔ اے
- محمد عبدہٗ ۔ از چارلس ایڈمز مترجمہ
- علمائے کرام کا مستقبل ۔ از مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی اے
- حقیقت نفاق ۔ از مولانا صدر الدین اصلاحی
- افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ از مولانا صدر الدین اصلاحی
- معرکۂ اسلام و جاہلیت
- دربار رسول کے فیصلے مترجمہ ابو العرفان حکیم محمد عبد الرشید
- اقبال کا تصور خودی از ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی
- المنبہات (عربی) از حافظ ابن الحجر العسقلانی
- القول الجمیل (〃) از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- سیدہ فاطمہؓ
- ابو جعفر منصور
- یاد اقبال
- کتب سماوی پر ایک نظر
- کالا پانی
- ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر
- نبوت محمدی کا عقلی ثبوت
- قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں
- اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

اقبال اکیڈمی

۵۴ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

علمائے کرام کا مستقبل علماء کو کیا کرنا چاہیئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر

از

مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام ۔ (ایک دلنشین موازنہ) " " " ۔ ۸ر

انتخاب غالب ۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب ۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندی مسلمان { سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات ۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال } ۱۲ر

المنبہات { عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے ۔ شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف } عمر

اسلامی پارٹی کا آئین { مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے ۔ از مولانا عزیز ہندی } ۸ر

ہیگل کا فلسفہ (فلسفہ اضداد کی تشریح) ۔ از مولانا عزیز ہندی ۔ ۱۴ر

ہندوستان کے مسلمان کا نصب کیا ہے ۔ " " ۔ ۱۴ر

القول الجمیل (عربی) ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۔ عمر

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ۔ ۸ر

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ۔ ابو القاسم رفیق دلاوری ۔ ۸ر

[illegible] برائے گورنمنٹ سکول [illegible] ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

جلد ۱۱ عدد [illegible] ... ۱۹۵۶ء

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
اقبال

ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم۔اے

ظفر منزل تاجپورہ لاہور

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر ۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ ۔ عہ/
شرح اسرارِ خودی ۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے ۔ عہ/
تعلیماتِ اقبال ۔ " " " ۔ ۸ر
اقبال اور پیامِ حریت ۔ " " " ۔ ۸ر
اقبال کا تصورِ زمان و مکان ۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی ۔ ۱۰ر
موت و حیات اقبال کے کلام میں " " " ۔ ۱۴ر
تعلیم کا مسئلہ ۔ " " " ۔ عہ/
اقبال کے چند جواہر ریزے ۔ پروفیسر خواجہ عبد الحمید ایم اے ۔ ۱۰ر
یادِ اقبال ۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار ۔ عہ/
حقیقتِ نفاق ۔ مرتبہ مولانا صدر الدین اصلاحی ۔ عہ/
افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ " " " ۔ عہ/
اسلام اور وطنیت ۔ " " " ۔ عہ/
معرکۂ اسلام و جاہلیت ۔ " " " ۔ عہ/
محمد عبدہٗ ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات ۔ عہ/

ماہنامہ

پیغامِ حق

ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

عدد ۲	اگست ۱۹۴۵ء	جلد ۱۱

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر نے دین محمدی پریس سرکلر روڈ لاہور
میں طبع کرا کر ظفر منزل۔ تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

سخنہائے گفتنی

اس مہینے کا سب سے اہم واقعہ ایٹم بم (Atom Bomb) کی ایجاد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بم امریکہ کے سائنس دانوں نے بنایا ہے اور اس میں فضا کے اُن چھوٹے سے چھوٹے ذرات کی حیرتناک طاقتوں سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں فلسفے کی اصطلاح میں جوہر فرد یا جزو لا یتجزیٰ کہتے ہیں۔ یہاں اس فلسفی نکتہ سنجی میں نہ پڑیئے کہ کسی جسم کا "لایتجزیٰ" ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں اس لئے کہ نئے فلسفے میں ذرّے یا ایٹم کا جو مفہوم ہے اُسے جزو لایتجزیٰ کے قدیم مفہوم یا قدیم بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل ایٹم یا ذرّے کے لفظ سے بعینہٖ جوہر فرد مراد نہیں ہوتا بلکہ ایٹم نام ہے الیکٹرون اور پروٹون کے مجموعہ کا الیکٹرون کا ترجمہ برق پارہ کہا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر الیکٹرون میں بجلی کی منفی طاقت موجود ہوتی ہے اور اس لئے ہر الیکٹرون کو بجلی کی اکائی کہنا چاہئے!

ایٹم بم بنانے والوں نے بجلی کی اسی طاقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور ایسی کامیاب کوشش کی ہے کہ جو طاقت ہزاروں من کے آتش فشاں بموں میں بھی نہیں ہو سکتی وہ تقریباً آدھ سیر کے اس چھوٹے سے بم میں پائی جاتی ہے۔ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بم کی ہلاکت آفرینی اتنی خوفناک ہے کہ اس کا تصور بھی مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس بم کا سب سے پہلا تجربہ میکسیکو کے ایک ویران جنگل میں کیا گیا جہاں انھوں نے آٹھ دس مربع میل کے رقبہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اور اس کے بعد میلوں تک کی

زمین پر ایک زبردست زلزلہ سی کیفیت طاری ہوگئی بیسیوں میل دور کے مکانات کی کھڑکیاں ہلنے لگیں اور اس چمک سے پیدائشی اندھوں تک کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک سی دوڑ گئی۔ موجودہ جنگ میں اس کا سب سے پہلا استعمال جاپان کے ایک شہر ہیروشیما پر ہوا اور کہا جاتا ہے کہ ایک ہی بم نے پوری بستی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ روم کے پاپائے اعظم نے جب اس بم کی قیامت آفرین تباہی کا حال سُنا تو اسے انسانیت کی سب سے بڑی لعنت قرار دیا اور یہ درخواست کی کہ اس کے استعمال کو فوراً روک دیا جائے۔ "لنڈن ٹائمز" نے لکھا کہ اگر اس بم کی تباہ کاریوں پر مضبوط نگرانی قائم نہ کی گئی تو ایک دن کرۂ زمین کی پوری انسانی تہذیب تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی۔

پھر اگر مذکورہ بالا بیانات واقعی صحیح ہیں تو اس بم کی ایجاد کو انسانی تاریخ کا ایک ایسا اہم واقعہ سمجھنا چاہئے جس پر پوری انسانیت کی موت و زیست کا دارومدار ہے۔ سائنس کی مدد سے انسان نے تباہی اور بربادی کے جو ہولناک آلات اب تک ایجاد کئے ہیں ان سب میں ملا کر بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ساری دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں لیکن ایٹم بم میں اسی قسم کی طاقت کا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اخبارات کا بیان ہے کہ جس فوجی افسر نے یہ بم جاپان کے شہر ہیروشیما پر پھینکا تھا وہ خود اس کی حشر سامانیوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا کہا جاتا ہے کہ ابھی امریکہ اور برطانیہ کے سوا اس بم کو بنانے کا راز کسی اور کو معلوم نہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آگے چل کر یہ راز افشا نہ ہو جائے گا اور دوسری قومیں کبھی اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں گی پھر اگر دو متحارب طاقتیں اس قسم کی ہلاکت آفرینی پر تُل جائیں تو دنیا کی عافیت کا خطرہ سے محفوظ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ گُر امریکہ اور برطانیہ کے سوا کسی اور قوم کو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکے گا تب بھی دنیا کا خطرہ سے محفوظ

رہنا ناممکن ہے اس لئے کہ پھر امریکہ اور برطانیہ کو مل کر ساری دنیا پر اپنی قومی شہنشاہیت جمانے کی شیطانی خواہش سے باز رکھنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو سکے گی۔ غرض اس بم کی ایجاد ہر حیثیت سے انسانی تاریخ کا ایک نہایت افسوسناک واقعہ ہے اور ہمیں خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ سائنس کی ان تباہ کاریوں سے انسانیت کو محفوظ رکھے۔

اتحادی طاقتیں اس بم کی ایجاد پر بہت خوش ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ اب جاپان کا ہار جانا چند دنوں کی بات ہے۔ غالباً اسی بنا پر ۸ اگست کو روس نے بھی جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ روس کے اس اعلان جنگ اور ایٹم بموں کی ہلاکت آفرینی کے بیچ میں پھنس جانے کی وجہ سے جاپان نے اعتراف شکست کی آوازیں بلند کرنی شروع کر دی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جاپان کا باضابطہ "اطاعت نامہ" اتحادی حلقوں تک پہنچا دیا گیا ہے لیکن تاہم تحریر کوئی آخری اور فیصلہ کن بات نہیں ہوئی ہے اور جنگ بدستور جاری ہے۔ تاہم گمان غالب یہی ہے کہ جاپان اپنے حریفوں کی تمام شرائط تسلیم کر کے ہتھیار ڈال دے گا اور اس طرح کم از کم فی الحال دنیا کو جنگ کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد دنیا کو واقعی مستقل اور پایدار قسم کا امن و امان حاصل ہو سکے گا یا نہیں۔ موجودہ حالات میں اس سوال کا جواب نفی ہی میں نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہٹلر، مسولینی اور ٹوجو پر جنگ شروع کرنے کا الزام آپ جتنا چاہیں عائد کر دیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دنیا جن مشکلات سے گزر رہی ہے ان میں ہٹلر، مسولینی اور ٹوجو کا پیدا ہونا حالات کا بالکل فطری اور قدرتی نتیجہ ہے۔ اس لئے جب تک اس قسم کے حالات کو رفع نہیں کیا جائے گا جنگ

کا دروازہ بند کرنا ناممکن ہے۔ اٹلانٹک چارٹر اور سان فرانسسکو کانفرنس کے نام سے جو کچھ کیا گیا وہ یہی دراصل جنگ کے خاتمہ کا سبب بن سکتا ہے لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ ان چارٹروں اور کانفرنسوں نے دنیا کی مشکلات میں کوئی خاص کمی نہیں کی۔ جرمنی کی شکست کے بعد اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے وہ ہرگز ایسا نہیں ہے جسے آٹھ کروڑ جرمن خاموشی سے برداشت کر سکیں۔ پھر آج آپ انھیں جتنا چاہیں دبا لیں لیکن ہمیشہ کے لئے انہیں محکوم و مجبور بنائے رکھنے کی کوشش کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی کیسی قوم کی بے چینی اور بے اطمینانی کا یہی وہ نقطہ ہوتا ہے جو دنیا کے امن کو ہمیشہ خطرہ میں رکھتا ہے اور اسی وجہ سے جرمنی بار بار جنگ کے شعلے بھڑکانے پر مجبور ہوتا رہا ہے یہی صورت جاپان کی بھی ہے۔ جاپان کے جارحانہ مظالم کو تسلیم کر لینے کے باوجود بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی کچھ معاشی اور سیاسی مشکلات ایسی ہیں جو اسے جنگ کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ اس لئے جنگ کے امکانات کو ختم کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہو سکتا کہ جبر اور طاقت کی مدد سے قوموں کو دبائے رکھنے کی کوشش کی جائے اس کے برعکس ضرورت اس کی ہے کہ ہر قوم کے جائز حوصلوں اور امنگوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کسی قوم میں مجبوری اور بے کسی کا وہ احساس پیدا نہ ہونے دیا جائے جو بغاوت و سرکشی کا میلان پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

حالات کی یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس وقت فاتح اقوام کی صف میں جو نام شامل ہیں وہ خود ایک دوسرے پر شک و شبہ کی نظریں ڈال رہے ہیں، خصوصاً روسی اور غیر روسی یا اشتراکیت اور جمہوریت کی رقابت تو اب اتنی نمایاں ہو چکی ہے کہ اس کا چھپانا ناممکن ہو گیا ہے۔ روس کی یہ خواہش ہے کہ فلسفۂ اشتراکیت ساری دنیا پر چھا جائے اور

ماسکو کو پورے روئے زمین کا مرکزی مقام بنا دیا جائے ہٹلر کی شکست نے چرچل اور روز ویلٹ کو گرا کر اسٹالین کو پیدا کیا ہے جس کی اشتراکی شہنشاہیت، نازی پارٹی کی ہوس عالمگیری سے کچھ کم نہیں ہے چنانچہ ایک طرف تو وہ چین میں اپنا جھنڈا نصب کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف عراق و ترکی سے لے کر ہندوستان تک اپنے پاؤں پھیلانے کا آرزومند ہے۔ روس کی یہ خواہش اب کوئی راز نہیں رہی کہ وہ نہ تو برطانیہ اور امریکہ کا اقتدار دیکھنا چاہتا ہے اور نہ چین اور فرانس کی موجودہ حالت کو پسند کرتا ہے۔ ایسی صورت میں رقابت اور مناقشت کی یہ کشمکش اگر جلد ہی کسی نئی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو تو محل تعجب نہیں۔

شملہ کانفرنس کے بعد سے ہندوستان میں جو حالت پیدا ہو گئی ہے وہ ابھی تک بدستور باقی ہے لیکن خیال یہ ہے کہ برطانیہ کی نئی مزدور وزارت اس حالت کو زیادہ دیر تک نہ رہنے دے گی۔ البتہ یہ امر حیرتناک ہے کہ ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی واضح اعلان نہیں ہوا۔ بدنصیبی سے مسلم لیگ اور کانگریس کا جو جھگڑا ملک میں پیدا ہو گیا ہے اس کو حل کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت برطانیہ ثابت ہو رہا ہے ورنہ اگر جدید انتخابات کا اعلان کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی رائے عامہ سے فیصلہ کرا لیا جائے تو پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے تمام جھگڑے آسانی سے ختم ہو سکتے ہیں۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ برطانیہ تو جنگ یورپ کے خاتمہ کے بعد نئے انتخابات کر کے مزدور اور قدامت پسند کا قضیہ نبٹا سکتا ہے لیکن ہندوستان کو پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کا قضیہ نبٹانے کے لئے نئے انتخابات کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہمیں قائد اعظم کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ اب

عارضی اور ہنگامی انتظامات کا وقت نہیں ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مستقل طور پہ یہ بتایا جائے کہ ہندوستان کو برطانیہ کیا دینا چاہتا ہے اور پھر عام انتخابات کے ذریعہ معلوم کیا جائے کہ ہندوستان کی رائے کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ برطانیہ کی طرف سے اس قسم کا کوئی قدم اب تک نہیں اٹھایا گیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لیگی اور غیر لیگی مسلمانوں پر ایک نہایت ہی افسوسناک فتنہ ہندوستان میں کھڑا ہو گیا ہے اور جناح و ابوالکلام کے درمیان ایک مصنوعی اور بالکل غیر حقیقی جنگ چھڑ گئی ہے۔

ہم پاکستان کے حامی ہیں اور ہماری یہ مستقل رائے ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت بھی پاکستان کی ہمنوا ہے لیکن چونکہ آج کل آٹھ دس برس کے پرانے انتخابات کو سامنے رکھا جا رہا ہے اس لئے کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا دشوار ہے۔ اگر آج انتخابات کا اعلان ہو جائے تو مسلم رائے عامہ ان تمام قضیوں کا فیصلہ کر سکتی ہے جس کے بعد نہ تو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کسی چپقلش کا باقی رہنا ممکن ہو گا اور نہ جناح و ابوالکلام کی موجودہ آویزش کا کوئی وجود رہے گا۔

تدوینِ فقہ "پیغامِ حق" کے کسی سابقہ پرچے میں عنوانِ بالا کے تحت فتاوائے عثمانیہ کی جلدوں پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ ناظرین ان مجلدات کے متعلق جملہ خط و کتابت فاضل مؤلف مولنا منور الدین صاحب پارک مینشن۔ دریا گنج۔ دہلی کے پتہ پر کریں۔

اقبال نمبر — پیغام حق کا اقبال نمبر نکالنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اس کا تذکرہ اس سے قبل ان اوراق میں آچکا ہے۔ اجرت دے کر مضامین لکھوائے جا رہے ہیں، انعامی مضامین کے لئے اشتہار دئے جا رہے ہیں۔ نادر مضامین، غیر مطبوعہ مضامین اور غیر مطبوعہ کلام اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ کاغذ کے لئے گورنمنٹ سے خط و کتابت جاری ہے۔ یہ پرچہ ضخامت کے لحاظ سے اتنا بڑا ہوگا جتنے پانچ ماہ کے اکٹھے رسالے یعنی چار سو صفحات۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ پرچہ ہر لحاظ سے کامیاب اقبال نمبر ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے قارئین کرام نے مطلقاً کوئی سرگرمی اور توجہ نہیں دکھائی۔ اس رسالہ کی تیاری پر ساڑھے تین ہزار روپیہ خرچ آ رہا ہے۔ اگر سارا نہیں تو اس کا کچھ حصہ توسیع اشاعت کے ذریعے دفتر کو وصول ہو جانا چاہئے۔ بار بار اپیلیں شائع کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی مگر اب تک میری اپیلوں کا اثر صرف دو حضرات پر ہوا ہے اور رسالہ کے خریداروں میں جس قدر اضافہ ہوا ہے وہ صرف دو حضرات کی توجہ کا رہین منت ہے۔ کیا باقی تمام حضرات کے لئے میری اپیلیں بے اثر رہیں گی؟

خاکسار

محمد شاہ ایڈیٹر پیغام حق

اُردو!

وطن کہاں ہے اور عمر کیا ہے؟

(از جناب ابو سعید بزمی)

اُردو کی حالت اس بیکس و بے بس یتیم بچے کی سی ہے جسے پہلے سوتیلی ماں سے واسطہ پڑا ہو اور پھر سوتیلے باپ سے سب سے پہلے اس کے حال زار پر اُن گوری نسل کے نوواردوں نے "دستِ شفقت" پھیرا جو آئے تو تھے بنیے بن کر لیکن چھا گئے آقا ہو کر۔ تقریباً ایک صدی تک اُردو غریب اُن "سرپرستوں" کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہی۔ یہ نظریہ کہ اُردو کے معنے لشکر کے ہیں اور چونکہ مسلمان فاتحوں کے لشکری سپاہی یہی زبان بولتے تھے اس لئے اس کا نام اُردو پڑ گیا، انہی آقاؤں کے دماغ کی ایجاد ہے۔ پھر چونکہ دولت و ثروت اور حکومت و غلبے کی طاقتیں انہی کے ساتھ تھیں، اس لئے ہم ہندوستانی بھی یہی سمجھنے لگے کہ گورے نوواردوں کی یہ تحقیق سو فیصدی صحیح ہے ——— اس کے بعد دوسرا دور وہ ہے جو بابو پرشوتم داس ٹنڈن (اسپیکر یوپی لیجس لیٹو اسمبلی) اور بابو سمپورنانند جی ایم۔ ایل۔ اے (سابق وزیر کانگریس یوپی) جیسے کرمفرماؤں" کی آتش بیانی سے شروع ہوتا ہے اور جسے صاف صاف لفظوں میں ٹنڈن جی نے پچھلے دنوں پونا میں تقریر کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا کہ ———

اُردو بھی انگریزی کی طرح ایک بدیسی زبان ہے جو محض مسلمان حکمرانوں کے غلبہ و حکومت کی وجہ سے ہندوستانیوں کے گلے منڈھ دی گئی ہے۔ اس لئے آپ کی رائے میں اب

ضرورت اس کی ہے کہ اردو کے مقابلے میں صدیوں پرانی ہندی کو جاری کیا جائے جس کا ماخذ سنسکرت ہو اور جس میں عربی فارسی کے کسی لفظ کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے بڑی لڑائی ریڈیو کے خلاف لڑی جارہی ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ ریڈیو پر ہندوستانی کے نام سے جو زبان بولی جاتی ہے، وہ "مسلمانوں کی زبان" ہے اور مسلمانوں کے عہد حکمرانی کی یادگار ہے اس لئے اسے ترک کرکے اس کی جگہ اس دقیانوسی زبان کو رائج کیا جائے جس میں ہوا کو وریو، اگر کو یدی، وزیر کو منتری اور سکین کو بہنتو جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نرالی زبان کے حامیوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ابھی یہ زبان ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی نہیں بولی جاتی، لیکن عزم و حوصلہ یہ ہے کہ ہم کوشش کریں گے اور اسے بلوا کے چھوڑیں گے

ہندی کے نام سے آج جس زبان کو اردو کے مقابلے میں پیش کیا جارہا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے الفاظ اور صرف و نحو دونوں کا سرچشمہ سنسکرت کو قرار دیا جائے گا اور فارسی یا عربی کو ایک بدیسی زبان سمجھ کر اس کے اثرات کو پوری طرح زائل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ عربی و فارسی کے مقابلے میں سنسکرت کو اتنی اہمیت کیوں دی جارہی ہے؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ سنسکرت، ہندوستان کی اصلی زبان ہے لیکن عربی و فارسی بدیسی ملکوں سے آئی ہوئی زبانیں ہیں۔ اس لئے دیس و وطن کی چیز کو ہر حالت میں بدیسی و غیر وطنی چیز پر ترجیح حاصل ہونی چاہئے۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے ہمیں اس کے معقول ہونے سے انکار نہیں۔ بلاشبہ دیسی چیزوں کو بدیسی چیزوں پر ترجیح حاصل ہونی چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سنسکرت واقعی دیسی زبان ہے؟ اور کیا سنسکرت ہی پر کیا منحصر ہے ہم تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر یہ پوچھتے ہیں کہ وہ ہندو مذہب جس میں

برہمن پنڈتوں کو نظام شمسی کی حیثیت حاصل ہے ۔ کیا خود وہ مذہب ہندوستان ہی کی پیداوار
ہے ؟ تاریخ کا ایک معمولی سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے ۔ آج
سے تین چار ہزار سال قبل آریہ نسل کے جو لوگ وسطی ایشیا کے پہاڑوں سے اتر کر ہندوستان آئے تھے
یہ مذہب اور یہ سنسکرت زبان انہی کی لائی ہوئی ہے ۔ پھر وہ اپنے خیالات کی اشاعت میں اتنے
کنجوس واقع ہوئے تھے کہ نہ تو انہوں نے سنسکرت کو عام لوگوں کی زبان بنانا پسند کیا اور نہ
ہندو دھرم کو ہندوستان کی عام آبادی کا مذہب قرار دینے پر رضامند ہوئے ۔ سنسکرت بولنے
اور پڑھنے کی اجازت صرف پنڈتوں اور اسی قسم کے دو ایک اور آریہ نسل کے لوگوں کے سوا اور کسی
کو حاصل نہ تھی ۔ اسی طرح ہندو مذہب کی رسوم کی بجا آوری کا دروازہ بھی چند مخصوص افراد
کے علاوہ باقی تمام ہندوستانیوں پر بند تھا ۔ چنانچہ آج بھی اچھوتوں کے نام سے ہندوستان
میں یہاں کے اصل باشندوں کی جو قوم بستی ہے ، اس پر ہندو مندروں اور ہندو عبادتگاہوں
کے دروازے بند ہیں اور ان کا چھونا بلکہ ان کی پرچھائیں پڑ جانا بھی ایک آریائی نسل کے ہندو
کو ناپاک بنا دینے کے لئے کافی ہے ۔ منو کے شاستر میں صاف طور سے مرقوم ہے کہ اگر کوئی
شودر سنسکرت زبان کی کسی مذہبی کتاب کا کوئی جملہ کسی طرح سن لے تو اس کے کانوں
میں کھولتا ہوا تیل ڈال دیا جائے تاکہ آئندہ اسے کبھی اس قسم کی جرأت نہ ہو ۔ نیز یہ ہدایت بھی جاری
کی گئی ہے کہ سنسکرت زبان کا کوئی لفظ عام لوگوں کو نہ سکھایا جائے اور نہ سنسکرت
کی مقدس کتابوں کو عام طور سے پڑھنے کی اجازت دی جائے ۔ مختصر یہ کہ سنسکرت جو
نووارد آریائی نسل کے ہندوؤں کی زبان تھی وہ کبھی بھی عام ہندوستانیوں کی زبان نہ بنی نہ
بنائی گئی ۔ اور غالباً یہ صورت حال اب تک باقی رہتی اگر اخوت و مساوات کا پیام لے کر
اسلام کے نام لیوا اس ملک میں نہ آتے ۔

اس حقیقت سے تاریخ کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا کہ پنڈتوں کے مذکورہ بالا استبداد اور آریائی نسل کے افراد کی شہنشاہیت کو ہندوستان میں کمزور بنانے کا کام صرف مسلمانوں ہی کے ہاتھوں انجام پایا اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے اور یہاں چندر گپت اور اشوک کے زمانہ کی طرح برہمنوں ہی کا راج ہوتا تو آج اس ملک کی نوّے ۹۰ فیصدی آبادی ذلت اور حقارت کے ساتھ جہالت کے غار میں پڑی ہوتی۔ مسلمانوں نے دنیا کو انسانی مساوات اور انسانی یکرنگی کا جو درس دیا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عربی فارسی الفاظ عام لوگوں کی زبان پہ چڑھنے شروع ہو گئے اس لئے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی زبان کو سنسکرت کی طرح چند افراد کی مخصوص دولت بنا کر نہیں رکھا۔ مسلمانوں کی طرف سے صلائے عام تھی کہ جو جس علم کو جس زبان میں چاہے پڑھے۔ اچھوت اور غیر اچھوت یا اونچ ذات اور نیچ ذات کا کوئی امتیاز اسلام کی نگاہ میں وجہ جواز نہیں رکھتا۔ اسلام دنیا کا وہ پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے بندہ و آقا کی تمیز اٹھا کر محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں بٹھا دیا۔ اقبال کا یہ مشہور شعر اسی فلسفہ کی ترجمانی کرتا ہے ۔ ع

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

مسلمان کی نگاہ میں جس طرح نسل و نسب کی کوئی اہمیت نہ تھی اسی طرح وہ رنگ و وطن کے امتیازات کا بھی قائل نہ تھا۔ وہ ساری انسانی برادری کو ایک ہی پیمانے سے ناپتا ہے اور ایک ہی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک عزت و ذلت کا معیار صرف اعمال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے اور اس نے دنیا کو یہ اصول بتایا ہے کہ تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ط

اسلام کے اسی فلسفۂ زندگی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو ان کی صفت آریائی نسل کے سابق نوواردوں سے بالکل مختلف تھی۔ آریائی ہندوؤں نے اپنی نسل کو بلند ترنسل اور اپنی زبان کو ممتاز ترین زبان قرار دیا۔ انہوں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کے ساتھ مل جُل کر بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ انہیں اچھوت کہہ کر ہر مجلس و محفل سے دور ہٹایا حتیٰ کہ مندروں میں مورتی کے درشن کرنے کی اجازت بھی ان کو نہ دی۔ مہاتما بُدھ نے آریائی ہندوؤں کے اس استبداد کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا جس کے نتیجے میں ہندوستان کی مظلوم و بےبس مخلوق ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے قدموں میں آپڑی لیکن برہمنوں اور پنڈتوں کو اپنے اقتدار کی یہ شکست کیسے گوارا ہو سکتی تھی ـــــ وہ موقع کی تاک میں بیٹھے رہے اور آخر وہ وقت آیا کہ انہوں نے بدھ مذہب کو ہندوستان سے اس طرح ناپید کر دیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بدھ مذہب کو ہندوستان سے دیس نکالا دینے میں نووارد آریائی نسل نے جس ظلم و استبداد کا ثبوت دیا اگر اس کا ایک ہزارواں حصہ بھی مسلمانوں کی طرف سے عمل میں لایا جاتا تو آج ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو مذہب کا نام لینے والا کوئی ایک فرد و بشر بھی نہ ملتا۔

اس تمام بحث سے مطلب صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو انھوں نے یہاں ایک پردیسی قوم کی طرح اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تھلگ بنا کر رہنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہاں کے باشندوں کے دل میں جگہ پیدا کر کے ان کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ بننے کی کوشش شروع کی مسلمانوں کے اسی رویّے کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی ہندو قوم کے افراد جوق در جوق اسلام کے حلقے میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس

سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو حکومت و سلطنت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ اثر سے بھی مسلمان بنانے کی کوشش کی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دہلی سے لے کر پٹنے تک کا وہ علاقہ جو مسلم حکمرانوں کا مرکز رہا ہے اور جس کی عمارات اور محلات آج تک اُن کی سطوتِ رفتہ کی یاد دلانے کے لئے موجود ہیں، وہاں ہندو آبادی کا وہ تناسب ہرگز نہ ہوتا جو آج نظر آ رہا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی کوشش یہ رہی کہ یہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اشتراک و تعاون سے کام لیں۔ وہ آئے تو تھے ایران و افغانستان اور عراق و عرب سے، لیکن گھُل مل گئے ہندوستانی باشندوں ہی میں۔ آج ہندوستان میں سیّدوں، شیخوں، مغلوں اور پٹھانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج اُن کا وطن ہندوستان کے سوا کہیں اور ہے؟ بہت سے مسلمان آپ کو ایسے ملیں گے جو خود کو سبزواری، ترمذی، کرمانی یا بخاری کہتے ہیں۔ لیکن یہ چیز صرف رسمی ہے۔ ورنہ سبزوار، ترمذ، کرمان یا بخارا میں اُن کو جاننے والا بھی کوئی نہیں۔ وہ خود بھی ان شہروں کے محلِ وقوع تک سے ناواقف ہیں۔ وہ یہیں رہتے ہیں، یہیں کی زبان بولتے ہیں اور یہیں شادی بیاہ کر کے آخر کار یہیں کی خاک میں دفن ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کو بدیسی کہنا اگر صحیح ہو سکتا ہے، تو پھر آریائی نسل کے ہندو بھی بدرجۂ اولیٰ بدیسی قرار پا جاتے ہیں۔ بنا بریں ہم شدھی جی کی قسم کے لوگوں سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اگر مسلمان ہندوستان میں اسلامی عہدِ حکومت کی یادگار ہیں اور اس لئے ان کی لائی ہوئی ہر چیز بھی بدیسی و غیر ہندوستانی ہے، تو پھر نہرو، گاندھی اور سپرو کی نسل کس دلیل سے

ہندوستانی ہوسکتی ہے ؟ علیٰ ہذا القیاس اگر اُردو صرف اس لئے ایک بدیسی زبان ہوسکتی ہے کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں، تو پھر وہ ہندی بھی یقیناً بدیسی ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے۔ عربی فارسی کی طرح سنسکرت بھی ہندوستان کی نہیں، ہندوستان سے باہر والوں کی زبان تھی۔ اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا، آریائی نو واردوں نے اپنی اس زبان کو قدیم ہندوستانی باشندوں سے دور رکھنے کی اتنی کوشش کی کہ آج بھی اُس کے اثرات صاف نظر آرہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آریائی ہندوؤں کی طرف سے تعصب و تنگ نظری کا اظہار نہ کیا جاتا اور سنسکرت کی تعلیم تمام ہندی باشندوں کے لئے عام ہوتی تو آج ہماری زبان میں خود بخود اس کے الفاظ نظر آتے لیکن جب آپ کی سنسکرت والوں نے اپنی اس زبان کو چھوئی موئی بنا کر ساری دنیا سے بالکل الگ تھلگ رکھا اور کسی عام آدمی کو اس تک رسائی ممکن نہ ہوسکی، تو مجبوراً عوام نے عربی فارسی کے الفاظ سے اپنی روز مرّہ کی ضرورتیں پوری کرنی شروع کیں۔ اس لحاظ سے یہ تو مسلمانوں کا احسان ہے کہ ایسے کنجوسوں کے ہجوم میں آکر انھوں نے بے کس و بے بس عوام کے سامنے اپنی زبان کے ذخائر کھول دیئے اور اُنھیں اس بات کا پورا پورا حق دیا کہ وہ جب اور جس طرح چاہیں اس ذخیرے سے فائدہ اُٹھائیں۔ مسلمانوں کے ذہن میں اس وقت یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ہزار بارہ سو برس کے بعد ہندوستان پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب یہاں سات سمندر پار کے گورے آقاؤں کی عملداری ہو گی اور جمہوریت کے نام پر ہندوستان کا سوال کھڑا ہو گا جس میں زبان کا مسئلہ بھی حصولِ اقتدار کی ایک کڑی ثابت ہوسکے گا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو حقیقت یہ ہے کہ

آریائی نسل کے ہندو آج بھی کچھ فراخدلی یا فراخ حوصلگی کی وجہ سے سنسکرت کو عام کرنا نہیں چاہتے بلکہ مقصد اُن کا صرف یہ ہے کہ جمہوریت کے اس دَور میں زبان کی راہ سے اپنا تسلط عوام کے دل و دماغ پر حاصل کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کانگریسی وزارت کے زمانے میں مدراس کے وزیر اعظم راجہ گوپال اچاری نے اپنے صوبے میں ہندی کو رواج دینا چاہا تو وہاں کی غیر آریائی آبادی نے اس پر سخت سے سخت احتجاج کیا اور وہ کسی طرح اس سنسکرت زبان سے اپنا رشتہ جوڑنے پر آمادہ نہ ہوسکے جس کی جڑیں ہندوستان سے سینکڑوں میل دُور وسطی ایشیا کی سرزمین سے وابستہ ہیں۔

غرض ان تاریخی حالات سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی زبان پر عربی فارسی الفاظ کا اثر کسی حاکمانہ جبر و تسلط یا کسی شاہانہ اقتدار و سرپرستی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے دو عوامل کا۔ اوّلاً ہندو برہمنوں کی وہ تنگ نظری جس نے علوم کے ذخائر کو عوام کی آنکھوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی اور سنسکرت کو چھوئی موئی کا پودا بنا کر صرف برہمن پروہتوں ہی تک اُسے محدود رکھا، اور ثانیاً مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کے ساتھ گھُل مل کر رہنے کا وہ جذبہ جس نے ہندو مسلمانوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبے میں اخلاص و محبت پر مبنی تعاون و اشتراک کی راہیں کھول دیں۔ آج جس زبان کو اُردو کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی ہندو مسلمانوں کے اسی میل ملاپ کی نشانی ہے۔ اس کی صرف و نحو ساری وہی ہے جو پہلے سے چلی آرہی تھی۔ الفاظ بھی سب وہی ہیں لیکن مسلمانوں سے قبل یہ عام زبان، علم و ادب کی زبان نہ تھی اس لئے اس میں الفاظ کا ذخیرہ بہت تھوڑا اور بہت محدود تھا۔ اس لئے جب اسے علم و ادب کی زبان بنایا گیا تو قدرتاً تو

لفظوں کی ضرورت پیش آئی سوال پیدا ہوا کہ یہ لفظ کہاں سے آئیں سنسکرت کی طرف لوگوں نے نظر اُٹھائی تو اس کے دروازے پر موٹے موٹے قفل پڑے ہوئے تھے اور برہمنوں کے سوا اور کسی کو ان کے کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ اب مجبوراً عربی فارسی کی طرف رُخ کیا گیا یہاں خیر مقدم کے لئے آغوش کھلی ہوئی تھی۔ اذن عام تھا کہ جس کا جی چاہے عربی و فارسی علوم کے چراغ سے اکتساب نور کرے۔ اندھے کو کیا چاہئے۔ دو آنکھیں! اس مصیبت کے وقت میں ہندوستانیوں کے لئے عربی فارسی کی یہ فراخدلی چشمۂ حیات ثابت ہوئی۔ وہ اس کی طرف دوڑ پڑے اور اس کے آب صافی سے اپنی پیاس بُجھانے لگے۔

انہی حالات کا نتیجہ ہے کہ رفتہ رفتہ عربی فارسی کے ہزاروں الفاظ ہندوستان کی زبان میں اس طرح پیوست ہو گئے کہ اب ان کو فارسی یا عربی کہنا بھی غلط ہے۔ چنانچہ آج بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کا تلفظ عربی فارسی میں کچھ اور ہے اور ہماری زبان میں کچھ اور یہی نہیں بلکہ بیشمار الفاظ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ ابتدا میں لئے عربی یا فارسی ہی سے گئے تھے لیکن مقامی ضروریات کے پیش نظر اب ان کے معنے ہماری زبان میں بالکل دوسرے ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "خیر" کے لفظ کو لیجئے۔ جب آپ کہتے ہیں "خیر، جانے دو" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ اچھا کوئی حرج نہیں۔ یونہی سہی، لیکن فارسی میں خیر کے معنے ہوتے ہیں "نہیں" اور عربی میں خیر صرف نیکی اور بھلائی کے لئے آتا ہے اور "خیر جانے دو" میں اس لفظ کا جو استعمال ہے وہ عربی لغت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ لیکن اُردو لغت میں یہ بالکل صحیح ہے۔ اسی طرح "خراب" کا لفظ ہے عربی میں اس کے معنے ہیں ویران وغیر آباد لیکن اُردو میں ہم ہر بگڑی ہوئی یا ناپسندیدہ چیز کو خراب کہتے ہیں۔ عربی لغت کے لحاظ سے یہ بھی غلط ہے مگر خود ہندوستان میں گزشتہ ایک ہزار برس تک رہنے کی وجہ سے اس لفظ

نے ہماری لغت میں جو معنے اختیار کر لیے ہیں۔ اب اس کا کوئی تعلق عربی لغت سے نہیں رہا۔
اسی طرح تمدن و تہذیب سے تعلق رکھنے والے ہزاروں الفاظ ہیں جن کا کوئی مترادف نہ سنسکرت میں تھا اور نہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں اس لیے مجبوراً وہ الفاظ بھی عربی یا فارسی ہی سے لیے گئے۔ مثلاً رکابی کے لیے ہندی میں کوئی لفظ نہیں، خوان کے لیے کوئی لفظ نہیں، طباق کے لیے کوئی لفظ نہیں ـــــ بس ہندو کے یہاں تو ایک "تھال" آتی ہے جو مذکورہ بالا ہر لفظ کے لیے بولی جائے گی۔ اسی طرح کھانوں کا حال ہے۔ بتلایئے فیرنی، پلاؤ، قورمہ، قیمہ، کوفتہ یا اسی قسم کے سینکڑوں الفاظ کے لیے آپ سنسکرت میں الفاظ کہاں سے لائیں گے؟ بیچارے سنسکرتی پنڈت نے ان کھانوں کا تصور بھی کبھی نہ کیا تھا، پھر وہ ان کے نام سے کیا واقف ہو سکتا تھا۔ اسی طرح سیب، انگور، انار اور بادام وغیرہ کی قسم کے ان سینکڑوں پھلوں کا حال ہے جن کا تعارف ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے دم قدم سے ہوا ہے۔ اس لیے قدرتاً ان پھلوں کے نام بھی عربی یا فارسی ہی سے لیے گئے۔ غرض اس قسم کی سینکڑوں ضرورتوں سے مجبور ہو کر ہندوستانی زبان میں عربی فارسی الفاظ شامل ہوئے ہیں۔ تاریخ کے صفحات سے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں دکھائی جا سکتی جب مسلمانوں نے اپنی زبان کے الفاظ کو عوام کی بول چال میں رائج کرنے کی ذرہ برابر بھی کوشش کی ہو۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہندوستانی زبان میں عربی فارسی الفاظ کا یوں گھل مل جانا کوئی ایک سال یا دو سال یا ایک دو صدی کی بات نہیں ہے بلکہ تاریخ کا یہ عمل آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں غوری خاندان کا پرچم حکومت ہندوستان میں لہرا رہا تھا۔ اس وقت کے

لٹریچر کا مطالعہ کیجئے تو اس میں آپ کو شاعر، شاعری، محل، فرمان، سلام، پیغام، حکم، خط، پیالہ وغیرہ کے الفاظ ملنے شروع ہو جائیں گے۔ یہ گویا ہندو مسلم اتحاد کا نوروز تھا۔ اس کے بعد تیرھویں صدی میں امیر خسرو نے اس اتحاد کے پودے کو اور زیادہ پروان چڑھایا۔ چنانچہ آپ کی "بتیاں چھتیاں" والی مشہور غزل کو موجودہ اُردو زبان کے لئے زندگی کی پہلی کروٹ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

زحالِ مسکیں مکن تغافل، ورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لے ہو کاہے لگائے چھتیاں

یہ گویا اُردو فارسی کے ملاپ کی پہلی تصویر ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہندوستانی زبان کے الفاظ سیکھ رہے تھے اور اپنی زبان کے الفاظ ہندوؤں کو سکھا رہے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ بابر نے اپنی خود نوشت سوانحعمری میں بیسیوں خالص ہندوستانی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً روٹی، پانی، موتی اور مجھ کو کے لئے مجکا کچھ کے لئے کچ وغیرہ وغیرہ۔

اس ابتدائی دور کے بعد سولھویں صدی میں کبیر داس کے دوہوں میں زبان اور زیادہ صاف ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کبیر کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

دین گوایو، دُنی سے اور دُنی نہ آیا ہاتھ
پیر کہاڑی مارلیو کا پھل ہے اپنے ہاتھ

دیکھئے، اس شعر میں دین کے لفظ کے علاوہ دنیا کے لئے "دُنی" کا لفظ بھی کس خوبی سے مستعمل ہوا ہے۔ "پھر پیر" کا لفظ۔ ایک اور شعر سنئے:

کبیر سرائے سرہے، کیوں سووے سکھ چین ۔۔ کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

اس میں سرائے تو خالص فارسی لفظ ہے۔ اس کے علاوہ "نقارہ" میں ذرا سا تصرف کر کے "نگارا" کیا گیا ہے۔ سریر، سنسکرت کے لفظ شریر (جسم) کی عام فہم شکل ہے۔

کبیر داس کے بعد سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں یعنی شہنشاہ اکبر کے عہد میں اس ملی جلی زبان کی شکل اور زیادہ ترقی یافتہ ہوجاتی ہے۔ اس زمانے کے مشہور شاعر تلسی داس کا یہ مشہور شعر تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ — تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

غور کیجیے کہ گریب (غریب) کا یہ لفظ آج سے چار سو سال پہلے کے شاعر کی زبان سے ادا ہو رہا ہے اکبر کے عہد تک ہماری اس ملی جلی زبان کا گویا دوسرا دور ختم ہوجاتا ہے۔ پیدائش اس کی غوری خاندان کے عہد میں ہوتی ہے امیر خسرو کے زمانے میں یہ ہوں ہاں اور غوں غاں کرنا سیکھتی ہے۔ اس کے بعد اکبر کے عہد میں اس کے اعضا کچھ سنبھلتے ہیں اور ادھر ادھر کروٹ لینا سیکھتی ہے۔ مگر ابھی یہ بچہ اتنا نہیں سمجھا تھا کہ اس کی جوانی کا تصور کیا جا سکے۔ پھر جہانگیر کے عہد میں ہندو مسلم اتحاد کا یہ سچا گیہ پوت پالنے سے پاؤں باہر نکالنا شروع کر دیتا ہے اور گھٹنیوں چلنے لگتا ہے۔ گویا گھٹنیوں چلنے تک کی یہ طاقت اس میں کوئی پانچ چھ سو سال کے بعد آتی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ تاریخی تبدیلی اور قومی ارتقاء کی منزلوں میں ایک صدی کی حیثیت چند ماہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ عہد جہانگیر کے ایک شاعر "خاکی" کا شعر سنئے:۔

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سجن — تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

غور کیجیے یہ شعر آج کل کی زبان سے کتنا قریب تر ہے۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں کے عہد میں زبان کی یہ سلاست ایک آدھ قدم اور آگے بڑھاتی ہے۔ اس عہد کے ایک شاعر

سلطان عبداللہ قطب شاہی کا یہ شعر بطور نمونہ سُنئیے :۔

اے پری پیکر ترا انکھ آفتاب دیکھتا ہوں تو رہتا مجھ میں تاب

لیکن اورنگ زیب کے عہد میں گھٹنیوں چلنے والے اس بچے میں بہت زیادہ طاقت آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اب عنقریب ہی یہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو کر دوڑنا شروع کر دے گا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں دکن کے لوگ دہلی کے لوگوں پہ بازی لے گئے۔ چنانچہ ذیل میں چند دکنی شعراء کے کلام سے نمونے پیش کئے جاتے ہیں

تُمری انکھیاں زلف سے کافر ہوا سارا جہاں

اسلام اور تقویٰ کہاں، زہد اور مسلمانی کدھر (ہاتف)

تجھ عشق کی آنگن سے شعلہ ہو جل اٹھا جی

دل موم کے نمونے، گھل گھل پگھل گیا ہے (لطفی)

پی سے جُدا ہونا نہ تھا، چاہا خدا کا یوں ہوا

جُز صبر کچھ چارہ نہیں، بیچارہ ہو رہنا پڑا (بیچارہ)

مجھ ناتواں میں کیا سکت جو بولوں ویاں کی صفت

عاجز عزیز اللہ ہے، دکھن کے سب پیران مرد (عزیز اللہ)

تن من فدا کروں اس ہشیار ساقی اوپہ

یک قطرہ مے چکھا کر جن بے خبر کیا ہے (ملک)

نوری آپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ بتا

حاصل بھلا اب اس سے ادوانے جو تھا سو تھا

یہ نوری دکنی کا شعر ہے جو تانا شاہ کے وزیر اعظم کے لڑکے کا اتالیق تھا اور بہت

اونچے حلقے کے لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ مگر اس شعر کی زبان سے اندازہ کیجیے کہ مسلمان اونچے ہونے کے باوجود بھی ہندوستان کے عام لوگوں کی بول چال سے کتنے قریب ہوتے تھے۔

سعدی دکنی کا ایک شعر سنئے :۔

سہنا تمن کو دل دیا، تم دل دیا اور دکھ دیا

تم یہ کیا ہم وہ کیا، ایسی بھلی یہ ریت ہے

دیکھیے اس شعر کے الفاظ سے کیسی تازہ وار وافغان کی بو آرہی ہے مگر اس بو میں تلخی نہیں مٹھاس ہے اور مٹھاس بھی عجز و فتادگی کے ساتھ۔ حاکمیت کی شان کا تو ذکر ہی کیا۔

افضل دکنی کا ایک شعر ہے۔

پری ہے دل میں میرے پریم پھانسی   مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی

اس شعر کے پہلے مصرع میں اگر "پری" کو رائے ہندی کے ساتھ "پڑی" کر دیا جائے تو بالکل آج کل کے محاورے کا صاف شعر ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اُردو کے "بچپن" کی بو آتی ہے لیکن قادر دکنی کا یہ شعر اس سے بھی زیادہ صاف ہے۔ کہتا ہے

ہر چند ہمن سب سے اُٹھایا ہے ہاتھ

اُس پر بھی نہ آزاد کہائے، ہیہات

یہاں پہلے مصرعہ میں "ہمن" کو ہم نے اور دوسرے مصرعہ میں "کہائے" کو کہلائے اگر کر دیا جائے۔ پورا شعر آج کل کی سلیس و بامحاورہ زبان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ولی دکنی کو اُردو کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے لیکن اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو کی بنیادیں ولی سے کئی صدی پہلے قائم ہو چکی تھیں۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ولی غالباً پہلا شاعر ہے جس نے گھٹنیوں چلنے والے اس بچے کا ہاتھ پکڑ کر

اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا جس کے بعد یہ زبان اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور رن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔ وَلی کی پیدائش اورنگ زیب کے عہد میں ہوئی تھی لیکن چونکہ عمر اس کی کافی ہوئی اس لئے محمد شاہ کے زمانے تک کی تبدیلیاں اس نے دیکھی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کا ابتدائی دَور اورنگ زیب کے زمانے کے مذکورہ بالا شعرا کی زبان سے ملتا جلتا ہے مثلاً ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ترے بن مجھ کو اے ساجن نو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مجھ کن، تو یہ سنسار کیا کرنا

لیکن اس کے بعد اس کی زبان صاف ہونا شروع ہوئی ہے چنانچہ اس کی زندگی کے آخری دَور کے اشعار تو اتنے رواں اور اتنے سلیس ہیں کہ صاف طور سے اُردو کی ترقی کی جھلک دکھاتے ہیں اور صاف بتاتے ہیں کہ اُردو کا یہ پوت، درباروں چڑھنے والا ہے۔

چند شعر سُنئے :۔

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن — باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

زندگی جامِ عیش ہے، لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لے جائے

غور کیجئے، یہ شعر کتنا برجستہ اور آج کل کے محاورۂ زبان کے لحاظ سے کتنا شستہ و پاکیزہ ہے

ایک اور شعر سُنئے :۔

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گراں

اگر آپ سے یہ نہ کہا جائے کہ یہ شعر ولی دکنی کا ہے جو آج سے ڈھائی سو سال پہلے گذرا ہے تو آپ بلا شبہ اسے عہدِ حاضر کے کسی سخن سنج کا نتیجۂ فکر قرار دیں گے۔

اسی زمانے میں غواصی نے اپنی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" لکھی۔ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ھ ہجری ہے یعنی آج سے کوئی ۳۳۰ سال پہلے۔

اس کا ایک شعر ہے:

برس ایک ہزار ہور پنچ تیس میں کیا ختم یو نظم ون تیس میں

پہلے مصرعے میں ہور یعنے اور مستعمل ہوا ہے۔ عروض کے لحاظ سے ہزار کی رے اور ہور کی ہے کو ایک حرف کی طرح ملا کر پڑھئے اور پنچ (یعنے پانچ) کے نون کو نون غنّہ کی طرح اس طرح پڑھئے کہ تلفظ "پچ" کے مانند ہو۔

اس کے کوئی سو سال بعد ... جری نے "من لگن" کے نام سے ایک طویل قصّہ اسی قسم کی ابتدائی اُردو میں منظوم کیا۔

مثنوی بوستانِ خیال، اُردو کی بہت مشہور مثنوی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۶۰ھ ہجری میں لکھی گئی ہے یعنی اسے لکھے ہوئے آج دو سو برس سے بھی زیادہ کا زمانہ گذر چکا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہماری اس زبان کا قالب بالکل تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس مثنوی کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

پنٹ بے حجابی سے ملنے لگے ہنسی ساتھ جوں پھول کھلنے لگے
کبھی سر کو لاویں مرے منہ کے پاس کہ پہنچے ہر اک طرح زلفوں کی باس

کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں
وہ دوپٹہ مرا اوڑھ کر لیٹ جائیں کبھی شال اپنی مجھے تئیں اُڑھائیں

کہوں کیا کہ کیا کیا کئے مجھ سے چھند
کہ دل اس کا ہووے ہر اک طرح بند

ان اشعار میں اگرچہ پٹ اور چھند کی قسم کے چند الفاظ آج کل متروک ہو چکے ہیں لیکن ویسے زبان میں کوئی ایسی غرابت نہیں جسے آپ سمجھ نہ سکتے ہوں یعنی آپ اس مثنوی کو اگر پڑھنا چاہیں تو اس کے سمجھنے میں مطلق کوئی دقّت محسوس نہ ہوگی اور آپ کو یہ ہرگز محسوس نہ ہوگا کہ اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ آپکی اپنی زبان نہیں ہے

ولیؔ سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل کا شاعر ہے اس کے بعد شاہ عالم کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم کی حکومت کا زمانہ طویل بھی تھا اور پُرسکون بھی ۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۶ء تک سینتالیس سال اس نے حکومت کی۔ اس کے زمانے میں زبان بہت زیادہ منجھ گئی بلکہ صحیح معنی میں اُردو اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ سوداؔ، میرؔ، میرزا مظہرؔ، میر سوزؔ، اور میر دردؔ جیسے شعراء اسی زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن ان شعراء کی زبان اس عہد کے نصف ثانی کی زبان ہے نصف اول کی زبان کے نمائندے شاہ مبارک آبروؔ، شاہ حاتمؔ، یکرنگؔ، فغاںؔ اور احمد گجراتی جیسے شعراء ہیں۔

ذیل میں ان کے نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:۔

کریں جو بندگی ہوویں گنہگار
بتاں کی کچھ نرالی ہے خدائی (شاہ مبارک آبروؔ)

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد
روح پتھر سے سر پٹکتی ہے (شاہ مبارک آبرو)

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک
تب سے لگتی ہیں پلک سے پلک (شاہ حاتم)

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا (ایضاً)

شب جھوٹے وعدوں پر جو ترے ہم بہک گئے
لاکھوں ہی بار گھر سے اٹھے در تلک گئے

یہ شعر احمد گجراتی کا ہے۔ گویا اُردو نے اپنے دامن میں شمالی ہند اور دکن کے علاوہ گجرات کی سرزمین تک کو سمیٹ رکھا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو لنگوا فرینکا (قومی زبان) کا کوئی سوال ہندوستان میں پیدا ہوا تھا نہ ہندی اُردو کی چشمک نے سر اٹھایا تھا اور نہ ہندو مسلم حقوق و نیابت کی آوازیں فضا میں گونجتی تھیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبان کی یہ ترقی اور پھیلاؤ کسی مصنوعی یا مبنی بر اغراض کوششوں کا نتیجہ نہ تھا بلکہ تاریخ کے قدرتی رجحانات اور وقت کے فطری تقاضوں کا ایک ناگزیر نتیجہ تھا۔

اس دور کے دو ایک شاعروں کا نمونۂ کلام اور سنئے۔ یکرنگ کہتا ہے :-

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے میرا صبر و قرار جاتا ہے

جو لوگ اُردو زبان کو ایک چھوٹی عمر کی حال میں پیدا ہونے والی یا ماضی قریب میں پیدا ہونے والی زبان کہتے ہیں وہ ہمیں بتائیں کہ تقریباً دو سو برس پرانے اس شعر میں اور آجکل کے محاورے میں کیا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی فرق نہیں۔ پھر جو زبان دو سو برس پہلے ڈھل

دھلا کر اتنی صاف ہو چکی تھی کہ اس میں مذکورہ بالا شعر کہے جا سکتے تھے تو کون کہتا ہے کہ اُردو ایک چھوٹی عمر رکھنے والی زبان ہے؟ اسی دَور کا ایک اور شاعر فغاںؔ کہتا ہے:

کیا حال پوچھتے ہو فغاںؔ کا سُنا نہیں
خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا!

البتہ یہ صحیح ہے کہ ہماری اس ملی جُلی زبان جس کو ہم اُردو یا ہندوستانی جس لفظ سے چاہیں تعبیر کریں اس کے عہد شباب کی پہلی سالگرہ سوداؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے ہاتھوں ہوتی ہے لیکن جانتے ہو سوداؔ کی پیدائش کا سنہ کیا ہے؟ وہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوا تھا یعنی آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے۔ سوداؔ کی زبان ہمیں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی لیکن یہ زبان دو ڈھائی سو برس پُرانی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرؔ کا عہد شروع ہوتا ہے۔ میرؔ عمر میں سوداؔ سے بارہ تیرہ سال چھوٹے تھے لیکن ان کی عمر کیونکہ سوداؔ سے زیادہ ہوئی اس لئے وہ سوداؔ کے انتقال کے تیس [۳۰] برس بعد تک زندہ رہے۔ میر دردؔ، میر سوزؔ اور مرزا مظہرؔ بھی ان سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ میرؔ کا سنہ وفات ۱۲۲۵ھ ہے یعنی آج سے ایک سو چالیس [۱۴۰] سال پیشتر۔ پھر کیا جس زبان کی تاریخ میں ڈیڑھ دو سو سال پہلے میرؔ اور سوداؔ جیسے صاف و رواں لکھنے والے موجود ہوں اسے چھوٹی عمر والی زبان کہا جا سکتا ہے؟

میرؔ اور سوداؔ کے بعد مومنؔ اور ذوقؔ اور غالبؔ اور انشاؔ کا عہد شروع ہوتا ہے جس میں زبان کا قالب اور زیادہ ستھرا بن جاتا ہے ان کے بعد امیرؔ مینائی اور داغؔ آتے ہیں اور زبان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان ایک محکوم اور غلام ملک نہ ہوتا تو اُردو زبان اپنی وسعت اور پاکیزگی کے لحاظ سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں سے

ایک زبان شمار کی جاتی لیکن غلامی کی بدنصیبی نہ صرف یہ ہے کہ سات سمندر پار کے گورے آقاؤں کی زبان نے ہماری اس زبان کو زبار رکھا ہے بلکہ اس سے بھی بڑی بدنصیبی ٹنڈن اور سمپورنانند جی جیسے لوگوں کی ذات ہے جن کی کوتاہ اندیشی، تنگ نظری اور تعصب پروری ایک ہزار سال پرانی ہندو مسلم میل جول کی اس نشانی کو مٹا کر اس کی جگہ ہندی کے نام سے ایک نئی نویلی زبان قائم کرنا چاہتی ہے۔ اکثریت کے بل پر ممکن ہے وہ اپنی اس افتراق انگیز اور فتنہ پرور کوشش میں ایک حد تک کامیاب ہو جائیں لیکن اس کے نتائج میں سے ایک سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دو ایسی ٹکڑیوں میں بٹ جائیں گے جن میں باہمی اشتراک و اتحاد کا کوئی رشتہ باقی نہ رہا ہو۔ ہندوستان کے مستقبل کے لئے یہ خطرہ ایک معقول اور سنجیدہ انسان کو تڑپا دینے کے لئے کافی ہے لیکن ہمیشہ اندیشہ ہے کہ ٹنڈن اور سمپورنانند جی جیسے جسموں میں جو ناپاک اور خبیث روح حلول کر گئی ہے وہ ہرگز انہیں صحیح راستہ نہ دیکھنے دے گی لیکن یہاں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اردو کو مٹانا ان کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ترقی کرے گی اور ترقی کرتی رہے گی۔ کارواں چلتا رہے گا چاہے کتے کتنے ہی بھونکا کریں۔

زندانِ احمد نگر کا پہلا دن

(از جناب مولانا ابو الکلام آزاد)

مولانا ابو الکلام آزاد اُردو خطابت و انشاء کے مسلمہ تاجدار ہیں لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے ایک عرصے سے اپنی اس خداداد صلاحیت و استعداد کو نذر بے اعتنائی کر رکھا ہے حالانکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں سے کہیں زیادہ مفید ان کے وہ ادیبانہ و خطیبانہ کارنامے ہی ہو سکتے ہیں جو ہمارے ذہن و دماغ کی تعمیر و تربیت میں سب سے بڑا درجہ رکھتے ہیں۔

سُنا ہے کہ جیل کی تین چار سالہ مدت میں مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ابھی تک بجز ایک خط کے کوئی تازہ چیز معرضِ اشاعت میں نہیں آئی ہے۔ ذیل میں یہ خط درج کیا جا رہا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس کا ہر ہر لفظ ادب و انشاء کا کتنا بلند معیار پیش کرتا ہے کاش مولانا کانگریسی سیاسیات کے خارزار میں اُلجھنے کے بجائے ہمارے ادب و انشاءؔ کو اس قسم کے بے بہا جواہرات سے مالا مال کر سکتے۔

مولانا نے یہ خط قلعہ احمد نگر سے لکھا ہے جہاں آپ اگست ۱۹۴۲ء میں محبوس کئے گئے تھے۔ اس خط پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ آپ نے کسی دوست یا عزیز کو پرائیویٹ طور پر لکھا ہے۔ (ایڈیٹر)

قلعہ احمد نگر —————— ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء

از ساز و برگ بے خوداں ہیچ مپرس بے نالہ می رود جرس کاروانِ ما

صدیق مکرم! کل صبح تک وسعت آباد بمبئی میں فرصت تنگ حوصلہ کی بے مائیگی کا یہ حال تھا کہ ۳ اگست کا لکھا ہوا مکتوب سفر بمبئی اجمل خان صاحب کے حوالہ نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعہ احمد نگر کے حصار تنگ میں اس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں۔

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش لشکر آہ من از دل خیمہ بیروں می زند

نو مہینے ہوئے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لئے کھولا گیا کل ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصار کہنہ کا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا اس کارخانۂ ہزار شیوہ رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تا کہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کئے جاتے ہیں تا کہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی

وہ کروٹیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی!

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گذر چکی ہے

چوں صفحہ تمام شد، ورق بر گردد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کرے گا۔

فریب جہاں قصۂ روشن ست بہ بیں تا چہ زاید شب آبستن ست

۴ اگست کو بمبئی پہنچا تو انفلوانزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷ اگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی

دن کا انتظام بھی کیا تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے
۸ کو دیکھے سے رات کے گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا لیکن کارروائی ختم کر کے اُٹھا۔

کام تھے عشق میں بہت، پر اے میر — ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پہنچا، تو صاحب مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصے سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں میں ان سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا۔ تاکہ ان کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفےٰ منظور نہیں کیا ہے لیکن انہیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لئے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے:۔ فلاں شخص شام کو آیا تھا کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا۔ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتے تک ہر شخص کی زبان پر تھیں میں سنتے سنتے تھک گیا تھا

یا وفا، یا خبرِ وصلِ تو، یا مرگِ رقیب
بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں میں نے جھنجلا کر کہا جس طرح کے حالات درپیش ہیں۔ ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اُڑتی ہی رہتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا؟ اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجیے کہ آدھی رات جو باقی رہ گئی ہے ہاتھ سے نہ جائے اور چند گھنٹے آرام کر لوں۔

گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کے مے خوریم

حسبِ معمول ۴ بجے اٹھا لیکن طبیعت جھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی میں نے جن اسپرین (GEN ASPRIN) کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوں کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریذیڈنٹ روزویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا۔ کچھ نسیم صبح گاہی کے ان شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کر دی

نسیم صبح! تیری مہربانی

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گذر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطہ میں داخل ہو گئی ہیں اور اس بنگلہ کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے کی طرف واقع ہے اور جس میں صاحب مکان کا لڑکا وضیر و رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا کہ مَیں خواب دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا۔

نہ ہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری ست

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ صرف گذرے ہوں گے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ وضیر د ایک کاغذ ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لئے کافی تھی

مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں ۔

کس کس کی مہر ہے محضر لگی ہوئی؟

مَیں نے دستیر وسے کہا مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا ان سے کہہ دو کہ انتظار کریں پھر غسل کیا۔ کپڑے پہنے چند ضروری خطوط لکھے اور باہر نکلا۔ تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوچکے تھے

کار مشکل بود ۔ ما بر خولیش آساں کردہ ایم

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی ۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشوں پر پھرتے ہوئے ملے ۔ یہ پھولوں کی خوشبو چُن چُن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلا تا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گذرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی ۔

صبا وقتِ سحر بوئے ززلفِ یار می آورد

دل شوریدۂ ما راز نو در کار می آورد

کار وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گذر رہا تھا لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا ۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی ۔ کیونکہ انجن ریسٹورنٹ کار کو دھکیل دھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا معلوم ہوا یہی کاروانِ خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے ۔ گاڑیاں کیریڈور کیریج (Carridor Carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے تک اندر ہی اندر چلا جا سکتا ہے ۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا کہ گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے ۔ بہت سے آ چکے ہیں جو نہیں آئے وہ آتے جاتے ہیں ۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے ان کے چہروں پر بے خوابی اور بے وقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا بمشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ میں نے کہا معلوم نہیں سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؟ اسے بھی کوئی جگانے کے لئے پہنچا یا نہیں؟

درازیِ شب و بیداریِ من این ہمہ نیست
ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفت است

بہرحال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چونکہ ریسٹورنٹ کار لگ چکی تھیں اور چاء کے لئے پوچھا گیا تھا اس لئے گو پی چکا تھا لیکن پھر منگوائی اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جام صبح گاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار مٹائیں۔

بنوش مے چو سبک روحی اے حریفِ مدام
علی الخصوص دریں دم کہ سر گراں داری

یہاں "بادۂ دوشینہ" کی ترکیب محض "جام صبح گاہی" کی مناسبت سے زبانِ قلم پر طاری ہو گئی مگر غور کیجئے کتنی مطابق حال واقعہ ہوئی ہے؟ صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورت حال کیسی منقلب ہو گئی ہے؟ کل شام کو جو بزم کیف و سرور سے آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دو پہر رات تک طول کھینچا تھا لیکن اب صبح کے وقت دیکھئے تو:

نے وہ سرور و سوز نہ جوشِ و خروش ہے

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی اور مجلس دوشین کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی تو اب صبح خماری کی افسردہ جمائیوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا تھا

خمیازہ سنج تہمت عیش رسیدہ ایم
مے آں قدر نہ بود کہ رنج خمار برد

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا ہوتا تو ایسا ہونا ناگزیر تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا۔ تو کاش جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی اور نیچے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیئے ہوتے۔ خواجہ میر درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کبھو خوش بھی کیا ہے جی کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا:

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی اور پونا کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا، غالباً منزل مقصود پونا ہی ہے لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقاء اتار لئے گئے اور بمبئی کے مقامی قافلہ کو بھی اترنے کے لئے کہا گیا۔ مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

اب احمد نگر شہر ہر شخص کی زبان پر تھا کیونکہ اگر ہم پونا میں نہیں اُتارے گئے تو پھر اس رخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسّی میل سے زیادہ نہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیئے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا۔ احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے۔ بہت جلد آ جائے گا مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے؟ احمد نگر سے شروع ہوگا۔ بے اختیار ابو العلا معری کا لامیہ یاد آ گیا:

فیا دارها بالخیف، انّ مزارها
قریبٌ، ولاکن دون ذالك اهوال

(اس کا مکان خیف ہے اور مزار قریب ہے لیکن اس سے پہلے ہول اور تذبذب کی دنیا حائل ہے)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے۔ مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو قصد بھی کیا تھا۔ مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں جب دکن میں بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی تو ملک احمد نظام الملک بحیری نے علم استقلال بلند کیا اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر چنیز کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دار الحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ جس کا خاندان مازندران سے آکر یہیں آباد ہوا تھا لکھتا ہے کہ چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کر لی تھی کہ بغداد اور قاہرہ سے چشمک کرنے لگا تھا۔

کس پائمال آفتِ فرسودگی مباد
دیروز ریگِ بادیہ آئینہ خانہ بود

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس کا حصار مٹی کا تھا اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول نے اسے منہدم کر کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کیا اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کے استحکام کا غلغلہ پہنچا ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ولیسلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ولنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا۔ تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا۔ پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

کارواں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہ ہر راہگزار افتادست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگارِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اُتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے۔

بیفشاں جرعۂ بر خاک وحال اہلِ شوکت ہیں
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سُنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سُہیل حبشی کی طاقتور فوج

سے ٹکرانا پڑا تو دولت خان لودھی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی، اگر حادثہ رو دہد، جائے نشان و ہید کہ شمار او دریا بیم" - خانخاناں نے جواب دیا تھا "زیر لاشہا"

ونحن اناس لا توسط بیننا

لنا الصدر دون العالمین ولنا القبر

(ہم ایسے لوگ ہیں کہ درمیان میں کوئی واسطہ نہیں رکھتے ہمارے لئے سینہ ہے اور ان کیلئے قبر)

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کردیئے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔ میدان کے میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پہ نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا! احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہن لئے ورق پر ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی تھی کہ دوسرا سامنے آجاتا۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا اگر ہمارے قید و بند کے لئے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خرابانیوں کے لئے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا۔

بایک جہاں کدورت، بازایں خرابہ جائیست

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا لیا

تو پھر کوئی موڑ نہیں ملا۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے؛

ہاں، رہِ عشق ست، کہ گشتن ندارد بازگشت

جرم را این جا عقوبت ہست استغفار نیست

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہو گی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے اور اس میں جو قلعہ کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجئے کہ زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ

دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا ؟

قلعہ کی خندق جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ولیسلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رخ سے ہم داخل ہوئے اس طرف پاٹ دی گئی ہو۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی۔ وہ بھی اس رخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے، وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔ قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی۔ پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہو گا اور اس لئے چڑھائی پر واقع ہے، کاریں رک گئیں اور ہمیں اترنے کے لئے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا۔ ہمارے ناموں کی

فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کر دی۔ وہ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سر رشتہ حکومت بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی صیغہ کے ہاتھ آ گیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری میں داخل ہو گئے۔

در جستجوئے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

دروازہ کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے۔ یہ اگرچہ اتنا وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے۔ تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام ضرور دے سکتی ہے۔ آدمی کمرے سے باہر نکلے گا تو محسوس کریگا کہ کھلی جگہ میں آ گیا کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے۔

سر پہ ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے چبوترہ میں جھنڈے کا مستول نصب ہے مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لئے سر اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا۔

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پرانی ٹوٹی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پہ سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا۔

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں!

معلوم نہیں کس کی قبر ہے؟ چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہرحال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی۔ ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی گئیں وہاں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سبحان اللہ! اس روزگارِ خراب کی ویرانیاں بھی چرخِ بادپیما کے کرشمے رکھتی ہیں۔ اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اسلئے کہ کبھی ہم زندانیانِ خراباتی کے شور و ہنگامۂ سوز و آہ

کشتیوں کا بیرِ چشمِ پیمبرست کے مزا ہو گا خراب بھی تو خرابات ہووے گا

مغربی رخ کے تمام کمرے کھلے اور تیسرے برآمدہ تھے قطار کا پہلا کمرہ میرے حصہ میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر بچھی ہوئی تھی دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن سب سادہ بستر پر گری۔

ما گوشہ را بہر قناعت گرفتہ ایم تن پروری بگوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کے نو بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھلی۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تین بجے اٹھا تو تازہ دم اور چست و چالاک تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی، نہ انفلوائنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا اور چائے دم دی۔ اب جام و صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصور کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و کوہ کن سنا رہا ہوں۔

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصۂ تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا، تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا:۔

غلط گفتنی چرا سجادۂ تقویٰ گرد کردی بہ زہر آلودہ بودم گر نمی کردم چہ می کردم

یہ اس غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو اس سے مجتہد کاشانی کی نسبت کہا تھا بہت مشہور ہو چکا ہے:۔

زشیخ شہر جاں بُردم بہ تزویرِ مسلمانی
مدارا گر بہ آں کافر نمی کردم چہ میکردم

ردیف کا نباہنا آسان نہ تھا مگر دیکھئے کس طرح بول رہی ہے۔ بول نہیں چیخ رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں اور اس کا مطلع دہرا رہا ہوں۔

زساغر گر دماغے تر نمی کردم، چہ میکردم

خدارا داد دیجئے۔ نظر بہ حالات موجودہ یہاں "چہ میکردم" کیا قیامت ڈھا رہا ہے۔ گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقعہ کے لئے کہا گیا تھا۔ مگر بول پتا نہیں چلے گا۔ "چہ میکردم" پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھئے اور پھر دیکھئے صورت حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے اُبھر آتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، اکلپترہ گوئی اور لاطائل نولیسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ بحالتِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں۔ تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہے جسے مرزا غالب نے ذوق خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:۔

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

اتباعِ سُنّت

کیا اختلافِ اُمّت رحمت ہے؟

(مولانا طٰہٰ محمد ساکت پروفیسر جامعِ ازہر قاہرہ کے قلم سے)
(خاص "پیغام حق" کیلئے ترجمہ کیا گیا)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احزاب سے مراجعت فرما ہوئے تو صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ قبیلہ بنو قریظہ میں پہنچنے سے پہلے کوئی شخص نماز عصر نہ پڑھے لیکن صحابہ کرامؓ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ نماز عصر کا وقت ختم ہونے کے قریب ہوگیا پس ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم تو حکم کے مطابق بنو قریظہ میں پہنچے بغیر نماز نہ پڑھیں گے اور دوسرے کہنے لگے کہ ہم تو یہیں پڑھ لیتے ہیں۔ آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا۔ آپ نے فریقین میں سے کسی کو کچھ ملامت نہ کی (بخاری مسلم)

تمہید:

بنو قریظہ یہود کا ایک قبیلہ تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں تمام دوسرے یہودیوں سے بڑھا ہوا تھا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اتحاد کا معاہدہ کر لیا لیکن بنو قریظہ نے غزوہ احزاب کے وقت سخت بدعہدی کی اور بجائے اس کے کہ لڑائی میں مسلمانوں کا ساتھ دیتے، وہ حملہ آور اعداء کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑے اور دشمنوں کی قوت و جمعیت میں اضافہ کر دیا۔ جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ۵ھ کے اواخر

میں غزوہ خندق سے مراجعت فرما ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی کی کہ بنو قریظہ کی تادیب سرکوبی کے لئے ان سے مقابلہ کیجئے کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے اور مسلمانوں کی بجائے مشرکوں کا ساتھ دیا ہے۔ چنانچہ حکم ہوا کہ مسلمان فوراً بلا توقف پیشقدمی کریں۔ اسی عجلت کی بنا پر آپ نے اصحابؓ کو حکم دیا کہ نماز عصر بنو قریظہ ہی میں پہنچ کر ادا کرنا۔

باوجودیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سخت مشقت اٹھا کر تھکے ماندے آئے تھے امتثالِ امر کے لئے اسی وقت چل پڑے۔ یہاں تک کہ نماز عصر کا وقت گزرنے لگا اور جب دیکھا کہ آفتاب غروب ہونے کے قریب آپہنچا ہے اور بنو قریظہ تک پہنچتے پہنچتے نماز کا وقت جاتا رہے گا تو غروب سے پہلے نماز پڑھ لی اور صحابہؓ میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ وہ ڈرے کہ اگر ہم نماز ادا کرتے ہیں تو حضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی لازم آئے گی اس لئے وہ ادائے نماز سے باز رہے یہاں تک کہ منزل مقصود پر پہنچ کر اس کو نماز عشاء کے بعد ادا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر کے پیچھے پیچھے آرہے تھے جب آپ وہاں پہنچے تو یہ واقعہ حضورؐ کے گوش گذار کیا گیا لیکن آپ نے دونوں میں سے کسی پر عیب گیری نہ کی۔

یہاں میں اس غزوہ کی تفصیل میں جانا اور اس کے اسباب و نتائج پر بحث نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ سب باتیں سیرت اور شمائل کی کتابوں میں شرح و بسط سے مذکور ہیں اور نہ ہم ان حضرات کے فعل کو ترجیح دینا چاہتے ہیں جنہوں نے فرمانِ نبویؐ کے ماتحت نماز کو مؤخر کیا اور تاویل کو چھوڑ کر اس بات کا لحاظ رکھا کہ ہمارے آقا کا حکم ہے۔ انہوں نے وقت گزر جانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے دلی امر اور صاحب الشرع صلی اللہ علیہ وسلم

کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حق ادا کیا، اور نہ ہم اُن حضرات کے اس فعل کو سراہنا چاہتے ہیں جنہوں نے نماز بھی وقت پر پڑھ لی اور امتثالِ امر میں جلدی کر کے قبیلہ بنو قریظہ میں بھی دوسروں کے ساتھ پہنچ گئے اور یہ کہ وہ اپنی تاویل میں دین حق کے بڑے فقیہ تھے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض اور مقصد کو سمجھا اور صلوٰۃ وسطیٰ یعنی نماز عصر کی پوری محافظت کی جس کی نسبت سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کی نماز عصر جاتی رہی گویا کہ اُسکا تمام مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ (رواہ البخاری و مسلم)

متذکرہ صدر حدیث اور اس قسم کی دوسری روایتیں بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہماری زبانیں دین حنیف کے ائمہ اعلام کی بزرگی کے سامنے عاجزی اور فروتنی کے ساتھ رُک جائیں اور ہم ان کے اختلافات کے لئے اپنے دل میں وسعت اور کشادگی پیدا کریں کیونکہ اختلاف ائمہ پسندیدہ اور محمود ہے جو قیامت تک علیٰ حالہا قائم رہے گا۔

اللہ اکبر! اصحابہ رضوان اللہ علیہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اختلاف کرتے تھے اور آپ اس کو دیکھ کر (اظہار ناراضی کی بجائے) ان کی تائید فرماتے اور مدح و تحسین کرتے تھے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ اس اختلاف میں حق ہی کے متلاشی ہیں۔ ان کی تمام جد و جہد حق کے لئے ہے اور افراط و تفریط سے بچنا ان کا شیوہ ہے۔

جس نے اجتہاد کیا اور راہ صدق و صواب پائی اس کو دوہرا اجر ملتا ہے اور جس نے اپنے اجتہاد میں خطا کی اس کے لئے بھی ایک اجر ہے۔ یہ ایک مستحکم قانون اور قاعدہ کلیہ ہے اور اُن تمام دینی مسائل کو مشتمل ہے جو اجتہاد کو قبول کرتے ہیں۔ یہ قانون اُس جلیل القدر ہستی کا مقرر کیا ہوا ہے جو اپنی خواہشِ نفسانی سے نہیں بولتی تھی صلوات اللہ و سلامہ علیہ۔ یہ ضابطہ ان علماء کے حق میں ہے جو صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین

سے مستنبط کرتے ہیں اور اس شریعت عزا کے خصائص میں داخل ہے جسے حضور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے ۔

اسی اصول کے پیش نظر ہمارے سلف صالح رضی اللہ عنہم نے رحمت الٰہی کو وسعت دینے میں کبھی تامل نہ کیا اور ایسی حالت میں کہ کسی مسئلہ میں کوئی وسعت اور گنجائش نکل سکتی تھی لوگوں کو کسی خاص مسلک کا پابند رکھنے سے اجتناب کیا۔ یہ وسعت خواہ نص صریح سے ثابت ہوتی تھی یا فہم صحیح سے، ہر طرح اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی۔ علاوہ ازیں ان علمائے حق سے پوچھ کر بھی عمل کر لیا جاتا تھا جو اپنے دین میں متہم نہ تھے قرون اولیٰ میں مسلمانوں کا برابر یہی معمول رہا لیکن اس کے بعد ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے جدال کو پیشہ اور دلیل بنا لیا۔ ذاتی رائے اور ہوائے نفس ان کا قبلہ مقصود بن گئی۔ پھر یہ نہ پوچھو کہ کیا کیا فتنے ظاہر ہوئے اور غیر ضروری فروعی مسائل پر جو مغز کی بجائے محض قشر (چھلکے) کا حکم رکھتے تھے کیا کیا لڑائیاں کیں کس حد تک سر پھٹول ہوا اور خون بہے۔

ان اختلافات کی وجہ سے مسلمان گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں سنت کی نشانیاں معدوم ہوئیں۔ ہر طرف بدعتوں نے سر اٹھایا یہاں تک کہ قبح نے حسن کی شکل اختیار کی اور منکرات مرغوب ہو گئے اور اگر دنیا میں وہ گروہ موجود نہ ہوتا جس کے متعلق حضور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق کی حمایت میں سینہ سپر رہے گا، تو بس اسلام ہی کا خاتمہ تھا۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے اعراض بڑی بدبختی ہے اور جو کوئی ان دونوں سے تمسک کرے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا۔ آراء وقیاسات سے تمسک کرنے اور متعصب قسم کے فقہاء کے اقوال پر جمود اختیار کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ انسان براہ راست کتاب

وسنت سے استشہاد کرے۔ زمانہ کی اسی حالت کو مدنظر رکھ کر بعض اہل علم مختلف اوقات میں یہ صدا بلند کرتے رہے ہیں کہ تمام مسلمانوں کو ایک مذہب پر قائم کر دینا چاہیے۔

اختلاف کے اقسام۔

اختلاف کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اصول دین میں ہو جیسے کوئی شخص اللہ تعالیٰ اس کی کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لانے میں اختلاف کرنے لگے تو یہ صریح کفر ہے اور جو اختلاف دین کے قواعد اور ان احکام میں کیا جائے جن کی دلیل موجود اور حجت واضح ہو تو وہ بھی کجروی اور گمراہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں خلاف و انکار کی راہ اختیار کرنا دین میں تفرقہ ڈالنا اور مومنوں کے شیرازہ وحدت کو منتشر کرنا ہے اور جو اختلاف اس فروع میں ہو جس میں ایک کے سوا کسی دوسری وجہ کا بھی احتمال ہو سکے یہ وہی اختلاف ہے جو عہد رسالت میں اور صحابہ کرامؓ اور امت کے خیر القرون میں پایا جاتا تھا یہ اختلاف فی الحقیقت کسی شمار میں نہیں کیونکہ یہ محض افضل اور غیر افضل اور جائز اور مکروہ ہونے کا اختلاف ہے۔ یہ کوئی حقیقی نزاع نہیں اور اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جب مجتہد اجتہاد میں خطا کرے تو اس کی عیب گیری نہ کی جائے معمولی باتوں پر جماعت کی وحدت میں انتشار پیدا کرنا کسی طرح پسندیدہ نہیں ہے۔ ہم نے یہاں ان اختلافات کی مثالیں پیش نہیں کیں کیونکہ یہ ائمہ کی کتابوں میں بکثرت درج ہیں اور اگر کسی کو ان کے معلوم کرنے کی خواہش ہو تو کتاب اعلام الموقعین مؤلفہ شیخ ابن قیمؒ، حجۃ اللہ البالغہ مرتبہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے اُس رسالہ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو انہوں نے صحابہ و تابعین کے اجتہاد کے موضوع پر زیب رقم فرمایا۔

اور امام عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی کتاب "المیزان الکبریٰ" میں اس پر طویل بحث کی

ہے کہ شریعت عملاً میں فی الحقیقت کوئی خلاف نہیں ہے اور اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ محض رخصت اور عزیمت اور تخفیف و تشدید میں ہے۔ رخصت اور تخفیف کے مخاطب کمزور اور درماندہ لوگ ہیں اور عزیمت اور تشدید کا خطاب قوی لوگوں کی طرف ہے جو محنت اور تکلیف برداشت کر سکتے ہیں پس شریعت عام ہے لیکن لوگوں کی حالت یکساں نہیں ہے۔

فروعی اختلاف کی حکمت

فروعی اختلافات کی مثال جیسا کہ شیخ ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے قراءتوں کے اختلاف کی مانند ہے۔ کوئی بھی قراءت پڑھ لی جائے وہی جائز ہے۔ گو بعض لوگ ایک قراءۃ کو پسند کرتے ہیں اور دوسرے دوسری کو لیکن ہر ایک کے جائز ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ یہ ایسا خلاف ہے جو مضر نہیں بلکہ منفعت بخش ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاشبہ ہر قاری کو حکم دیا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھا کرے جس طرح جانتا ہے البتہ ان تمام قاریوں کو اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ اختلافات میں پڑ کر اس طرح ہلاک نہ ہوں جس طرح پہلے لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ یہ سخت حماقت اور بیوقوفی کی بات ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف کیا جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں آسانی کیواسطے اور مسلمانوں کیلئے رحمت بنانے کیلئے توسع کیا ہے۔

اِختِلَافُ اُمَّتِی رَحْمَةٌ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) یہ ایک حدیث ہے جو خاص و عام کی زبان پر ہے گو اس کی تمام روایتیں ضعیف ہیں مگر معنیً فی الجملہ صحیح ہیں اور مروی ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اختلاف نہ ہوتا اور وہ ہر مسئلہ میں متفق ہوتے تو یہ بات مجھے ہرگز پسند نہ آتی کیونکہ اختلاف نہ ہونے کی صورت میں شریعت میں رخصت اور آسانی کبھی نہ ہوتی۔

اگر یہ امت فروعِ دین میں ایک ہی طریقہ کی پابند بنائی جاتی تو امت کے لئے بڑی تنگی

ہوتی اور یہ پابندی مسلمانوں کے حق میں بھی ویسی ہی مصیبت بن جاتی جو پہلی امتوں کے لئے بنی ہوئی تھی اور اگر اصول دین اور اس کے قواعد میں طرح طرح کے طریقے رکھے جاتے تو یہ امت کے لئے اور بھی زیادہ مصیبت ہوتی پس پاک ہے وہ ذات جس کی حکمت جلیل و عظیم ہے اور اس کی رحمت ہر چیز کو محیط ہے ۔

علماء اور عامۃ الناس کا فرض

اس کے بعد علماء پر فرض ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے فقہ نبوی اور سلف صالح کے علمی خزانے پیش کیا کریں اور بوقت ضرورت اس خلاف کی حکمت بیان کر دیا کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختلاف کی کیا نوعیت تھی اور حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہمارے اتفاق و اتحاد سے کہیں بہتر تھا۔ ان کا باہمی اختلاف اس سے بھی کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا کہ لوگوں کو ایک مذہب پر جمع کرنے کی کوشش کی جائے ۔ خدارا اس سے بچو کہ لوگ ایک مذہب پر جمع ہوں اور اس سے سخت پرہیز کرو کہ عامۃ الناس کو ایک مذہب پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے ۔

اللہ تعالیٰ امام مالکؒ پر رحم کرے ۔ اُن کی نظر بڑی وسیع اور رائے بڑی مضبوط تھی ۔ خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی نے اُن سے درخواست کی کہ اس کے لئے موطا کے امام مالکؒ کا ایک نسخہ لکھ دیں ۔ اس نسخہ کی نقلیں تمام بلاد اسلامیہ میں بھیج دی جائیں گی اور مسلمانوں کو حکم دیا جائے گا کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر عمل کریں اور اس کی بجائے کسی دوسری کتاب کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں" ۔ امام مالکؒ نے منصور سے فرمایا کہ امیر المومنین ! ایسا نہ کیجئے ۔ لوگوں کے پاس صحابہ و تابعین کے اقوال پہنچ چکے ہیں ۔ لوگ حدیثیں سُن چکے ہیں اور ان کی روایت کر چکے ہیں ۔ ہر عالم علمائے سلف سے علوم اخذ کر چکا ہے اور ان پر عمل پیرا ہے ۔ ہر ایک کو

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے اختلافی مسائل کا علم ہے۔ پس لوگوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیجیے۔ وہ اپنے لئے جن علوم و احادیث کو چاہیں اختیار کریں۔

اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے ارادہ کیا کہ کتاب موطاء مالکؒ کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو حکم دیا جائے کہ اسی کی حدیثوں پر عمل درآمد کریں۔ خلیفہ ہارون رشید کو بھی یہی صلاح دی گئی کہ امیر المومنین! ایسا نہ کیجیے۔ علماء کا باہمی اختلاف اس امت کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ ہر عالم جس چیز کو صحیح سمجھتا ہے، اسی پر عمل کر لیتا ہے۔ ہر امام اور اس کا پیرو ہدایت پر ہے اور ہر کوئی اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کا جویاں ہے۔

پھر عوام الناس پر لازم ہے کہ اپنا دین صرف اسی سے حاصل کریں جس پر اس بات کا پورا وثوق ہو کہ وہ دین حق ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر وہ دین و دنیا کی بہتری چاہتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ علماء کی بات سنیں اور انکی اطاعت کرتے رہیں اور یاد رکھیں کہ علماء زمین پر وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ستارے آسمان پر۔ جس طرح رات کی تاریکی میں ستاروں کو دیکھ کر راہ ملتی ہے اسی طرح زمین پر علماء سے گمراہی کی تاریکیوں میں راستہ ملتا ہے عوام الناس کو علماء کی اس سے بھی کہیں زیادہ ضرورت ہے جسقدر کہ وہ کھانے پینے کی محتاج ہیں۔ غیر علماء پر علماء کی اطاعت نص قرآنی سے ثابت ہے چنانچہ رب العالمین فرماتا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔	اے مومنو! اللہ کی اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان کا بھی حکم مانو جو تم میں سے صاحب امر (علماء) ہیں۔ اور اگر کسی امر میں تمہاری آپس میں نزاع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کی یہ شرط ہے کہ اس امر میں اللہ اور رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو کہ یہ (تمہارے حق میں) بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت پسندیدہ ہے ۔

تنقید و تبصرہ

غدر کے بعد ہندوستان میں جب انگریزی حکومت مستقل طور پر قیام پذیر ہوگئی تو ہندوستانی اقوام تقلیدِ مغرب میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی سر توڑ کوشش کرنے لگیں۔ بعض قومیں اس دوڑ میں پہلے شریک ہوئیں اس لئے وہ بعد میں آنے والوں سے بہت دور نکل گئیں آگے نکل جانے والی اقوام میں پارسی اور ہندو اور پیچھے رہ جانے والی قوموں میں مسلمان اور اچھوت خاص طور پر نمایاں ہیں۔

"ترقی" یا "تقلیدِ مغرب" (اس لئے کہ دراصل ہندوستانیوں کے نزدیک "ترقی" کے معنے "تقلیدِ مغرب" ہی کے تھے) کے میدان میں مسلمان بہت بعد میں آئے اس آگے نکل جانے والوں تک پہنچنے کے لئے وہ بیتاب تو بہت ہوئے لیکن پریشانی میں وہ صحیح راہ اختیار نہ کرسکے ہندوؤں اور پارسیوں نے انگریزی قوم سے ترقی کے راز سیکھ لئے تھے۔ اس لئے وہ قومی تعمیر کی صحیح شاہراہ پر لگ گئے تعلیم، صنعت و حرفت، تجارت۔ قومی تنظیم ایسے معاملات میں انہوں نے حکمران قوم کی تقلید کر کے صدیوں کے جمود و تعطل کو توڑ دیا لیکن مسلمانوں نے انگریزوں سے انگریزی بولنا۔ انگریزی کپڑے پہننا۔ چھری کانٹے سے کھانا وغیرہ سیکھا۔ اس سے ان کی ذہنیت بہت جلد غلامانہ بن گئی۔ تاریخ کی یہ المناک حقیقت ہے کہ انگریزی حکومت کے قیام کے جلد ہی بعد ہندو جو صدیوں سے غلام چلے آتے تھے۔ آزادی کا خواب

دیکھنے لگے اور مسلمان جو صدیوں سے حکومت کرتے آئے تھے چند ہی سال میں غلامی پر رضامند ہو گئے

اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانانِ ہند نے اکثر غیر ضروری اور مضر باتوں میں انگریزوں کی طرح سوچنا شروع کیا اور تمام اچھی باتوں میں انگریزوں کی تقلید بے کار سمجھی چنانچہ جہاں عورتوں کو بے پردہ کر دیا گیا وہاں آزادی حاصل کرنے کا خیال دل میں نہ لایا گیا۔ شراب نوشی اور جوئے کی نئی صورتوں کو بآسانی اختیار کر لیا گیا لیکن تعلیم کو اچھے طریق پر قائم کرنے کا کوئی صحیح اور دیرپا طریق اختیار نہ کیا گیا۔ داڑھیاں منڈوا دی گئیں شلواریں اتار کر پتلونیں پہن لی گئیں لیکن پابندیٔ وقت، حب الوطنی، خدمتِ خلق ایسے جذبات عالیہ سے مسلمان کورے ہی رہے۔

انہی مضر اثرات میں سے ایک نہایت افسوسناک امر یہ تھا کہ انگریزوں کی نقالی میں مذہب کے ساتھ بیزاری اور استہزاء برتا جانے لگا جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ نکلا کہ علیگڑھ کالج (جو اب یونیورسٹی ہے) اور اسلامیہ کالج لاہور ایسے "اسلامی" ادارہ میں مسلمان پروفیسروں اور طلباء کے ایسے گروہ پیدا ہو گئے جو ان "اسلامی مرکزوں" میں بے دینی اور الحاد پھیلانے میں کامیاب ہوئے۔ آج بھی ان "اسلامی" درسگاہوں میں بے دین، ملحد اور مذہب سے استہزا کرنے والوں کی کمی نہیں۔

مگر پھر بھی مسلمانوں میں ایک گروہ ایسے آدمیوں کا موجود تھا جو مذہب سے شغف رکھتا تھا۔ اس گروہ کے دو حصے ہو گئے۔ ایک وہ جو کتاب و سنت کی پیروی سے سرمو تجاوز نہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ رجعت پسند کہلائے لیکن الحمد للہ کہ اس "رجعت پسند" گروہ علماء کے وجود سے اسلام کا نام سرزمینِ ہند میں قائم رہا۔ دوسرا گروہ مذہب سے شغف رکھنے والے ان لوگوں کا تھا جو تہذیبِ مغربی سے متاثر و مرعوب تھے۔ ان میں نمایاں نام سر سید احمد خان

رائٹ آنریبل سید امیر علی۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور علامہ عنایت اللہ خان مشرقی کے ہیں۔
ان حضرات میں ایک مشترک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ ہر وہ چیز جسے یورپ اچھا کہتا یہ اسلام کے اندر اُسے داخل کرتے اور ہر وہ چیز جسے یورپ ناپسند کرتا یہ لوگ اُسے اسلام سے خارج قرار دے دیتے چنانچہ اسی اصول پر چل کر اس گروہ نے معجزات سے انکار کر دیا تعداد ازدواج کو روحِ اسلام کے خلاف قرار دیا۔ سود کو دنیا کے اقتصادی نظام کے ساتھ چلنے کے لئے ضروری تسلیم کر لیا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو عین اسلامی نظریہ مان لیا۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس طرزِ عمل کو (APOLOGETIC) قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ طرزِ عمل اس لئے زیادہ افسوسناک تھا کہ بیشتر وہ خیالات جو یورپ سے اخذ کئے گئے بعد میں خود اہل یورپ کے نزدیک ناقابلِ تسلیم ثابت ہوئے۔

اسلام کو جو لوگ خدا کی طرف سے آیا ہوا دین مانتے ہیں وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس کے اصولوں کے مقابلہ میں انسانوں کے بنائے ہوئے اصول نوعِ انسانی کی زندگی کو پُرامن بنانے کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اور اس لئے اسلام کے علمبرداروں کا صحیح طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہر مسئلہ کے متعلق اسلام کا نکتہ نگاہ دُنیا کے سامنے پیش کریں اور اس کو صحیح جانیں اور صحیح ثابت کریں۔

الحمدللہ کہ مغربیت زدہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کو اس کی اصلی صورت میں پیش کرنے کے لئے ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو تہذیب مغربی کی ظاہری چکا چوند سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور ان کا ایمان اتنا راسخ تھا کہ انہوں نے اسلام کے اصولوں کو دنیا کی تمام دوسری تعلیمات کے مقابلہ میں برتر جان کر پورے زور کے ساتھ اس کا اعلان کیا۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے

کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اُس گروہ میں نمایاں جگہ رکھتے ہیں جو اسلام کی تعلیمات کو اس دعوے کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے کہ یہی تعلیمات دنیا میں بہترین تعلیمات ہیں۔

جن مسائل میں علماء اور مغربیت زدہ لوگوں کا ہمیشہ اختلاف رہا ہے ایک معرکہ آرا مسئلہ سُود کا ہے۔ مغربیت زدہ گروہ نے انگریزی حکومت کے قیام سے لے کر آج تک متواتر سُود کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش اسی لئے تھی کہ یورپ کی قومیں سودی کاروبار کو اپنی قومی اور بین الاقوامی زندگی کے لئے ناگزیر سمجھتی تھیں۔ ورنہ اگر یہ لوگ اس بات کی طرف توجہ کرتے قرآن کریم کے اندر "ربٰو" کے متعلق جس قدر سختی کے ساتھ وعید آئی ہے کسی اور گناہ کے متعلق نہیں آئی تو سُود کے حق میں جواز کا فتویٰ دینے سے پہلے وہ یہ سوچنے کی کوشش کرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو جس چیز کو سُود کے نام سے وہ جائز کرنا چاہتے ہیں وہ قرآن کے "ربٰو" کی تحت میں تو نہیں آتی۔

آج مغربی تعلیم یافتہ گروہ کے اندر ہی ایسے مسلمان فاضل نظر آنے لگے ہیں جو اختلافی مسائل میں (یعنی وہ مسائل جن کے بارہ میں اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے) اسلام کے نکتہ نگاہ کو صحیح سمجھتا ہے اور ببانگ دہل اپنے خیال کا اظہار بھی کرتا ہے ایسے ہی ایک فاضل عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اقتصادیات کے استاذ ڈاکٹر انور اقبال قریشی ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف "اسلام اور سُود" (حیدر آباد دکن ۱۹۴۶ء) میں بہت مدلل طور پر یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ سُود کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر دوسرے تمام نقطہ ہائے نظر کے مقابلہ میں صحیح ہے اور اسلام کا وہ نقطۂ نظر کیا ہے۔ ایک جملہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سُود کی ہر ممکن صورت میں حرمت ہے۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی اقتصادیات کے فاضل ہیں۔ مغربی درسگاہوں کی سندلت

کے حامل ہیں وہ ایم۔ اے ہیں ایم۔ ایس سی ہیں اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے صدر ہیں۔ اس لئے یقیناً ان کے خیالات مغربیت زدہ لوگوں کے نزدیک شائستہ اعتنا تسلیم کئے جائیں گے۔

زیر نظر کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سُود کے مغربی نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں سُود کا اسلامی نظریہ بیان ہوا ہے۔ تیسرے باب میں سُود اور ربوٰ کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب کا موضوع "اسلام اور بنک کاری" ہے۔ پانچویں باب میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ ربوٰ کے کیا کیا مضر اثرات انسانی معاشرت پر پڑتے ہیں اور چھٹے باب میں "معین شرح کے قرضوں کے بُرے اثرات" پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

وہ حضرات جنہوں نے اپنی زندگیاں یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیں کہ موجودہ زمانہ میں سُود کے لین دین کے بغیر دنیا کا اقتصادی نظام چل ہی نہیں سکتا وہ پروفیسر انور اقبال قریشی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے جن سے انہوں نے اپنی زیر نظر کتاب شروع کی ہے:۔

"تیرہ سو ساٹھ سال تک تاریکی میں بھٹکنے کے بعد دُنیا آج یہ محسوس کر رہی ہے کہ شرح سُود صفر کے قریب ہو سکتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایک ایسے سرمایہ دارانہ معاشرت کا تصوّر ممکن ہے جس میں سُود ادا نہیں کیا جائے گا یا زیادہ کھلے الفاظ میں سرمایہ دارانہ معاشرت کا وجود بغیر سُود کے بھی ممکن ہے۔ چنانچہ یہ امکان روز بروز حقیقت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔"

اس دعوے کا یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سرکاری قرضوں پر سُود ایک فیصدی تک آ گیا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر قرضہ کی ادائگی کی خاطر خواہ ضمانت

موجود ہو تو بالآخر سُود کا سلسلہ بالکل موقوف ہو سکتا ہے اور لارڈ کینیس ایسے ماہر اقتصادیات کی رائے میں بھی "ایک منضبط معاشرت میں سُود کو صفر تک گھٹایا جا سکتا ہے۔"

فاضل مصنّف نے اس پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ شواہد پیش کرکے یہ واضح کیا ہے کہ "مغربی دنیا میں بھی ایسے مفکر موجود ہیں جو سُود اور موجودہ بنک کاری کو معاشرت کے لئے لعنت سمجھتے ہیں۔"

کتاب کے دوسرے باب میں ڈاکٹر انور اقبال صاحب نے اسلام کے نظریۂ سُود پر پوری شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے۔ یہ تمام بحث بڑی پُر از معلومات ہے اور ثابت کرتی ہے کہ فاضل مصنّف نے اس بارہ میں جو کچھ لکھا ہے پوری شرح صدر کے ساتھ لکھا ہے اور قرآن حکیم اور احادیث کے مجموعے پر اپنے موضوع کے متعلق ان کی نظر بہت وسیع ہے ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے سُود کے احکام بڑے سخت الفاظ میں دیئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ حکم ممانعت کے باوجود بھی سُود لیں گے وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ہمیشہ مبتلا رہیں گے۔ ایک اور مقام پر یہ اعلان کیا ہے کہ "جو سُود لوگوں کے ذمہ باقی ہے اس سے دست بردار ہو جاؤ۔ اگر تم ایسا نہیں کروگے تو پھر اللہ اور رسولؐ کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔" پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ سُود سے دولت بڑھتی ہے۔ اللہ تعالےٰ سُود میں بے برکتی پیدا کرتا ہے اور خیرات کرنے والوں پر برکات نازل فرماتا ہے۔ ایک جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہود سے جو نعمتیں چھینی گئیں اور انہیں اللہ تعالےٰ نے اپنے غضب کا مورد بنایا تو ان کے جرائم کی فہرست میں ایک بہت بڑا جرم یہ تھا کہ باوجود ممانعت کے وہ سودی لین دین سے باز نہ آئے۔

یہ تو قرآن حکیم کا حال تھا۔ اب احادیث پر نگاہ ڈالئے تو وہاں بھی اس بارہ میں بڑی

سخت ممانعت اور وعیدیں ملیں گی۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے۔ دینے والے۔ دستاویز لکھنے والے۔ گواہی دینے والے یعنی تمام اشخاص متعلقہ پر لعنت فرمائی اور سب کو برابر کا گنہگار قرار دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ سود کا ایک درہم کھانا چھتیس بار زنا کرنے سے زیادہ بُرا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جس کا گوشت حرام (سود خواری) سے بڑھا وہ آتشِ دوزخ کا سزاوار ہے۔

اس سلسلہ میں ایک معرکۃ الآرا بحث یہ ہے کہ ربٰو جس کو قرآن حکیم نے قطعاً ممنوع قرار دیا ہے وہ کیا چیز ہے ظاہر ہے کہ قرآن میں "سود" کا لفظ تو استعمال ہوا نہیں۔ ربٰو ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر انور اقبال ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ربٰو کے معنی "کسی شے میں زیادتی" کے ہیں اور اصطلاحاً اہلِ عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جو ایک قرض دار اپنے مقروض سے مہلت کے عوض میں وصول کرتا تھا۔ اس کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔

سود کی بحث کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ اوّل قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ سود اس فیاضانہ اصول کے منافی ہے جس پر شریعت اسلامیہ کی بنیاد ہے دوّم۔ یہ خیال مطلقاً غلط ہے کہ اسلام صرف سود در سود کی ممانعت کرتا ہے اور سارے سود کو اسلام نے منع نہیں کیا۔ اسلام میں ہر قسم کا سود خواہ اس کی شرح کتنی ہی کم کیوں نہ ہو منع ہے۔ سوّم۔ بنک کے سود اور بنک کاری کے سود میں کوئی فرق نہیں اور اس لئے بنک کا سود قطعی طور پر ناجائز ہے۔ چہارم کسی قسم کے حیلے سے بنک کے سود کو جائز قرار دینا اسلام کی بنیادی تعلیم سے منحرف ہونا ہے اور قرآن پاک کے صاف اور واضح احکام کو جھٹلانا ہے۔

اس موقع پر مصنف نے ایک ایسی بات کہی ہے جو حرز جان بنانے کے قابل ہے اور جسے ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات کو خاص طور پر ہر مسئلہ پر اسلام کا نکتہ نگاہ معلوم کرتے وقت ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "ہمارا فرض یہ ہے کہ پہلے ہم اصول کی وضاحت کر دیں اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے یا ان پر پردہ ڈالنے کے لئے اصول کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہ کریں"۔

اب یہ سوال کہ سود کیوں حرام قرار دیا گیا جواب طلب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال کا تشفی بخش جواب دیا ہے جس کا ملخص حسب ذیل ہے:۔

۱۔ سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

۲۔ تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے ایک بار لیتا ہے لیکن سود کے معاملہ میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے۔

۳۔ سود کے معاملہ میں قرضدار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اسکو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافہ کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

۴۔ تجارت اور صنعت و حرفت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور نفع میں جس کی شرکت منافع کے تناسب سے ہوتی ہے بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔

سود کی حرمت کی بحث ڈاکٹر صاحب نے کی ہے وہ زریں حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے آپ فرماتے ہیں

"ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اس کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے اور ہمدردی و امداد باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوعِ انسان کے لئے تباہ کن ہے۔"

غرض یہ تمام کتاب اس قابل ہے کہ ہمارے پرانی اور نئی طرز کے تعلیم یافتہ لوگ اسے پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی جو مسلمانوں کے روشن مستقبل کے حامیوں نے پیدا کر رکھی ہیں اور جن میں وہ لوگ بآسانی مبتلا ہو جاتے ہیں جنہوں نے نہ اقتصادیات کا بحیثیت ایک علم کے مطالعہ کیا ہے نہ قرآن و سنت سے انہیں واقفیت ہے۔ ڈاکٹر انور اقبال صاحب کے مندرجہ ذیل الفاظ ہر مسلمان کو ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

"اسلام میں ربوٰا اور سود میں کوئی تفریق نہیں۔ وہ ہر قسم کے سود کو جسے ہم چاہے کوئی نام دیں منع کرتا ہے اس نے دنیا کو ایسا سبق دیا ہے جو روز بروز صاف ہوتا جاتا ہے اور جس میں اعتراض کی گنجائش نہیں ہے مجھے توی توقع ہے کہ دنیا اس چیز کو بہت جلد تسلیم کرلے گی کہ جو نظریہ اسلام نے آج سے ۱۳۶۴ سال پہلے پیش کیا تھا۔ وہی صحیح ترین نظریہ تھا اور معاشرت کی آئندہ فلاح و بہبودی اس وقت ہو گی جبکہ اُسے سود کے چکر سے نجات دلائی جائے گی۔"

(خواجہ) عبدالوحید

یادِ اقبال مرتبہ چودھری غلام سرور فگار۔ کتابت، طباعت اور کاغذ خوشنما قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/) ملنے کا پتہ:۔

مینیجر اقبال اکیڈیمی ۔ ۵۸ (الف) سرکلر روڈ۔ بیرون موچی دروازہ ۔ لاہور

کلام اقبال کو جو عالمگیر قبولیت سر محمد اقبال کی زندگی میں ہوئی۔ اس کی مثال ادبیات کی تاریخ میں کمیاب ہے اور جس فراخدلی کے ساتھ ان کے ہمعصر شعراء نے ان کی وفات کے بعد ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بالکل بے مثل ہے۔ مجھے کوئی اور نظیر معلوم نہیں کہ اتنے شاعروں نے اپنے ہمعصر کے کلام کی داد ایسی بے ساختگی سے دی ہو جیسی اقبال کے عہد کے شعراء نے دی ہے۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو ابتدا میں اقبال کی بڑھتی ہوئی شہرت پر رشک کرتے تھے مگر آخر مان گئے کہ قسام ازل نے جو بلندی سر اقبال کو دی تھی وہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ اقبال کے ہمعصروں کو چھوڑ کر نوجوان شعراء تو اس حد تک ان کے مداح ہیں کہ تقریباً سب اُن کے رنگ سخن کے مُقلد ہیں۔ انہوں نے اقبال کے انتقال کو اس قدر محسوس کیا ہے کہ ان کے آنسو اب تک نہیں تھمے۔ انہی ارادتمندوں میں جناب غلام سرور فگار بھی ہیں۔ انہوں نے "یادِ اقبال" نامی ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں وہ چیدہ چیدہ نظمیں جمع کی ہیں جو اقبال کی وفات پر لکھی گئی ہیں۔ اس کا حصہ اول شائع ہوا ہے۔ شروع میں کچھ درد بھری غزلیں ہیں جن میں فگار صاحب نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور اس کے بعد دیگر معاصرین کی نظمیں ہیں۔

فگار صاحب ایک مشاق اخبار نویس ہیں کچھ عرصہ تک آپ لکھنؤ کے اخبار ہمدم کی ادارت میں حضرت جالب مرحوم کے ساتھ شریک رہے۔ سیالکوٹ سے ان کا ایک رسالہ دبستان کئی سال تک شائع ہوتا رہا اور اب اس کی جگہ رسالہ "پیغام حق" نے

لی ہے جو لاہور سے نکلتا ہے۔ کلامِ اقبال کی اشاعت اس رسالہ کا خاص مقصد ہے اس لئے "یادِ اقبال" جیسی کتاب کی ترتیب کے لئے نگار صاحب خاص طور پر موزوں ہیں۔

نگار صاحب کی اپنی نظموں کے بعد دوسرے شعراء کے منتخب مرثئے ہیں۔ سب سے پہلے جناب حسرت موہانی کی ایک نظم ہے جس کا یہ مصرعہ اُن کے احساس کی ترجمانی کے لئے کافی ہے۔ فرماتے ہیں :

دل پہ ذوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

حضرت حفیظ جالندھری نے اپنی مختصر سی نظم کو اس بلیغ شعر پر ختم کیا ہے۔

اقبال بلند تھا ہمارا اب اور بلند ہو گیا ہے

جناب حفیظ ہوشیارپوری کے مرثئے کے ایک بند کا یہ آخری شعر قابلِ ملاحظہ ہے۔

کدھر کو جائیں اہلِ کارواں "بانگِ درا" گُم ہے
درا کا ذکر کیا اِس کارواں کا رہنما گُم ہے

خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور نے کئی قطعات تاریخ لکھے ہیں جن میں یہ قطعہ خاص طور پر داد کے قابل ہے۔

کون لائے گا اب پیامِ سروش اے دل، اقبال ہو گیا خاموش
شمع خاموش سالِ ہجری ہے، عیسوی، شمعِ شاعری خاموش
۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

جو مراثی اِس مجموعہ میں انتخاب کئے گئے ہیں، سب اپنی اپنی جگہ قابلِ تعریف ہیں اور اس منظیر اثر کا ثبوت دیتے ہیں جو اقبال اور کلامِ اقبال نے شعرائے وقت پر کیا۔ امید ہے کہ "یادِ اقبال" کے پڑھنے والے اس انتخاب کو پسند کرینگے اور نگار صاحب کی تلاش اور محنت کی داد دیں گے۔

(آنریبل سر شیخ) عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا رسابق ممبر انڈیا کونسل حال چیف جج ریاست بہاول پور

علامہ سر محمد اقبالؒ کی تصانیف

بانگِ درا:۔ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے اردو کلام کا مجموعہ نہایت آب و تاب کے ساتھ کئی بار شائع ہوا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کا فوٹو بھی لگا دیا گیا ہے۔ قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنہ۔

بالِ جبریل:۔ اردو کلام کا دوسرا مجموعہ جس میں زیادہ غزلیں اور نظمیں ہیں جو یورپ، ہسپانیہ اور دیگر ممالک میں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب حیاتِ نو کا پیغام ہے۔ قیمت مجلد چار روپے۔

ضربِ کلیم:۔ یہ اردو کلام کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں علامہ مرحوم نے زمانہ حاضر کے الحاد و زندقہ کے خلاف نہایت مؤثر جہاد کیا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنہ۔

ارمغانِ حجاز:۔ یہ کتاب علامہ اقبالؒ کے آخری فارسی اور اردو کلام کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے جو مرحوم و مغفور کی وفات سے چند روز پیشتر مرتب ہوا تھا۔ قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی:۔ علامہ مرحوم کا سب سے پہلا فارسی شاہکار ہے جس کے ذریعے علامہ نے مسلمانوں کے ان عقائدِ فاسدہ کی اصلاح کی کوشش کی ہے جو مرورِ زمانہ اور تسلطِ اغیار کے باعث ان کے اندر رائج ہو گئے تھے قیمت مجلد چار روپے

فلسفۂ عجم:۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اس میں ایرانی تفکر کے منطقی تسلسل کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے فلسفۂ جدید کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ تصوف کے موضوع پر نہایت سائنٹیفک طریقے سے بحث کی گئی ہے اسے ڈاکٹر صاحب موصوف کی ایک بلند پایہ عالمانہ کتاب سمجھا جاتا ہے۔ قیمت تین روپے دو آنے

پیامِ مشرق:۔ یہ فارسی زبان میں ایک بلند پایہ دیوان ہے جو جرمن شاعر گوئٹے کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔ دیباچہ میں سابق شاہِ افغانستان غازی امان اللہ خان کو خطاب کیا ہے۔ قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

زبورِ عجم:۔ یہ بھی فارسی زبان میں آپ کی بلند پایہ نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلد چار روپے۔

چھ لیکچر:۔ یہ وہ لیکچر ہیں جو علامہ نے مدراس اور علی گڑھ میں دیئے تھے اس میں اسلام کے جدید تعمیری پہلو کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہے۔ کتاب انگریزی میں ہے۔ ابھی تک اردو میں ان تمام لیکچروں کا ترجمہ نہیں ہوا۔ صرف دو لیکچروں کا اردو ترجمہ رسالہ پیغامِ حق میں طبع ہوا ہے یہ رسائل دفتر پیغامِ حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے مل سکتے ہیں۔ انگریزی دان حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے۔

ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر:۔ علامہ کا یہ قابلِ قدر مضمون انگریزی میں شائع ہوا تھا مولانا ظفر علی خان مدظلہ نے اس کو اردو کا جامہ پہنا کر شائع کیا تھا۔ اب ہم نے اسے پمفلٹ کی شکل میں نہایت دیدہ زیب کر کے طبع کیا ہے۔ قیمت ۶/

ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکیڈمی ۵۸ (الف) سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور

تصنیفات

مولنا ابوالکلام آزاد و امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم

مضامین ابوالکلام آزاد قیمت ۴/
خطبات ” ” ۶/
مضامین الہلال۔ از مولنا ابوالکلام آزاد ” ۸/
الحرب فی القرآن۔ ” ” ۱۰/
اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان ” ” ۸/
ولی اللہ۔ از امام ابن تیمیہ ” ۲/
تفسیر سورہ الکوثر۔ ” ” ۴/
فتویٰ شرک شکن۔ ” ” ۶/
ائمہ اسلام۔ ” ” ۸/
خلافت الامہ۔ ” ” ۶/
تفسیر آیت کریمہ۔ ” ” ۷/
اصحاب صفہ۔ ” ” ۸/

ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ عبداللہ بٹ۔ قیمت ۸/
مقالات آزاد۔ ” ” ۶/
مقالات الہلال از مولنا ابوالکلام آزاد ” ۸/
ایام و تخیر۔ ” ” ۸/
المنبہات۔ از حافظ ابن حجر عسقلانی ” ۸/
سیرت امام ابن تیمیہ۔ از مولانا مہر ” ۱۲/
اسوۂ حسنہ۔ از حافظ ابن قیم ” ۶/
اسلامی تصوف۔ ” ” ۸/
تفسیر سورۂ معوذتین ” ” ۸/
نجد و حجاز۔ از سید رشید رضا ” ۸/
القول الجمیل۔ از مولانا شاہ ولی اللہ ” ۸/
العروۃ الوثقی۔ از امام ابن تیمیہ ” ۱۲/

ہر قسم کے قرآن مجید۔ مذہبی۔ علمی۔ اسلامی کتابیں منگوانے کا پتہ۔

اقبال اکیڈمی ۵۴ (الف) سرکلر روڈ۔ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور

علمائے کرام کا مستقبل - علماء کو کیا کرنا چاہیئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام - (ایک دلنشین موازنہ) " " " - ۸ر

انتخاب غالب - غالب مرحوم کا اپنا انتخاب - ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندستانی مسلمان
{ سید صاحب بریلوی اور شاہ اسمعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے
بالکل صحیح اور سبق آموز حالات - انگریزی سے اردو ترجمہ
از
ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال } ۱۲ر عہ

المنبہات
{ عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ
ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے
شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف } عہ

اسلامی پارٹی کا آئین
{ مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر
ہونی چاہیئے - از مولانا عزیز ہندی } عہ

ہیگل کا فلسفہ (فلسفہ اضداد کی تشریح) - از مولانا عزیز ہندی - ۴ر

ہندستان کے مسلمان کا نصب کیا ہے - " " " - ۴ر

القول الجمیل (عربی) - حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - عہ

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید - عہ

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) - ابوالقاسم رفیق دلاوری - عہ

Registered L. No. [illegible]

منظور کردہ ڈائرکٹر صاحبان محکمہ تعلیم برائے گورنمنٹ سکولز صوبہ سندھ، ریاست بہاولپور و ریاست بھوپال

نومبر ۱۹۴۵ء — جلد ۱۱ عدد ۵
دسمبر ۱۹۴۵ء — جلد ۱۱ عدد ۶

ماہنامہ

پیغامِ حق

اصلاحی اور اخلاقی، علمی اور دینی مضامین کا ذخیرہ

مرتبہ

سید محمد شاہ ایم اے

ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور

قیمت فی پرچہ

قیمت سالانہ پانچ روپے

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ۔ عہ؍

شرح اسرار خودی۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے۔ عہ؍

تعلیمات اقبال۔ 〃 〃 〃 — عہ؍

اقبال اور پیام حریت۔ 〃 〃 〃 — ۸؍

اقبال کا تصور زمان و مکان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۰؍

موت و حیات اقبال کے کلام میں 〃 〃 〃 — ۱۲؍

تعلیم کا مسئلہ۔ 〃 〃 〃 — عہ؍

اقبال کے چند جواہر ریزے۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید ایم اے — ۱۰؍

یادِ اقبال۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار۔ عہ؍

حقیقتِ نفاق۔ مرتبہ مولانا صدرالدین اصلاحی۔ عہ؍

افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ 〃 〃 〃 — عہ؍

اسلام اور وطنیت۔ 〃 〃 〃 — عہ؍

معرکۂ اسلام و جاہلیت۔ 〃 〃 〃 — عہ؍

محمد عبدہٗ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات — عہ؍

ماہنامہ

پیغامِ حق

ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

جلد ۱۱ | بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء | عدد ۵-۶

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس سرکلر روڈ لاہور میں طبع کرا کر ظفر منزل تاج پورہ لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

"پیغام حق" کا یہ پرچہ کئی ماہ کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ جس کے اسباب کی تشریح مینیجر صاحب نے آگے کے اوراق میں کی ہے۔ اگرچہ ادارے کو اس تاخیر سے کوئی واسطہ نہیں۔ تاہم قارئین کرام کو اس سلسلے میں جو زحمتِ انتظار ہوئی۔ اس میں ادارہ بھی شریک ہے ؎

دُنیا کی تبدیلی و ترقی کی رفتار اتنی سُست ہے کہ ہفتے اور مہینے تو تیزی سے گذرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن دنیا کے حالات جہاں کے تہاں نظر آتے ہیں۔ اکتوبر سے لے کر اس وقت تک دنیا نے کوئی ایسی کروٹ نہیں بدلی جسے قابل ذکر کہا جا سکے۔ وہی تین بڑوں کی کشمکش، وہی فلسطین میں برطانیہ، امریکہ کی یہود نوازی وہی شرق الہند میں انگریزی اور ڈچ شہنشاہیت کی ستم آرائی، وہی بلادِ اسلامیہ کی مشکلات اور وہی ترکی، عراق اور ایران پر دندانِ آز۔

وہی رفتارِ بے ڈھنگی جو پہلے تھی، سو اب بھی ہے !

ہندوستان میں انتخابات کا ہنگامہ گرم ہو چکا ہے۔ اس وقت تک آسام اور سندھ کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں میں مسلم لیگ، اور غیر مسلموں میں کانگرس واحد نمائندہ جماعتیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ سندھ میں مسلم لیگ ہائی کمان کی غلطی سے غلام مرتضیٰ (سید) اور حاجی مولابخش نے لیگ کے خلاف جو مساعی کیں، اُن کی بنا پر مقامی اسمبلی میں مسلمانوں کی واضح اکثریت نہ ہو سکی۔ تاہم اتنا ضرور ثابت ہو گیا۔ کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد صرف مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ یہاں

ساٹھ ممبران کے ایوان میں مسلمان ممبروں کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں سے ۲۷ ممبر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن وزارت کی ترتیب کے لئے جب تک کم از کم ۳۱ ممبر نہ ہوں۔ کام نہیں چل سکتا۔ اگر سید گروپ لیگ ہائی کمان نے اپنا رشتہ منقطع نہ کیا ہوتا تو اس کے چار کامیاب امیدواروں کو ملا کر یہ گتھی بڑی آسانی سے سلجھ سکتی تھی۔ اور کم از کم ایک صوبے میں لیگ کی وزارت بلا شرکت غیرے بن سکتی تھی۔ مسٹر سید کے تعاون کے بعد بہت ممکن تھا کہ حاجی مولا بخش اور اُن کے تین حامی مسلمان بھی لیگ کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ اس طرح ساٹھ کے ایوان میں لیگ کو پورے ۳۵ مسلمانوں کی تائید و حمایت حاصل ہو جاتی ؏

لیکن لیگ ہائی کمان نے غلام مرتضیٰ سید کے مقابلے میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی حمایت کر کے جو رویہ اختیار کیا تھا۔ وہ تو کیا ہی تھا۔ اس سے بھی بڑی غلطی بعد میں یہ کی گئی کہ جب نتائج کے اعلان کے بعد مسٹر سید نے غیر مشروط طور پر لیگ میں آنا چاہا تو ان کی یہ درخواست پائے استحقار سے ٹھکرا دی گئی۔ اس طرز عمل کا قدرتی رد عمل یہ ہوا کہ سید اور مولا بخش دونوں کانگرس کی طرف دھکیل دیئے گئے۔ پھر کانگرس تو ایسے موقعہ کی تاک ہی میں تھی۔ فوراً سردار پٹیل سندھ پہنچے۔ اور سید و مولا بخش سے سمجھوتہ کر کے کانگرس کے تعاون کا یقین دلا دیا۔ چنانچہ ان آٹھ مسلمان ممبروں کے ساتھ بائیس کانگریسی مل کر تیس ہو گئے۔ ان کے مقابلے میں لیگ کی تعداد صرف ۲۷ رہ گئی۔ باقی تین ممبر یورپین ہیں۔ جو اول تو لیگ کے اصول کے مطابق لیگ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ دوسرے اگر شامل ہو بھی جائیں تو اس موقعہ پر کم از کم ایک وزارت اپنے اس تعاون کی قیمت مانگیں گے ؏

ان حالات میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں لیگ کی وزارت نہیں بن سکتی۔ مسلم

سیاسیات کی یہ نوعیت بہت افسوسناک ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر غلام مرتضیٰ سید کو الزام سے بالکل بری قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن زیادہ تر الزام اُس لیگ ہائی کمان پر عائد ہوتا ہے۔ جس میں نواب زادہ لیاقت علی اور قاضی عیسیٰ کے نام نامی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ دونوں حضرات قائدِ اعظم کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کی مسلم سیاسیات کو ہر جگہ خراب کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ لیکن سندھ میں تو ان کی کارگذاریاں اتنی المناک ہیں کہ اس پر ان سے جتنی باز پُرس بھی کی جائے کم ہے ۔

مرکزی اسمبلی میں لیگ کو سو فیصدی کامیابی ہوئی۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ کانگرس نے لیگ سے تعاون کرنے کے بجائے مخاصمت اختیار کی فضا پیدا کر دی ہے۔ اس تلخ فضا کا سب سے پہلا مظاہرہ اسمبلی کے صدر کے انتخاب پر ہوا۔ دونوں جاعتوں نے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ لیکن چونکہ کانگرس کے ہندو ممبروں کی اکثریت ہے۔ اس لئے قدرتاً مسلم لیگ کو ناکامی رہی۔ صدر کا انتخاب بذاتِ خود بہت غیر اہم سی بات ہے۔ مگر چونکہ اس سے کانگرس کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے کا کوئی سوال فی الحال کانگرس کے سامنے نہیں ہے ۔

سندھ اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کے ان واقعات کے بعد یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ غالباً سارے ہندوستان میں کانگرس کا تعاون غیر لیگی مسلمانوں کے ساتھ رہے گا۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ شاید کسی صوبے میں بھی لیگ کی وزارت نہ بن سکے۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ملا کر بھی اتنی نہیں ہے کہ بلا شرکت غیرے وزارت بن سکے اس لئے یہاں اگر لیگ نے بہت ہی حزم و دانشمندی سے کام نہ لیا۔ تو جیت کانگرس ہی کی رہے گی۔ سرحد میں پچاس کے ایوان میں کانگرسی ہندو بارہ ہیں جو ایک ٹھوس بلاک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اگر باقی ۳۸ میں سے ۱۴ - ۱۵ مسلمان بھی مسلم لیگ سے ٹوٹ

گئے۔ تو وزارت کانگرس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔

یہ حالات بظاہر بہت مایوس کن نظر آتے تھے لیکن مایوسی کی اس اندھیاری میں روشنی کی ایک کرن ضرور موجود ہے۔ اور وہ ہے ہماری لیگ ہائی کمان کا طرزِ عمل۔ اگر ہمارے لیڈروں نے معاملہ فہمی اور تدبر کا ثبوت دیا۔ تو ان بادلوں کا چھٹ جانا بہت آسان ہے۔ قائدِ اعظم" کی ذاتِ گرامی اس سلسلے میں ایک روشن مینارے کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ بشرطیکہ قاضی عیسے اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کی ذاتی اغراض بیچ میں حائل نہ ہو جائیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے لیڈروں کا محاسبہ کریں اور جو "کالی بھیڑیں" ہمارے گلے میں موجود ہیں۔ اور جو سارے نظام کو تہ و بالا کئے ہوئے ہیں۔ ان سے نجات حاصل کریں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ملتِ اسلامیہ ہند کی طاقت کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی کوئی ڈر نہیں ہو سکتا۔ اور علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر میں پاکستان کا نظام زیادہ دیر تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ (ایڈیٹر)

معذرت

یہ پرچہ تین مہینے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ اس میں عملہ انتظام کی کوتاہی سے زیادہ حکومت ہند کے ان قوانین کو دخل ہے۔ جنہوں نے قدم قدم پر نئی نئی قسم کی مشکلوں اور الجھنوں کے خار زار کھڑے کر رکھے ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ جنوری کا یہ پرچہ "اقبال نمبر" ہو۔ لیکن جب حکومت سے اس کے لئے کاغذ طلب کیا گیا۔ تو جواب ملا کہ ہم کسی خاص نمبر کے لئے خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، کاغذ میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ حکومت کے اس جواب پر مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ دو تین اشاعتیں یکجا کر کے اقبال نمبر کے لئے کاغذ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کی بنا پر اکتوبر کے بعد سے پیغام حق کی کوئی اشاعت آپ کے

ہاتھوں تک نہ پہنچ سکی۔ البتہ اس سلسلے میں ہمارے عملہ اہتمام کی یہ کوتاہی ضرور ہے کہ قارئین تک اپنے اس ارادے کی اطلاع بروقت نہ پہنچائی جا سکی۔ اس میں بھی تھوڑی سی مجبوری تھی۔ کئی ہفتے تو کاغذ کی فراہمی کی دوڑ دھوپ میں گذر گئے۔ اور جب بالکل مایوسی ہوئی۔ تو جنوری کی اشاعت قریب ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس فروگذاشت پر قارئین کرام سے معذرت طلب کرتے ہیں ؛

جنوری میں اقبال نمبر نکالنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن بعض مضمونوں کی فراہمی میں دیر ہو گئی پھر پنجاب میں انتخابات کا جو ہنگامہ آجکل گرم ہے۔ اس کی وجہ سے کاتب حضرات اور مطابع کے پاس کام اتنا آ گیا کہ پیغام حق بھی اس کی زد سے نہ بچ سکا۔ اس لئے مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ اقبال نمبر کو روا روی میں تیار کرنے کے بجائے کچھ انتظار اور کر لیا جائے اور اس سے قبل ایک اشاعت قارئین تک پہنچا دی جائے۔ امید ہے۔ کہ اس کے بعد اقبال نمبر حاضر کیا جا سکے گا ؛

"اقبال نمبر" اسی سائز کے ۲۰۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ علامہ اقبال کا ایک فوٹو اور ایک آٹوگراف بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ سرورق رنگین اور آرٹ پیپر پر بہت ہی زیب شکل میں دیا جا رہا ہے۔ مضامین اتنے زیادہ اور اتنے متنوع قسم اور بلند پایہ ہیں کہ آج تک اُردو زبان میں جس قدر اقبال نمبر نکل چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس نمبر کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

یہ پرچہ جنوری اور فروری کے دو ماہ کے عوض میں دیا جائے گا۔ مارچ کا پرچہ بھی وسط مارچ تک انشاءاللہ العزیز شائع ہو جائے گا۔ "اقبال نمبر" مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ میں دیا جائے گا۔ مگر باقی حضرات کے لئے تین روپے قیمت مقرر کی گئی ہے۔ کاغذ کی قلت کی وجہ سے یہ نمبر بہت بڑی تعداد میں نہیں چھپوایا جا سکے گا۔ ایجنٹ حضرات و دیگر شائقین کو چاہئے کہ اپنی فرمائش ۱۵ مارچ سے پہلے درج کرا دیں ؛ (مینیجر)

دُنیا کی معاشی مشکلات

کیا اِسلام ان کا کوئی حل پیش کرتا ہے؟

(از ابو سعید بزمی ایم - اے)

دنیا کی تاریخ میں معاشی مشکلات کا چرچا اتنا کبھی نہیں ہُوا۔ جتنا آجکل ہو رہا ہے۔ انسانی ضروریات جتنی اور جیسی کچھ تھیں۔ ویسی ہی اور اسی طرح آج بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے۔ کہ کل دنیا میں انسان کے معاشی مسائل اتنے پیچیدہ نہ تھے۔ جتنے آجکل ہیں۔ پھر لطف یہ ہے۔ کہ یہ پیچیدگی پیداوار کی کمی یا وسائل پیداوار کی کمزوری کی بنا پر نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا کی اوسط پیداوار آجکل پہلے سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ پیچیدگی اس بنا پر بھی نہیں ہے کہ موجودہ پیداوار موجودہ آبادی کے لئے ناکافی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معمورۂ ارضی کی آبادی گذشتہ ایک صدی کے اندر دوگنی ہو گئی ہے۔ اور دنیا کی پوری معلومہ تاریخ میں اتنی تھوڑی سی مدت میں آبادی کا اتنا اضافہ کبھی نہیں ہُوا۔ لیکن اس کے ساتھ اس دوران میں جو نئی زمینیں دریافت ہوئی ہیں۔ اُن کی وسعت اتنی زیادہ ہے۔ کہ اس کثرت آبادی کے باوجود لاکھوں مربع میل رقبہ ابھی تک غیر آباد پڑا ہے۔ آسٹریلیا کا رقبہ تیس لاکھ مربع میل ہے۔ یعنی تقریباً دو ہندوستانوں کے برابر۔ لیکن آبادی کی تعداد ستر لاکھ سے زائد نہیں۔ گویا خدا کی اتنی بڑی سرزمین جہاں ہندوستان کے تناسب آبادی کے لحاظ سے اسی کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔ وہ صرف ستر لاکھ نفوس کی جاگیر بنی ہوئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔ کہ آپ سارے ہندوستان کو خالی کر کے پنجاب کی صرف دو تین کمشنریوں کے باشندوں کے حوالے پورا ملک کر دیں۔ اسی طرح امریکہ کا مجموعی رقبہ (شمالی و جنوبی دونوں علاقوں کو ملا کر)

ایک کروڑ ستر لاکھ یعنی ہندوستان کے برابر رقبہ رکھنے والے پورے دس ممالک اس میں سما سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی مجموعی آبادی ہندوستان سے تھوڑی ہی زیادہ ہے۔

ہم نے ہندوستان کی مثال محض اس لئے دی ہے کہ وہ ہم سے قریب تر ہے۔ ورنہ ماہرین معاشیات کے نزدیک خود ہندوستان میں بھی ابھی کافی آبادی کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ویسے بھی ہندوستان اپنے رقبہ کے لحاظ سے بہت کم آباد ہے۔ انگلستان اس سے زیادہ آباد ہے۔ اور جاوا کی آبادی سے تو ہندوستان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

ان اعداد و شمار کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر دنیا میں کوئی ایسی طاقت ہوتی جو سب سے اپنا حکم منوا سکتی اور خاندان کے بڑے بوڑھے کی طرح پوری دنیا کا انتظام کر سکتی۔ تو آج روئے زمین پر بسنے والے ہر انسان کے قبضے میں اوسطاً دو فرلانگ مربع اراضی ہونی چاہئے تھی۔ کیونکہ دنیا کی موجودہ آبادی کا تخمینہ دو ارب کیا گیا ہے۔ اور کل زمین کا رقبہ ۵۵ کروڑ مربع میل قریب ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک خدا کی بخشائشوں کا تعلق ہے۔ کسی انسان کو بھی مفلس و شکستہ حال نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود آج عالم یہ ہے۔ کہ دنیا کی تین چوتھائی آبادی ایسی ہے جس کو ایک گز زمین پر بھی مشکل سے اختیار ہے۔ ایک تہائی آبادی ایسی ہے جو مشکل سے اپنا پیٹ بھر سکتی ہے۔ اور صرف ایک چوتھائی آبادی کو زندگی کی لازمی ضروریات نصیب ہوتی ہیں۔ حالانکہ خدا کی اس سرزمین میں انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اتنی صلاحیتیں ہیں۔ کہ موجودہ آبادی سے دگنی بلکہ تگنی آبادی کی کفالت بھی بخوبی کر سکتی ہیں۔
چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ہر ملک نے پیداوار بڑھانے کی کوشش کی۔ تو ۱۹۳۲ء میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ کہ لاکھوں من غلہ بیکار پڑا سڑتا رہا۔ اور مجبوراً اسے ایندھن کے کام میں لایا گیا۔ ہندوستان میں چائے کی لاکھوں بوریاں محض اس لئے نذر آتش کی گئیں۔ کہ ان کا گاہک کوئی نہ تھا۔

برازیل میں کافی کے ڈھیر کے ڈھیر جلائے گئے۔ امریکہ نے اپنے کاشتکاروں کو ہدایت کی کہ غلہ کم سے کم پیدا کریں۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جس زمانے میں پیداوار کو کم کرنے کی یہ کوشش ہو رہی تھیں اُسی زمانے میں بھی دنیائے انسانیت کی ایک کثیر تعداد افلاس و تنگدستی کی پریشانیوں میں بدستور مبتلا تھی۔

ان حالات کا صاف مطلب یہ ہے کہ جہاں تک خدا کی بخشائشوں کا تعلق ہے انسان پر کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ قدرت نے انسان کو ہر چیز اتنی افراط سے دے رکھی ہے کہ کوئی ایک شخص بھی معاشی مشکلات میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی اگر لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں تو اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہمارا انتظام ناقص ہے؟ ہم قدرت کے عطیات سے صحیح طور سے فائدہ اٹھانے کے ناقابل ہیں۔ اور ہم دی ہوئی چیزوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ انسانیت کی یہ بدانتظامی آج کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہمیشہ سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ البتہ پچھلی صدی سے اس میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ ساری دنیا ایک نئی مصیبت میں مبتلا نظر آتی ہے۔

آپ کہیں گے۔ یہ "روشنی" کا زمانہ ہے۔ نئی نئی ایجادوں کا زمانہ ہے۔ وسائل آمد و رفت کی آسانیوں کا زمانہ ہے۔ تہذیب و اخلاق کی ترقی کا زمانہ ہے۔ کارخانوں اور مشینوں کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں کم سے کم مصیبتیں ہونی چاہئے تھیں۔ بظاہر یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن آپ یہ سن کر حیرت کریں گے کہ ہماری موجودہ مصیبتیں اس روشنی، اس ترقی، اس مشین و کارخانے داری اور اس ایجاد و اختراع کی جدت طرازی کا نتیجہ ہیں۔ جن پر آپ فخر کر رہے ہیں۔ کل تک جب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی۔ اور لوگ سارا کام ہاتھ سے کرتے تھے۔ انسانیت کی پریشانیاں آج سے بہت کم تھیں۔ لیکن آج جب کہ مشینوں، کارخانوں اور سائنس کی ایجادوں نے مہینوں کا کام منٹوں میں کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہماری مصیبتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

اس عجیب و غریب صورتِ حالات کی وجہ یہ ہے کہ مشینوں کی ایجاد نے قدرتی وسائل پر انسان کو اتنا اختیار دے دیا ہے۔ کہ چند انسان مل کر اگر چاہیں تو ساری دنیا کے معاشی وسائل کو اپنے قبضے میں لا سکتے ہیں۔ اور یہی وہ حالت ہے جو آج نظر آ رہی ہے۔ اتفاق سے بجلی اور بھاپ کی طاقتوں پر اختیار حاصل کرنے کا دنیا میں سب سے پہلا موقعہ یورپ کو حاصل ہوا۔ اس لئے اس اختیار سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے تمام امکانات بھی یورپ ہی کے حصے میں آئے حتےٰ کہ آج بھی یہ حالت ہے کہ عرب میں تیل کے چشمے دریافت ہوئے تو ان کو نکالنے کا کام اہل عرب انجام نہ دے سکے۔ اور یورپ و امریکہ کے ماہرین صنعت کے ہاتھ میں کروڑوں روپے کی دولت کا یہ کاروبار دینا پڑا۔ عراق آج کل اپنے پٹرول کی وجہ سے دنیا کے اہم ترین مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن عراق کے باشندے اس دولت کے پانچویں حصے کے حقدار بھی مشکل سے ٹھیرتے ہیں۔ یہی صورت ایران کے پٹرول کی ہے۔ جہاں تقریباً سارا نفع انگریزی کمپنی کے ڈائرکٹروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے ——— غرض مشینوں کی ایجاد نے جہاں ایک طرف بیشمار سہولتیں فراہم کیں۔ وہاں عام انسانی آبادی کو ان چند لوگوں کے رحم و کرم پر لا ڈالا۔ جن کے ہاتھ میں مشین کی یہ طاقتیں ہیں۔ کل تک ہاتھ سے کام کرنے والے کروڑوں انسان اپنی دستکاری کے واحد مالک تھے اور جو کچھ پیدا کر سکتے تھے۔ اس کے جائز حقدار خود ہی قرار پاتے تھے لیکن آج نقشہ یہ ہے کہ صرف ایک کپڑے کا مل ہزاروں پارچہ بافوں کو اپاہج بنا کر رکھ دے سکتا ہے۔ یہ پارچہ باف مجبور ہوتے ہیں کہ اس مل میں جا کر مزدوری کریں۔ جہاں ان کی گردنیں مل مالک کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ وہ جب چاہے ان کو چھٹی دے۔ جب چاہے نہ دے۔ کام کے اوقات کا تعین اور تیار شدہ مال کی خرید و فروخت بھی ان مزدوروں کے اختیار میں نہیں ہوتی۔

مل مالک کو کروڑوں کا نفع ہو۔ تب بھی مزدور کے پلے اپنی مزدوری کے سوا اور کچھ نہ پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشینوں کی بدولت آج لاکھوں دستکاروں کی صنعت سمٹ کر چند ایسے افراد کے قبضے میں چلی گئی ہے جو خود دستکار بھی نہیں ہیں۔ آج ہندوستان میں برلا، سر لو امتو اور سنگھانیا وغیرہ کے کارخانے کروڑوں

کہ کپڑا ہر سال تیار کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو اتنی خبر بھی نہیں کہ سوت کتنی قسم کا ہوتا ہے۔ اور روئی میں اچھی اور بری قسمیں کیسے ہوتی ہیں۔

یہ صورت حالات بھی جدید مشینوں کی پیداوار ہے۔ ورنہ کل تک یہ بات ممکن نہ تھی۔ کل تک زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ ایک آدمی بزور شمشیر کچھ زمین پر قبضہ کر لے لیکن اول تو وہ اس قبضے کو زیادہ دیر باقی نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسرے عام لوگوں کو مفلس و بے دست و پا بنا دینے کا وہ حربہ بھی اس کے پاس نہ تھا جو آجکل ہاتھ آگیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ گھروں کو لوٹ سکتا تھا۔ لیکن زمین میں گڑی ہوئی دولت کو پانا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔ کہ پہلے تو کاغذ کے نوٹ چھاپ کر اور سونے کا نرخ بڑھا کر سارا چھپا ہوا سونا لوگوں کے قبضے سے نکلوا لیتا اور پھر بیک جنبش قلم کچھ نوٹوں کو ردی قرار دے کر بڑے بڑے دولتمندوں کو اپنی دولت کے ڈھیر سمیت بینکوں کے دروازے پر لا کھڑا کرتا۔ فرعون کے مظالم کی داستان آج ہم بڑی دہشت سے سنتے ہیں لیکن اگر آج وہ موجود ہوتا تو لوگ اس کے مظالم کا مذاق اڑاتے۔ وہ صرف چند ہزار بچوں کو مار سکتا تھا۔ مگر جو بھاگ جائیں۔ انہیں ڈھونڈ کر نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ وارنٹ جاری کر کے ساری دنیا کو کسی ایک انسان کے لئے تنگ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایٹم بم بنا کر شہروں کے شہروں کو منٹوں میں بھسم کر کے نہیں رکھ سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اپنی ذہنیت کے اعتبار سے وہ کتنا ہی ظالم و جابر کیوں نہ ہو مگر اس کے پاس وسائل و ذرائع اتنے وسیع و ہمہ گیر نہ تھے۔ کہ ان سے دنیا کو تباہ کر سکتا۔ لیکن آج اس کا عکس ہے۔ آج اگر کوئی ظالم و جابر ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس کے پاس ظلم و جبر کے وسائل بے شمار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ وسائل و ذرائع دنیا کے لئے لعنت ہیں۔ اور کیا ان مشینوں اور کارخانوں کو تباہ کر دیا جائے؟ بعض لوگ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ لیکن یہ چیز عقلاً محال ہے۔ جو چیز ایک مرتبہ انسانی

دماغ کو معلوم ہو چکی ہے۔ اُسے کیسے بُھلایا جا سکتا ہے۔ اس لئے اصل مشکل یہ نہیں ہے۔ کہ انسان کو اختیارات کی یہ نعمت کیوں ملی۔ بلکہ مصیبت یہ ہے کہ یہ اختیارات صرف چند لوگوں میں محدود ہو کر کیوں رہ گئے۔ یہ کیوں ہے کہ آج صرف یورپ ہی صنعت و کارخانہ پر قبضہ رکھتا ہے۔ یہ کیوں ہے کہ صرف امریکہ ہی ایٹم بم بنانا جانتا ہے۔ یہ کیوں ہے کہ صرف برلا اور ڈالمیا ہی کارخانوں کے مالک ہیں۔؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج دنیا کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے اور اسی مشکل کو حل کرنے کے لئے وہ نسخے تیار ہوئے ہیں۔ جن کو سوشل ازم اور کمیونزم کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان نسخوں کی رُو سے مصیبت کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ پیداوار کی تمام مشینری پر کسی فرد واحد کا قبضہ نہ ہو۔ بلکہ عوام کی منتخب کی ہوئی حکومت کا قبضہ ہو۔ اور یہ حکومت تجارتی منافع کے نقطۂ نظر سے نہیں۔ بلکہ عام مفاد کے نقطۂ نظر سے ان کا استعمال کرے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہُوا کہ کارخانوں اور مشینوں کے حصہ دار (شیئر ہولڈرز) ملک کے سارے باشندے ہوں اور ان باشندوں کی منتخبہ حکومت کے افراد کو ان کا "بورڈ آف ڈائرکٹرز" سمجھا جائے۔

مشکل کا یہ حل اگرچہ بظاہر بہت سادہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں بہت پیچیدہ ہے۔ اس لئے کہ اس کے نتائج صرف ملوں اور کارخانوں ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اس حل کو کامیاب بنانے کے لئے "ذاتی ملکیت" کو اُٹھانا پڑتا ہے پھر چونکہ موجودہ معاشی سوسائٹی میں "ذاتی ملکیت" کا تصور ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کو ختم کرنے کے نتیجے میں پوری معاشرت کو نئی بنیادوں پر اُستوار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کسی عمارت کے ستون بدل کر آپ دوسرے ستون اُن کی جگہ نصب کرنا چاہیں۔ تو قدرتی طور پر پوری عمارت کا نقشہ بدلنا پڑے گا۔ یہی صورت سوشلزم اور کمیونزم کی ہے۔ ان کا اصل مقصد تو مشینی طاقت پر قابو پا کر پیداوار اور تقسیم پیداوار کو زیادہ منصفانہ اصول پر قائم کرنا ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کا جو طریقہ دریافت کیا گیا ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانا اس وقت تک

ناممکن ہے۔ جب تک زندگی کے پورے نظام کا ڈھانچہ نہ بدل دیا جائے۔ اس سلسلے میں سوشلزم کو سب سے پہلی ٹکر مذہب سے لینی پڑتی ہے۔ خصوصاً اُن مذہبوں سے جو زندگی کا ایک منظم لائحہ عمل رکھتے ہیں۔ اور جن میں اسلام سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں جتنی رہنمائی اسلام کرتا ہے دنیا کا کوئی مذہب نہیں کرتا +

لیکن اسلام دنیا کے جن علاقوں میں پھیلا ہُوا ہے۔ وہ مشینی طاقت سے بہت دُور رہیں۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ کہ بجلی اور بھاپ کی اس طاقت کا سب سے پہلا علم یورپ کو ہُوا۔ اس لئے قدرتاً وہی مشینوں کا واحد مالک بن گیا۔ بنابریں مشینوں سے پیدا شدہ حالات کا سب سے پہلا اور براہ راست اثر یورپ پر پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم کے فلسفوں نے وہیں جنم لیا۔ دنیائے اسلام جو افریقہ اور ایشیا کی سر زمینوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ آج تک مشینوں کی طاقت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہے۔ اور نہ اس وقت تک واقف ہو سکتی ہے۔ جب تک یورپ کا ڈھینگا اس کے سر پر ہے۔ اس کہنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسلامی اصول کی روشنی میں آج تک دنیائے اسلام کو اس بات پر غور کرنے کا صحیح موقعہ ہی نہیں ملا کہ دنیا کی موجودہ معاشی مشکلات کا حل کیا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی کا احساس تو سب کو ہوا۔ مگر اس کے اسباب تلاش کرنے میں اُنہی اصول سے کام لیا گیا۔ جو صنعتی انقلاب سے پہلے پائے جاتے تھے۔ مثلاً اخلاق اور دیانت کی کمی، شرافت و انسانیت کا فقدان، اتحاد و یکجہتی کی نایابی وغیرہ وغیرہ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ شمالی افریقہ میں سنوسی تحریک اور بلادِ عرب میں محمد ابن عبدالوہاب کی جدوجہد اپنی تمام اخلاقی خوبیوں کے باوجود یوروپین حملہ آوروں کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا مرض ان تحریکوں کے نتیجے میں علاج پذیر نہ ہو سکا۔ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ اخلاقی کمزوریوں اور عقائد کی خرابیوں کو کوئی مرض نہ کہا جائے۔ اس کے برعکس مقصد صرف یہ ہے کہ

اس وقت انسانیت کے جسم پر سب سے بڑا پھوڑا مشینی طاقت ہے۔ اس لئے جب تک اس پر قابو نہ پایا جائے۔ دوسرے تمام امراض اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

سوشلزم نے یورپ کی مقامی مشکلوں کا جو حل تلاش کیا ہے۔ اس کی بنیاد مادیت پر رکھی گئی ہے۔ وہ خدا اور مذہب کے پرانے تصور کو نظر انداز کئے بغیر نئی سوسائٹی نہیں بنا سکتے۔ وہ پیداوار اور وسائل پیداوار کو اپنے نظریوں کا اصل الاصول قرار دیئے بغیر آگے قدم بڑھانے کا کوئی راستہ نہیں پاتے۔ وہ انسانیت کے مقصدِ کبریٰ کی طرف صرف اس لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ کہ کھانے پینے کے وسائل کہاں تک حاصل ہیں۔ انہوں نے انسانیت کے جسم کے ایک تکلیف دہ پھوڑے سے اتنا اثر قبول کیا ہے۔ کہ دوسرے تمام امراض کو بھول گئے ہیں۔ اور صرف اسی ایک مرض کو واحد مرض سمجھنے کے لئے ایک نئے مرض میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ پھر چونکہ آج بدنصیبی سے دنیائے اسلام کی تقریباً ساری آبادی یورپ ہی کی محکوم ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں دو قسم کے رجحان پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سوشلزم عین اسلام ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اسلام ایک دفترِ پارینہ ہو چکا ہے۔ اس لئے جس طرح یورپ نے عیسائیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں

لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ ——— ؟

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ قرآن کریم اور قرآن کریم کے بعد اسوۂ رسولؐ اور صحابہؓ کی زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے۔ اور اسی کی مدد سے ہم زندگی کی تمام مشکلات کا حل دریافت کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے بدلتے ہوئے حالات کی ہر جزئی کے لئے قرآن و سنت میں کوئی واضح حکم موجود ہے۔ اور نہ کوئی سمجھدار آدمی ایسا سمجھ سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کتاب و سنت میں وہ

اصول و حقائق بتا دیئے گئے ہیں جو پہاڑوں سے بھی زیادہ اٹل اور پرانے ہوتے ہیں۔ اور جو لازوال حیثیت رکھتے ہیں۔ انسانی حالات اسو سائٹی کے دستور و رواج اور ہماری معاشرت و معیشت کے قواعد و ضوابط آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ اور انہیں بدلتے رہنا چاہیئے۔ بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے۔ تو دودھ پیتا ہے۔ بڑا ہو کر کشتی لڑتا ہے۔ اور گوشت کھاتا ہے۔ شروع میں اسے سرپرستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعد میں خود سرپرست بن جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی جماعت کا حال ہے پچھلی صدی میں بہت سی باتیں معلوم نہ تھیں اس لئے حالات کچھ اور تھے۔ آج علم میں اضافہ ہوا تو حالات کچھ اور ہو گئے۔ انسانی علم ناقص ہے۔ اور ہمیشہ ناقص رہے گا۔ ہم ہر روز نئے نئے تجربات کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس لئے کبھی تو ہم کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ اب تک ہم نے فلاں چیز کے بارے میں جو کچھ سمجھا تھا۔ وہ صحیح نہ تھا۔ اور کبھی ہم کو اپنی گزشتہ معلومات میں کچھ اضافہ نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر انسان کی تعریف قرآن نے "ظلوم و جہول" کے الفاظ سے کی ہے۔ ہم "ظلم و جہل" کی گھپ اندھیاری میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ قدرت نے ہم کو عقل کی امانت دے کر یہ بار گراں عطا کیا ہے جس کی تعریف قرآن میں مذکور ہے۔

۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَہَا وَاَشْفَقْنَ مِنْہَا وَحَمَلَہَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَہُوْلًا ۔

عقل کی امانت خدا کے صفات مطلق کی ایک چھوٹی سی چنگاری ہے جو ہم کو عطا ہو گئی ہے۔ یہ چنگاری ہمارے تن بدن کو جلائے دے رہی ہے۔ اس لئے کہ گوشت و پوست سے بنا ہوا جو مکان اس چنگاری کے قیام کے لئے تجویز ہوا ہے وہ اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ قدرت نے ہمیں دوسرے جانوروں کی طرح تمام جسمانی ضرورتوں میں عام جانوروں کی طرح کھانے پینے۔ سونے، جاگنے۔ اور تھکنے سستانے کا پابند بنا دیا ہے۔ مگر جانوروں کو چونکہ عقل کی امانت نہیں سونپی گئی ہے اس لئے وہ بڑے مزے میں ہیں وہ قدرت کی منشاء کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ صرف وہی کھائیں گے۔ جس کی خواہش ان کی جبلت میں

روز پیدائش سے رکھ دی گئی ہے۔ وہ آگ کے استعمال سے غلے کو پکانے کی ترکیب نہیں سوچ سکتے۔ وہ جس طرح ہزاروں سال پہلے جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے تھے۔ ویسے ہی آج بھی رہتے ہیں۔ مگر انسان کو عقل دے کر قدرت نے حقائق کے انکشاف کے راستے پر لا ڈالا ہے۔ وہ آج چیزیں ایجاد کرتا ہے۔ تو کل پھکنی دریافت کرتا ہے۔ پھر کھانا پکاتا ہے۔ بڑھتے بڑھتے دنیا کے سارے کرّے پر چھا جاتا ہے۔ بجلی اور بھاپ کی طاقتوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد ذرات کی تحلیل کر کے ان سے ایٹم بم بناتا ہے۔ اور آگے چل کر اس سے بھی زیادہ عجیب انکشافات کی توقع رکھتا ہے۔

اس لئے انسانی عقل کی بدولت ہمارے حالات میں جو تبدیلی ہوتی رہتی ہے وہ معاشرت و معیشت کے بنیادوں کو بدلتی رہتی ہے۔ اور جب تک انسان کے پاس عقل و خرد کی امانت موجود ہے یہ تبدیلی ہوتی رہے گی۔ البتہ حق ہمیشہ حق ہی رہے گا۔ اس میں کوئی تبدیلی کبھی نہیں ہو سکتی۔ بنیادی صداقتیں ہمیشہ صداقتیں ہی رہیں گی۔ قرآن انہی صداقتوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ کہ:۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً ۔

پھر چونکہ اسلام انہی صداقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بلکہ انہی صداقتوں کی ایک عملی تفسیر ہے۔ اس لئے وہ بھی ایک ابدی حقیقت ہے۔ جس میں کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں۔ لیکن اصول کے اٹل ہونے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے۔ کہ ان اصول سے مستنبط ہونے والے جزئیات و فروعات میں بھی کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ انسانی معیشت و معاشرت کی حیثیت اصول کی نہیں۔ ایک جزئی کی ہے۔ اس لئے اسلام یہ دعوےٰ نہیں کرتا کہ اس نے کسی خاص قسم کی معیشت و معاشرت کے آئین و ضوابط کو سند دوام بخش دی ہے۔

اس گزارش سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ کتاب و سنت میں کہیں مشینوں اور کارخانوں کی دنیا کا ذکر نہیں ہے اور نہ ان بحثوں کا تذکرہ ہے جو آجکل سوشلزم اور کیمونزم کے نام سے برپا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسے اصول و کلیات قرآن میں موجود ہیں۔ جن کی روشنی میں موجود و پیدا

ہوئے سوالات میں رہبری حاصل کی جا سکتی ہے۔ بجلی اور بھاپ کی طاقتوں کی تسخیر گذشتہ صدی کی پیداوار ہے۔ اس لئے اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کی عمر بھی اتنی ہی ہے۔ پھر چونکہ دنیا نے اسلام کا براہ راست واسطہ ان سوالات سے بہت کم رہا۔ اس لئے ان کا حل دریافت کرنے کا کام بھی ہم نے پوری طرح سرانجام نہیں دیا ؎

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے۔ کہ مسئلہ کیا بنتا ہے۔ مسئلہ یوں بنتا ہے!

۱۔ بجلی اور بھاپ وغیرہ سے چلنے والی مشینوں اور دیگر آلات کی طاقت نے محنت و سرمائے کو سمیٹ کر چند افراد کے قبضے میں ڈال ہے۔ اور اس طرح

۲۔ دنیا کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت ان چند افراد کی محکوم و دستِ نگر ہو کر رہ گئی ہے جو سرمایہ دار کہلاتے ہیں اور اپنے سرمائے کی وجہ سے عوام کی محنت و مشقت کی صلاحیتوں کے بھی مالک بن گئے ہیں ؎

یہ تو ہوا مسئلے کا وہ پہلو جس میں مشکلات کو پیش کیا گیا ہے۔ اب ان مشکلات کا جو حل تجویز کیا گیا ہے۔ اور جس پر مختلف طریقوں سے عمل بھی ہو رہا ہے۔ یہ ہے:۔

۱۔ مشینوں کی طاقت پر افراد کا قبضہ نہ ہو۔ بلکہ عوام اپنے منتخبہ نمائندوں کی جمہوری حکومت کے تحت ان پر قابو رکھیں۔

۲۔ پھر چونکہ مشینوں کا پہلا کام زرعی پیداوار اور خام اجناس سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخری کام تیار شدہ مال کی فروخت پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کاروبار کا اختیار بھی افراد سے چھین کر عوام کو دیا جائے ؎

۳۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی ملکیت سرمایہ داری کو یا تو بالکل ختم کردیا جائے یا اتنا محدود کردیا جائے کہ اس کے بداثرات عوام کی خوشحالی پہ نہ پڑیں۔

۴۔ مگر موجودہ سوسائٹی چونکہ ذاتی سرمایہ داری اور ذاتی حقوق ملکیت پر قائم ہے۔ اور اس اصول کو برقرار رکھنے کے لئے سرمایہ داروں کا طبقہ مذہب کے نام پر ترک دنیا، رہبانیت اور صبر و رضا کے نام سے عوام کی محنت و شقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور مزدوروں اور محنت کشوں میں اپنی شکستہ حالی کو دور کرنے کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں انہیں مذہب کے نام پر ختم کیا جاتا ہے۔ اس لئے مذہب کی بنیادوں پر قائم ہونے والے نظام معاشرت کو مٹانا بھی ناگزیر ہے۔

۵۔ لہٰذا جدید مادیت کا فلسفہ عام کیا جائے۔ اور دنیا پر یہ ثابت کیا جائے کہ تاریخ کے تمام انقلابات صرف معاشی محرکات کا نتیجہ ہیں۔

یہ ہے آجکل کی معیشی مشکلات میں مسئلے کی نوعیت۔

اب آپ یہ دیکھئے کہ یہ اصول اسلام سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں۔

جہاں تک موجودہ دور کی معیشی مشکلات کا تعلق ہے اس سے تو کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان کا جو علاج تجویز کیا گیا ہے اس پر بحث کی جاسکتی ہے۔ اس علاج میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے:۔

(۱) ذاتی سرمائے کا خاتمہ یا تحدید

(۲) مذہب و روحانیت کے اثر سے معاشی نظام کو آزاد کرنے کی کوشش۔

اسلامی احکام شریعت سے واقفیت رکھنے والے اس امر پر متفق ہیں۔ کہ ذاتی سرمائے کی تحدید پر تو اسلام خود بھی زور دیتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کی ہدایات کا نتیجہ بجز اس کے اور

کچھ نہیں کہ ذاتی ملکیت پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد کی جائیں ۔ پھر "اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کی ہدایات کے ماتحت افراد کی دولت کو مفادِ عامہ کے مقاصد پر قربان کر دینے کی جو مثالیں نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور خلفائے راشدین کے عہد میں ملتی ہیں ۔ ان کا صاف مطلب یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کو باقی رکھنے پر اسلام نے زور نہیں دیا ہے ۔ البتہ روکا بھی نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اگر مفادِ عامہ کا تقاضا روکنے کا مقتضی ہو تو اسلام کی رو سے ایسا کرنا جائز ہی نہیں ضروری ہوگا ۔

ہم یہاں صرف مختصر اشارات پر اکتفا کر رہے ہیں ۔ اور کتاب و سنت سے مثالیں پیش کرنے کو اختصار کی وجہ سے نظرانداز کرتے ہیں ۔

البتہ مذہبی ملاّئیت ۔ کے سوال پر اسلام کو سوشلزم یا کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن یہاں یہ جان لینے کی ضرورت ہے کہ سوشلزم کا مقصود بالذات مذہب سے جنگ مول لینا نہیں ۔ بلکہ اقتصادی نظام کے قیام کی راہ ہموار کرنا ہے ۔ پھر چونکہ عیسائی مذہب نے اس راہ پر بعید کانٹے بوئے تھے ۔ اس لئے مجبوراً دنیا کی نئی معاشی مشکلات کی اصلاح کرنے میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے ، امداد کر سکے تو پھر صورتِ حالات بالکل بدل جاتی ہے ۔

اب یہ دیکھئے کہ آیا اسلام مذکورہ بالا معاشی مشکلوں کے حل کرنے میں مدد دیتا ہے یا نہیں دیتا ۔ جو لوگ اسلام کی اس معاشرت کا علم رکھتے ہیں ۔ جو عہدِ سعادت اور عہدِ سعادت کے بعد خلافتِ راشدہ میں قائم ہوئی تھی ۔ اور جس میں بیت المال کو عوام کی ملکیت قرار دے کر ہر شخص کا وظیفہ مقرر کیا جاتا تھا ۔ ان کے سامنے مسئلے کی نوعیت کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہو سکتی ۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کا بنیادی مقصد معاشی اصلاح ہرگز نہیں ہے لیکن جس طرح عبادت

کرنے کے لئے درو دیوار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وضو کرنے کے لئے لوٹے کی احتیاج ہوتی ہے اسی طرح انسان کو روحانی ترقی کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے معاشی احول کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسلام دنیا کا پہلا اور آخری مذہب ہے جس نے انسانی معاشرت کی اصلاح کو اپنے طریق ہدایت کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ ورنہ بدھ مذہب یا عیسائیت وغیرہ تو ترک دنیا پر زور دے کر دولت اور رسائل دولت کو غلط ہاتھوں ہی میں رہنے دیتے ہیں مگر چونکہ روحانی ترقی کے لئے جسمانی ضروریات کی تکمیل ناگزیر ہے۔ اس لئے دولت و وسائل کو ہیچ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مذہب رفتہ رفتہ دولت کا تابع و محکوم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے جو لوگ اسلام کے اس بنیادی اصول سے واقف ہیں کہ دولت و وسائل پر قابو حاصل کر کے عوام کو صحیح معاشی ماحول عطا کیا جائے تاکہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" کی غایت کبریٰ پوری ہو۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکتے کہ موجودہ معاشی مشکلات میں اسلام زیادہ سے زیادہ محدود ملکیت کی اجازت دے سکتا ہے۔ لیکن پیداوار اور تقسیم پیداوار پر عوام ہی کی گرفت ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ کمیونزم کی اصلاح کا کام اس وقت صرف اسلامی اصول کے تحت ہی انجام پا سکتا ہے۔ لیکن واے بدنصیبی کہ ہمارے علماء ابھی تک صورت حالات کی صحیح نوعیت ہی سے واقف نہیں ہوئے۔ تا بہ علاج چہ رسد۔

مولانا ابوالکلام آزاد

(تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں)

جناب ابوسعید بزمی ایم اے کا جو شہرۂ آفاق مضمون مندرجہ بالا عنوان سے پیغام حق میں طبع ہو چکا ہے اس کو شائقین کے اصرار پر کتابی شکل میں طبع کر دیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (۱/۴) مانگ زیادہ ہے اور تعداد کم طبع ہوئی ہے۔ اپنی فرمائشیں جلد بھیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ (مینیجر)

مہر فاطمی کیا ہے ؟

شرعی اقتصادیات کا ایک نکتہ جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے

(از حق پسند)

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ "شرعی مہر" کے نام پر ہمارے علماء بعض دیندار گھرانوں میں سو ڈیڑھ سو روپیہ حق مہر مقرر کرنے پر زور دیتے ہیں۔ یعنی "مہر فاطمی" کے نام سے اس زمانے میں درہم و دینار کی قیمت کا جو معیار مقرر کرتے ہیں اسی کو "شرعی مہر" تصور کرتے ہیں۔ ذیل میں "حق پسند" صاحب نے اپنی ایک عزیزہ کی شادی پر اس سلسلے میں جو خط اس کے جائز وارثوں کو لکھا تھا۔ اس میں اس سوال پر چونکہ بڑی عمدہ بحث کی گئی ہے اس لئے ہم اسے ذیل میں بجنسہٖ درج کرتے ہیں۔ امید ہے کہ "حق پسند" صاحب کی یہ تصریحات "شرعی مہر" یا "مہر فاطمی" کے بارے میں مشعل ہدایت کا کام دیں گی۔ (ایڈیٹر)

برادر عزیز !

"ج" کی تقریب نکاح پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔ میں خود بے حد مصروف تھا اس لئے حاضر نہ ہو سکا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا کہ آپ نے "مہر فاطمی" کے نام سے عزیزہ سلمہا کا جو حق مہر مقرر کیا ہے وہ ڈیڑھ سو چہرہ شاہی سے زیادہ نہیں۔ عزیزہ کے باپ کی تعلیم بھی تھی اس لئے آپ ہی

اس کے خسر ہونے کے علاوہ اس کے باپ بھی تھے کیونکہ باپ کے بعد چچا ہی کو یہ حق پہنچتا ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کی اس تقریب میں اپنی بھتیجی کے مفاد کو کند چھری سے ذبح کر ڈالا۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ اس خاندان کا "مہر مثل" زمانۂ دراز سے پانچ ہزار روپے چلا آرہا ہے۔ آپنے شریعت کے نام پر اس مہر کو قابل ترمیم سمجھا مجھے اس پر اعتراض نہیں۔ لیکن احکام شریعت کی جو توجیہہ اس سلسلے میں آپ نے فرمائی، اُسے مَیں کسی طرح بھی صحیح نہیں سمجھتا۔ تاہم مَیں آپ کی دیانتداری پر شبہ نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے میں آپ نے ایک بہت بڑی شرعی و اسلامی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں آپ کی یہ غلطی دوسروں کو گمراہ کرنے کا باعث نہ بن جائے چند تصریحات کر دینا ضروری ہے۔

مہر کے تعین کا مسئلہ سکہ، زر تبادلہ اور اشیاء کی قیمت کا مجموعی مسئلہ ہے۔ اس لئے آج کل درہم یا دینار کی جو شرح تبادلہ روپے کی شکل میں ہے۔ صرف اسی کو مدار فیصلہ نہیں بنایا جا سکتا۔ مثلاً فرض کیجئے۔ عہد سعادت میں کسی شخص کی ایک وقت کی خوراک کے لئے نصف درہم درکار تھا گویا آج کل کے معیار تبادلہ کے لحاظ سے تقریباً دو آنے۔ لیکن کیا آج اشیاء کی قیمتوں کو دیکھتے ہوئے۔ آپ یہ معیار خوراک مقرر کر سکتے ہیں؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ اس سے بھی زیادہ سامنے کی مثال یہ ہے کہ جنگ سے پہلے چیزوں کی جو قیمت تھی اُس کی رُو سے آپ ایک شخص کی گذر بسر کے لئے جو "شرعی معیار" مقرر کر سکتے تھے۔ کیا جنگ کے دوران میں بھی اُسی معیار کو صحیح قرار دے سکتے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر خدارا بتلائیے کہ "حق مہر" کا فیصلہ کرتے وقت آپ اشیاء کی قیمتوں کے اُس تفاوت کو پیش نظر کیوں نہیں رکھتے جو عہد سعادت اور عہد حاضر کے وقتوں میں ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ درہم ہو یا روپیہ، ان کی بذاتہٖ کوئی قیمت نہیں۔ ان کی قیمت کا معیار اشیاء کی اضافی حیثیت سے متعین ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں ایک روپیہ دس من گیہوں لا سکتا ہے

لیکن دوسرے زمانے میں یہی روپیہ صرف پانچ سیر گیہوں لاتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے روپے کی جو قیمت تھی وہ اسّی گنا بڑھ گئی۔ گویا دس من فی روپیہ گیہوں خریدنے کے زمانے میں ایک روپے کی جو قیمت تھی۔ وہ پانچ سیر فی روپیہ والے وقت میں اسّی روپے کے برابر ہوگئی۔

اب اصول کو پیش نظر رکھنے کے بعد آپ عہد سعادت کی قیمتوں سے آج کل کی قیمتوں کا مقابلہ کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس زمانے میں درہم یا دینار کی جو قیمت تھی۔ وہ آج کل کتنی بڑھ گئی ہے۔

آئیے ذرا تفصیل سے اس سوال پر غور کریں۔

اُس زمانے میں آج کل کی طرح مصنوعی سکہ نہ تھا بلکہ خالص سونا اور خالص چاندی ہی کو معیارِ تبادلہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے اور سب باتوں کو چھوڑ دیجئے۔ صرف سونے اور چاندی کی قیمتوں کے باہمی تناسب پر غور فرمالیجئے۔ اسلام نے زکوٰۃ کے لئے سونے اور چاندی کا جو معیار تناسب مقرر کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری کافی رہبری کرسکتا ہے۔ یہ مسئلہ آپ جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کا وجوب ۵۲ تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونے کی ملکیت سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ عہدِ اسلامی میں ۵۲ تولہ چاندی کی اضافی قیمت سونے کی قیمت کے لحاظ سے ۷½ تولہ کے برابر تھی۔ یعنی نسبت یوں ہوئی ۷½ : ۵۲۔ (سونا : چاندی)

اب آئیے اس نسبت کو اور زیادہ واضح کریں۔ تخمینی طور پر یہ نسبت ایک اور سات کی ہے۔ یعنی عہد سعادت میں سونے کی ایک اکائی چاندی کی سات اکائیوں کے برابر ہوتی تھی۔ گویا نسبت یہ تھی ایک تولہ سونا برابر سات تولہ چاندی۔ (۱ : ۷) (سونا : چاندی)

اس نسبت کو ذہن میں رکھئے اور آج کل کی قیمتوں کے پیمانے پر اس کو ناپنے کی کوشش کیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل ہمارے ملک میں سونا اور چاندی معیار تبادلہ نہیں بلکہ معیار تبادلہ وہ مصنوعی

سکہ ہے جسے ہم روپے کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس لئے حق مہر مقرر کرتے وقت درہم و دینار کو روپوں کی شکل میں تبدیل کرنے سے پہلے آپ کو چاہئے کہ عہد سعادت میں سونے اور چاندی کی قیمتوں میں جو اضافی نسبت تھی، اُسے روپے کی صورت میں جاننے کی کوشش کریں۔

یہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ عہد سعادت میں سونے اور چاندی کا تناسب ۱ : ۷ تھا۔ اب یہ دیکھئے کہ آج کل یہ تناسب کیا ہے۔ آج سونے کی قیمت اوسطاً ۱۴۷ روپے تولہ ہے اور چاندی تخمیناً اٹھاون آنے تولہ۔ یعنی نسبت یہ ہوئی ۱۴۷ : ۵۸/۱۶۔ اب اسے مفرد شکل دینے کی کوشش کیجئے تو نسبت یہ ہو گی ۱ : ۶۵۔ مطلب یہ کہ آج آپ کے پاس اگر ایک تولہ سونا ہو تو اس کے عوض ۶۵ تولہ چاندی خرید سکتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ آج آپ جتنے روپے میں ۶۵ تولہ چاندی خرید سکتے ہیں۔ اُتنے روپوں میں سونا صرف ایک تولہ ملے گا۔ لیکن عہد سعادت میں صورت حال یہ نہ تھی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ جتنے درہم و دینار میں ۵۲ تولہ چاندی خریدی جا سکتی تھی۔ اتنی ہی رقم میں ساڑھے سات تولہ سونا مل جاتا تھا۔ گویا آج سونے چاندی کی اضافی قیمت میں (۶۵ – ۷) ۵۸ گنا زیادتی ہو گئی ہے۔ یعنے اُس زمانے کے مقابلے میں آج ایک تولہ سونے کی قیمت چاندی کے مقابلے میں اٹھاون گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ بالفاظ دیگر آج چاندی کی قیمت ۵۸ گنا بڑھ گئی۔

اگر ہم سونے اور چاندی کے اسی تناسب کو اشیاء کی قیمتوں کا معیار بھی مان لیں تو غلط نہ ہوگا۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہد سعادت کے مقابلے میں آج چیزوں کی قیمتیں اٹھاون گنا زائد ہیں۔ لیکن احتیاط کی خاطر آپ اٹھاون کی بجائے پچاس رکھئے۔ پچاس بھی نہیں چالیس ہی رکھئے۔ مطلب یہ کہ اُس زمانے میں ایک روپے میں ہم جتنی چیزیں خرید سکتے تھے، اُتنی چیزیں خریدنے کے لئے آج کم از کم چالیس روپے کی ضرورت ہو گی۔

زیادہ واضح لفظوں میں عہد سعادت اور عہد حاضر کی قیمتوں کا تناسب یہ ہوا - ۱ : ۴۰ -
اس لئے جس طرح ہم اپنی تمام دوسری ضروریات زندگی میں آج اس معیار کے پابند ہیں اسی طرح مہر کے معاملے میں بھی ہم کو اسی اصول کا پابند ہونا چاہئے یعنی ایک روایت کے مطابق اُس زمانے میں "مہر فاطمی" میں تین سو درہم مقرر کیا گیا تھا تو آج بارہ ہزار درہم ہونا چاہئے یعنی تین ہزار روپے کے قریب۔
مگر آپ نے ان تمام باتوں کو نظر انداز فرما کے غریب عزیزہ کا مہر صرف ڈیڑھ سو روپے مقرر فرمایا ہے۔ غور فرمایئے۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ عہد سعادت میں تو لوگ دس درہم میں مہینہ بھر پیٹ بھر کھانا کھا سکتے تھے لیکن کیا آج آپ ڈھائی روپے ماہوار میں ایسا کر سکتے ہیں! پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جب آپ کے کھانے پینے کا معاملہ آئے تب تو آپ گرانی و ارزانی اور قیمتوں کی کمی وزیادتی کی بحث کر کے اپنے لئے زیادہ روپیہ طلب کریں۔ لیکن جب "حق مہر" کے نام سے "شرعی مہر" کا سوال پیدا ہو تو اُس پرانی لکیر کو پیٹ کر ایک درہم کو چار آنے کے برابر قرار دے لیں اور اس کو "شرعی فیصلہ" سمجھ کر ایک معصوم لڑکی کا گلا گھونٹ ڈالیں۔

• مہر کے سلسلے میں شوہر کی مالی حیثیت کا سوال بھی سامنے آتا ہے یعنی ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ جو رقم حق مہر کے طور پر مقرر کی جا رہی ہے، آیا اُس کے ادا کرنے کی صلاحیت شوہر میں ہے بھی یا نہیں خصوصاً جب مہر معجّل نہ ہو یعنی فوراً ادا نہ کیا جائے بلکہ مؤجّل یا عند الطلب ہو اور اس کی ادائیگی آئندہ کے کسی معین یا غیر معین مدت تک کے لئے ملتوی ہو۔ ایسی صورت میں زر مہر کی حیثیت "قرض" کی سی ہو جاتی ہے۔ پھر جس طرح قرض دینے والا، قرض لینے والی کی ساکھ کو دیکھ کر ہی قرض دیتا ہے اسی طرح "دین مہر" بھی شوہر کی مالی حیثیت کو سامنے رکھ کر ہی متعین کرنا چاہئے۔ اگر ایک غریب آدمی کو آپ ایک لاکھ روپے میں کوئی قیمتی ہیرا اس وعدے پر فروخت کر دیں کہ وہ قیمت بعد میں

ادا کر دے گا تو لوگ آپ کو بے وقوف سمجھیں گے۔ اسی طرح کسی معمولی حیثیت کے شوہر سے گراں قدر زر مہر کی ادائگی کی توقع کرنا خود کو بے وقوفوں کے زمرے میں شامل کرنا ہے۔ اسی وجہ سے آج کل بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب، مہر تو محض ایک نام کی چیز ہے ورنہ کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے لیکن ان لوگوں کو شاید یہ علم نہیں ہوتا کہ اگر زر مہر کی ادائگی کا خیال شوہر کے دل میں نہ ہو۔ تو شرعی اصول سے، ایسا نکاح، نکاح ہی نہیں ہوتا۔ شریعت نے مرد و عورت کو باہم زن و شوہر بنا دینے کے لئے تین شرطیں رکھی ہیں۔ ایک تو دونوں کا راضی ہونا جسے فقہی اصطلاح میں "ایجاب وقبول" کہتے ہیں اور دوسرے اس ایجاب وقبول پہ کم از کم دو آدمیوں کا گواہ ہونا تاکہ اگر کسی وقت کوئی جھگڑا پڑے تو یہ دو گواہ عدالت مجاز کے سامنے شہادت دے سکیں۔ اور تیسرے زر مہر

زر مہر کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے آپ بازار میں کوئی سودا کریں تو جب تک قیمت ادا نہ کر دیں خرید کردہ چیز کو گھر نہیں لے جا سکتے۔ البتہ اگر دکاندار کو آپ پر بھروسہ ہو اور وہ فوری ادائگی کے سوال پر اصرار نہ کرے تو آپ قیمت کے معاملے کو کسی اگلے وقت پر اٹھا سکتے ہیں۔ بعینہ یہی صورت زر مہر کی ہے۔ اس میں منکوحہ لڑکی کو سارا اختیار حاصل ہے۔ وہ اگر چاہے تو فوراً وصول کر لے اور چاہے تو کسی معین یا غیر معین مدت تک کے لئے ملتوی کر دے اور چاہے تو بالکل ہی معاف کر دے

لیکن "زر مہر" کے معاملے میں جب ہم "شوہر کی مالی حیثیت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ نکاح کے وقت اس کے پاس جو دولت ہے صرف اسی کو معیار فیصلہ بنا لیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمیں "دولت" کو عرفی لحاظ سے نہیں۔ اقتصادی و معاشی لحاظ سے دیکھنا ہوگا۔ عرف عام میں تو "دولت" سے صرف وہ مادی اشیاء مراد ہوتی ہیں جن کو سکوں کی شکل میں بیچا یا خریدا جا سکے لیکن اقتصادی نقطۂ نظر سے "انسانی محنت" بھی دولت کہلاتی ہے

اس لئے کہ اگرچہ یہ بالفعل آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ لیکن بالقوہ ہر مادی دولت کا اصل مخزن یہی ہے۔ زمین میں پڑی ہوئی مٹی کو اینٹوں کی شکل میں تبدیل کرکے "دولت" بنانے والی طاقت، کمہار کی وہ "محنت" ہی تو ہے جس کے بغیر مٹی ایک بے قیمت چیز تھی۔ اسی طرح اینٹوں کے کم قیمت ڈھیر کو ایک قیمتی "تاج محل" کی شکل میں کھڑا کر دینے والی چیز بھی معماروں اور مزدوروں کی "محنت" ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ غرض کارگاہ عالم میں آپ جدھر بھی نظر اٹھائیں گے، محنت کے اصل دولت ہونے کے بے شمار مناظر دیکھیں گے۔ بڑی سے بڑی دولت، انسانی محنت کے بغیر بیکار ہے۔ البتہ اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ محنت کو اپنے جوہر دکھانے کے لئے مادی وسائل کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ محنت بجائے خود دولت نہیں۔

دولت کی اس تعریف کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ زرمہر مقرر کرتے وقت شوہر کی صرف مادی دولت ہی کو معیار نہیں بنانا چاہئے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس میں محنت کرکے پیدا کرنے کی صلاحیت کتنی ہے۔ اگر ایک شخص بہترین مصور و نقاش ہے لیکن اس کے پاس فوری طور پر کوئی جائداد نہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ آپ اس کی مالی حیثیت صرف اس کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد کو دیکھ کر لگائیں۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس کی محنت کے جو ثمرات تصویر و نقاشی کی شکل میں پیدا ہوں گے، ان کی قیمت کیا ہوگی۔ اسی قیمت کو سامنے رکھ کر آپ کو "مہر" کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے مہر کی فوری ادائیگی کے سوال پر زور نہیں دیا ہے یعنی مہر مؤجل کو مہر معجل پر فوقیت دی ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ جو لوگ فوری ادائیگی کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ اپنی "محنت" کے نتائج سے رفتہ رفتہ اس قرض سے سبکدوش ہوتے رہیں۔

میں نے یہ بحث یہاں تفصیل سے اس لئے چھیڑی کہ آج کل بعض لوگ کم سے کم مہر مقرر کرنے پر زور دیتے ہیں اور دلیل اس کی یہ لاتے ہیں کہ شوہر کی حیثیت اتنی ہی ہے لیکن ایسے لوگوں کو اس حقیقت کو ہمیشہ کے لئے سمجھ لینا چاہئے کہ مالی حیثیت صرف مادی دولت کا نام نہیں ہے، بلکہ "محنت"

بھی اس میں شامل ہے۔

محنت و دولت کی اس تصریح کے بعد میں دوسرا الزام آپ پر یہ لگاتا ہوں کہ آپ نے اپنی بھتیجی کو اپنے بیٹے سے بیاہتے وقت زر مہر کے معاملے میں اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے کی مالی حیثیت صرف اُن چند برتن بھانڈوں سے لگائی جو اس وقت اس کی ملکیت ہیں لیکن اُس میں محنت کر کے کمانے کی جو صلاحیت ہے۔ اُسے بالکل نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی بیچاری مفت میں ماری گئی۔ آپ نے ڈیڑھ سو روپے پر اس کا معاملہ طے کر لیا کتنی بڑی زیادتی ہے کہ جس ڈیڑھ سو روپیہ میں آج کل ایک ادنےٰ چپیسٹر بھی تیار نہیں ہو سکتا، اُسے آپ ایک نرم و نازک دوشیزہ کے زر مہر کا معیار مقرر فرماتے ہیں۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مرد و عورت کے تعلقات اچھے رہیں تو بیوی کو زر مہر کی کمی زیادتی کا خیال بھی نہیں آ سکتا کیونکہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے تمام وسائل تو بہر حال شوہر ہی کے ذمے رہتے ہیں میں اس بات کو مانتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اول تو زر مہر کو نان و نفقے سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسری سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر فرض کر لیجئے کہ زن و شوہر کے تعلقات ناشگفتہ ہو جائیں تو پھر کیا اُس وقت آپ زر مہر کی کم رقم کو بڑھا دیں گے؟ اگر نہیں بڑھا سکتے تو پھر آپ غریب لڑکی کا تحفظ کیوں چھینتے ہیں؟

آپ نے اپنے بیٹے کی شادی پر یقیناً بہت کم خرچ کیا۔ تاہم چار پانسو روپے آپ کے اُٹھ گئے۔ علاوہ ازیں آپ کے اعزا و اقربا کی طرف سے ہدایا و تحائف کے طور پر جو رقم آپ کو ملی اس کی تعداد بھی چار پانسو سے کم نہیں۔ گویا اس شادی میں تقریباً ایک ہزار روپے کا ہیر پھیر ہو گیا۔ لیکن وہ غریب لڑکی جس نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا اور جس کی وجہ سے یہ سب کچھ عمل میں آیا۔ اُس کی "قیمت" آپ نے صرف ڈیڑھ

دو سو روپے مقرر کی۔

آپ کہتے ہیں لڑکے کی حیثیت ہی یہ ہے لیکن جس لڑکے کی محنت کے نتائج سے آپ کو اور آپ کے اعزا و اقرباء کو یہ توقعات ہوں کہ ہزار روپے کے تحائف دلوا کر اس کے لئے زائد سمجھیں، کیا اس میں اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ چند سال کی مدت میں سات آٹھ ہزار روپیہ بالاقساط زرِ مہر کے طور پر ادا کر دے؟ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ تحفہ و سوغات دینے والے کے سامنے ہمیشہ یہ معیار رہتا ہے کہ آج ہم نے اسے دیا ہے تو کل یہ ہم کو بھی دے گا۔ یہ بات زبان سے نہیں کہی جاتی لیکن "حساب دوستاں در دل" کے طور پر ہر ایک کے دل میں ہوتی ہے۔ پھر کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ ایک لڑکے سے یہ توقع تو کرتے ہیں کہ وہ اپنے افراد خاندان کے ہزار بارہ سو روپے کے تحائف و سوغات تھوڑے دنوں میں واپس کر دے گا لیکن زرِ مہر جو شرعی چیز ہے۔ اور جو عورت کی زندگی کا بہترین ضامن و تحفظ ہے۔ اس کے معاملے میں آپ لاکھوں بہانے نکالتے ہیں اور ایک ایسی رقم پر معاملہ طے کر لیتے ہیں جس میں آج کل "صاحب بہادر" کا کتا بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ جس میں ایک اچھی بھینس بھی نہیں آ سکتی اور جو تانگے کے گھوڑے کی قیمت سے بھی کمتر ہے۔

میرے نزدیک مسلمانوں کا یہ عمل اسلام کو سب سے زیادہ بدنام کرنے والا ہے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ آپ سرے سے اسلام ہی کی مخالفت شروع کر دیں کہ سنی سے سوم بھلا جو تکا سا لے جواب۔ اس سے کم از کم اسلام تو بدنامی سے بچے گا۔ صرف آپ ہی تنہا بدنام ہوں گے۔

(حق پسند)

—————— (٥) ——————

شاعر اقبال

(از جناب غلام محمد صاحب بی۔اے۔حیدر آباد دکن)

اصول ارتقاء کی کار فرمائیاں "کمیت کی دنیا" اور "کیفیت کے عالم" میں یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح جسد بعض اصولوں کے تحت کمزوری سے توانائی کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح قلب و دماغ (جو خاص کیفیات ہیں) چند خاص موثرات کے تحت اسفل سے اعلیٰ کی جانب عروج کرتے ہیں۔ ان موثرات کے تابع ایک ہی شخص کی فکری عمر کے کئی الگ الگ حصے بن جاتے ہیں۔ کلام اقبال کے مطالعہ سے ان کے فکری ارتقاء اور تغیرات کے چار رخ ظاہر ہوتے ہیں اور اسی اعتبار سے علامہ اقبال کی چار ممیز حیثیتیں ہو جاتی ہیں جنہیں ہم "شاعر اقبال" "مفکر اقبال" "حکیم اقبال" اور "عارف اقبال" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس قسط میں ہم صرف "شاعر اقبال" کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

اقبال شاعرانہ طبیعت لے کر آئے تھے اور حسن اتفاق سے ان کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ شاعری کا مرکز لکھنؤ اور دہلی سے ہٹ کر لاہور قرار پا چکا تھا۔ دلی اور لکھنؤ کے بچے کھچے شاعر جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظم حسین لکھنوی خاص ہیں۔ یہیں لاہور ہی کو اپنا ٹھکانا بنا چکے تھے ــــ اقبال نے پہلے پہل ارشدی مکتب میں داخلہ حاصل کیا لیکن داغ کی نمایاں حیثیت نے ان کو بہت جلد یہاں سے نکال بزم داغ میں لا داخل کیا۔ اقبال پر داغ کا کافی اثر جما۔ چنانچہ اسی رنگ کی کئی غزلیں ہوئیں ــــ جیسے "نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی" الخ اور "ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں" الخ وغیرہ غزلیں اسی اثر کی آئینہ دار ہیں ــــ لیکن اقبال محض شاعرانہ صلاحیت کے حامل نہ تھے بلکہ فکر کی دولت

سے بھی مالا مال تھے۔ داغ کے ہاں تحریری صلاح لی جاسکتی تھی، معنوی استفادہ کا موقع نہ تھا۔ فکر اقبال نے اس پیاس کو بجھانے کے لئے ایک بحر کا رخ کیا جس کی گہرائیوں میں معنی کے انمول موتی تھے۔ غالب کے ہاں اقبال کو نہ صرف سکون ملا بلکہ غواصی میں لطف آنے لگا۔ اب داغ کا رنگ ڈھلتا گیا۔ یہاں تک کہ محو ہو گیا۔ اور اب جو غزلیں لکھی گئیں تو ان میں وہی دقت پسندی، وہی نکتہ رسی اور سیدھی سادی زبان کی جگہ وہی فارسی زدہ طرز جو غالب کا خاص انداز ہے۔ ذیل کی غزلیں ملاحظہ ہوں:

مثال پرتو مے طوف جام کرتے ہیں ـــ یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں (بانگ درا)

اور

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں ـــ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

(بانگ درا)

یہ رنگ مٹنے والا نہ تھا خوب جما، یہاں تک کہ بعض بعض مصرعے، غالب ہی کی طرح صرف ایک آدھ لفظ سے اُردو ہونے لگے۔ اور یہی طرز اخیر تک قائم رہی۔

فطرت کو اقبال سے غزل گوئی کا کام لینا نہ تھا بلکہ یہ صلاحیت ایک ذریعہ بنائی جانے والی تھی ایک عظیم تر مقصد کا ـــــ اقبال کو ایک حیات افریں ادب چھوڑنا تھا۔ اور یہ صنعت ادب میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ ادیب کے ہاتھوں میں زندگی کی نبض ہو اور وہ انسان کے دل میں زندگی کے امکانات اور اس کے حسن و شوکت کا زیادہ گہرا احساس پیدا کرے۔ اقبال کے لئے یہ مقام مقدر ہو چکا تھا۔ ان کی اس قسم کی شاعری کی ابتدا "نالۂ یتیم"، "ہمالہ"، "تصویر درد" اور "صدائے درد" وغیرہ سے ہوتی ہے ـــــ مگر اس مقصد عظیم کے لئے اردو کا میدان تنگ تھا۔ اقبال کو جب اُردو کی تنگ دامانی اور اپنے پیام کی وسعت و عظمت کا خیال پیدا ہوا تو فارسی کو آلہ کار بنایا گیا ـــــ عربی و فارسی کی تعلیم مولوی میر حسن جیسے استاد سے ملی تھی۔ ذاتی مطالعہ نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ یہی

وجہ ہے کہ جب ذہن کا بہاؤ اُردو سے ہٹ کر فارسی کی طرف ہوا تھا اس میں بھی وہی بے ساختگی اور لطف کلام اور موثر انداز نمایاں رہا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ مولانا روم کے گہرے اثر کے عبدالقادر بیدل کا طرز بھی اقبال پر کافی اثر انداز رہا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

کشتۂ انداز ملا جامیم   نظم و نثر او علاج خامیم   (اسرار خودی)

اب اقبال صاحب "اسرار و رموز" مصنف "پیام مشرق"، "جاوید نامہ" و "زبور عجم" ہیں ــــ اُردو کے ہواخواہوں کو تکلیف ہوئی کہ فکر اقبال کا گرانمایہ ذخیرہ سب کا سب فارسی کی نذر ہوا جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے پھر اُردو کی طرف توجہ منعطف کرائی جس کا نتیجہ "ضرب کلیم"، "بال جبریل" اور "ارمغان حجاز" کا نصف حصہ ہے ــــ لیکن اخیر کے اُردو کلام میں زبان کی پہلی سی خوبیاں نہیں پائی جاتیں، مگر حکمت کے جواہر پارے ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔

ابتداً اقبال نے شاعری فن کی خاطر بھی کی تھی۔ لیکن یورپ کے مشاہدہ نے ان کی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اگر اس وقت سر شیخ عبدالقادر کا اصرار اور پروفیسر آرنلڈ کی تائید نہ ہوتی تو آج اقبال ایک بڑے فلسفی اور حکیم تو رہتے لیکن ایک اعلیٰ شاعر نہ ہوتے ــــ اس کے باوجود شاعری کے فن سے دلچسپی جاتی رہی۔ اور اب اس کی حیثیت اظہار خیال کے موثر ذریعہ کی حد تک رہ گئی اب اگر کوئی ان کو محض شاعرانہ نظر سے دیکھے تو بارگاہ عدل میں شکایت کرنے لگتے ہیں۔

من اے میر امم داد از تو خواہم   مرا یاراں غزل خوانے شمردند

شاعری کا دعوےٰ ہے کہاں۔ خود کہہ رہے ہیں کہ مجھے کوئی شاعر نہ سمجھے۔ نغمہ سرائی میرا مقصد نہیں بلکہ ملت کے پریشاں افراد کو ایک صف میں لانا ہے:

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست   سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

کوئی دلکش صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر میں

(بال جبریل)

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ (بال جبریل)

عجمی شاعری سے اقبال کو نفرت ہو چکی ہے کیونکہ اس میں الفاظ کی شوکت تشبیہوں کی ندرت، بندشوں کی چستی، سب کچھ سہی لیکن یہ بے روح ہے، اس میں حیات کا کوئی عنصر نہیں۔ انقلاب کا کوئی جذبہ نہیں۔ اسی لئے وہ اس کے عدم کو وجود سے بہتر تصور کرتے ہیں:

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے جس سے متزلزل نہ ہوئی دولت پرویز (ضرب کلیم)

اقبال تو اس کے قائل ہیں کہ نیام ناقص سہی، تلوار تیز ہو، جام سفالی ہو تو حرج نہیں مئے تند ہو، لوازمات شعری نہ رہیں تو کیا پروا، شعر میں حیات کا عنصر ہو۔ ان کے نزدیک یہی سب سے اچھا شعر اور یہی سب سے اچھا شاعر ہے۔

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تیری مے (ضرب کلیم)

وہ شعر جس میں پیام زندگی ہو (خواہ الفاظ و تشبیہہ کی خوبیاں نہ رہیں) اقبال اس کے سب سے بڑے مداح ہیں:

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل (ضرب کلیم)

اقبال کے اس نظریہ شعر و سخن کو سمجھ کر یہ خیال نہ پیدا ہو کہ ان کی شاعری محاسن سے خالی ہے اقبال نے نہ صرف اردو میں صحیح "ترقی پسند" ادب کی طرح ڈالی بلکہ اس کو اتنا گراں قدر بنایا کہ اب اس کی کوتاہ دامنی کا گلہ مضحکہ خیز بن گیا ——— اردو ادب پر ایک بڑا اعتراض اور بڑی حد تک صحیح اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ اس میں مصوری اور عکاسی کے وہ نمونے نہیں ملتے جو انگریزی ادب

میں شیکسپیر، ملٹن اور بیسیوں شعراء نے چھوڑے ہیں۔ اُن کو اگر میر حسن، دیا شنکر نسیم، مرزا شوق اور مومن کو الگ رکھ کر دیکھئے تو اردو اس اعتراض کے جواب سے بالکل عاجز تھی لیکن اقبال نے اس کو اس ندامت سے بچا لیا ــــ "ایک آرزو" "جگنو" "کنار راوی" "ماہ نو" "ابر کہسار" اور "ابر" وغیرہ کی سی نظمیں نیچرل شاعری کی ایسی شاہکار ہیں جن کی مثالیں اور زبانوں کے ادب میں بھی مشکل ہی سے ملیں گی ــــ تشبیہات کا ایک مستقل باب بن سکتا ہے۔ "گل و بلبل" "شمع و پروانہ" اور "شبنم و خورشید" وغیرہ کی تشبیہات سے اقبال نے قومی شاعری میں جو فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ علاوہ ازیں "شاہین" "تدرو" "کرگس" وغیرہ کی نئی تشبیہات بھی تراشیں ــــ تشبیہ کی ندرت ملاحظہ ہو:-

بارش کے قطرے سطح آب پر گرنے سے جو حلقے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے لیکن اسی منظر کو کس ندرت سے بیان کیا ہے ــــ ابر کہسار کہہ رہا ہے

سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں   بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

ڈالی کے جھکنے اور ٹوٹنے سے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ   پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی   جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

پت جھڑ کو اتنی خوبی سے کس نے بیان کیا ہے۔

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح   دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

حباب سے یہ معنے شاید ہی کسی نے پیدا کئے ہوں:-

تو اگر خوددار ہے منت کش صہبا نہ ہو   عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

عکاسی ملاحظہ ہو:-

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو   طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

وغیرہ۔

شبنم و خورشید سے انوکھا فائدہ اٹھایا ہے۔

نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی   یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

اسی طرح اور دوسری قدیم تشبیہوں سے نئے نئے معنی پیدا کئے ہیں۔

فارسی میں گو اقبال کے ہاں حافظ، خاقانی، قاآنی، عرفی وغیرہ کی سی نادر تشبیہیں، الفاظ کی شان و شوکت اور بیان کی نزاکت نہیں ملتی۔ پھر بھی بعض مقامات بہت قابل تعریف ہیں۔ مثلاً چند اشعار پیش ہیں:-

صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من   آں سیل سبک سیرم، ہر بند گسستم من

سرمایہ عشق تو، غارت نہ تواں کردن   ہر اشک کہ پیدا شد در دیدہ شکستم من

قدم بے باک تر نہ در حریم جان مشتاقاں   تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

(پیام مشرق)

ایں صورت دلآویزے از زخمۂ مطرب نیست   مہجور جہاں حورے نالد بہ رباب اندر

(جاوید نامہ)

اس قسم کی تشبیہات کے سوا اقبال نے اردو ادب میں جس قسم کی نئی تشبیہوں کا ذخیرہ چھوڑا ہے وہ "مذہبی تشبیہات" ہیں مثلاً ایک شام کا سین یوں کھینچا ہے۔ ع "فطرت ہے مراقبہ میں گویا" ——— یاد سے معمور دل کی کیفیت یوں ادا کی ہے:-

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے   جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

(والدہ مرحومہ کی یاد)

نجم سحر کے غروب ہونے کو یوں تشبیہہ دی ہے :-

ہے رواں نجم سحر جیسے عبادت خانہ سے — سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار (نمود صبح)

تشبیہہ کے علاوہ تلمیح، کنایہ، اور استعارہ وہ چیزیں ہیں جو کلام کو زیادہ بلیغ اور اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں —— اقبال کے گہرے اسلامی مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے —— تلمیح، استعارہ اور کنایہ میں اقبال کو کمال حاصل ہے۔ مثلاً خضر سے تخاطب ہے

کشتیٔ مسکین، و جانِ پاک، و دیوارِ یتیم — علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

(خضر راہ)

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد — عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد — وغیرہ

تو خود حدیثِ مفصل بخواں ازیں مجمل ——

اس سے ہٹ کر نئی نئی ترکیبوں کا ایک دفتر یہاں ملتا ہے جس کی بقول پیکرِ تعلیماتِ اقبال (قائد ملت محمد بہادر خاں) نور اللہ مرقدہٗ ایک مستقل زبان بن سکتی ہے۔ مشتے از خروارے پیش ہیں :-

ذوقِ تبسم۔ سنگ ہوس۔ شیشۂ ہوش۔ احرامِ حیات۔ مجبورِ جنبش۔ شہید جستجو۔ ضمیرِ آسماں۔ ضمیرِ حیات۔ ضمیرِ کن فکاں۔ مئے یقیں۔ عقلِ سنگدل۔ ادابِ خود آگاہی۔ ادابِ عشق۔ خوئے غلامی۔ ذوقِ تجلی، جذبِ دروں۔ ضعفِ خودی۔ زورِ خودی۔ غنیم موت ——

بہرکیف اقبال کی نیچرل اور قومی شاعری کے علاوہ ان کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ مغربی شعرا (مثلاً ٹینی سن، امرسن، گوئٹے وغیرہ) کے کلام سے ماخوذ ہے۔ یہ ماخوذ نظمیں اتنی اپچ رکھتی ہیں کہ بظاہر اقبال ہی کے کلام کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے اُردو ادب میں

خاصا اضافہ ہوا ــــــ

ظریفانہ کلام کا ایک حصہ بھی ملتا ہے جو اکبر کا خاص اسلوب ہے لیکن یہاں بھی اقبال اکبر کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ ہیں۔ اور وہ کمال حاصل نہیں ــــــ

اقبال نے تضمینیں بھی لکھی ہیں جن میں سے بعض بہت اعلیٰ درجہ کی ہیں مثلاً تضمین بر شعرِ ملک قمی" "بر شعر سعدی" "بر شعر صائب" "بر شعر عرفی" وغیرہ۔ اس کے علاوہ "شکوہ" "جواب شکوہ" اور "ساقی نامہ" ایسی نظمیں ہیں جو اپنی نظیر نہیں رکھتیں ــــــ "شکوہ و جواب شکوہ" میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کے اسباب و علاج کی شاعرانہ توضیح ہے۔ "ساقی نامہ" اقبال کی جدت پسند طبیعت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ وہی ساقی، مے اور جام کا تذکرہ لیکن نہ ساقی وہ فانی ساقی ہے۔ نہ شراب ویسی خمار آور شراب ہے اور نہ ساغر پھیلوں کا سا ادنیٰ ساغر ہے ساقی نامہ کیا ہے، جذبات کا ایک سیلاب ہے جس میں مئے توحید کی جھلک، نام نہاد توحید کے مئے آشاموں کی تباہ حالی کا اظہار اور "دلِ مرتضیٰ" اور "سوزِ صدیق" کے لئے دعائیں ہیں۔ غرض اپنی نوعیت کا پہلا ساقی نامہ ہے

بحیثیت مجموعی اقبال "جدید" یا "ترقی پسند" ادیبوں کے سالار ہیں۔ ان کی شاعری ترقی پسند ادب کا نہایت اعلیٰ اور نادر نمونہ ہے جس میں عروض کی پابندیوں کو روا رکھتے ہوئے، اخلاقی اقدار کو بغیر نقصان پہنچائے انسانیت کے دکھ کی صحیح ترجمانی موجود ہے اور اس کے علاج کے صحیح نسخے فراہم کئے گئے ہیں جس کے مطالعہ سے آنکھیں کھلتیں اور دل بیدار ہوتا ہے۔ مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے اور ٹھٹھرے ہوئے قدم دوڑنے لگتے ہیں۔ ــــ غرض اقبال نے اپنی شاعری سے ثابت کر دکھایا کہ قدیم شاعری کا سبو اس قدر چھوٹا نہیں کہ جدید رجحانات کی شراب اس میں سما نہ سکے۔ نام نہاد ترقی پسند ادیب اب اس ادب میں بے ادبی کی جرأت نہ کریں ۔

ــــــ (٥) ــــــ

محب وطن اقبال

اور

بعد ۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاست۔ ہندو مسلم اتحاد میں حضرت اقبال کی سعی

(از جناب شیخ شیر محمد صاحب پاکستانی ڈیرہ غازی خاں)

ا

۱۸۵۷ء کی ہندو مسلم مشترکہ کاوشیں ناکام بن کر رہ گئیں۔ اور وہ قومی اتحاد کے روح پرور نظارے جو شاہان اسلام علاؤ الدین خلجی، اکبر، جہانگیر، اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے وقتوں میں منظر عام پر دیکھنے میں آتے تھے۔ بالکل خواب پریشاں بن کر رہ گئے۔ مسلمانوں نے اپنے آخری پانچ صد سالہ عہد حکومت میں اپنا تمام تر زور صرف کر کے متحدہ قومیت بنانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے مسلمانوں نے اس مقدس رشتہ کی خاطر اُردو زبان تیار کی۔ جو فارسی و سنسکرت کے ملاپ سے تیار کی گئی۔ مغلیہ تخت کے وارثوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ نرم سلوک روا رکھا ان کے مال و دولت کی نگہبانی کی گئی۔ اسلامی عہد میں (ہندوستان بھر میں) مالی حالت بہت عمدہ تھی جس کے متعلق عہد تغلق کا سب سے مشہور سیاح ابن بطوطہ تحریر کرتا ہے :-

"شاہ تغلق اپنے ملک سے باہر روپیہ جانے کی کبھی اجازت نہ دیتا تھا۔ اور مشہور تھا کہ اگر کوئی شخص کبھی روپیہ لے جاتا۔ تو ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑ جاتا"

اور انگریز مصنف میجر باسو تحریر کرتا ہے:۔

"رعایا کی خوش حالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دور حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔"

حفاظت جان کے اعتبار سے ملک دنیا کے کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک سے پیچھے نہ تھا۔ عدل و انصاف کا تو پوچھنا ہی کیا۔ قصبہ قصبہ میں مسلمانوں کے لئے قاضی صاحب اور ہندوؤں کے لئے پنڈت جی مقرر کئے جاتے تھے۔ جگہ جگہ اخلاقی مسائل حل کرنے کے لئے پنچ مقرر کئے جاتے تھے۔ اور عدل جہانگیری جس کا آج تک چرچا ہے۔ مذہبی حفاظت کا طریقہ سب سے پہلے حضرت محمد بن قاسم کے وقتوں رائج کیا گیا۔ جو ہر مسلمان فرمانروا کے دور حکومت میں ملک بھر میں جاری و طاری رہا مساجد اللہ کے برابر برابر اہل ہنود کے منادر کو بیش بہا عطیے بخشے جاتے تھے۔ مندروں کے حنت سرکاری تنخواہ پاتے تھے۔ محکوم رعایا کی تہذیب کی حفاظت کا کیا ہی کہنا۔ ہندوؤں کی ہر تہذیب، ہر تمدن۔ ہر یادگار کی قابل یادگار نگہبانی کی گئی۔ آج تک کسی تواریخ۔ کسی سفرنامے کسی یادداشت یا کسی دستاویز سے یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی کسی یادگار یا تہذیب کو مٹانے کا کبھی ارادہ کیا ہو۔ آج تک کسی مسلمان نے کسی ہندو کی دھوتی یا کسی ہندو کی چوٹی میں مداخلت کی ہو یا اس میں ردوبدل کیا ہو۔ بلکہ ہندوستان میں پہنچ کر ہندو تہذیب نے اسلام ازم پہ گہرا اثر کیا۔ توحید اسلام کی لہریں وادی گنگا میں پہنچ کر رک گئیں۔ اور اسلامی لہریں ہندو لہروں میں ایسی خلط ملط ہوئیں کہ ان میں تمیز کرنی بھی مشکل ہو گئی۔ فلسفہ ویدانت نے اسلامی تصوف پہ اتنا گہرا اور پائیدار اثر کیا۔ کہ حضرت اقبال نے ایک حکایت بیان فرماتے ہوئے کیا خوب کہا ہے

شیر بیدار از فسون میش خفت   انحطاط خویش را تہذیب گفت

اور کچھ ہندوستان کی آب و ہوا کا فیض کہ مسلمان اچھے خاصے ہندو تہذیب میں رنگے گئے۔

ہندوستانی مسلمان شاہان کے دربار میں ہر مذہب وملت کے قابل افراد ملازم تھے۔ بیشتر ہندوؤں کو منصب داری اور جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ جس کا ثبوت اکبر، جہانگیر، اورنگ زیب حضرت سلطان ٹیپو شہیدؒ کے سنہری دورِ حکومت میں مل سکتا ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں کسی فرد کی ذاتی جائداد ضبط نہ کی جاتی تھی۔ ہر قسم کا کاروبار کرنے والوں کی ملکیتیں اور جائدادیں محفوظ تھیں اور اگر یہ محفوظ نہ ہوتیں۔ تو ملک میں کس طرح خوش حالی قائم رہ سکتی۔ اور میجر باسو عہدِ اسلامی کو سونے کے حروف میں لکھے جانے کا فیصلہ صادر نہ فرماتے۔

الغرض مختصر یہ کہ باوجود مسلمانوں کی اس قابلِ ستائش مساعی کے شاطرانِ یورپ کے پیرِ پراگندہ کے زیرِ اثر مسلسل جادوگرانِ فرنگ نے مسلمانوں کے خلاف حملے کئے۔ ہندو قوم نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنا نیا راستہ اختیار کر لیا اور وہ پانچ صد سالہ کی مساعی اور خلوص و نیک نیتی پر پانی پھیر کر تہذیبِ فرنگ کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

انگریز تاریخ دانوں نے مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے خلاف خوب لکھا۔ اور ان کتابوں کے ترجمے دیسی زبانوں میں کرا کر بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عناد اور دشمنی کا بیج بو دیا۔ سرہنری ایلیٹ اسی کارگزاری کو سرانجام دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے۔ جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات۔ توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے۔ مگر وہ احکام و ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو "محرم شریف" اور قرآن کو "کلام پاک" کہتے ہیں اور اپنی تحریرات بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔"

انگریز مؤرخوں کو سب سے بڑا غصہ اس بات پر ہے کہ ہندو کیوں مسلمان عہد کو سراہتے ہیں اور یہ مؤرخ اس معمر ہندو مصنف پر غصہ کا اظہار فرماتے ہیں جس نے اپنی تصنیف میں نوبہار کی خاطر

کہیں لکھا کہ۔

"وہ اپنی ارتھی کے قریب اور قبر کے کنارے کھڑا ہے"

انگریز مورخ کا ارشاد ہوتا ہے جبکہ اسے معلوم ہے کہ "میری لاش جلا کر اور اس کی راکھ گنگا میں بہا دی جائے گی۔ تو پھر اس نے "قبر کے کنارے کھڑا ہوتا کیوں لکھا"۔ اور پھر اُردو۔ ہندی۔ ناگری زبانوں گاؤکشی اور گاؤ رکھشا کے مسائل پیدا کر کے ہندو اور مسلمانوں کی جدائی کی خلیج اور بھی وسیع کر دی جاتی ہے۔ جس کے متعلق ایک حق گو انگریز سر تھیوڈر مارسین صاحب حسب ذیل تحریر کرتے ہیں :-

"گاؤکشی کی شورش کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں سے علیحدہ ہونے میں اور بھی مدد ملی"

غرض ہم جیسا کہ اوپر تحریر کر آئے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کر لیا۔ تو مسلمان ایک طرف تو حکومت اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھے۔ اور اسلامی سلطنت کے آفتاب غروب ہو جانے پر انگریزی سلطنت کا دور شروع ہوا۔ غدر کے بعد ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ جس میں مسلمانوں کی تباہی ہوئی۔ اگرچہ مسلمان غدر کے ہنگامے میں افسردہ ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ انیسویں ۱۹ صدی کے اواخر میں کچھ ایسے سامان پیدا ہوئے۔ جن سے وہ ایک خیالی خوف و ہراس میں مبتلا ہو گئے۔ اور ان کی ذہنیت کمزور ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہم ایک مشہور مسلمان مصنف کے قول کے مطابق دیکھتے ہیں۔ "جو بار پہلے اسلامی حکومت پر مسلمانوں کی بہبودی کا عائد ہوتا تھا۔ وہ اب تمام و کمال ان کے کمزور کندھوں پر آن پڑا۔ باوجود ایک خوف میں مبتلا ہونے کے وہ جان کی بازی لگانے اور مالی قربانی کرنے کے وقت کسی سے پیچھے نہیں رہتے"۔ جس کی تمثیلیں سلطنت کے زوال اور اس کے بعد منظر عام پہ ظہور میں آتی رہی ہیں۔ سید احمد بریلوی۔ سید اسمٰعیلؒ۔ حضرت سلطان ٹیپو۔ تحریک خلافت۔

موپلا تحریک. تحریک خاکسار و احرار کی مثالیں صفحۂ دہرتی پر موجود ہیں۔

جس قوم میں پستی و قعر مذلت سے ابھرنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ تو سب سے پہلے اس میں خود اپنی تباہ حالی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور اس بیدار شدہ جماعت میں کوئی فرد پیدا ہوتا ہے جو اس کو سرگرم عمل و جستجو بنا دیتا ہے۔

سب سے پہلے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ۱۸۵۷ء میں سرسید احمد خان نے مذہبی و تمدنی اصلاح کا کام شروع کیا۔ اور تعلیم جدید کے لئے ایک سکیم تیار کی۔ جس کے مطابق ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ اور جس کا اثر روز بروز قوم میں بڑھنے لگا۔ اور تمام ہندوستان میں اسلامی سیاست کا مرکز علی گڑھ بن گیا۔ اور ۱۸۹۸ء میں سرسید احمد خان کا انتقال ہوگیا۔

۲

اب قوم کو ایک ایسے رہبر عالی کی ضرورت پیش آتی ہے جو اس کی رگ حمیت پہ تازیانے لگا کر اسے بیدار کرے۔ اسے ورے لگا لگا کر خواب خرگوش سے جگائے۔ اور جب وہ فرزند جلیل پیدا ہوتا ہے۔ تو مسلمانوں کی سلطنت کا زوال ہو چکا ہوتا ہے۔ ان کی عظمت بالکل مٹ چکی تھی۔ ان کی سیاسی قوت ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ روز بروز نئے صدمات سے دوچار کرائے جا رہے تھے۔ برادران وطن انہیں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر رہے تھے۔ ہندو رہنما ہندو عوام کو جوش دلا دلا کر مسلمانوں کے خلاف ابھارنے سے باک نہیں کرتے تھے۔ رواداری کا ذرا بھر بھی احساس و لحاظ گوارا نہ کیا جاتا تھا۔ مسٹر تلک ایسے لیڈروں نے پونہ سے ایک دس یومیہ تہوار گنپتی نامی جاری فرما کر مسلمانوں پہ وار کیا اور اسی میلہ میں مسلمانوں کی ایک مسجد پہ حملہ کیا گیا۔ مسلمانوں کو ان کے جائز مطالبہ سے دستکش

ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ گاؤ رکھشا کی خاطر مسلمانوں کے مقدس مقامات مساجد و مقابر کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ ان کا خون بہانے سے دریغ نہ کیا گیا۔ بمبئی۔ اعظم گڑھ۔ اجودھیا۔ الہ آباد۔ آگرہ وغیرہ مقامات پر کئی بلوے ہوئے۔ اور جن میں مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔

آمدم بر سر مطلب۔ جب اسلام کے فرزند جلیل حضرت اقبال جنت مکیں پیدا ہوتے ہیں۔ تو وہ ملک اور خاص طور پر مسلمانوں کو تاریک گھٹاؤں میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ وہ اسلام کا ایک فرزند ہے۔ ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ اور وہ برادر اقوام کی اس پست ذہنیت کو بالکل مٹانے کے لئے اپنی قوت گویائی صرف کر دیتا ہے۔ جس قوم کے متعلق فرانس کے مشہور عالم مسٹر گارسن د تاسی نے ایک لکچر میں اظہار فرمایا تھا۔

"ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں۔ جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے"۔

اور یہ دنیا بھر میں ایک ایسی بدترین احسان فراموشی کی تمثیل ہے۔ جو کسی چھوٹے سے چھوٹے اور غیر مہذب ملک میں بھی نہ مل سکے گی۔

حضرت اقبال ہندوستان جنت نشان کی کھوئی ہوئی عظمت کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور برادران وطن کی تمیز ملت و مذہب کو قابل نفرت قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

اٹھا کر پھینک دو تمیز ملت و آئین نے قوموں کو   میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

اور آگے وہ برادر اقوام کی متعصبانہ اور اتحاد کے خلاف سرگرمیوں کو روکتے ہوئے نصیحت فرماتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں

حضرت اقبالؔ ہندوستان کے تازہ قومی و ملی تنازعات اور وطن عزیز کی دگرگوں حالت اور مادر وطن کے روح فرسا واقعات کو بُری طرح محسوس فرماتے ہیں۔ ان کے کمزور جسد خاکی کی رگ رگ میں بجلی سرایت کر جاتی ہے۔ وہ بے چین و بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اور ہندوستان کی دو عظیم اور سنہری روایات رکھنے والی قوموں میں نفاق و حسد کی خلیج وسیع ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اور پھر وہ ہندوستان کو اس کی عظمت گذشتہ کی یاد دلاتے ہوئے۔ اس کی موجودہ پستی اور اس کے دردناک زوال کا ترانہ سناتا ہے۔ اس کا نرم و نازک دل شری رام چندر جی۔ سری کرشن جی اشوک اعظم۔ پورس۔ قطب الدین۔ علاؤ الدین۔ بابر۔ اکبر۔ جہانگیر۔ اورنگ زیب۔ حضرت سلطان ٹیپو شہید کے سنہری عہد حکومت کو یاد کرتے ہوئے روتا ہے۔ اور چلا چلا کر اور دھاڑیں مار مار کر روتا ہے اور ہندوستان کی اس گراوٹ کو محسوس کرتا ہے۔ کہ آج وطن عزیز روٹی کے لئے محتاج ہے۔ مادر وطن کا بچہ بچہ کپڑے کے لئے ترساں ہے۔ ہزاروں لاکھوں کروڑوں افراد جانوروں ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اقتدار ملک کا زر و سیم نچوڑ نچوڑ کر دریائے ٹیمز کی وادی میں جمع کر رہے ہیں۔ اور حضرت اقبال برملا کہتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا   لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

سبحان اللہ ہندوستان کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے کہ وہ دنیا بھر کے باقی تمام ممالک سے زیادہ خوش نصیب واقع ہوا ہے کہ اُسے ایسے قحط الرجال زمانہ میں اقبال ایسا فرزند جلیل بخشا گیا جو خفتہ قوم کو بیدار کرنے اور ان کی مردہ لاشوں میں روح پھونکنے اور زندگی کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ملک کی دو بچھڑی ہوئی قوموں کے درمیان اتحاد کی سعی فرماتا ہے۔ اور حضرت اقبال ہمالیہ کی بلند و بالا پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر اپنی بانگ درا بلند کرتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا   وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو   اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا   ہندی ہیں ہم۔ وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما مٹ گئے جہاں سے   اب تک مگر ہے۔ باقی نام و نشاں ہمارا

اور یہ پھر وہ ہندی بچے کی توتلی میٹھی اور رس بھری زباں سے کہلواتا ہے۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا   نانکؒ نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا   جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا   سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا   ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے   پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے   میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا   نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا   جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے۔ میرا وطن وہی ہے

اقبال اتحاد پرور گیت گا کر اب ہندو مسلمانوں کو شاطران یورپ کے بچھائے ہوئے ہمرنگ زمین جال سے نکالنے کی سعی فرماتے ہیں۔

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے   دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

اور وہ دشمن کے جادو کو اسم اعظم پڑھ کر مٹاتے ہیں۔ اور ان دو بڑی فریب خوردہ قوموں پر راز منکشف کرتے ہیں۔

نشان برگ گل تک نہ چھوڑا اس باغ میں گلچیں نے   تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

اور وہ آگے فرماتے ہیں:۔

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے   عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

پھر آپ اہل وطن کو کچھ کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ زمانے کے قیامت خیز رنگ کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں۔ زمانہ بقول حضرت شاہ دین ہمایوں مرحوم کے —

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

فرماتے ہیں :۔

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر زمیں پر تُو ہو۔ یہ تیری صدا ہو آسمانوں میں

حضرت اقبال کا ارشاد ہوتا ہے کہ اے مادر وطن کے نا اہل و بے غیرت سپوتو۔ اے نالائق فرزندو! اگر تم نے زمانہ کی نبض کو صحیح طور پر نہ پہچانا۔ تم نے وقت کی آواز پہ کان نہ دھرا۔ تم نے قافلہ سالار کی بانگ درا کو سُن کر اپنی منزل کی طرف قدم نہ بڑھایا۔ تو یاد رکھو تمہارا حشر بُرا ہوگا۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اور آگے ارشاد ہوتا ہے کہ قانون فطرت یہی۔ قدرت کا آئین یہی ہے۔ جو قوم زمانہ کی دوڑ میں شریک اور شامل ہوگی۔ جو ملت اس میدان کارزار میں موجود ہوگی۔ جو فرقہ رفعت گردوں میں پرواز کرنے کے لئے رزم میں سرگرم ہوگا۔ جو جتھہ ملی جدوجہد میں شریک ہوگا۔ وہ دُنیا کی نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ وہ کائنات ارضی میں سرفراز کیا جائے گا۔ اس کے سر پہ طرہ امتیاز و فضیلت رکھا جائے گا۔ اور وہی قوم دُنیا میں خلیفہ ارض کہلانے کی حق دار ہوگی۔ یاد رکھو تمہارے سامنے دنیا کی بہتیری عبرتناک و درد بھری حکایات موجود ہیں۔ تم تواریخ روما کو اُٹھا کر دیکھو جولیس سیزر۔ پمپی وغیرہ کے شاندار محاربات و کارناموں پہ نگاہ ڈالو مشاہیران یونان سکندر اعظم و افلاطون حکیم کی شہرت پہ نظر کرو۔ بابل کے جلیل القدر فرمانرواؤں کی داستانیں بغور پڑھو۔ اور آج ان کی عظمت کا پتہ باب البابل سے لگاؤ جس کے کھنڈرات آج بھی زینت دنیا میں موجود ہیں۔ سری رام چندر جی۔ سری کرشن جی کے نام لیواؤں کی پست ذہنیت پہ جھلکتی ہوئی نگاہ ڈال کر ان ہردو بزرگان ہندوستان کے یادگار کارناموں کو جوش عقیدت سے پڑھو۔ فرعون

مصر اور تاریخ مصر پر بھی غور کرو۔ کیا اہرام مصری کی تیار کرنے والی قوم غیر ترقی یافتہ ہوگی۔ کیا یہ قوم موجودہ ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے ہوگی نہیں۔ تو پھر یہ قومیں کیوں صفحۂ ہستی سے مٹادی گئیں۔ قدرت کیوں ایسے جوش میں آگئی جو ان کو حرفِ غلط کی مانند مٹا کر رکھ دیا۔ جب تک یہ قومیں کائنات کے طول و عرض پر سرگرم عمل رہیں جب تک دنیا میں ان کے اعمال عمدہ رہے جب تک یہ ملتیں زمانہ کی کسوٹی پر پوری اُترتی رہیں۔ کائنات کے گوشہ گوشہ میں ان کا نام جپا گیا۔ ان کا کلمہ پڑھا گیا۔ اور جب یہ قومیں عمل وجہد کی صلاحیتیں کھو بیٹھیں تو وہ ختم کر دی گئیں۔ اور نئی سرگرم عمل قوم کو ان پر حاوی وطاری کر دیا گیا۔ آج انگریزوں کی ترقی کا کیا راز ہے۔ امریکہ کا دنیا میں کیوں بول بالا ہے۔ روس کیوں سرفراز کیا جارہا ہے۔ تو اس کا جواب صرف عمل وجہد ہے۔ آج ہماری آواز کیوں نہیں سُنی جاتی ہمیں کیوں وقعت نہیں دی جاتی۔ صرف عمل وجہد میں سرگرمی نہ دکھانے کی وجہ سے۔ سُنیئے حضرت اقبال اس بڑے مسئلہ کو۔ اس وسیع عقدہ کو۔ اتنے بڑے دفتر کو۔ دنیا بھر کی مختلف قوموں کی سزا وجزا کو ایک شعر میں قلم بند کر کے رکھ دیا ہے۔

یہی آئینِ قدرت ہے۔ یہی اسلوبِ فطرت ہے   جو ہے راہِ عمل میں گامزن وہی محبوبِ فطرت ہے

لیکن یہاں نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ ہندوستان میں ایک نیا سماں بندھ رہا ہے۔ اغیار کے پراگندہ کے زیر اثر برادرانِ وطن سرگرم پیکار ہیں۔ اور مسلمان بھی جوابی کارروائیوں میں منہمک ہیں۔ اور وطن عزیز کا خدا ہی حافظ۔ وہ چلّا اٹھتے ہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے   تری بربادیوں کے چرچے ہیں آسمانوں میں

کیا آج کوئی ایسا بدبخت ہندوستانی ہوگا جو اس جلیل القدر رفیع الشان حکیم مشرق حضرت شیخ محمد اقبال جنت مکیں کی سرگرمیوں کو عقیدت بھرے دل سے نہ سراہے گا۔ کیا برِاعظم ایشیا کوئی ایسی مثال اس بت بڑے محبِ وطن شاعر کے ہوتے ہوئے پیش کر سکے گا۔ کاش آج حضرت اقبال کے پیغام وکلام کو بغور پڑھا اور بگوش ہوش سُنا جائے تو آزادیٔ ہند کا مسئلہ آنِ واحد میں حل ہو جائے۔

صراطِ مستقیم

(از جناب ڈاکٹر اسلم عمر صاحب)

صراط مستقیم کی تعریف ہے ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یعنی ان لوگوں کی راہ عمل جو اللہ کے انعام و اکرام سے سرفراز ہوئے"۔ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۔ یعنی صاحبان عظمت و جلالت حضرات انبیائے کرام کے بعد وہ مومنین مجاہدین جنھوں نے اپنے عمل سے اپنے ایمان کو سچ کر دکھایا ۔ اسلام کے وہ عساکر جو شہدائے مقربین کی بلندی پر فائز ہوئے اور وہ غازیان صالحین و متقین جو اپنے عمل سے حیات قومی کی آبیاری کرتے رہے ۔ (عمل صالح ۔ وہ عمل جو معاون حیات ہو) ۔

وراثت ارضی، حکومت و سلطنت ایسے ہی صالحین کے لئے مقدر رہتی ہے ۔ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ جس قوم میں اس نعمت عظمیٰ کی قدر و حفاظت کی اہلیت و صلاحیت نہیں باقی رہتی ۔ جن سے سپاہیت و شجاعت ضائع ہو جاتی ہے وہ اس نعمت و کرامت سے محروم کر دیئے جاتے ہیں ۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقت و زمانہ شاہد ہے واقعات زمانہ و تاریخ عالم گواہ ہیں کہ قدیم سے دستور و قانون خداوندی یہی رہا ہے کہ صرف ایمان و اعمال صالح والی قومیں عزت و کامرانی اور عظمت و فلاح کی حامل رہی ہیں ۔ خدا نے اسی قوم کی نصرت فرمائی ہے جس نے بہتر و منظم تر سپاہیانہ و مجاہدانہ زندگی اختیار کی

جو ہمہ وقت اپنی حفاظت اور دشمن کے مقابلہ کے لئے ہوشیار و طیار رہی۔ الیسون کے سوا باقی تمام سست اور غفلت زدہ لوگ ہمیشہ نقصان و خسران میں رہے۔

خداوند بے نیاز کسی قوم سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا نہ کسی کی بے جا رعایت و مروت کرتا ہے۔ اس کا دستور اٹل ہے۔ وہ سریع الحساب ہے جَزَاءً وِّفَاقًا اس کا قانون ہے۔

اسلام کی مطلوب ایک سپاہیانہ شان کی قوم تھی۔ صراط مستقیم میں عسکریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے جیسے خارج کر دینے سے صراط کی پختگی و ہمواری مضبوطی و خوشنمائی قائم نہیں رہ سکتی۔ رومی فرماتے ہیں

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ   مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

مگر ان دونوں کا ایک مدت سے مبادلہ ہو گیا ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

ہم نے اپنی عسکریت کو جلا وطن کر دیا ہے۔ ایسا کہ آج کے ۰۰۰۰۰ دارالاسلام میں بھی اس کا نام نہیں لیا جاتا۔ تحریک طلیجہ تک اس میں بار نہیں پا سکی۔ ایک بہت زیادہ لکھنے والے حضرت کو بیک وقت دو یک قلم جہاد کی عظمت اور عسکریت کی مخالفت تعلیم کرتے دیکھا گیا ہے۔ دوسرے حضرات صرف جہاد کی بڑائیاں لکھ دیا کرتے ہیں۔ یہ حضرات عمداً و مصلحتاً ایسا کرتے ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ ہراکری صرف جاپانی حیوانوں کے درمیان محمود چیز ہے۔ اسلام میں خودکشی کی تعلیم غداری کے برابر ہے خواہ اس کے ارتکاب کی جگہ میدان جنگ بتائی جائے۔

قرآن عظیم فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ تعلیم فرماتا ہے۔ عسکری تنظیم و تربیت اول و مقدم چیز ہے۔ اس سے روکنے والے۔ اپنے اغراض کی خاطر مسلمانوں کی جنگی اہلیت و قابلیت سے عمداً محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے سنہری زمانہ میں ہر شخص سپہ گری سیکھتا اور تلوار زیب کمر رکھتا تھا۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی ایک تحریر میں یہ اعلیٰ ارشاد گرامی پیش کیا ہے:" میں

قیامت کے نزدیک تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں کہ خدائے واحد کی عبادت کی جائے میرا رزق میرے نیزے کے سایہ کے نیچے بنایا گیا ہے۔ جو میرے امر کی مخالفت کرے گا وہ ذلیل وخوار کیا جائے گا۔" شاعر اسلام ترجمان حقیقت فرماتا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام — میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

خون دل وجگر سے ہے سرمایہ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

غازی اعظم اتاترک نے دنیائے اسلام کو پیغام بھیجا تھا کہ دنیا میں اگر عزت سے رہنا ہے تو فاروق اعظمؓ کی لازمی عسکری تنظیم و تربیت کو واپس لانا ہوگا۔ واجب یہ ہے کہ سپہ گری کی تعلیم سولہ سال کی عمر سے شروع ہو جائے۔ اور زائد عمر والوں کے لئے اس تعلیم کے نائیٹ سکول قائم کئے جائیں۔ مسلمان کثرت سے فوجی خدمات حاصل کریں۔

(غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ) یہود خدا کے غضب کا محل اس لئے بنے کہ وہ ارشادات عالیہ کی نافرمانی کرتے اور صحیح عبادت و اطاعت کی نصیحت فرمانے والوں کو قتل کرتے تھے۔ کیا ہندوستان کے مسلمان بھی صرف بنی اسرائیل کو مغضوب علیہم سمجھتے رہیں گے؟ کیا ہماری اپنی روش بھی ویسی ہی نہیں ہے؟ کیا ثَمَنًا قَلِيْلًا والے فتوؤں سے یہود کی تلوار کا مقصد حاصل کرنے کی فکر نہیں کی جاتی؟ ..... خود اپنی ذلت ومسکنت کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس کا تعلق بھی خدا کے غضب سے ہے یا کسی اور بات سے؟

یہود نے عُزَیر کو اور نصاریٰ نے مسیح کو ابن اللہ کہا۔ شرک الوہیت خیال

کیا اور اپنے احبار و رہبان کو ارباب مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنایا اس لئے وہ ضال و گمراہ ہوئے۔ کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ہم بھی صرف اُن ہی کو ضالین سمجھیں؟ ... ابن اللہ نہ سہی کیا ہم نے غیر خدا کو اپنا حاجت روا و مشکلکشا نہیں سمجھ رکھا ہے؟ کیا ہم نے بھی اپنے احبار و رہبان کو ارباب نہ سہی موالی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ نہیں بنا لیا ہے؟ کیا ہم انہیں ربّی کی جگہ مولائی و مولانا نہیں کہتے؟ کیا ہم اُن کے قولوں فتووں کو قابل ترجیح نہیں سمجھتے؟ کیا ہم نے اپنے قرآن کو اُن کی توریت کی طرح مہجور نہیں کر دیا ہے؟ کیا اُن کی مانند ہمارا واسطہ بھی صرف اپنے تالمود سے نہیں رہ گیا ہے؟ حالی فرماتے ہیں۔

نبوت نہ گر ختم ہوتی عرب پر   کوئی ہم پہ مبعوث ہوتا پیمبر
تو ہے جیسی مذکور قرآں کے اندر   ضلالت یہود اور نصاریٰ کی اکثر

یونہیں جو کتاب اُس پیمبر پہ آتی
وہ گمراہیاں سب ہماری جتاتی

کیا اس میں کسی کو بھی کلام ہو سکتا ہے؟ مذکورہ بالا ارشاد عالی کے سلسلہ میں خصوصیت سے مسلمانوں کو مخاطب فرما کر کیوں اس طرح خبردار کیا جاتا ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اِنّ کثیرًا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل وَیصدون عن سبیل اللہ مسلمانو۔ ہوشیار رہو کثرت سے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) ایسے ہیں جو دوسروں کا مال ..... ناحق طور سے کھاتے اور لوگوں کو صحیح راہ عمل پہ چلنے سے روکتے ہیں؟ اور یہ شدید صورت کی تنبیہ کیسے فرمائی گئی۔ یعنی — ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد .... ولھم عذاب عظیم۔ لیکن باوجود ان فہمائشوں اور تنبیہوں کے ہمارا طرز عمل کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں

جو ہمارے پیشرو یہود کا تھا؟

دل بے قید من با نور ایماں کافری کردہ   حرم را سجدہ آوردہ بتاں را چاکری کردہ

حفظ کیجئے ایک علامہ کی اس اعلیٰ تفسیر کو۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ.....

"اور اے محمدؐ سب سے بڑا احسان جو ہم نے تم پر اور تمہاری قوم پر کیا ہے یہ ہے کہ ہم نے سورہ فاتحہ کی بار بار دہرائی جانے والی آیتوں کا اہم اور عظیم الشان نصب العین پیش کر کے تمہاری قوم میں حصولِ نعمت اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ایک لازوال ترغیب و تحریک پیدا کر دی ہے۔ اُن کے دلوں میں اس نعمت کے حصول کے ولولے پیدا کر دیے ہیں۔ اُن کے اندر اس دنیا میں قوت و زور کے ساتھ رہنے اور ہلاک شدہ قوموں کی طرح مغضوب علیہ اور ضالین نہ بننے کا ایک دائم و قائم ہیجان پیدا کر دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ ہم نے تم کو قرآن عظیم بھی دیا ہے جس کے اندر اس صراط مستقیم پر چلنے کا مکمل.... دستور العمل درج ہے۔ یہی وہ نصب العین ہے جس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین نہیں۔ یہی وہ معزز و محمود صراط ہے جس سے مستقیم تر کوئی صراط نہیں۔ اسی کو ہر دم پیش نظر کر دینے کے لئے سبع مثانی کا ہر نماز میں دہرانا ہے۔ توحید کا اصل اصول یہی اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے الفاظ میں اسی سورۃ کے اندر ہے۔ اسلام کی تمام و کمال تعلیم اِهْدِنَا سے لے کر الضَّآلِّيْنَ تک کے الفاظ میں مضمر ہے جس قوم نے سورۂ فاتحہ کے مطلع نظر کو پا لیا اور پھر وہ اُس پر عامل ہو گئی اُس کو فلاح دارین قطعاً حاصل ہے"

کسی مفتوح و محکوم خطہ میں کوئی جماعت کامل صورت سے مسلم نہیں رہ سکتی اُس کے دین و دنیا سب ناقص اور کم و بیش بالکل ناقص، اگرچہ اُس کے افراد خود ستائی میں ہزار داستانی کرتے

رہی محکوم قوم مومن کے درجہ پر کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ یوں اپنی زبان سے اُس کے فرزند خواہ نبی و مہدی بنتے رہیں
أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ. أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ اللہ تعالیٰ اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب دیکھنا چاہتا ہے مسلم و مومن حقیقت
میں صرف وہی لوگ ہیں جو آزاد و حکمران ہیں (ع مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے) اور اس زمین پر
خدا کے سب سے بڑے انعام و اکرام سے سرافراز ہیں (مگر یہ سرافرازی کسی غیر سپاہی قوم کو نہیں حاصل ہوتی)

وجود اُن ہی کا طواف بتاں سے ہے آزاد   یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

محکوم قوم کا اسلام ایک نواب معذور و بے ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔

از خواب گراں خیز

ایں نکتہ کشایندۂ اسرار جہان است   ملک است تن خاکی و دیں روح روان است

تن زندہ و جاں زندہ ز ربط تن و جان است   با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز

از خواب گراں خیز

لیکن اس خیز و برخیز پر عمل صرف وہی کر سکتا ہے جو اُس کے قواعد و ضوابط سے واقف ہو۔ اُس کا علم حاصل
کیسے ہو درۂ اعلیٰ تعلیم و تربیت والوں کے مقابلہ میں وہ لوگ جو الف بے تک نہیں جانتے ترکاری سے
زیادہ کیا ثابت ہو سکتے ہیں۔ آزادی و حکمرانی۔ طاقت و عزت صرف عسکریت کے بطن سے پیدا ہو سکتی ہے

ما چشم عقاب و دل شہباز نداریم   چوں مرغ سرا لذت پرواز نداریم

اے مرغ سرا خیز و پریدن دگر آموز

وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

—— ۰ ——

سوئی اور قینچی کا مقدمہ

(از جناب ایس۔ ایم سعید بشیر قصوری)

ایک تھا درزی۔ اس کے دو بڑے پیارے اوزار تھے۔ سوئی اور قینچی۔ ایک دن کیا ہوا کہ درزی نے کام کرتے کرتے کہیں قینچی کے اوپر سوئی رکھ دی۔ قینچی کو اس بات پر بہت غصہ آگیا اور وہ سوئی سے بولی: "ذلیل کہیں کی۔ دور ہو۔ پرے ہٹ۔ خدا کی شان تجھ موئی کو بھی اتنی مجال ہوئی کہ جھٹ سے میری پیٹھ پر سوار ہو گئی۔"

سوئی نے جواب دیا: "بہن خفا نہ ہو اس میں میرا تو کچھ قصور نہیں ہے ویسے ہم دونوں ہی اپنے آقا درزی میاں کے اوزار ہیں پھر بڑائی اور چھٹائی کیسی"۔ اب قینچی کا غصہ آسمان پر چڑھ گیا اور اسکی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی بولی "چھوٹا منہ اور بڑی بات اسی کو کہتے ہیں پہلے اپنی اوقات پر غور کرو پھر میرے منہ لگنا بھلا تمہارا میرے ساتھ کیا مقابلہ اگر میں نہ ہوں تو درزی میاں کی ساری کاریگری دھری رہ جائے"۔ اب سوئی کو بھی غصہ آگیا اور جو کچھ اسکے منہ میں آیا کہنے لگی ذرا سی بات کا بتنگڑ بن گیا۔ دونوں کا مقدمہ درزی تک پہنچا وہ جج مقرر ہوا۔ دونوں طرف کے وکیلوں کی خوب بحث ہوئی۔ جج نے سب بیانوں کو بڑے غور سے سنا۔ ہر بات پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد جج نے اپنا فیصلہ سنایا کہ قینچی اور سوئی دونوں ہی میرے محبوب اوزار ہیں یہ بالکل سچ ہے کہ میں قینچی کے بغیر کپڑے نہیں کاٹ سکتا لیکن اگر میرے پاس سوئی نہ ہو تو قینچی سے کپڑے کاٹنا ہی بیکار ہے قینچی کا کرا دھرا یونہی پڑا رہ جائے۔ خاندانی بڑائی دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ عدالت کی رائے میں کام کی حیثیت سے سوئی کا درجہ قینچی سے کہیں زیادہ بلند ہے کیونکہ قینچی کا کام تو صرف کاٹنا ہے لیکن سوئی کا کام ہے کٹے ہوئے کو جوڑنا۔

پس میرے عزیز نونہالو! تم سوئی بنو قینچی نہ بنو۔ دلوں کو توڑنا تو بڑا آسان کام ہے لیکن ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ہی اصل انسانیت ہے۔ تم اس جوہر انسانی سے محروم نہ رہو۔ ہمیشہ یاد رکھو۔

تو برائے وصل کردن آمدی ۔ نے برائے فصل کردن آمدی ۔

تنقید و تبصرہ

دربارِ رسولؐ کے فیصلے :- تالیف عبداللہ محمد بن فرج المالکی ۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ ۔ طباعت کتابت دیدہ زیب ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے ۔ پتہ ۔ اقبال اکیڈمی ۴۵ الف سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے اولو حضرات انبیاء و رسل کی جو بحکم قرآن ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کے عذاب سے ڈرانے ۔ اس کے انعامات کی خوشخبری سنانے ۔ اس کی طرف بلانے اور خود ساز و باطل معبودوں سے ہٹانے کا مقصد لے کر اس عالم ناسوت میں پے درپے تشریف لاتے رہے ہیں ۔ تعلیمات و احکامات کا مطالعہ کرنے والے اس سے بے خبر نہیں کہ ان کی اصل شریعت بلاشبہ خدا کی توحید و ربانیت اور کفر کی ان گمراہیوں اور فتنہ سامانیوں کا استیصال تھی جن میں یہ ساری مخلوق الٰہی عمومی طور پر مبتلا تھی لیکن نہیں مانا جا سکتا کہ ان برگزیدہ پیغمبرانِ برحق کا کام محض اتنا اور ان کا مقصد صرف ابتدا کی ان چند چیزوں میں محدود تھا ۔ وہ خدا کو خدا اور اپنی خدائی میں اسے کسی شریک و رفیق سے بلند منوانے ، انسانوں کو بت بتکدہ کی اطاعت سے ہٹا کر صحن حرم میں سربسجود کر دینے اور دیر و کلیسا کی فلک بوس عمارتوں کو ڈھا کر ان کی جگہ مسجد و مدرسہ بنا ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ خدا کو ایک منوانے ۔ اس کو قضا و قدر ، موت و حیات ، صحت و علالت ، رزق و تنگدستی ، ہر اچھائی اور برائی اور ہر بلندی اور پستی پر قدرت رکھنے والا بتانے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس ہستی برتر و بلند کی اطاعت پر مجبور ہو ۔ اس کے احکامات کی پابندی پر تیار ہو

تمدن و تہذیب اور معیشت و معاشرت میں اسی کے بتائے ہوئے قوانین پر چلے اور اپنی زندگی کے ہر معاملہ اور ہر ضرورت میں اسی رہنمائے برحق سے درخواست رہبری کرے، اور اس طرح ایک پر امن اور صالح نظامِ زندگی پرورش پا سکے۔ ایک نیک اور بے ریا عالم انسانیت وجود میں آسکے۔ انسان کو انسان پر بیداد کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ زیردست زبردست کی ستمرانی سے محفوظ رہے۔ مرد عورت پر بے جا تشدد نہ کرے۔ ایک کو دوسرے پر سختی کرنے کی جرأت نہ ہو۔ باہمی حقوق برقرار رہیں اور سب کی ضرورتیں اپنے وقت پر اپنے اندازے میں پوری ہوں۔ یہی ہر سچے مذہب کی تعلیمات کا ملخص ہے اور یہی ہر الہامی شریعت کا منتہائے نظر۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی اور آپ کی لائی ہوئی شریعت چونکہ انسان کے لئے آخری دستور زندگی ہے۔ اس لئے خود آنحضرتؐ نے بھی اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے مردانہ وار جدوجہد کیں۔ ان کی شریعت میں باہمی قیام امن اور استیصال فتن پر زور دیا گیا اور اعمال و معاملات کے تمام متفرق جزئیات کو چن چن کر ایک نظامِ زندگی میں باندھنے کی کوششیں ہوئیں۔ یوں اللٹپ اعتراض کر دینے کا کوئی علاج نہیں اور ان لوگوں کی دریدہ دہنی کو بند کرنے کی اب تک کوئی تدبیر تلاش نہیں کی جا سکی جنہیں کسی معاملہ اور کسی مسئلہ کے تمام بیرونی اور اندرونی پہلوؤں پر نظر ڈالے بغیر محض مخالفانہ اعتراض کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور شریعت اسلامی کی ساری تفصیلات پر کوئی نظر رکھتے ہیں وہ مانتے ہیں کہ مسلمان کو صرف مسجد میں پنج گانہ حاضری دینے اور آٹھوں پہر اللہ اللہ کے وظیفے پڑھتے رہنے کے قابل نہیں بنانے کا ارادہ کیا گیا بلکہ اسے اخلاق و تہذیب کی بھی ایسی مفید اور مؤثر تعلیم دی گئی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کے لئے رحمت، اپنے گھر کے لئے نیکی اور بھلائی کا ایک پیکر اور اپنے ماحول کے لئے سرتاسر ایک سکون۔ ایک راحت، ایک فخر اور ایک امتیاز بن سکے۔ ما سوائے اسلام سوسائٹی کی ان خرابیوں اور تمدن کے

ان فسادات کو پکڑنے اور پانے میں بڑی تیز نظر رکھتا ہے اور وہ دبی اور چھپی ہوئی نیکیوں اور نکوکاریوں کے تمام اچھے جذبوں کو ابھار دینے اور سنوارنے میں بھی یکتا ماہر ہے۔ اس لئے اس نے ہر برائی کے استیصال کے لئے بڑی مؤثر دفعات قائم کیں اور ہر اچھائی کو باقی رکھنے میں کوشاں ہوا۔ یہ صرف ایک دعوے نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے زنا، چوری، ڈاکہ، قتل، غصب، دھوکہ دہی، جعل سازی اور آپس کے تمام تنازعات وخصومات کو روکنے کے لئے جو قوانین بنائے اور ان قوانین کو نافذ کرنے میں اپنی جس جرأت اور جس حاکمانہ طاقت کا ثبوت دیا اس کی مثال کوئی مذہب نہیں لا سکتا۔ یہ دنیا بگڑتے اور بنتے رہنے کا نام ہے۔ یہ ضرورتوں کی جگہ اور ضرورتوں کے موافق ایجادات عمل میں لاتے رہنے کا مقام ہے۔ فطرت انسانی نے جب پستی اور گنہگاری کی طرف رخ کیا۔ جب چوری کر کے دوسروں کا مال چھین جھپٹ لینے کا شوق پیدا ہوا جب زنا کی شکل میں خواہش نفس کو پورا کرنے کا مذموم ارادہ ہوا۔ جب دھوکے دے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے طریقے عمل میں لائے گئے۔ جب قتل وغارتگری کے ذریعہ انتقام کی آگ بجھانے کی کوششیں ہوئیں۔ جب انسان مار دھاڑ اور فتنہ وفساد پر بے دھڑک مائل ہوا تو ہر تہذیب اور ہر مذہب نے اسے روکنے اور حدود امن وانسانیت سے باہر نہ جانے دینے کی اپنے اپنے طور پر کوششیں کیں۔ ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر حکومت فوجداری اور دیوانی کا کوئی نہ کوئی قانون رکھتی ہے۔ چاہے وہ نامکمل اور ضرورت کے لحاظ سے کتنے ہی نامکمل سہی لیکن بہرصورت ان کی موجودگی اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ان برائیوں پہ مائل ہونا انسان کی فطرت ہے۔ اور ان برائیوں کو امن عالم کے لئے مضر اور انسان کے باہمی تعلقات کے لئے بے حد مضر جان کر ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر حکومت انہیں مٹانے اور دبا دینے کی کوششیں کرتی رہی ہے۔

قرآن۔ حدیث اور فقہ چونکہ مسلمانوں کے لئے قرآن کی آیات و محکمات محض قطعی اور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و احکامات، ان کی زندگی کا ہر کام۔ ان کا ہر فعل اور ہر قول ایک
اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہے اس لئے شروع سے علمائے اسلام اور مسلمانوں کے ذمہ دار حضرات
نے ان آثار و انشانات کی محافظت و مزاولت کے فریضہ کو اپنے ذمہ رکھا اور بڑی تن دہی سے
اپنے کام میں لگے رہے۔ ہر زمانہ میں قرآن کے ترجمے اور تفسیریں لکھنا۔ اس کے مفہوم و معانی
کو واضح اور متعین کرنے کے لئے زبردست علمی خدمات انجام دینا اور درس و تدریس کے علاوہ
خطبات و اذکار کی شکل میں بار بار اسے پیش کرتے رہنا۔ نیز اسی طرح احادیث کے تمام
ذخیرہ کو مرتب کرنا اور اسے اپنی ہر ہر ضرورت میں ہر ہر وقت کارآمد بنانے کے لئے اس پر
شرحیں لکھنا۔ تقریریں کرنا۔ حدیث کے ایک ایک لفظ کو جمع کرنے کے لئے سینکڑوں میل
کے سفر کرنا اور قرآن کے ایک نکتہ کو جاننے کے لئے مسافرانہ زندگی کے صبر آزما مصائب
کو بخوشی لبیک کہنا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا رہا کہ قرآن و حدیث کے یہ تمام ارشادات باقی
رہیں، اور مسلمانوں کی بڑی بڑی ضرورتوں سے لے کر معمولی حاجتوں تک کے لئے نیز سیاست
و حکومت کے اسرار و غوامض سے لے کر ان کے گھر کے رہن سہن تک قرآن و حدیث نے
جو رہنمائی فرمائی ہے وہ اپنے معنی و لفظ کی تمام خوبصورتیوں اور باریکیوں کے ساتھ محفوظ
رہے۔ مذہب ہمیشہ وہی باقی رہتا ہے جس کی پشت پر مضبوط تعلیمات و قوانین کی ایک قوت
اور صحیح عملی اور صحیح فکر کی ایک طاقت موجود ہو۔ وہ مذہب مذہب نہیں جسے فکر انسانی نہ قبول
کر سکے، اور نہ وہ شریعت شریعت ہے جسے شارع نے خود عملی طریقہ پر واضح نہ کیا ہو۔ علمائے
اسلام نے مذاہب کی زندگی کے اس سب سے پہلے اور سب سے بڑے نکتہ کو شروع سے
پہچانا ہے، اور ضرورت کے لائق وہ ہمیشہ سے ان قوتوں کو جمع کرنے کی سعی کرتے رہیں۔ بلاشبہ

قرآن، حدیث اور ان دونوں کو ملا کر فقہ اسلامی کے جو مسائل وضع کئے گئے ۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسی چیز رہ گئی ہو جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو اور مسلمانوں کی کوئی ایسی ضرورت نہیں جو ان میں مذکور نہ ہو۔ یہ تینوں ذخیرے اتنے مکمل اور جنبتی طور پر الگ الگ ہونے کے باوجود اپنی اصل میں ایک دوسرے سے اس طرح ملے جلے ہوئے ہیں کہ ان تینوں کو ہر طرح مسلمانوں کو سنبھال لینے کی طاقت بھی حاصل ہے اور یہ مل کر بھی کہ وہ الگ الگ ہونے کے باوجود مسلمانوں کو اپنے اندر ہی رکھتے ہیں باہر نہیں جانے دیتے کہ دراصل فقہ کی ساری ترتیب قرآن و حدیث سے ہوئی اور حدیث کا سارا ذخیرہ ایک طرح قرآن کی تفسیر ہے۔

لیکن یہ کوشش اپنی جگہ بے حد کامیاب، بصیرت افروز اور مکمل ہے کہ مختلف قیہ معاملات اور مسلمانوں کے باہمی مقدمات و خصومات میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بزمانہ حیات جو فیصلے صادر فرمائے ان سب کو حدیث و سیرت کے لٹریچر سے الگ ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ حضرت الفاضل الافخم مولانا سید سلیمان ندوی کے حسب تحریر اس طرح کی خاص کوششیں دو ہوئیں۔

(۱) امام ظہیر الدین مرغینانی حنفی المتوفی [illegible]ھ کی کتاب اَقضِیَۃُ الرَّسول صلے اللہ علیہ وسلم۔

(۲) عبداللہ محمد بن فرج المالکی القرطبی کی کتاب اسی پہلے ہی نام پر یہ دوسری کتاب الحمد للہ اقبال اکیڈیمی لاہور کی اولوالعزمی اور فرض شناسی کی بدولت عربی سے اردو میں منتقل ہو کر اب شائع ہو چکی ہے اور اس طرح اردو دان حضرات کو یہ نعمت ملی ہے۔

"دربارِ رسول کے فیصلے"۔ اردو میں اس کتاب کا نام "دربارِ رسول کے فیصلے" ہے اور یہ بڑے سائز کے دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مصنف نے حدیث و تفسیر کی تقریباً [illegible]

کتابوں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ تمام ارشادات دو سو کی تعداد میں یکجا جمع کر دیئے ہیں۔ یہ سب چیزیں ایسے سادہ و صاف طریقے پہ بیان ہوئی ہیں کہ پڑھنے والے کو اصل موضوع کے سوا کسی اور موضوع کے مضامین پڑھنے اور قدم قدم طرز تحریر کی ایک ناگوار طوالت اور ابہام سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس مجموعہ میں جہاد، نکاح، زنا، طلاق، بیع و شری، وصایا، قضیہ، قتل ان موضوعات پر آنحضرت کے فیصلے جمع کئے گئے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان چیزوں کا صرف ایک دفعہ پڑھ لینا ہی نہیں بلکہ انہیں دل سے ماننا اور اپنے معاملات میں ان فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہر مسلمان کے لئے دینی اور دنیادی طور پہ بہت بڑی سعادت کا موجب ہے

فقہ اسلامی میں چونکہ شروع سے چار مذاہب ہیں۔ ایک امام اعظم ابوحنیفہؒ کا۔ دوسرا امام مالکؒ کا۔ تیسرا امام احمد ابن حنبلؒ کا۔ چوتھا امام شافعیؒ کا۔ رحمتہ اللہ علیہم اجمعین۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ قرآن و حدیث سے مسائل کے استخراج و استنباط میں ان حضرات کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ہے جو ان کے متبعین میں ان کی بے بصری اور کج فہمی کی بنا پر ذاتی مخالفت و مناقشت کی صورت بھی اختیار کر گیا۔ بقول حافظ شیرازیؒ ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

یہ واقعہ ہے کہ ہر فروعی اختلاف منتظر ملت اسلامیہ کو الگ الگ جماعتوں اور فرقوں میں متفرق کر گیا۔ اس کی قوت منتشر اور مرکزیت فنا ہو گئی۔ بڑے بڑے تعلقات ان فقہی تعلقات پر قربان ہوئے اور بڑے بڑے فرائض سے ان اختلافات کے پردہ میں کوتاہی روا رکھی گئی اس لئے ہم مصنف کی اس کوشش کو اس سلسلہ میں بھی ایک اہم خدمت سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تا بمقدور مختلف مسائل و معاملات اور مقدمات و خصومات میں شارع علیہ السلام کے فیصلے ہم تک پہنچا کر کم از کم اس حد تک تو ہمارے اختلافات کو ختم کیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ

جتنے معاملات کے متعلق اس کتاب سے یہ ثابت ہوگیا کہ ان میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا ان میں اب امت کے لئے اختلاف اور شبہ کا دروازہ بند ہوگیا۔ ہم جہاں اقبال اکیڈیمی کو ان کی اس علمی کاوش پر تبریک و تحسین کا مستحق سمجھتے ہیں وہاں مولانا سید محمد شاہ ایم۔ اے اور تمام کارکنان اقبال اکیڈیمی بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ عریانی اور فحاشی کے اس دوَر ادب میں مسلمانوں کو زندہ رکھنے کے لئے ایسا قیمتی لٹریچر چھاپ رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ان کی بہت بڑی اسلامی خدمت ہے جس پر میں اپنے آپ کو اس اظہار حق پر مجبور پاتا ہوں کہ اقبال اکیڈیمی اس قسم کی تعمیری کتابیں چھاپ کر جن میں ادبی اور افسانوی مزہ اور ہوائے نفس کی تحریکی قوت بالکل نہیں تجارتی حیثیت سے خودکشی کا ارادہ کرتی ہے مگر اللہ کے لئے اس کی یہ قربانی یقیناً اللہ کے ہاں قبول ہوگی۔

ابو الانور سید محمد ازہر قیصر کشمیری دیوبند

مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی ایک تجویز (انگریزی) سائز ۲۲×۱۸ طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت للعہ شائع کردہ میسرز شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر اقبال اکیڈیمی سرکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

انگریزی کے مشہور اہل قلم مسٹر ایف۔ کے۔ خان درانی جنہوں نے اسلامیات پر متعدد کتابیں انگریزی میں تصنیف کی ہیں مسلم لیگ کی تعلیمی کمیٹی کیلئے تجویز کے طور پر یہ مقالہ A PLAN FOR MUSLIM EDUCATIONAL REFORM کے نام سے تحریر کیا تھا۔ اس مقالہ میں چند تجاویز ایسی ہیں جو نہایت قابل قدر اور اہل علم کی خاص توجہ کی محتاج ہیں مسٹر درانی فرماتے ہیں کہ جبتک ہم اپنی بنیادی تعلیم میں صنعت و حرفت اور تجارت کو لازمی مضامین کی حیثیت سے شامل نہیں کریں گے ہماری ترقی کے امکانات بہت کم ہیں۔ درانی صاحب دلائل نہیں کی زبانی سُنئے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو سنوارنے کیلئے ابتک جس قدر تجاویز پیش کی گئی ہیں اُن میں درانی صاحب کی تجاویز معقول ترین اور مفید ترین ثابت ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ کتاب ہمارے اُس طبقہ میں پہنچے جو تعلیمی سکیمیں بنانے میں مصروف ہے نیز سکولوں اور کالجوں کے ہیڈماسٹروں اور پروفیسروں کو ان تجاویز پر غور کرنا چاہئے۔ اس لئے ہم تعلیمی معاملات کے ارباب بست و کشاد

ہماری تازہ ترین مطبوعات

عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر قانون عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے حضور علیہ الصلوٰۃ کے زمانے کی جنگوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ عہدِ سعادت کا منظر آنکھوں کے سامنے آنے لگتا ہے۔ عہد حاضر میں مسلمانوں کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں موجودہ کتاب اُن میں بہترین ہے اگر کوئی فنڈ ایسا ہوتا جس میں سے اسلامی تاریخ پر لکھی جانے والی کتابوں پر انعام دیئے جاتے تو مجھے یقین کامل ہے کہ اس کتاب پر ڈاکٹر صاحب موصوف کو اول درجہ کا انعام دیا جاتا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

بکھرے موتی لیفٹیننٹ کرنل میاں عطاء الرحمٰن صاحب جو ریاست رامپور میں ہز ہائنس کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں بڑے خوش ذوق اور بلند پایہ ادیب واقع ہوئے ہیں آپکے ادبی مضامین اکثر رسالہ ہمایوں لاہور میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ یہ کتاب میاں صاحب کے افسانچوں کا ایک مجموعہ ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔ زبان پاکیزہ و شستہ ہے اور خیال نہایت بلند۔ تھکا ماندہ انسان تنہائی کے وقت میں اس کتاب کو لے کر بیٹھ جائے تو شگفتگی و تروتازگی بدن میں آجائے! اگر آپ کو ادب لطیف کا چسکا ہے تو بکھرے موتی پڑھیئے۔ قیمت مجلد پارچہ سنہری ڈائی والی ۱؍عہ۔ مجلد کاغذ مع گردپوش عہ ۴؍

سیدہ فاطمہؓ۔ بنت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی والدہ حسنؓ و حسینؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سیرت اور خاندانی حالات کا مرقع۔ ہر طبقہ کے مسلمان کے لئے پڑھنے کے قابل کتاب ہے قیمت مجلد مع خوبصورت گردپوش عکہ ۱۲؍

القاء الہام اور وحی۔ مولانا سید ذوقی شاہ صاحب کے قابلقدر مضامین جن میں اسلامی تصوف پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بڑی مفید اور ایمان افروز کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

شبلی نعمانی (انگریزی) ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ ڈی لٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی نے علامہ شبلی کے کام اور ان کی ذات سے متعلق ایک مختصر مگر جامع مضمون لکھا تھا جسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت آٹھ آنے

علمائے کرام کا مستقبل۔ علما کو کیا کرنا چاہئے اور وہ کیا کر رہے ہیں ۸ر
از
مولانا محمد مظہر الدین صدیقی بی اے

اشتراکیت اور اسلام۔ (ایک دلنشین موازنہ) 〃 〃 〃 ۔ ۸ر

انتخاب غالب۔ غالب مرحوم کا اپنا انتخاب۔ ۶ر

باغی مسلمان یا ہمارے ہندوستانی مسلمان (سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے بالکل صحیح اور سبق آموز حالات۔ انگریزی سے اردو ترجمہ از ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال) عـ ۱۲ر

المنبہات (عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے۔ شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف) عہ

اسلامی پارٹی کا آئین (مسلمانوں کی تنظیم نو کن خطوط پر ہونی چاہیئے۔ از مولانا عزیز ہندی) ۸عہ

ہیگل کا فلسفہ (فلسفۂ اضداد کی تشریح) ۔ از مولانا عزیز ہندی۔ ۴ر

ہندوستانی مسلمان کا نصب العین کیا ہے۔ 〃 〃 〃 ۔ ۴ر

القول الجمیل (عربی) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ عہ

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید۔ ۸عہ

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ابو القاسم رفیق دلاوری۔ ۸عہ

علامہ اقبال کی تصانیف

بانگ درا (اردو نظموں کا مجموعہ) مجلد ... ۴/۸
ضرب کلیم " " " ... ۳/-
جبریل " " " ... ۴/۸
حجاز " " " ... ۴/۸

اسرار و رموز (فارسی) مجلد ... ۱
پیام مشرق " " ... /۸
زبور عجم " " .. /۸
پس چہ باید کرد " " ... /۸

تشریحی کتب

اقبال پر ایک نظر:

علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے متعلق جس قدر بہترین مضامین لکھے گئے تھے وہ اس مجموعہ میں لے لئے گئے ہیں
مجلد ... ۲/۱۲

شرح اسرار خودی:

اسرار خودی کی بہترین شرح از پروفیسر یوسف سلیم خاں چشتی
مجلد ... ۱/۸

تعلیمات اقبال:

علامہ کی تعلیمات کا نچوڑ از پروفیسر یوسف سلیم خاں چشتی
مجلد ... ۱/۸

یاد اقبال:

علامہ اقبال کی وفات پر ہمارے شعراء نے آپ کے غم میں جو مرثیے لکھے اور بطور اظہار عقیدت جو کچھ لکھا وہ سب اس مجموعہ میں لے لیا گیا ہے۔ دیباچہ آنریبل سر شیخ عبدالقادر مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے۔ مجلد ... ۱/۸

Our English Publications

MISHKAT-UL-MASABEEH
مشکوٰۃ المصابیح

Being a collection of the most authentic speeches of the Founder of Islam and reports concerning his person, his public and domestic life and his teachings on civil and military policy etc.
Translated by Cap. A. M. Matthews Revised and edited with notes by F. K. Khan Durrani, B.A. ... 3/12

THE SPIRIT OF ISLAMIC CULTURE
by Khwaja Abdul Waheed, B.A. -/8/-

ISLAM AND AHMADISM
by Dr. Sir Mohammad Iqbal ... -/8/-

SHIBLI NUMANI (شبلی نعمانی)
His Work and His Personality
by Dr. Sayyid Mohammad Abdullah, M.A., D. Litt. ... -/8/-

Ask your copy from :

The Manager, Iqbal Academy
Circular Road, Outside Mochi Gate, LAHORE



قیمت سالانہ پانچ روپے ، قیمت فی پرچہ ۸ آنے ، قیمت پرچہ ہذا ایک روپیہ



سید محمد شاہ ایم اے

(۱) ایڈیٹر رسالہ پیغام حق، لاہور
(۲) سابق ایڈیٹر رسالہ حقیقت اسلام، لاہور
(۳) مالک اقبال اکیڈیمی، لاہور
(۴) مینیجنگ ڈائرکٹر نیو پبلشرز لمیٹڈ، لاہور
(۵) چیئرمین اقبالیہ دواخانہ لمیٹڈ، لاہور
(۶) مولف مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن، مطبوعہ پیکو آرٹ پریس، لاہور
(۷) مولف مطالب القرآن۔ (زیر طبع)
(۸) مولف و مترجم تجرید ترمذی،

★ مطالب الفرقان

قرآن پاک کے مکمل تیس پاروں کا آسان اردو میں ترجمہ ہے اور حاشیہ پر مختصر مگر نہایت ضروری تفسیر دی گئی ہے۔ یہ ترجمہ فوٹو بلاک کے ذریعے بہت دیدہ زیب انداز میں طبع ہوا ہے۔

★ مطالب القرآ…

قرآن پاک کے مکمـ…
تیس پاروں کا ا…
میں مفہوم پیش…
کرتا ہے۔ یہ ترج…
نہیں، قرآن…
اردو مفہوم ک…
مولف کا خیال…
کہ قرآن پاک کا تر…
اسی زور اور معا…
کے ساتھ پیش ک…
ناممکن ہے۔

ایڈیٹر: سید محمد شاہ ایم اے

سالانہ چندہ پانچ روپے (پیشگی)

پیغام حق

جلد ۱۴ | جنوری فروری ۱۹۴۷ء | نمبر ۱-۲

یہ رسالہ اتحاد پریس ٹمپل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین طبع ہوا اور سید محمد شاہ ایم۔ اے
پرنٹر و پبلشر نے دفتر پیغام حق نظر منزل ۔ ۱۵ ۔ نیا چوبرجی لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

گذشتہ اعلان کے مطابق "جمال الدین افغانی نمبر" کو دسمبر کے اوائل میں شائع ہو جانا چاہئے تھا لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ عزم و ارادہ تکمیل کی راہ پہ نہ آ سکا۔ اور "افغانی نمبر" قدرے تعویق سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ دنیا کے چہرے سے جنگ کی خونیں نقاب اتر چکی ہے لیکن اس کی دہشت اب تک قائم ہے۔ اس کے علاوہ امن و امان کی بنیادوں کو متزلزل کر دینا اتنا دشوار نہیں جتنا ان کو مستحکم اور استوار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت دنیا کی باگ ڈور ہے وہ ناقابل بیان ذہنی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اور ارباب علم و صحافت اس کے ردِ عمل سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے پھر جنگ کے دوران میں عام کاروبار کو اگرچہ بڑی حد تک فائدہ پہنچا لیکن رسائل و جرائد کی کشتی کچھ اس درجہ نازک واقع ہوئی ہے کہ حرب و ضرب کے تھپیڑوں سے اب تک سنبھالا نہیں لے سکی۔ چنانچہ کاغذ پر بدستور سرکاری کنٹرول ہے۔ سامانِ طباعت گراں ہے، اور عام مصارف اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ایک خالص علمی و تحقیقی مجلہ ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان سب باتوں کے باوجود "پیغام حق" ایک نئے ارادے اور ایک نئے عزم کے ساتھ سنہ ۱۹۴۷ء کے میدان میں اترا ہے۔ اور اب تہیہ کر لیا گیا ہے کہ اس سال ان تمام بے قاعدگیوں کا ازالہ کر دیا جائے گا جن کا شکار وہ مختلف وجوہ کی بنا پر گذشتہ سال ہوتا رہا۔ "پیغام حق" کو ہر مہینے التزام اور پابندیٔ وقت سے شائع کرنے کا اطمینان بخش انتظام کر لیا گیا ہے اور اب انشاء اللہ قارئین کو اس کوفت کا سامنا نہیں ہوگا جو بے ترتیبی اور بے قاعدگی کا لازمی نتیجہ تھی۔

گذشتہ سال دو ضخیم اور معرکہ آرا "اقبال نمبر" ہدیۂ قارئین کئے گئے تھے۔ ان کی کامیابی کا ثبوت وہ تعریفی

خطوط ہیں جو دفتر میں روزانہ موصول ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے متعدد رسائل و جرائد نے بھی حوصلہ افزا ریویو کئے۔ اور "پیغامِ حق" کی اس ناچیز کوشش کو تعمیری کارنامہ سے تعبیر کیا گیا۔ حکومتِ ہند کی طرف سے چونکہ علیحدہ خاص نمبر شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے یہ دونوں نمبر تین تین عام اشاعتوں کو یکجا کر کے پیش کئے گئے تھے۔ اس لحاظ سے قارئین کو گزشتہ برس "پیغامِ حق" کے صرف چھ پرچے مل سکے۔ اب چونکہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے گزشتہ سال کی جلد کو چھ نمبروں پر ہی ختم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر اشاعت سے نئی جلد کا آغاز ہوتا ہے لیکن جو قارئین بارہ مہینے کی بارہ اشاعتوں کا چندہ ادا کر چکے ہیں ان کی حق تلفی مقصود نہیں اس لئے اُن کی مدتِ خریداری میں چھ ماہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔

۱۹۴۶ء کی دھوپ سمٹ چکی ہے اور ۱۹۴۷ء کا سورج وقت کے اندھیرے غاروں سے نکل کر اپنی تجلیاں بکھیر رہا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جنگ کے بعد اب انسانیت آرام و سکون کا سانس لیتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملوکانہ مفاد کی کشمکش دُنیا کو امن و امان کے ساحل سے کبھی ہمکنار نہ ہونے دے گی۔ جب جرمنوں کی یلغار کا خنجر یورپ کے سینے میں پیوست ہو رہا تھا۔ تو اتحادیوں نے ایک بار نہیں دو بار نہیں، بیسیوں مرتبہ اعلان کیا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی دُنیا کو محکومیت اور غلام سازی کی لعنت سے پاک کر دیا جائے گا اور کونے کونے میں آزادی و جمہوریت کی روشنی پھیلا دی جائے گی لیکن ہُوا کیا؟ حریف کو پچھاڑنے کے بعد اب فاتحین آپس میں دست بگریباں ہو رہے ہیں۔ اور ہر ملک کی یہی خواہش ہے کہ لُوٹ کے مال میں اُسے زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ چنانچہ یورپ میں ایک طرف روس اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے تو دوسری طرف انگریز بھی اس میں اپنی استعماریت کے پنجے گاڑ رہا چاہتا ہے۔ اُدھر امریکہ ہزاروں میل دُور ہونے کے باوجود یہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ یورپ کا تر لقمہ اس کے تجارتی کام و دہن کی تسکین نہ کرے۔ چنانچہ وہ بھی اس پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑانے کے لئے برابر مصروفِ کار ہے۔ اقتدار و استعمار کی اس ہولناک کشمکش میں اسلامی ممالک کا مستقبل خطرات و خدشات کے ہجوم سے محفوظ دکھائی نہیں دیتا۔ جنگ کے دوران میں

سفارشات ہی پر منحصر ہے تو ہمیں خطرہ ہے کہ اس کے ارباب سیاست احمقوں کی بہشت میں خوش خرامی کر رہے ہیں۔ کاش برطانوی تدبر اب بھی ہوش کی لے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب بحر روم سے خلیج فارس تک تمام ممالک عربیہ کی تلواریں بے نیام ہو جائیں گی اور برطانوی و امریکی اقتدار ہر جگہ دم توڑتا ہوا نظر آئے گا۔ پھر وہ سیاسی و اقتصادی مراعات بھی باقی نہ رہیں گی جن کے لئے "یہود نوازی" کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔

روسی فوجیں آذر بائیجان سے رخصت ہو چکی ہیں لیکن اب برطانوی شیر نے خلیج فارس کو حریصانہ نظروں سے گھورنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۶ء میں اطلاع موصول ہوئی تھی کہ برطانیہ کے دو جنگی جہاز خلیج فارس کے ساحل پر پہنچ چکے ہیں۔ اس خبر نے تمام اسلامی ممالک میں تشویش و اضطراب کی لہر دوڑا دی لیکن ایران کے وزیر خارجہ نے حقیقت کی آگ پر فریب کے خس و خاشاک کا پردہ ڈالنے کے لئے اعلان کر دیا کہ برطانی جہازوں کے پیش نظر عراقی ساحل کی نگرانی ہے اور بس لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ ہندوستانی فوجیں ایران کی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد وزیر ایران کے لئے رائے عامہ کو دھوکہ دینے کے لئے کوئی گنجائش نہ رہی چنانچہ انہی دنوں حکومت برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے جس کے باعث ان ہندوستانیوں کو بھی خطرہ در پیش ہے جو آئل کمپنی کے ملازم ہیں۔ اگر اس اعلان کے بین السطور کا مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایران میں اشتراکیت کا زور بڑھ رہا ہے۔ اگر جنوبی ایران میں انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی تو برطانیہ کے روغنی مفاد کو خطرات کی زد میں آنا پڑے گا یہی وجہ ہے کہ اس نے فوجی استحکام کا بندوبست کر لیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایرانی اضطراب کے پردے میں بھی روس و برطانیہ کے اغراض "پائے کوب" ہیں۔ اور یہی حالت افغانستان کی ہے۔ اس ملک میں سب سے پہلے روس نے جرأت آزما قدم اٹھایا تھا۔ اس نے افغانستان سے تجارتی، سیاسی اور اقتصادی تعاون کا معاہدہ کر لیا لیکن انگریز کب خاموش رہ سکتا تھا؟ اس نے بھی افغانوں پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ اور اب تک "ثقافتی مشن" اور فوجی تربیت کے دستوں" کے ذریعہ سے زمین ہموار کر رہا ہے۔

روس و برطانیہ کی رقابت کی گونج "وادئ نیل" میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ حکومت مصر نے کمیونزم کے خلاف اعلان جنگ کردیا ہے۔ کمیونسٹوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اور بالشویک پراپیگنڈے کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف برطانوی فوجوں نے اگرچہ مصر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن برطانیہ اپنے استعمار پسندانہ مفاد سے دست کش نہیں ہونا چاہتا۔ چنانچہ ابھی تک برطانیہ و مصر کے معاہدہ کی تنسیخ عمل میں نہیں لائی گئی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس سے وزارتیں ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ "افتراق و انتشار" کی قدیم پالیسی کو نیا جامہ عمل پہنانے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ اس نے "وادئ نیل" کی وحدت و یگانگی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے یہ ترکیب سوچی ہے کہ سوڈان کو مصری کنٹرول سے آزاد رکھا جائے۔ حالانکہ ان ممالک کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ وہ متحد ہو کر برطانیہ و روس کی استعماریت کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کریں۔ حال ہی سوڈان کے گورنر نے تقریر کی تھی کہ سوڈان مصر کے زیر سایہ ہرگز نہ رہے گا۔ اس کے مقابلہ میں نقراشی پاشا کی وزارت نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ سوڈان و مصر میں افتراق کی خلیج حائل نہ ہونے دے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برطانوی ملوکیت اور مصری جمہوریت کی کشمکش کا انجام کیا ہوتا ہے؟

ہندوستان کے مسلمان اپنا نصب العین تو متعین کر چکے ہیں لیکن ابھی تک اس کے حصول کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا نہیں جا سکا۔ آج سے چند ماہ پہلے "عمل و جہاد" کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ ہنگامہ خیز جلسے منعقد کئے گئے تھے، قراردادیں منظور کی گئی تھیں، مضامین لکھے گئے تھے، لیکچر پلائے گئے تھے لیکن عارضی حکومت کی گدی پر بیٹھتے ہی یہ کاغذی کارروائیاں اخباروں کے فائلوں میں دفن ہو کر رہ گئیں۔ اور وہ ہنگامہ سرد ہو گیا جس کے لپکتے ہوئے شعلے استعمار و ملوکیت کی فلک بوس دیواروں کو چاٹنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ عام طور پر اس افسردگی و بے عملی کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمان تیار نہیں ہیں، ان کے پاس طبل و علم نہیں ہے، وہ اپنے حریفوں کی طرح کیل کانٹے سے لیس نہیں ہیں لیکن سوال یہ ہے کیا جنگوں میں کامیاب ہونے کے لئے ہتھیار اور اسلحہ ہی سب کچھ ہوتے ہیں؟ کیا قرون اولیٰ میں

آگئے ہیں کہ اپنی جانیں تلف کر رہے ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے گھر پر قابض ہے اور اس میں اجنبیوں کو لا بسایا ہے۔ عقاب شیر کی آنکھوں میں ٹھونگیں مار رہا ہے۔ جمشید داوند بھاگ گیا، کوہ ہمالیہ پر بہماد جدو طرب میں ہے بکرماجیت شوق میں قبر سے سر نکال کر نئی زندگی کا طالب ہے۔ دریائے بلند اور اٹک پر پُل کی ضرورت نہیں کیونکہ ان دریاؤں کو کشتوں کے پشتوں نے پاٹ رکھا ہے۔ سارے عالم میں آگ برس رہی ہے جو تری اور خشکی سب کو جلائے جا رہی ہے۔ کم و درطا قتوروں کے چہرے فوج رہے ہیں۔ بیماروں کو صحت کی امید ہو چلی ہے اور مُردے قبروں میں پڑے زندگی کی امید میں لوح مزار اور قبر کی کڑیوں کو ہلا رہے ہیں۔ سمندر کی تاریکی میں کشتیوں اور جہازوں کے تختے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور اب ان سے مدافعت اور مزاحمت کی کوئی صدا سنائی نہیں دیتی۔ فقرا تخت شاہی پر قابض ہو چکے ہیں۔

سُنو سُنو، دیکھو! بادشاہ کوہ قاف کی چوٹی پر استادہ ہے، خدائی ہاتھ شمشیر برہنہ لئے آسمان سے نمودار ہوا، سارا عالم لقعہ نور بن رہا ہے۔ آفتاب جہاں تاب طلوع ہوا اور تیرہ تار بادلوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ غبار بیٹھ گیا اور وحشت کا دور ختم ہو گیا۔ جو جس راہ سے آیا تھا اسی راستے لوٹ پڑا، ہر زمین پر اس کے مالک حقیقی نے قبضہ کر لیا ہے۔ کانٹے خشک ہو گئے، کلیاں چٹکنے لگیں، اور سارا عالم پھولوں سے چمن بن گیا۔ کیا ہی مسرت اور شادمانی کا وقت ہے! دیو بھاگ گئے اور شیطان ہلاک ہو گیا۔ سارا جہان امن و امان سے معمور ہے۔ اس وقت عدل ہی کا راج ہے۔ ضحاک کوہ دماوند سے نکل آیا اور سارا جہان فردوس بریں بن گیا۔ حکومت خدا ہی کی ہے۔ انسانوں کی فریاد اب اللہ ہی سے ہے۔

فنا کا ن دھر کرشن لو کہ یہ زندگی ابدی ہے جس کو موت کا خوف نہیں اور نہ اب اس کو بیماری کی تلخی سے دوچار ہونا ہے۔ ہر قوی و ضعیف اپنے اپنے گوشے میں امن و امان سے نچنت بیٹھا ہے۔ ہر ایک گروہ اپنی اپنی زمین پر آرام سے آباد ہے۔ مختصر یہ کہ دست تعدی کوتاہ و بازوئے ظلم شکستہ شد"!

تعارف

(مشاہیر کے قلم سے)

"سید جمال الدین افغانی زبردست حکمائے اسلام میں سے تھے۔ آپ ایک سحر البیان خطیب اور لکچرار تھے۔ پیشانی سے رعب و جلال ٹپکتا تھا۔ آپ کا انداز بیان منطق و استدلال سے پُر اور اتنا مؤثر ہوتا کہ دل میں جاگزین ہو جاتا تھا۔ آپ کی آواز میں مقناطیسی اثر تھا۔ اور سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جس جگہ بھی گئے تھوڑے ہی عرصے میں وہاں منصب قابلہ حاصل کر لیا۔ اور ایسے ایسے اصلاحی فرائض انجام دیئے کہ آئندہ آنے والی نسلیں اُن سے مستفید ہوتی رہیں گی۔

"سید جمال الدین افغانی بہت بڑے سیّاح تھے۔ اور نہ صرف دُنیائے اسلام سے کما حقہٗ واقف تھے۔ بلکہ مغربی یورپ سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ پیدائشی مبلغ تھے اور اس حیثیت سے لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتے تھے۔ جمال الدین پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مغربی غلبہ کے آنے والے خطرے کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اور انہوں نے اس خطرے سے دُنیائے اسلام کو آگاہ کرنے اور اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر ڈالے یہی تو آبادیوں کے حکام انہیں شورش پسند قرار دیتے تھے اور انگریز اُن سے خائف رہتے تھے آپ ذکی الحس اور فہیم تھے آپ میں کام کرنے کی غیر معمولی قوت تھی"

لاتھراپ اسٹاؤرڈ۔ "جدید دُنیائے اسلام"

"جمال الدین افغانی ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت فلسفی، ادیب، خطیب، اور اخبار نویس تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک زبردست سیاستدان تھے اُن کے مداح انہیں ایک بہت بڑا محب وطن سمجھتے تھے اور مخالف ایک خطرناک باغی۔۔۔ انکے پاس مادی ذرائع میں سے زبان و قلم کی فصاحت، وسیع علمیت اور اسکے ساتھ ہی سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی اور اسلام سے سچے عشق کے سوا کچھ نہ تھا۔ انہوں نے تخت پر بیٹھے ہوئے بادشاہوں کو سہما دیا اور مدبروں کی سوچی سمجھی ہوئی تدبیروں کو خاک میں ملا دیا۔ یورپ اور ایشیا کے سیاستدان اُنکا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے۔۔۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی بیداری کیلئے بہت بڑا کام کیا۔ انکا تحاد

اسلام کا بانی قرار دینے میں مبالغہ نہیں ہے۔" (اے۔ جی۔ براؤن ۔ "انقلابِ ایران")

"جمال الدین افغانی ایک بہت بڑے آدمی تھے انکی تعلیمات میں ایک خاص کشش تھی۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ آخری تیس سال میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم پیدا نہیں ہوا میں اپنے آپکو بہت خوش قسمت اور مسرور سمجھتا ہوں کہ دورانِ انگلستان میں میرے یہاں تین مہینے تک مقیم رہے کیونکہ وہ اپنے خیالات میں راسخ تھے اور پورے طور پر ایشیائی تھے وہ آسانی کیساتھ یورپی رسوم و آداب سے مانوس نہیں ہوتے تھے۔" (ولفرڈ بلنٹ ۔ "گارڈن خرطوم")

"جمال الدین پہلے شخص ہیں جنہوں نے زمانۂ حال میں اتحادِ اسلامی کے خیال کو تازہ کیا وہ جہاں کہیں گئے اپنے خیالات کے نقوش چھوڑ گئے انہوں نے حالات کا اندازہ لگا کر نصرانی یورپ کے خطرے کو زیادہ محسوس اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا ... انہوں نے تمام مشرقی ممالک پر اپنا اثر ڈالا۔ لیکن مصر اور ایران نے انکا سب سے زیادہ اثر قبول کیا وہ ایک بیدار سیاح اور ایک جادو بیان مقرر تھے جنکے علمی تبحر، صحیح فکر اور مذہبی تقدس نے انکو مشرقِ جدید کا مشعل بردار بنادیا۔" (ہانس کوہن "مشرق میں قومیت کی تاریخ")

"سید جمال الدین افغانی کی زندگی کے مختلف حالات پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ مقصد جو ہمیشہ انکے پیشِ نظر رہا اور وہ مرکز جس پر انکی امیدیں ہمیشہ مرکوز رہیں "اتحادِ اسلام" تھا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک سلطنت میں متحد کر کے واحد خلیفۂ اسلام کے ماتحت لانا تھا۔ اسی کوشش میں انہوں نے اپنی تمام تر قوت صرف کر ڈالی اور اسی مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے دنیاوی آسائشیں قربان کر دیں حتیٰ کہ شادی بھی نہ کی اور کوئی پیشہ بھی اختیار نہ کیا اسکے باوجود وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے لیکن انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دلوں میں ایک زندہ روح پھونک دی۔ انکی قوت نے انکو بیدار کیا اور انکے قلم کو قوت بخشی مشرق نے انکی جانفشانیوں سے فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ اٹھاتا رہے گا۔" (جرجی زیدان "مشاہیر الشرق")

"مولانا جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے انکی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی انکی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علما جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے۔ جیسے مصر کے سعد زاغلول پاشا وغیرہ انہی کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت۔ اور اس طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنادیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روحِ اسلام میں اتنی تڑپ پیدا نہیں کی جسقدر کہ انہوں نے پیدا کی تھی۔" (علامہ اقبالؒ)

حیاتِ جمال الدین کا اجمالی خاکہ

(مولانا ظفر علی خان)

پان اسلامزم: یورپ کو اصطلاحاتِ انسانی کے ماہر اور حقائق نفس الامری کے نقاد ہونے کا بہت بڑا دعویٰ ہے لیکن پھر بھی وہاں کے دانش پژوہوں میں ہمیں ایسے اشخاص بکثرت نظر آتے ہیں جو صورت کو معنی پر ترجیح دے کر واقعات کی طرف سے تو آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں اور اپنے پولیٹیکل دستور العمل کو ترتیب دیتے وقت محض چند الفاظ کے ورد و وظیفے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اسلامی اخوت ایک سیدھا سادہ جملہ ہے جس کے مفہوم میں برادرانہ یگانگت اور باہمی ہمدردی و غمگساری کے وہ عمرانی اصول داخل ہیں جن کو دنیا کا کوئی اخلاقی فلسفہ مذموم و ناروا نہیں قرار دے سکتا لیکن یورپ کے اہل قلم جن کے خیالات پر قسیسیت کا روغن چڑھا ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ "پان اسلامزم" کرتے ہیں اور یہ وہ نام ہے جس کے سنتے ہی مسیحیت کے پردۂ تصور پر مجاہدانہ جوش اور والہانہ تعصب کی تصویر آ جاتی ہے۔ "زرد خطرے" اور "کالے خطرے" کے جملوں کی طرح جو چین اور افریقہ کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے "پان اسلامزم" یعنی "اسلامی خطرے" کی ایجاد کی غایت یہ تھی کہ دنیا کی رہی سہی آزاد و خود مختار اسلامی طاقتوں کو بکلی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تاکہ ربع مسکون پر تثلیث کا واحد علم لہراتا ہوا نظر آئے اور مسیحیت کہنہ و مسئلۂ شرقیہ کا رخنہ ولا غیر ہی بچایا کرے۔ ورنہ اس اصطلاح کے موجدوں کو خود اچھی طرح معلوم ہے کہ "پان اسلامزم" اگر اس کا وجود دنیا میں کہیں ہے تو بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کی موجودہ خود مختارانہ حیثیت کو بیرونی مداخلت و بربادی سے برقرار رہنے دیا جائے۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کو دوسروں کے ملک و قلعے سے غرض نہیں۔ ان کی تمنا فقط اتنی ہے کہ ان کا وہ مال و لید جس سے وہ اتحاد جسم و روح قائم رکھیں ان سے نہ چھینا جائے اگر اس تمنا کو قوت سے فعل میں لانا "پان اسلامزم" ہے تب تو یہ تحریک

درحقیقت موجود ہے اور اس کی نشانیاں ہمیں افغانستان ایران ٹرکی اور مراکو میں نظر آرہی ہیں جنہوں نے یورپین طاقتوں کے طرزِ عمل اور واقعات کی موجودہ روش کو دیکھ کر اپنے مشترک خطرے کا احساس کرتے ہوئے بجز برادرانہ اتحاد کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا اور نہ اس تحریک کی حقیقت ایک کابوسِ خیالی سے زیادہ نہیں جسے یورپ نے جان بوجھ کر اپنی غاصبانہ پیش قدمی اور متعدیانہ درازدستی کے سینے پر اہلِ مشرق کا منہ چڑانے کے لئے بٹھا دیا ہے۔

اسلامی اخوت جس کا فقدان دُنیائے اسلام کے موجودہ افسوس ناک انحطاط کا ذمہ وار ہے وہ روشن اصول ہے جو مہاجرین و انصار کے عقدِ مواخذات کی مبارک رسم کی انجام دہی کے وقت سے لے کر اب تک ہر اس مسلمان کا نصب العین بنا رہا ہے جس کے دل کو مبداءِ فیاض نے دردِ قومی عطا کیا ہو اور چونکہ سرمایۂ دردِ قومی کا سب سے بڑا خازن وہ واجب التعظیم طبقہ ہے جسے حضور سرورِ کون و مکان کی بارگاہ سے انبیائے بنی اسرائیل کی ہم پائیگی کا درجہ عطا ہو چکا ہے لہذا کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں کسی مجدد وقت عالم نے مسلمانوں کی پستی کو محسوس کر کے ان کی شیرازہ بندی کی کوشش نہ کی ہو اور ان میں وہ روح نہ پھونکنی چاہی ہو جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے جسم میں حلول کئے ہوئے تھی۔

انیسویں صدی کا مجدد | سید محمد جمال الدین نوّر اللہ مرقدہٗ جن کے حالات ہم ذیل میں ہدیہ ناظرین کرنے میں اپنے وقت کے ایک ایسے ہی مجدّد تھے۔ جو راعیٔ عرب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گلّے کی تتر بتر بھیڑوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں جب کہ دُنیائے اسلام منتہائے ذلت کو پہنچ گئی تھی منجانب اللہ مامور ہوئے۔ افغانستان۔ ایران۔ مصر اور ٹرکی اس عجیب و غریب شخص کے فیضان سے یکساں بہرہ اندوز ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا احسان ایران پر ہے جس کے منقل جان میں وہ چنگاری ڈال کر جو ۱۹۰۶ء میں شعلۂ انقلاب بن کر بھڑکی۔ اس نے حریت مساوات اور دستوری حکومت کے خیالات ملک میں پھیلا دیئے۔ روس ان خیالات کو دبا دینا چاہتا ہے۔ انگلستان روس کے دم حجبانسے میں آکر اس جدوجہد کو جو ایرانی اپنی قسمت کی گرہ کو اپنی انگلیوں سے کھولنے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں۔ غیر ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ جرمنی اپنا اُتو ان دونوں

حریفوں کو شکست دے کر الگ سیدھا کرنا چاہتا ہے لیکن کیا وہ سلطنت جو تین ہزار سال تک یونانیوں۔ پارسیوں۔ عربوں مغلوں۔ تاتاریوں۔ ترکوں اور افغانوں کا باہم تختۂ مشق بنی رہنے پر بھی ہر بیرونی دست برد کے بعد ققنس کی طرح اپنی راکھ میں سے نئے پر و بال لے کر پیدا ہوتی چلی آئی ہو۔ آج مٹ سکتی ہے؟ کیا وہ خطہ جس کی خاک سے مانی و زرتشت۔ رستم و افراسیاب۔ عبداللہ ابن میمون و حسن ابن صباح۔ فارابی و بوعلی سینا۔ فردوسی و نظامی۔ سعدی و حافظ نے پیدا ہو کر انسان کے لئے مذہبی۔ عقلی۔ اخلاقی اور تخیلی ادراکات کا اچھوتا سرمایہ چھوڑا ہو۔ اس قابل ہے کہ مٹ دیا جائے کیا اس سرزمین سے جس کی ذہانت آفرینیاں صوفیوں۔ اسماعیلیوں۔ شیعوں۔ حروفیوں اور وہابیوں کے جانبازانہ و فدایانہ معتقدات کا سرمایہ بن کر ایسے ایسے انقلابات برپا کرتی چلی آئی ہوں جن کی نظیر کوئی دوسرا ملک نہیں پیش کر سکتا اپنے آپ کو اغیار و اجانب کی دست برد سے بچانے کی قابلیت چھین لی گئی ہے؟ کیا وہ ملک جس کے لٹریچر کی رنگینیاں آدھے ایشیا کی تخییل کا عنصر غالب ہوں اور جس کی تہذیب بزم عالم کی شمع کا فانوس ہو دنیا کے دل منت پذیر کا گوشہ نہیں ہو سکتا؟

انصاف پسند دل مرزا آقا خاں کرمانی کے ہم آہنگ ہو کر پکار اٹھیں گے۔

بہ ایراں مباد آں چناں روز بد — کہ کشور بہ بیگانگاں اوفتد
نخواہم زمانے کہ ایں نوعروس — بیفتد بزیر جوانان روس
بگیتی مباد آں کہ ایں حور دیس — شود ہمسر لردے (لارڈ) از انگلیس

روس جرمنی اور دوسری یورپین طاقتوں کے اس شکار سے تو ہمیں بحث نہیں جو تہذیب و شائستگی کی ٹٹی کی آڑ میں کھیلا جا رہا ہے۔ وہ اگر اپنا ضمیر بیچنے پر تلی ہوئی ہیں اور اپنی کشورکشایانہ خواہشوں کی قربان گاہ پر دنیا کی کمزور و ناتواں قوموں کو بھینٹ چڑھائے بغیر مانتی ہی نہیں تو خداوند عالم بشرطیکہ وہ موجود ہے اور ضرور موجود ہے۔ ایک دن ان سے سمجھ لے گا اور وہ اس طرح برباد ہوں گی کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہے گا لیکن ہمارا دل دکھتا ہے جب انگلستان پر جس کی بقا کے ساتھ ہماری بقا اور جس کی طاقت کے ساتھ ہماری سلامتی وابستہ ہے جس کی عظمت کا محل ہماری عقیدت کی بنیاد پر قائم ہے۔ دنیا اسی قسم کے اعتراض کرتی ہے جیسے وحشی روس یا بے اصول

جو منی پر کئے جاتے ہیں۔ ہم سات کروڑ مسلمانان ہند جو سلطنت برطانیہ کی پولیٹکل ہیئت ترکیبی کا جزو لاینفک ہیں اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے لئے انگریزی حکومت کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی جسم کے لئے جان کی۔ اس بات کے ہرگز روادار نہیں ہوسکتے کہ انگلستان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہو جس کا خمیازہ اس کے ساتھ نہ صرف ہمیں بلکہ کل ہندوستان کو کھینچنا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نہیں چاہتے کہ وہ ایران میں وہی پالیسی اختیار کرے جو روس نے اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے کہ اس پالیسی کا لازمی نتیجہ ایک دن یہ ہوگا کہ جنوبی ایران کے ہندوستان میں ضم ہو جانے سے ہندوستان کا ڈانڈا روس سے جا ملے گا۔ اور اس طور پر جو خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں جو روس کی عظیم الشان جنگی قوت اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی فوجی کمزوری سے واقف ہونے کے ساتھ ہی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ نقشہ عہد یورپین طاقتوں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اور روس کو تو اس فن میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

پروفیسر براؤن کا مقالہ | یہ بحث بیچ میں برسبیل استطراد آگئی تھی۔ اب ہم اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کا ماخذ پروفیسر براؤن کی وہ دل کشا اور دل آرا تصنیف ہے جو ایران کے پولیٹکل انقلاب کے متعلق انہوں نے حال ہی میں شائع کی ہے۔ پروفیسر براؤن کو ایران اور ایرانیوں سے ایک خاص الفت ہے اور جن لوگوں نے ان کی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" پڑھی ہے۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ الفت ان کے دل میں کیوں گھر کئے ہوئے ہے جس شخص نے تیس سال فارسی لٹریچر کے مطالعہ اور اس کی تنقید میں گذارے ہوں اور جسے اسلامی تمدن کی تصویر کے روشن رخ دیکھنے کا بار بار موقع ملا ہو۔ اسے چاہئے کیونکہ نہ ایران سے محبت ہو۔ اس محبت کا حق انہوں نے "انقلاب ایران" لکھ کر ادا کیا ہے اور جیسا کہ ان کا بیان ہے اس کتاب کے لکھنے سے ان کا یہ مقصود ہے کہ ان غلط فہمیوں کو جو انگلستان میں ایرانیوں کی طرف سے پیدا ہوگئی ہیں دور کریں اور اپنے ہم وطنوں کے دل میں ہمدردی کا وہ جذبہ پیدا کریں جس کا ایران کو انگلستان پر حق ہے۔

پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ابھی تک بحث طلب ہے کہ آیا بڑے آدمی بڑے واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا باعث ہوتے ہیں یا بڑے واقعات خود بڑے آدمیوں کو پیدا کیا کرتے ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان دونوں کا وجود

لازم و ملزوم ہے۔ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے باہمی اتحاد کی اس عظیم الشان تحریک میں جس کے اثرات خصوصیت کے ساتھ ایران و ترکی میں نمودار ہوئے کسی نے ایسا نمایاں حصہ نہیں لیا جیسا سید جمال الدین نے جن کی زبردست شخصیت متبحرانہ فضیلت متہورانہ جرأت ان تھک مستعدی فصاحت تقریر بلاغت تحریر اور شاندار شکل و صورت بتائے دیتی تھی کہ وہ بہت بڑے مشاہیر روزگار میں سے ہیں۔ یہ جامع حیثیات شخص فلسفی مصنف خطیب۔ اخبار نویس اور مدبر سبھی کچھ تھا جو لوگ اس کے موافق تھے اسے بہت بڑا محب وطن جانتے تھے اور جو اس کے مخالف تھے اسے ایک خطرناک مفسدہ پرداز سمجھتے تھے۔ اس نے وقتاً فوقتاً اکثر اسلامی ممالک اور یورپ کے متعدد پایہ تختوں کا سفر کیا اور اپنے وقت کے بہت سے سربرآوردہ مشرقیوں اور مغربیوں سے مل کر ان میں سے بعض کو اپنا دوست اور اکثر کو اپنا دشمن بنایا۔

ابتدائی تعلیم سید محمد جمال الدین موضع اسعد آباد میں جو کنارے متصل مضافات کابل سے ہے سنہ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید صفدر تھا جو حسینی سید تھے اور اپنا سلسلۂ نسب مشہور و معروف محدث سید علی الترمذی کی وساطت سے حضرت شہید کربلاؓ سے جا ملاتے تھے۔ ابھی وہ بچہ ہی تھے کہ ان کے والد نے کابل میں جا کر اقامت اختیار کر لی بچپن ہی سے ان میں غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کے آثار پائے جاتے تھے اور جب ان کا سن آٹھ سال کا ہوا تو سید صفدر نے اپنے ہونہار بیٹے کی معلمی کی خدمت خود انجام دینی شروع کی اٹھارہ سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو گئے اور نحو۔ بلاغت۔ تاریخ فقہ منطق تصوف۔ فلسفہ طبعیات۔ مابعد الطبعیات ریاضی۔ ہیئت۔ طب۔ تشریح ابدان وغیرہ کل اسلامی علوم و فنون میں انہوں نے منتہیانہ استعداد بہم پہنچا لی۔

امیر افغانستان کی ملازمت اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور یہاں ایک سال کئی مہینے رہ کر علوم مغربیہ میں کچھ دستگاہ حاصل کی۔ اس کے بعد بعزم حج بیت اللہ شریف کو روانہ ہوئے اور راستہ میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے سنہ ۱۲۷۳ھ (مطابق ۱۸۵۷ء) میں مکہ معظمہ پہنچے۔ حج سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنے وطن کو مراجعت کی اور امیر دوست محمد خاں کے دائرۂ ملازمت میں داخل ہو کر امیر موصوف کے ہمراہ مہم ہرات پر گئے جس پر امیر کے

ابن عم اور داماد سلطان احمد شاہ کا قبضہ تھا۔

امیر دوست محمد خان کا ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳ء) میں انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ امیر شیر علی خان مسند نشین ہوا۔ نئے امیر نے اپنے وزیر محمد رفیق خان کی صلاح پر چل کر اپنے تین بھائیوں محمد اعظم، محمد اسلم اور محمد امین کو قید کر دینا چاہا جن میں سے اول الذکر کی ملازمت سید جمال الدین نے اختیار کر لی تھی تینوں بھائی اس منصوبے سے آگاہ ہو کر اپنے اپنے صوبے کو بھاگ گئے اور خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد اعظم اور اس کے بھتیجے عبدالرحمن خان (سابق امیر افغانستان) نے پایہ تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور عبدالرحمن خان کے والد محمد افضل کو جو غزنی میں قید تھا رہا کر کے تخت پر بٹھا دیا لیکن محمد افضل ایک سال کے بعد راہگرائے عالم باقی ہو گیا اور اس کی جگہ محمد اعظم تخت نشین ہوا جس نے سید جمال الدین کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ اگر وہ اپنے وزیر باتدبیر کے کہے پر چلتا تو کل ملک اس کے قبضے میں آجاتا لیکن چونکہ وہ اپنے تمام رشتہ داروں کو حسد اور رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور بجز اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے جسے ملک داری کا کوئی تجربہ نہ تھا کسی کو ذمہ داری کی کوئی خدمت نہ دینا چاہتا تھا لہذا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

امیر شیر علی خان ابھی تک قندھار پر قابض تھا۔ محمد اعظم کے ایک بیٹے نے اس خیال سے کہ شجاعت کا کوئی نمایاں کارنامہ دکھا کر باپ کے دل میں گھر کر لے چچا پر حملہ کیا لیکن چونکہ ناتجربہ کار تھا۔ اس لئے دو سو جوانوں کے ساتھ اپنی فوج سے الگ ہو کر آگے بڑھا اور شیر علی خان کے ایک سردار یعقوب خان کے قابو میں آگیا۔ اس کامیابی نے شیر علی خان کی ہمت بڑھا دی چنانچہ اس نے سلسلہ جنگ وجدل کو پوری سرگرمی کے ساتھ از سر نو چھیڑ دیا۔ اور انگریزوں کی مدد سے جنہوں نے روپیہ سے اس کی خاطر خواہ مدد کی۔ وہ بالآخر اپنے بھائی محمد اعظم خان اور بھتیجے عبدالرحمن خان کی متفقہ قوتوں پر غالب آیا شکست کھا کر محمد اعظم خان نے تو نیشاپور کی طرف راہ فرار اختیار کی جہاں چند مہینے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور عبدالرحمن خان بخارا کو چلا گیا۔

سیاحت مصر | سید جمال الدین اس انقلاب کے بعد بھی بدستور کابل میں مقیم رہے اور چونکہ سید تھے اور لوگ ان کو

مانتے تھے اس لئے شیر علی خاںؒ کے انتقام سے محفوظ رہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ افغانستان سے چلے جائیں چنانچہ انہوں نے حج بیت اللہ سے مکرر مشرف ہونے کی اجازت امیر سے مانگی امیر کو چونکہ یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ مبادا وہ اپنے سابق ولی نعمت محمد اعظم خان سے مل کر فتنہ و فساد برپا کریں لہٰذا حج کرنے کی اجازت ان کو اس شرط کے ساتھ دی گئی کہ وہ ایرانی علاقے میں سے نہ گزریں۔ غرض سید صاحب ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۹ء) میں براہ ہندوستان مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ گورنمنٹ ہند نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ سربرآوردہ مسلمانوں سے بلا کسی انگریزی عہدہ دار کی نگرانی کے ملنے نہ پائیں اور ایک مہینے کے بعد اپنے ایک جہاز پر سوار کرا کے باعزاز تمام سوئز کو روانہ کر دیا۔ سوئز سے وہ قاہرہ گئے اور چالیس روز تک وہاں مقیم رہے۔ اس عرصہ میں وہ برابر جامعہ ازہر کو جاتے رہے اور وہاں کے اساتذہ و تلامذہ سے علمی مباحث پر گفتگو کرتے رہے اور اپنے مکان پر چند خاص خاص لوگوں کو درس بھی دیتے رہے۔

قسطنطنیہ میں آمد | قاہرہ سے سید جمال الدین کا قصد مکہ معظمہ جانے کا تھا لیکن اس قصد کو ملتوی کر کے وہ سیدھے قسطنطنیہ چلے گئے۔ جہاں ہز ہائینس عالی پاشا وزیر اعظم اور دارالخلافہ کے دوسرے اکابر و اعیان نے ان کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا۔ چھ مہینے تک قسطنطنیہ میں مقیم رہنے کے بعد وہ انجمن دانش کے رکن مقرر کئے گئے جو فرنچ اکاڈمی کی طرح ترکوں کی قومی مجلس علوم و فنون ہے۔ اور ماہ رمضان ۱۲۸۷ھ (مطابق ۱۸۷۰ء) میں دار الفنون یعنی عثمانی یونیورسٹی کے ناظم اعلیٰ تحسین آفندی نے ان سے استدعا کی کہ طلبہ کو ایک لکچر دیں۔ پہلے تو انہوں نے اس بنا پر معذرت کی کہ ترکی زبان میں انہیں کافی مہارت حاصل نہیں ہے لیکن بالآخر رضامند ہو گئے۔ انہوں نے اپنی تقریر ترکی زبان میں قلم بند کر کے صفوت پاشا وزیر سررشتہ تعلیمات اور شروانی زادہ وزیر سررشتہ پولیس منیف پاشا کو دکھائی اور ان سب نے اسے پسند کیا لیکن شیخ الاسلام حسن آفندی سید صاحب کو بنگاہ حسد دیکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کے روز افزوں رسوخ و اثر کو کسی طرح صدمہ پہنچائے۔ جب سید صاحب نے اپنی تقریر ایوانِ دارالفنون پایۂ تخت کے بھرے مجمع کے سامنے جس میں بہت سے سربرآوردہ عثمانی ارکانِ دولت اور اخبار نویس اور ارباب فضل و

کمال شریک تھے پڑھنی شروع کی تو حسن فہمی آفندی اس تاک میں تھا کہ کوئی فقرہ اس تقریر میں ایسا ہاتھ آجائے جس سے مقرر کے عقائد کی صحت پر خردہ گیری کی جاسکے۔ سید صاحب نے اپنی تقریر میں نظام تمدن کو ایک زندہ و متحرک جسم ذوی الاعضاء سے تشبیہ دے کر بیان کیا تھا کہ اس جسم کے اعضا مختلف حرفے اور پیشے ہیں۔ مثلاً بادشاہ اگر دماغ ہے تو لوہار ہاتھ ہیں۔ کاشتکار جگر ہیں۔ ملاح پاؤں ہیں۔ وقس علی ہذا۔ اس تمہید کے بعد سید صاحب نے کہا کہ انسانی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا بھی یہی حال ہے لیکن جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسانی جماعت کے جسم کی روح ملکۂ نبوت ہے یا ملکۂ تفلسف۔ اگرچہ ان دونوں میں بھی یہ امر مابہ الامتیاز ہے کہ نبوت ایک انعام وہبی ہے جو کوشش سے نہیں ہاتھ آتا بلکہ اس شخص کو ملتا ہے جسے جناب باری کی عنایت خاص اس کا مستحق خیال کرے اور دوسرا ملکہ یعنی فلسفیانہ قوت اکتسابی ہے جو غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان ملکات دوگانہ میں یہ فرق بھی ہے کہ پیغمبر غیر خاطی ہوتا ہے حالانکہ فلسفی گمراہ ہوسکتا ہے اور اس سے خطا سرزد ہوسکتی ہے۔

شیخ الاسلام نے ان الفاظ سے وہ موقع نکال لیا جس کا وہ آرزومند تھا اور سید جمال الدین پر منصب نبوت کو پیشہ اور نبی کو پیشہ ور ظاہر کرنے کا الزام لگایا۔ سید صاحب کی طرف سے اس الزام کی تردید ہوئی اور مطبع و منبر اس بحث کی جولانگاہ بن گئے۔ شیخ الاسلام کو اپنی کشمکش کی ہٹ تھی اور سید صاحب کو اپنے دعوے پر اصرار رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بحث طول کھینچ کر حد سے زیادہ تلخ ہوگئی اور دولت عثمانیہ کی طرف سے بخیال حفظ امن سید صاحب کو ایما ہوا کہ کچھ عرصے کے لئے قسطنطنیہ سے چلے جائیں۔ اس پر انہوں نے دیار مصر کا رخ کیا۔ جہاں وہ ۲۲ ۔ مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے۔

مصر اور ہندوستان کی سیاحت سید صاحب کا ابتدائی قصد تھا کہ مصر میں محض برائے چندے قیام کریں لیکن یہاں پہنچ کر ریاض پاشا سے ان کی ملاقات ہوئی جس پر ان کے کمالات و فضائل کا یہاں تک اثر ہوا کہ اس نے گورنمنٹ مصر سے ان کا ایک ہزار پیاستر ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ طالب العلم اور ارباب ذوق سلیم ان کے علم و فضل کا شہرہ سن کر جوق جوق ان کے پاس آنے لگے اور وہ ان لوگوں کے اشتیاق آمیز اصرار پر فقہ و حدیث فلسفہ و منطق و تصوف کے منتہیانہ

مسائل کی گتھیاں ان کے لئے سلجھانے لگے۔ مصر میں ان کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی اور ان کا حلقۂ اثر جلد جلد وسیع ہو گیا انہوں نے اپنے شاگردوں میں انشا پردازی کا مذاق پیدا کرنے پر بہت کچھ توجہ صرف کی اور ادب، فلسفہ، مذہب، پالیٹکس کے موضوع پر خامہ فرسائی کرنے کی انہیں ترغیب دلائی۔ اس وقت تک مصر میں گنتی کے ایسے نام موجود تھے مشہور انشا پردازوں میں عبداللہ پاشا فکری، خیری پاشا، محمد پاشا، مصطفیٰ پاشا وہبی اور چند اور ادیبوں کا نام لیا جا سکتا لیکن سید صاحب کی مساعیِ جمیلہ کی بدولت نوجوان طبقے میں مشاق اور نکتہ آفرین انشا پردازوں کی تعداد بسرعت تمام بڑھتی گئی اور ملک میں ایسے لوگ بکثرت پیدا ہو گئے جو نہایت قابلیت کے ساتھ ہر مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار بآسانی کر سکتے تھے۔

لیکن قسطنطنیہ کی طرح مصر میں بھی سید صاحب کے کمالات نے خاص خاص لوگوں کو فرطِ حسد سے آپ کا دشمن بنا دیا پرانی وضع کے علما کا ان پر یہ اعتراض تھا کہ وہ اپنے تعلیم فلسفہ میں ساعی ہیں۔ ادھر انگریزی قونصل جنرل مسٹر ویوین نے جو بعد میں لارڈ ویوین کے لقب سے ملقب ہوئے، سید صاحب کی پولیٹیکل سرگرمیوں کا بنگاہِ اشتباہ دیکھ کر توفیق پاشا خدیو مصر سے ان کے اخراج کا حکم جاری کرا دیا چنانچہ وہ اپنے جاں نثار شاگرد ابو تراب کے ساتھ جو کبھی مجتہد العصر آقا سید محمد طباطبائی کے متوسلین میں تھا اور اس وقت سید صاحب کا ارادت مند حلقہ بگوش تھا ماہ دسمبر ۱۸۷۹ء میں مصر سے روانہ ہو کر سیدھے ہندوستان پہنچے اور حیدر آباد دکن میں اقامت اختیار کی۔ زمانۂ قیام حیدر آباد میں انہوں نے ایک کتاب بزبان فارسی ملاحدہ کے رد میں لکھی جس کا بعد میں عربی ترجمہ بھی ہو گیا۔ اصل کتاب ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی اور اس کا ترجمہ بمقام بیروت ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔

سید کا اصل یہاں برسبیلِ تذکرہ یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے شروع میں سید صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کے سوانح اور خاندانی حالات تمہیداً خود سپردِ قلم کئے ہیں۔ سید صاحب کے واقعاتِ زندگی کو دوسرے لوگوں نے بھی قلمبند کیا ہے مثلاً جرجی زیدان نے اپنی کتاب "مشاہیر الشرق" میں جو بمقام قاہرہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی، سید صاحب کی مبسوط سرگذشت لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ناظم الاسلام کرمانی نے حال میں ایک کتاب "تاریخ بیداری ایرانیاں" کے نام سے تصنیف کی ہے جس کے مقدمہ کا ایک بڑا حصہ سید صاحب کے سوانح عمری کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ مصری رسالہ "المنار" میں سید صاحب کی

و قلموں اور عجیب و غریب زندگی کے ہر پہلو پر تفصیلی اور انتقادی نظر حال ہی میں ڈالی گئی ہے لیکن یہ مختلف سوانح سید صاحب کے مقام ولادت کے متعلق متفق البیان نہیں ہیں۔ صاحب "تاریخ بیداری ایرانیاں" کا بیان ہے کہ سید جمال الدین اسعد آباد میں جو مضافاتِ کابل سے نہیں ہے۔ بلکہ اسعد آباد میں پیدا ہوئے جو ہمدان سے ۱۰ فرسنگ اور کنگاور سے ۵ فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس لئے وہ حقیقت میں ایرانی الاصل تھے لیکن افغان وہ اپنے آپ کو اس لئے کہتے تھے کہ چونکہ وہ سنی المذہب تھے اس لئے ایران میں ان سے کوئی معترض نہ ہو! اس کے علاوہ ایرانی گورنمنٹ اپنی رعایا کے حقوق کی کافی حفاظت نہیں کرتی۔ صاحب "تاریخ بیداری ایرانیاں" ہی کا یہ خیال نہیں بلکہ تمام ایرانی سید صاحب کو اپنا ہم وطن سمجھتے ہیں لیکن ایسی حالت میں جبکہ سید صاحب خود بصراحت بیان کرتے ہیں کہ وہ افغان ہیں صاحب "تاریخ بیداری ایرانیاں" اور اس کے ہم آہنگوں کی کمزور اور بودی دلیلیں سید صاحب کے دعوے کی تردید میں باور نہیں کی جا سکتیں۔ اگر ایرانی شیعیت کے خوف سے انہوں نے اپنے آپ کو باوجود ایرانی الاصل ہونے کے افغان مشہور کیا اور شیعیان ایران ایسے ہی متعصب ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اسی شیعہ دنیا پر ایک سنی عالم ایسا گہرا اور ہمہ گیر اثر ڈال سکا۔ یہ خیال بھی مضحکہ انگیز ہے کہ چونکہ انہیں ایرانی گورنمنٹ کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ اپنی رعایا کو بچا نہیں سکتی۔ لہذا وہ افغان کہلانے لگے۔ اگر یہی خیال تھا تو انہوں نے اپنے آپ کو عثمانی کیوں نہ مشہور کیا۔ اس کے علاوہ بقول پروفیسر براؤن کے اگر وہ اسعد آباد ہی میں پیدا ہوئے ہوتے تو افغانستان کے پالٹکس سے گہرا تعلق انہیں ۱۸۶۸ء تک رہا۔ اس کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے۔

العروۃ الوثقیٰ کا اجرا | القصہ ۱۸۸۲ء میں نوجوان مصریوں کی وہ تحریک جس سے سید جمال الدین کو پوری ہمدردی تھی اور جس کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ خدیو کی مسرفانہ عادات اور غیر محدود اقتدارات کی اصلاح کر کے اغیار کی مداخلت اور [illegible] کا سدباب کیا جائے۔ عرابی پاشا کے خروج۔ اسکندریہ کی گولہ باری۔ تل الکبیر کی لڑائی اور برٹش قبضہ پر جا کر منتہی ہوا۔ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے گورنمنٹ ہند نے سید جمال الدین کو حیدرآباد سے کلکتہ بلا لیا۔ اور جب تک مصری قوم کو مستقل شکست نہ ہو گئی انہیں وہیں روکے رکھا۔ اس کے بعد انہیں ہندوستان سے رخصت ہونے کی اجازت دی گئی چنانچہ کلکتہ سے وہ پہلے لندن اور وہاں سے پیرس گئے جہاں وہ تین سال تک رہے۔

زمانہ قیام پیرس میں ان کے دوست اور شاگرد شیخ محمد عبدہ مرحوم مفتی مصر ان سے ملے۔ شیخ محمد عبدہ کی ملاقات ان سے قاہرہ میں اول اول ۱۸۷۱ء میں ہوئی تھی اور اس کے بعد سے دونوں میں رشتہ محبت و یگانگت روز بروز بڑھتا گیا تھا۔ شیخ کو ۱۸۸۱ء کے ہنگامہ میں حسب بیان کی وجہ سے جلا وطنی کی سزا دی گئی تھی اور وہ سیدھے پیرس چلے آئے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک ہفتہ وار عربی اخبار "العروۃ الوثقیٰ" نکالا جس میں زیادہ تر پولیٹیکل مباحث ہوتے تھے لو جس کا لہجہ انگلستان کے خلاف تھا۔ یہ اخبار ساڑھے چار مہینے سے زیادہ نہ نکلنے پایا اس لئے کہ انگریزی گورنمنٹ نے اس کے پرجوش حملوں سے ڈر کر اور اس کے روز افزوں اثر سے خائف ہو کر ہندوستان میں اس کا داخلہ بند کر دیا اور غالباً دوسرے ذرائع سے بھی کام لیا جنہوں نے اس کی شمع حیات کو گل کر دیا۔

زمانہ قیام پیرس میں سید صاحب نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کی اور اس میں کافی دستگاہ بہم پہنچائی جس سے یورپ کے مختلف سربرآوردہ اخباروں اور رسالوں میں آپ نے مضامین لکھے اور مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کے ساتھ مسئلہ اسلام و سائنس پر علمی مناظرہ میں مصروف رہے۔ انگلستان، روس، ٹرکی اور مصر کے متعلق ان کے پولیٹیکل مضامین کا اقتباس انگریزی اخباروں میں بکثرت شائع ہوتا رہا اور اس زمانہ کے انگلش مدبروں کا ان کی نسبت یہ خیال تھا کہ اس عجیب و غریب آدمی سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ اسی زمانہ ۱۸۸۵ء میں سید جمال الدین لندن گئے اور لارڈ رنڈالف چرچل، سر ڈرمنڈ ولف اور لارڈ سالسبری سے ملے جو مہدی سوڈانی کے متعلق ان کے خیالات دریافت کرنا چاہتے تھے اور مسٹر ولفرڈ بلنٹ نے جو مصری معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک لکھ دیا ہے کہ لارڈ سالسبری کی یہ تمنا تھی کہ اگر ممکن ہو تو سید جمال الدین کے ساتھ مناسب شرائط پر کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔

سید روس میں | جب عروۃ الوثقیٰ بند ہو گیا۔ تو سید جمال الدین پیرس سے پہلے ماسکو اور وہاں سے سینٹ پیٹرسبرگ گئے جہاں روسی گورنمنٹ نے ان کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ سینٹ پیٹرسبرگ میں ان کا قیام چار سال تک رہا۔ اور اس زمانہ میں انہوں نے مسلمانان روس کے ساتھ وہ احسان کیا جسے ان کی آئندہ نسلیں بلکہ کل مسلمانان عالم فراموش نہ کر سکیں گے۔ روس میں مسلمانوں پر حکومت کی طرف سے جو جبر و تشدد ہوتا تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ انہیں کلام مجید اور دوسری کتب مذہبی کے چھاپنے تک کی اجازت نہ تھی۔ سید جمال الدین نے زار کو اس ظالمانہ حکم کی تنسیخ پر آمادہ کیا اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو گئی وہ آزادی جو انہیں جان سے زیادہ پیاری ہے لیکن جسے وحشی اور

غلام حکومت نے ان سے بےخبر یقین رکھا تھا۔ کیا اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر ہم مسلمانانِ ہند کو درگاہِ ربّ العزت میں سجدۂ شکر نہ بجا لانا چاہئے کہ ہماری قسمت کی باگ ایک ایسی شریف النفس اور مصلحت اندیش قوم کے ہاتھ میں دے دی گئی جس کی جہانداری کے دستور العمل کا پہلا اصول موضوعہ یہ ہے کہ رعایا کو کامل مذہبی و عمرانی آزادی دی جائے۔ اور اُن کے عقائد کا پورا ادب ملحوظ رکھا جائے علمائے اسلام نے ہندوستان کو اگر دارالحرب نہیں سمجھا بلکہ دارالاسلام قرار دیا ہے تو ان کا یہ فتویٰ بے وجہ نہیں ہے۔

شاہ ایران سے ملاقات سید جمال الدین ابھی پایۂ تخت روس ہی میں مقیم تھے کہ ناصر الدین شاہ فرمانروائے ایران بہ تقریب سیاحت یہاں وارد ہوئے اور سید صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سید صاحب نے ازراہِ غایت استغنا کجکلاہ شاہ کے پیام کو نظر انداز کر دیا لیکن ع قابل تغییر نبود آنچہ تعیین کردہ اند

دونوں کی ملاقات اور وہ نتیجہ جو اس سے مرتب ہونے والا تھا مقدر ہو چکا تھا۔ کچھ دن بعد میونک میں سید صاحب شاہ سے ملے اور شاہ نے یہ کہہ کر کہ میں آپ کو صدر اعظم مقرر کروں گا ان سے باصرار زمام ایران تھامنے کو کہا۔ اول تو سید صاحب نے انکار کیا لیکن پھر بعض مصلحتوں سے رضامند ہو گئے۔ اگرچہ ان کے دوست شیخ عبدالقادر مغربی ان کو بار بار متنبہ کرتے رہے کہ ایسی حالت میں جبکہ آپ کو سنّی عقائد میں اس درجہ غلو ہے اور ملت حنفیہ کی تقویت اور استحکام میں آپ کی مساعی جمیلہ الم نشرح ہو رہی ہیں کیونکر ہو سکتا ہے کہ ناصر الدین شاہ آپ کو صدارتِ عظمیٰ کے منصب جلیلہ پر مامور کرے۔ سید جمال الدین نے جن کی زندگی کی غایت الغایات سنّی اور شیعی دنیا کا باہمی اتحاد تھی۔ اپنے دوست کا یہ فقرہ سُن کر زبان سے تو اپنی غلطی کا اعتراف کیا لیکن اپنے مقصدِ اصلی کو پیش نظر رکھ کر دل میں یہ کہا۔ ع شاید کہ ہمیں بیضہ برآید پروبال

اور شاہ کے ساتھ ہو لئے۔ شیخ عبدالقادر مغربی نے شیعیت اور حنفیت کے تخالف کو سید جمال الدین کی ہمرکابی شاہ کجکلاہ کا عائق گمان خیال کیا تھا۔ یہ خیال تو صحیح نہ تھا البتہ دوسری قوی وجہ ایسی تھی جو شاہ کی سلک ملازمت میں سید صاحب کے منسلک ہونے کی مساعد نہ تھی۔ دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ سید جمال الدین شیدائے حریت۔ ناصر الدین شاہ دلدادۂ استبداد۔ ایک قومی حقوق کی حمایت میں سینہ سپر دوسرا حقوق کی پامالی پر ثابت قدم۔ ایک جمہوری آئین کا آرزومند۔

دوسرا مطلق العنان شخصی اقتدارات کا متمنی۔ دونوں میں میل ہوتا تو کیونکر ہوتا۔ یہ اختلاف طبائع بہت جلد رنگ لایا۔ طہران آئے ہوئے سید جمال الدین کو زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ عارضی روغن جو یورپ کے سفر نے ناصرالدین شاہ پر چڑھا دیا تھا اتر گیا اور سید صاحب کے ساتھ بے اعتنائی برتی جانے لگی۔ شاہ کے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر سید صاحب نے مراجعت یورپ کی اجازت طلب کی جس کے دینے سے کسی قدر درشتی کے ساتھ انکار کیا گیا۔ اس پر سید صاحب درگاہ شاہ عبدالعظیم میں جو طہران کے قریب واقع ہے بست یعنی امان لے کر بیٹھ گئے اور اس درگاہ میں جو بوجہ اپنے تقدس کے آمن ہونے کے لحاظ سے حرم کا حکم رکھتی ہے سات مہینے تک رہے۔ زمانہ قیام درگاہ میں سید صاحب نے ناصرالدین شاہ کی کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی۔ تقریر و تحریر میں وہ شاہ کی بے عنوانیاں بیان کرتے رہے اور اس کی معزولی کے جواز کی تائید میں سلسلہ دلائل کو کبھی ٹوٹنے نہ دیا۔ بہت سے ایرانی جن میں ہر طبقہ و جماعت کے باثر افراد شریک تھے ان کے ہم خیال ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر ناصرالدین شاہ نے ان کے ملک بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایران سے اخراج ایران میں مقابر و معابد اور دیگر متبرک مقامات اور شاہی اصطبل اور توپخانے سے بست کا خیال وابستہ ہے یعنی جو مجرم یا مفرور کسی مقدس عمارت میں جا پناہ لے یا شاہی طویلے میں چلا جائے حتیٰ کہ شاہ یا شاہی خاندان کے کسی گھوڑے کی دم کو چھو لے یا توپ خانہ کی حدود کے اندر داخل ہو جائے وہ مامون و مصئون سمجھا جاتا ہے کسی کی مجال نہیں کہ اس کو ان حدود کے اندر ضرر پہنچا سکے چنانچہ تاریخ ملکم میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ نادر شاہ کے پوتے نادر مرزا پر جس قدر مصیبتیں نازل ہوئیں ان کی وجہ یہی تھی کہ اس نے ایک مفرور کو جس نے شاہی اصطبل میں جا پناہ لی تھی مروا ڈالا تھا۔ درگاہ شاہ عبدالعظیم میں سید جمال الدین اسی خیال سے بست نشین ہوئے تھے کہ اس کی مقدس چار دیواری میں کسی کو ان سے معترض ہونے کا حوصلہ نہ ہوگا لیکن ناصرالدین شاہ کو اس درگاہ کی امن آفرین چار دیواری بھی اپنے فیصلے کی تعمیل سے نہ روک سکی اس نے پانچسو سواروں کا دستہ اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ سید جمال الدین جس حال میں ہوں گرفتار کر کے ملک بدر کر دیئے جائیں۔ سید صاحب اس وقت بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ شاہی کارندوں نے اس کا بھی لحاظ نہ کیا اور انہیں بستر سے گھسیٹتے ہوئے درگاہ سے باہر لے آئے اور ترکی سرحد پر لے جا کر چھوڑ دیا۔ ناصرالدین شاہ کے اس طرز عمل نے سید جمال الدین کے وسیع حلقہ

احباب میں سخت برہمی پیدا کر دی اور یہی طرزِ عمل آگے چل کر ۱۸۹۶ء میں شاہ موصوف کے قتل کا ایک بہت بڑا باعث ثابت ہوا پس مقامِ تعجب نہیں اگر مرحوم ایرانیوں کا یہ خیال یقین کے درجے تک پہنچ گیا ہو کہ ناصر الدین شاہ کو درگاہِ شاہ عبدالعظیم کی بے حرمتی کی پاداش میں یہ سزا ملی۔

ایران سے سید جمال الدین کا اخراج اواخر ۱۸۹۰ء میں ہوا۔ سال ڈیڑھ سال تک کا زمانہ انہوں نے سفرِ یورپ میں گزارا۔ کچھ عرصہ تک وہ لندن میں رہے۔ جہاں انہوں نے "ناصر الدین شاہ کی ظالمانہ حکومت" کو اپنا موضوع قرار دے کر بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں اور متعدد مضامین شائع کیے جن میں شاہ موصوف پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی گئی تھی اور اس کے صحیح الحواس ہونے میں تک شک ظاہر کیا گیا تھا۔

آخری پانچ سال ۱۸۹۲ء میں سید صاحب پھر قسطنطنیہ گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی عمر کے بقیہ پانچ سال گزارے سلطان عبدالحمید خان کے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ اور وہ سلطان کے مقربینِ خاص میں سے تھے۔ ایک دن سلطان المعظم نے سید صاحب سے فرمایا کہ سفیرِ ایران تین مرتبہ عرض کر چکا ہے کہ سید جمال الدین شاہ کجکلاہ پر سخت حملے کر رہے ہیں اس کا سدِ باب ہونا چاہیے ہم نے دو دفعہ تو اسے ٹال دیا لیکن تیسری دفعہ اس سے وعدہ کیا کہ سید صاحب کی خدمت میں التماس کی جائے گی کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ اب اس بحث کے سر پر خاک ڈالیں۔ سید جمال الدین نے جواب دیا کہ جب خلیفۃ المسلمین ایسا ارشاد فرماتے ہیں تو میں شاہِ ایران کو معاف کرتا ہوں اس پر سلطان المعظم نے کہا کہ سید صاحب حقیقت یہ ہے کہ شاہ کجکلاہ آپ سے بہت ہی خائف ہیں۔ یہ خوف جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا بے وجہ اور بے بنیاد نہ تھا۔

جب یکم مئی ۱۸۹۶ء کو ناصر الدین شاہ کے قتل کے واقعہ نے جو مرزا محمد رضا کرمانی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا دنیا کے پولیٹکل حلقوں میں ایک کھلبلی سی ڈال دی تو اول اول حکومت ایران کو بابیوں پر شبہ ہوا لیکن بعد میں سید جمال الدین اور ان کے رفقا مرزا آقا خان، شیخ احمد کرمانی اور حاجی مرزا حسن خان خبیر الملک موردِ اشتباہ ہوئے چنانچہ دولتِ ایران نے بابِ عالی سے ان چاروں کی حوالگی کی درخواست کی کسی قدر ردّ و قدح کے بعد آخر الذکر تینوں اشخاص تو ایرانی حکام کے حوالے کر دیئے گئے اور تبریز میں ان تینوں کی خفیہ طور پر گردن مار دی گئی لیکن سید جمال الدین کی تحویل سے سلطان عبدالحمید خاں نے انکار کیا۔ ناصر الدین شاہ کی مخالفت میں سید صاحب کا اس سرگرمی سے حصہ لینا اور جس شخص نے شاہ کو قتل کیا۔ اس کا سید

صاحب کے ہم خیالوں میں سے ہونا بجز اس کے کہ سید جمال الدین کو ایرانی حکام کی نظروں میں شاہ کے قتل کا محرک قرار دے اور کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو سید صاحب ناصر الدین شاہ کو بُرا سمجھتے تھے اور اس کے دُنیا سے اُٹھ جانے پر ان کو افسوس کبھی نہیں ہُوا۔ پھر بھی یہ خیال کہ قتل ان کے ایما سے ہُوا۔ اصلیت سے کوسوں دُور ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ بابِ عالی نے سید صاحب کو دولتِ ایران کے حوالے نہیں کیا۔ اس عدم حوالگی کی بڑی وجہ تو یہ تھی کہ سید صاحب ایرانی رعایا نہ تھے بلکہ افغانی نژاد تھے اور اس کے علاوہ جب ان پر قتلِ ناصر الدین شاہ کے جرم میں شریک و معین ہونے کا شبہ ہُوا تو وہ مئی ۱۸۹۶ء کو قسطنطنیہ میں گرفتار کئے گئے اور یلدیز کوشک میں ایک خاص عدالت کے سامنے اُن کے اظہارات لے کر ان پر جرح کی گئی۔ اس تحقیقات میں وہ بری الذمہ ثابت ہوئے اور رہا کر دیئے گئے۔

۱۸۹۶ء میں سید جمال الدین مبتلائے مرض سرطان ہوئے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو اٹھاون سال کی عمر میں ان کی بے چین روح جو مسلمانوں کی ترقی اور اسلام کے عروج کی فکر میں ہر وقت غلطان و پیچاں رہتی تھی جسم سے مفارقت اختیار کر کے رہگرائے دار القرار ہو گئی۔ ان کا جنازہ نہایت دھوم دھام سے نکلا۔ اور وہ "شیخلر مزارلغی" (مزار شیخ) میں جو متصل نشان تاش واقع ہے دفن کئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سیرت و صورت | صاحب "مشاہیر الشرق" نے سید جمال الدین کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "اُن کا رنگ حجازی عربوں کی طرح سانولا تھا جسم وہرا تھا قوی مضبوط تھے آنکھیں سیاہ اور چمکدار تھیں۔ دُور کی چیز کو بوجہ نقص بصارت اچھی طرح نہ دیکھ سکتے تھے اور چونکہ عینک نہ لگاتے تھے لہذا پڑھتے وقت کتاب کو آنکھوں سے ملائے رکھتے تھے۔ اُن کے بال لمبے تھے اور لباس وہی پہنتے تھے جو عام طور پر قسطنطنیہ کے علما استعمال کرتے ہیں۔ کھانا کم کھاتے تھے اور دن میں عموماً ایک دفعہ سے زیادہ نہ کھاتے لیکن چاء ایرانیوں کی طرح دن بھر پیتے رہتے تھے۔ تمباکو بھی بہت پیتے تھے اور اس میں یہ اہتمام تھا کہ اپنے پینے کا تمباکو خود خریدتے تھے اکثر مشرقی سگریٹ پیا کرتے ہیں لیکن وہ سگار کو سگریٹ پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں جو انہوں نے قسطنطنیہ میں گزارے انہیں سلطان المعظم کی طرف سے ۷۵ پاؤنڈ ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا۔ نشان تاش میں ایک سجا سجایا مکان بھی سلطان نے اُن کی سکونت کے لئے مقرر کر دیا تھا اور ان کی سواری کے لئے گاڑی اور گھوڑے بھی اصطبل سلطانی سے

بھیجے جاتے تھے۔ وہ بالعموم دو منزلہ مکان پر رہتے تھے اور شام کے وقت گاڑی میں سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے گیا یا قہوہ خانوں یا قلعیہ کی کسی اور تفریح گاہ کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہ سوتے کم تھے اور دیر میں سو کر بہت سویرے اٹھتے تھے جو شخص ان سے ملنے جاتا تھا عام اس سے کہ وہ ادنیٰ حیثیت کا ہو یا بہت ہی بڑا درجہ رکھتا ہو۔ اس سے وہ بہ اخلاق و مہربانی پیش آتے تھے لیکن لوگوں کے مکان پر خصوصاً بڑے درجے کے آدمیوں کے ہاں ملاقات کے لئے بہت کم جاتے تھے۔ تقریر ان کی خوش گو شیریں اور فصیح و بلیغ ہوتی تھی وہ ہمیشہ شستہ و پاکیزہ زبان استعمال کرتے تھے سوقیانہ و پیش پا افتادہ محاوروں سے بچتے تھے۔ لیکن حتی الامکان تکلم الناس علی قدر عقولہم کے اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ تقریر کرنے کے فن میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا اور مشرق بھر میں کم ایسے شخص ہوں گے جو ان کی ٹکر کے ہوں۔ ان کے اندازِ گفتار سے متانت اور تمکنت مترشح ہوتی تھی اور استہزا بیہودہ گوئی سے وہ قطعاً ابا کرتے تھے۔ وہ تونگر تھے مگر ان کی تونگری کا سرمایہ قناعت تھی۔ دنیا کے مال و متاع کی ان کو بہت کم پروا تھی فطرتاً وہ جری اور دلاور تھے راست بازی اور شیر دلی ان کے خمیر میں داخل تھی اگرچہ مزاج اعتدال پر ہوتا تھا جس سے وہ جھک کر بڑے منکسر المزاج ہو کر ملتے تھے لیکن بڑے آدمیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ آزادی و استغنا کی شان لئے ہوئے ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب وہ مصر سے نکالے گئے تو سویز میں بحالت تہی دستی پہنچے۔ ایرانی قونصل نے چند ایرانی سوداگروں کے ہمراہ جا کر انہیں کچھ روپیہ دینا چاہا اور کہا کہ اس ناچیز رقم کو یا تو بطور ہدیہ قبول کیجئے اور یا قرض سمجھ کر لے لیجئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر رقم کے لینے سے انکار کر دیا کہ آپ اس روپیہ کو اپنے پاس ہی رکھئے اسلئے کہ بنسبت میرے آپ اس کے زیادہ محتاج ہیں ؎

تو باز باش کہ صیدے خوری و تحفہ دہی
طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پر و بال

ان کے قوائے عقلیہ و ممیزہ حیرت انگیز تھے جو لوگوں کے دل میں ہوتا تھا ابھی وہ ظاہر بھی نہ ہونے پاتا تھا کہ ان کی قوت انتقالِ ذہنی اس پر حاوی ہو جاتی تھی ان کے کلام میں جادو کا سا اثر تھا جو بات ان کی زبان سے نکلتی تھی سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی۔ ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں فلسفہ قدیم، فلسفۂ تاریخ، تاریخ اسلام، تمدنِ اسلام اور جملہ اسلامی علوم و فنون میں انہیں متبحرانہ دستگاہ حاصل تھی وہ ہفت زبان تھے عربی، ترکی، فارسی اور پشتو کے علاوہ جو گویا ان کی مادری زبان تھی وہ انگریزی روسی اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ فرانسیسی زبان انہوں نے تین مہینے میں استاد کی مدد کے بغیر اتنی سیکھ لی کہ

پڑھنے اور ترجمہ کرنے کے قابل ہوگئے۔ مطالعہ میں ان کا شغف حد درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ خصوصاً فلسفہ اور فارسی تصانیف تو ان کی ہر وقت کی مونس و ہمدم تھیں۔ انہوں نے شادی عمر بھر نہ کی اور تمام عمر تجرد میں گزار دی۔

سید صاحب کی صورت و سیرت کی تصویر اپنے لفظوں میں کھینچنے کے بعد جرجی زیدان ان کی پولیٹیکل تمناؤں کو یوں ظاہر کرتا ہے: سید جمال الدین کی زندگی کا نصب العین اور وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد ان کی امیدوں اور عمر بھر کی کوششوں کی پرکار گھومتی رہی، اتحاد اسلام اور ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کا قیام تھا جو ایک خلیفۃ المسلمین کے ماتحت ہو۔ اس کوشش میں انہوں نے اپنی تمام طاقتیں صرف کر دیں، دنیا کو چھوڑ دیا، شادی نہ کی اور کسب معاش کے لئے کوئی پیشہ نہ اختیار کیا تاہم وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے اور اپنے خیالات اور آرزوؤں کی کوئی تحریری یادگار بجز اس کتاب کے جو انہوں نے ملاحدہ کے رد میں لکھی ہے اور چند مختلف الموضوع رسالہ جات اور مضامین کے نہیں چھوڑی لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دلوں میں خیالات کی ایک نئی روح دوڑا دی جس نے ان کے قلم میں روانی اور ان کے دماغ میں جولانی پیدا کر دی۔ اس سے مشرق کچھ فائدہ تو اٹھا چکا ہے اور کچھ اٹھائے گا۔

تمباکو کا اجارہ | سید صاحب کی حیرت انگیز شخصیت میں جو مقناطیسی بلکہ برقی اثر مضمر تھا اس کا ادنیٰ قصہ اس واقعہ سے ذہن میں آسکتا ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک سنی المذہب عالم تھے اور اس لحاظ سے ایران میں جو شیعیت کا گھر ہے ان کا کوئی اثر نہ ہونا چاہئے تھا لیکن پھر بھی انہوں نے صرف یہ کیا کہ ایران کے عامۃ المسلمین کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور ان میں ان خیالات کی روح پھونک دی جنہوں نے چند ہی دنوں میں استبداد و شخصیت کا طبقہ الٹ دیا بلکہ علمائے کرام و مجتہدین عظام کو اتحاد بین المسلمین کی اصولی ضرورت سے آگاہ کر کے اپنا اس حد تک ہم خیال بنا لیا کہ جب ناصر الدین شاہ نے انگریزی کمپنی کو تمباکو کا اجارہ دے دیا تو سید جمال الدین کے ایک خط سے متاثر ہو کر مجتہد اعظم حاجی میرزا حسن شیرازی نے اس مضمون کا فتویٰ جاری کر دیا کہ تاوقتیکہ اجارہ منسوخ نہ کر دیا جائے اہل ایران پر تمباکو پینا حرام ہے۔ المنار کے ایڈیٹر سید محمد رشید لکھتے ہیں کہ اس خط نے جناب مجتہد اعظم کو جن کا روحانی اثر اہل ایران کے دلوں پر مستولی ہے گویا نفس اور قومی جوش کی تصویر بنا دیا چنانچہ آپ نے استعمال و کاشت تمباکو کی حرمت کے متعلق فتویٰ جاری فرما دیا اور تمام علمائے ایران نے اپنے اپنے حلقہ اثر میں اس فتویٰ کو بجلی کی سرعت کے ساتھ نافذ کر دیا۔ لوگوں نے بھی اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا

چنانچہ جس شام کو فتوے کی اشاعت طہران میں ہوئی اس کی دوسری صبح کو شاہ نے قلیان مانگا تو اسے یہ جواب ملا کہ محل میں تمباکو کی ایک پتی بھی موجود نہیں سب جلا ڈالا گیا۔ شاہ نے فرطِ استعجاب سے وجہ دریافت کی تو خدام نے کہا کہ حضرت حجت الاسلام حاجی مرزا حسن شیرازی مجتہد اعظم نے اس کے استعمال کے خلاف فتویٰ جاری فرما دیا ہے۔ شاہ نے جب پوچھا کہ پہلے میری اجازت اس بارے میں کیوں نہیں لی گئی تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اس میں اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اسکے بعد شاہ کو طوعاً و کرہاً اجارہ منسوخ کرنا پڑا اور انگریزی کمپنی کو پانچ لاکھ پاؤنڈ بطور تاوان دینے پڑے۔

پروفیسر براؤن سید جمال الدین کی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیائے اسلام کے واقعات پر تیس سال تک جو اثر عجیب و غریب شخص ڈالتا رہا اسکے لحاظ سے غالباً اس کا کوئی اسلامی معاصر اسکی برابری نہیں کر سکتا۔ اسکی مکمل سوانح عمری کے لکھے جانے کے یہ معنی ہونگے کہ مسئلہ مشرقیہ کی زمانہ حال کی پوری تاریخ قلمبند کی جائے جس میں افغانستان اور ہندوستان کے تذکرے کے علاوہ ٹرکی، مصر و ایران کے حالات پر نظر انتقاد ڈالی جائے جہاں اس کا اثر ابھی تک مختلف صورتوں میں بمنزلہ ایک زندہ طاقت کے ہے۔

زندہ تحریک | پروفیسر براؤن کی استشراقی قابلیت مسلم الثبوت ہے۔ ایران کے لٹریچر اور پالیٹکس میں جو دستگاہ انہیں حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ مصر اور ٹرکی کے معاملات پر بھی وہ اچھی طرح رائے زنی کرنے کے اہل ہیں اور اس لحاظ سے ان کا یہ دعویٰ کہ مصر، ٹرکی اور ایران میں سید جمال الدین کی قائم کی ہوئی تحریک زندہ صورت میں موجود ہے ہر طریق سے قابل تسلیم ہے لیکن تعجب تو یہ ہے کہ باوجود ان آسانیوں کے جو ایک ہمہ گیر پریس نے حصول معلومات کے متعلق آجکل بہم پہنچا رکھی ہیں پروفیسر ممدوح ہندوستان کے حالات سے یہاں تک بے خبر ہیں کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کی بیداری کو بھی بلحاظ اس بیداری کی خاص نوعیت کے سید جمال الدین کی تحریک سے منسوب کرتے ہیں۔ انقراضِ دولتِ مغلیہ کے بعد دولت و اقبال اور علم و فضل کا مسلمانانِ ہند کو جواب دے جانا۔ افلاس و جہالت اور ذلت و ادبار کی تیرہ و تار گھٹاؤں کا چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر انکو گھیر لینا۔ انکے امراء کی عشرت مزاجی۔ انکے علماء کی بے راہ روی انکے خواص کی بے بصری۔ انکے عوام کی بے خبری کا اغیار و اجانب کے نزدیک ناقابلِ اصلاح ٹھیرنا۔ اس یاس آفریں حالت میں یکایک رحمتِ حق کو حرکت ہوتا اور اس رحمت کا حضور رحمۃ للعالمین ﷺ کی آلِ اطہر کے ایک برگزیدہ فرد یعنی سید احمد خان کی شکل میں ظاہر ہونا۔ سید احمد خان کا اپنے آنسوؤں سے اپنی قوم کے اس باغ کو جس میں سات کروڑ خزاں رسیدہ پودے پڑے

مختصر یہ کہ سید صاحب کی آبیاری سے باغ میں کچھ بہار آتا جو مخالفت و اوہام پرستی کے دل بادل چھٹنا۔ اس متعصبانہ مغائرت کا جو عیسائی حاکموں اور مسلمان محکوموں کے درمیان چلی آتی تھی خاتمہ۔ مسلمانوں کا اس سچے یقین کے ساتھ کہ ہندوستان کی حدود کے اندر انہیں اپنے پولیٹیکل تفوق کے احیا کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزوں کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کے عقیدت مندانہ تعلقات قائم کرلیں۔ ان تعلقات کے استحکام میں انگریزوں کے اس طرز عمل کو جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو انتظام حکومت میں خاص خاص معاملات کے ساتھ شریک کر دیا ہے حصہ لینا اور اس طور پر دنیائے اسلام کے ہندوستانی خطہ میں بجائے اس کے کہ مسلمان اپنے سیاسی کھنڈروں پر ایک خالص اسلامی محل از سر نو تعمیر کرنا چاہیں۔ انکا ایک انگلو مسلم محل کی تعمیر میں مصروف ہو جانا کیا یہ تمام واقعات پروفیسر براؤن تک نہیں پہنچے اور کیا یہ سید جمال الدین کی شخصیت کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جس شخص نے جگایا انہیں حضیض مذلت سے نکال کر اوج عزت پر جس شخص کی مساعی جمیلہ نے پہنچایا وہ سید احمد خاں ہے جو اپنی زبردست شخصیت اور حیرت انگیز قابلیت دل و دماغ کے لحاظ سے کسی طرح سید جمال الدین سے کم نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ کئی ایک اعتبار سے اس پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔

پروفیسر براؤن کی رائے

بہرحال ہندوستان سے اگر ہم قطع نظر کریں تو اس میں ذرا شک نہیں کہ اسلامی دنیا کا باقی اکثر حصہ سید جمال الدین کی ان کوششوں کا رہین منت ہے جنہوں نے جمود و غفلت کے طلسم کو توڑ کر موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی اور پروفیسر براؤن نے ذیل کے بلیغ الفاظ میں جو رائے سید صاحب کی نسبت ظاہر کی ہے وہ حقیقت کی تصویر ہے۔

"مبداء فیاض نے اس شخص کے دل و دماغ میں حیرت انگیز قابلیتیں ودیعت کی تھیں اسکی ساری عمر خانہ بدوشی میں گزری اور باوجود فصاحت تقریر و بلاغت تحریر کے جس میں تبحر علمی اور وسعت معلومات دینی و دنیوی نے اسلامی درد کے ساتھ مل کر ایک اعجاز آفریں کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسکے پاس کوئی طاقت نہ تھی لیکن اسی طاقت کا یہ اثر تھا کہ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے لرزتے تھے۔ ان قوتوں کو حرکت میں لا کر جو اس کے ایک اشارہ پر چلتی تھیں اور جن پر یورپ اور ایشیا کے ارباب تدبر قابو نہ پا سکے اس نے فن سیاست کے ماہروں کے بڑے بڑے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ مصری وطن پرستوں کی تحریک اسی کی پیدا کی

ہوئی ہے اور اگرچہ ۱۹۰۸ء میں اس تحریک کے علمبرداروں کو شکست ہوئی لیکن

اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں

ایران کی دستوری تحریک کا بانی بلا تامل اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے اُس نے دول اسلامی کو اُن خطرات سے آگاہ کیا جو قضائے مبرم کی طرح ان کے سر پر سوار ہیں اور ان کو بتایا کہ دول یورپ کی مسلسل اور جارحانہ دست اندازیوں کا توڑ کرنے کے لئے ان میں باہمی اتحاد کا ہونا لازمی ہے۔ مسلمانوں کی چند خود مختار حکومتیں یعنی ترکی ایران اور مصر کو جو دستبرد روزگار سے اب تک بچی ہوئی ہیں دول یورپ کی انفرادی یا اجتماعی دراندازیوں سے خطرے میں ہیں اور یہ خطرہ انہیں بتدریج اس اتحاد پر مجبور کر رہا ہے جسے پان اسلامزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سچ پوچھا جائے تو پان اسلامزم کا خیال سید جمال الدین ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اگر کوئی اسلامی فرمانروا اس شخص کو ایسا ملتا جو اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا پورا پورا احساس کرتا اور جوش اسلامی و اخوت قومی کے جذبات سے اس حد تک متاثر ہوتا کہ ان آرزوؤں کو قوت سے فعل میں لا سکتا تو سید جمال الدین بہت بڑا کام کر گیا ہوتا۔ ناصر الدین شاہ نے جو خود غرضی استبداد اور مطلق العنانی کا جیتا جاگتا مرقع تھا کچھ دن کے تجربہ میں اسے مایوس کر دیا۔ البتہ سلطان عبدالحمید خاں کی ذات کے ساتھ اسکی بہت امیدیں وابستہ تھیں چنانچہ اس نے عملی طور پر ایک نئی تحریک کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا جو ابھی تک بہت سے ذی اثر ایرانیوں کا مطمح نظر ہے۔ اس تحریک کا منشا یہ ہے کہ ترکی سنیوں اور ایرانی شیعوں میں اس سمجھوتے کے ساتھ باہمی اتحاد قائم ہو جائے کہ ایرانی سلطان ترکی کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کریں اور ترک شاہ ایران کو شیعوں کا مقتدا مان لیں اور دونوں فریق ان خاص خاص لاطائل باتوں کو چھوڑ دیں جنہوں نے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے۔ سید جمال الدین پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ دونوں سلطنتوں کو ایک ہی قسم کے خطرات کا سامنا ہے اور ان کی خیر اسی میں ہے کہ بجائے ایک دوسرے پر زہر اگلنے اور باہم دست و گریباں ہونے کے وہ اپنی متحدہ طاقت کو اس حریف کے خلاف عمل میں لائیں جو دونوں کا یکساں دشمن ہے۔ اس حقیقت کا ادراک اگر سنی و شیعی دنیا نے کر لیا تو کوئی دن جاتا ہے کہ دنیا سید جمال الدین کی عمر بھر کی محنت کو ٹھکانے لگا ہوا دیکھے گی۔

نوٹ: مولانا کا یہ مضمون آج سے کئی برس پہلے کا لکھا ہوا ہے جب اینگلو مسلم "اتحاد" اور انگریزوں کے عزائم کو آجکل کی اسلامی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (مدیر)

السیّد الافغانی اور خلافتِ ترکیہ

(جناب مولانا اظہر امرتسری۔ مدیر و رئیس التحریر روزنامہ "زمیندار")

(۱)

ملوکیت کے غسل آبِ عدل و رحم سے لیکن
نہیں مٹنے کا اس کے ناصیہ سے داغِ خونریزی (اظہر)

سید جمال الدین افغانی ۱۸۷۰ء کے اوائل میں قسطنطنیہ پہنچے جہاں عمائد سلطنت نے وزیر اعظم کی زیر قیادت ان کا شاندار استقبال کیا اور قیام و طعام کے لئے شاہانہ آسائشیں بہم پہنچائی گئیں ابھی ان کو دو مہینے ہی یہاں رہتے ہوئے گذرے تھے کہ اسلامی حکومت کا یہ سب سے بڑا مرکز ان کی علمی و اجتہادی قابلیت کی نمائش گاہ بن کر رہ گیا تمام سیاسی و علمی حلقے خود بخود ان کی طرف متوجہ ہونے لگے ایک طرف حکومت کے قدامت پسند ارکان ان کے ارشادات سنتے نویدِ خیالات کی کوشش کرتے دوسری طرف اصلاح و دستور کے حامیوں کا گروہ ان کے خیالات سے اپنی فکر و نظر کی پرورش کرنے لگا لیکن سید صاحب کا انقلاب آفریں طریق کار دستوریت پسند احرار کے لئے بہت زیادہ قابلِ قبول تھا وہ فلسفیانہ دلائل اور بصیرت افروز براہین کی امداد سے ایک ایسے ذہنی انقلاب کے متمنی تھے جس کے نتائج کا عملی پہلو دنیائے اسلام میں سیاسی انقلاب کا موجب ہو سکے تاکہ دوسری قوم کی دیکھا دیکھی ملتِ اسلامیہ میں جو محدود وطنیت اور قومیت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اس کو احساسِ اخوت میں تبدیل ہونے کا موقع مل سکے ان کے خیال میں یورپ کی غلام سازانہ پیش قدمی کا انسداد کسی ایک ملک کے بس کا روگ نہیں تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان

اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے ایک لڑی میں منسلک ہو جائیں، اور اس حسرت کا ذریعہ تکمیل وہ اصلاح ترکی کے پردے میں دیکھ رہے تھے۔ ترکی مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت ہونے کے علاوہ اپنی تاریخی، جغرافیائی اور عسکری اہمیتوں کے باعث سید صاحب کے تمام نظریات کا مرکز تھی ان کو اس امر کا یقین تھا کہ جس طرح اسلامی سطوت کی صبح ترکوں کے خون میں نہا کر طلوع پذیر ہوتی رہی ہے اسی طرح ایشیا کی جدید ترقی کا سورج بھی اسی قوم کے دامنِ شجاعت و قابلیت سے نکلے گا اور ساری دنیائے اسلام کو اخوت و اتحاد کی تجلیوں سے روشن کر دے گا۔

ترکی کی سیاسی حالت انیسویں صدی کے اواخر میں ترکی کی سیاسی حالت مختلف اسباب کی بنا پر بگڑی ہوئی تھی، غیر ملکی سفیروں کو اس درجہ مراعات حاصل تھیں کہ وہ اپنے سفارت خانہ میں بیٹھے ہوئے تمام ترکی مقبوضات میں سیاسی سازشوں کا جال بچھا سکتے تھے ان کے اختیارات کا دائرہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہو چکا تھا کہ ہر سفارت خانہ بذاتِ خود ایک خود مختار حکومت تھا۔ انگلستان، اٹلی، فرانس اور برطانیہ کے اپنے ڈاک خانے تھے جن کے رسل و رسائل کا ذریعہ اس درجہ ہمہ گیر تھا کہ جب اتحادیوں کو ضرورت محسوس ہوتی غداران ملک کو خط و کتابت کے ذریعے سے بغاوت و سرکشی کی آزادی سے تعلیم دے سکتے تھے چنانچہ روسی سفیر قسطنطنیہ میں بیٹھا ہوا بہ آسانی بلقان میں بغاوت کی آگ پھیلا رہا تھا اور اس المناک مقصد کی راہِ تکمیل میں اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی بلکہ بعض غدار امراء جن کے ضمیر کی صدا اشرفیوں کی جھنکار میں دفن ہو چکی تھی اس کے اشارۂ ابرو پر ناچ رہے تھے۔ ڈاکخانوں کے علاوہ علمائے مغرب نے اپنی عدالتیں بھی قائم کر رکھی تھیں جہاں وہ اپنے اپنے ملک کے مہاجرین کے مقدمات کی سماعت کرتے بلکہ بعض اوقات کسی ترک اور انگریز کے درمیان جھگڑا ہو جاتا تو اس کے تصفیہ کے اختیارات بھی برطانوی سفیر ہی کو حاصل ہوتے ان عدالتی اور حاکمانہ اختیارات کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکی سفیروں کو ترکی میں اپنے اپنے ملک سے زیادہ مؤثر اقتدار حاصل ہو گیا اور یہی اقتدار ان کی سازش انگیز سرگرمیوں کو حصولِ مقصود تک پہنچنے میں امداد دیتا تھا۔

خارجی شورشیں غیر ملکی سفیروں کو مدارس کھولنے کی بھی کامل آزادی حاصل تھی ان مکتبوں میں ترکی کا اسلامی علم و ادب

کی بجائے یورپی زبان و تہذیب کی تعلیم دی جاتی اور طالبان علم کی ذہنیت مناسب تربیت سے کچھ اس درجہ مکدر بنانے کی کوشش کی جاتی کہ وہ بڑے ہو کر حمیت ترکی پر یورپی اقتدار کو ترجیح دے سکیں غرضیکہ سفراء کے حد سے بڑھے ہوئے اختیارات نے ترکی حکومت کی سیاسی روح نیم مردہ کر دی تھی خدا بھلا کرے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کا جن کی آزادانہ مساعی سے مراعات کا خاتمہ ہو گیا ورنہ ترکی پر آج بھی یورپی تسلط ہوتا ۔

ترکی کے تمام مقبوضات میں وطنی حریت کی آگ مشتعل ہو کر بغاوت و سرکشی کے شعلے برسا رہی تھی بلقان کی تمام ریاستیں روسی پراپگنڈے سے متاثر ہو کر خونریز انقلاب کا علم بلند کر رہی تھیں ۔ عرب کے مختلف صوبوں میں وطنی آزادی کا احساس اس درجہ ترقی کر چکا تھا کہ وہ ترکوں کی نام نہاد سیادت کو اپنی انسانیت و شرافت کے لئے سب سے بڑی لعنت قرار دے چکے تھے چنانچہ شام میں وطنی خود اعتمادی کا درخت بغاوت کے برگ و بار سے سرسبز ہو چکا تھا باغیوں کی سرگرمیاں اس درجہ ہمہ گیر ہو چکی تھیں کہ سارا عرب ایک ایسے انقلاب کے اجزا فراہم کر رہا تھا جس کی ایک ہی جنبش سے ایوانِ خلافت کی بنیادیں متزلزل ہو کر رہ جائیں ان شورشوں نے حکومت کو جیو تییوں بھرا کباب بنا رکھا تھا ایک فتنے کو وہ دبانہ چکتی کہ دوسری قیامت اپنی تمام ہلاکت انگیز قوتوں کے ساتھ میدانِ ظہور میں آجاتی ایک ملک کے باشندوں کا جوشِ بغاوت ابھی ٹھنڈا نہ ہونے پاتا کہ دوسرے ملک کے باغی خون و آتش کا طوفان اٹھاتے ہوئے میدان جنگ میں آجاتے ۔

داخلی حالت اس زمانہ میں اصلاحات کی ضرورت کا احساس نشو و ترقی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ترکی حکومت جو دنیائے اسلام میں سینکڑوں انقلابات کی پیدا وار تھی خود ایک ہولناک انقلاب کے دروازے پر کھڑی تھی ۔ یورپی حکومتوں کا جوشِ استعمار پسندی ملک کے ذرہ ذرہ سے فتنۂ ہلاکت انگیز بن کر اٹھنا چاہتا تھا ہمدردانِ ملک اس پُر آشوب ہنگامہ کے دفاع کی غرض سے ملک میں اصلاحی انقلاب کے ذریعہ سے عزم و عمل کے جذبات میں حرکت پیدا کرنے کی فکر میں تھے ۔

عوام میں وطنی آزادی کا جوش پوری طرح کارفرما تھا۔ ترکی کا ایک ایک باشندہ بھی اپنے وطن پر افیاء

کا قبضہ برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ حکومت محض خلیفہ کے شخصی اقتدار ہی کی زمرداؔ نہ ہو بلکہ اس میں عوام بھی آزادیٔ رائے کے استعمال سے برابر کے شریک ہوں تاکہ کارکنانِ حکومت اپنی بے اعتدال روش پر مسئول ٹھہرائے جا سکیں اور راعی و رعایا سیاسی و ملکی تعلقات کے اعتبار سے ہم مقصد ہوں۔ ان مقاصد کی اہمیت و صداقت پر ترکی کا سیاسی زوال ایک روشن ترین شہادت تھا۔ روشن دماغ مدبرین کا یہ نظریہ یقین و اعتماد کی تائید حاصل کر چکا تھا کہ اگر خلافت کے مسلم فریب نام پر اسلامی جمہوریت کے اصول قربان کر دیئے گئے تو یورپ کی تشویشناک پیش قدمی اس مردِ بیمار کو آخری ہچکی لینے پر مجبور کر دے گی یورپ کا وہ جوشِ خون ریزی جو صلیبی جنگوں سے نشوونما پا کر ترکی کی دائمی تباہی پر ختم ہونا چاہتا تھا پوری طرح کار فرما ہو چکا تھا ترکی حکومت اغیار کے مسلسل حملوں کے باعث بے حد کمزور ہو چکی تھی اس پر خلیفوں کی مطلق العنانی اور بے پروائی اس کمزوری کا علاج موت سے کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ایک طرف روسی حملے کا خوف لرزہ براندام کئے ہوئے تھا دوسری طرف آسٹریا اور اس کے یورپی حلیفوں کی دھمکیاں بہت بڑے خطرے کا موجب بنی ہوئی تھیں۔ خاک بلقان سے بغاوت و خون ریزی کے فتنے اٹھ اٹھ کر منظم ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ ترکی کا سیاسی و مذہبی حریف (یورپ) تو سیاسی و جمہوری ترقی کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد منزلِ کمال تک پہنچ چکا تھا ہر ملک میں رائے عامہ پر ذمہ داری کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ سیاست سرتاپا جمہوری اصول میں ڈھل چکی تھی کوئی قانون عوام کو استبدادی زنجیروں میں جکڑنے کا ذریعہ نہ ہوتا بلکہ جمہور کی شخصی و ذہنی آزادی کا محافظ بنا کر نافذ کیا جاتا حکمرانی کا طریق اطمینان رعیت کا موجب تھا لیکن اس کے مقابلہ میں ترکی صدیوں کی استبدادی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس کے آئین حکمرانی سرتاپا عہدِ گذشتہ کی یادگار تھے وہی دقیانوسی نظام حکومت، وہی عوام آزار استبداد، وہی شخصی ملوکیت اندھیر گردی، وہی سیاسی توہم پسندی، وہی دار و گیر کا ہنگامہ غرضیکہ نظام حکومت اور حلقۂ حکمرانی کا ہر حصہ اسی ستم پرورانہ جہالت کا مرقع تھا جس کو دور کرنے کے لئے اسلام اپنا ترقی پسندانہ لائحہ عمل لے کر عالم وجود میں آیا تھا۔ "خلافت" کیا تھی؟ خلیفہ کے عشرت پسندانہ

اقتدار کی محافظ تھی اس کو عوام کے جذبات و خیالات کی نمائندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا ان برائیوں کے پیش نظر مصطفےٰ فاضل پاشا، مدحت پاشا اور ان کے رفقاء کرام نے اصلاح حکومت کے لئے یہ جوش جدوجہد کا آغاز کر رکھا تھا جس کو ترکی قوم کی اخلاقی اعانت اور سیاسی قوت نے ہمہ گیر تحریک، کا باس عطا کر دیا تھا۔ اس حرکت عمل کا نصب العین چونکہ خلافت کی شرعی تصحیح و تہذیب تھا اور ان اسباب محرکات کو عالم وجود میں لانا تھا جو ایک مطلق العنان سیاسی حکومت کے جسم سے شخصی و ذاتی اقتدار کا مادہ فاسد خارج کر دیں اور اس کو خلافت راشدہ کی صحیح مذہبی روح قبول کرنے کے قابل بنا دیں لیکن ملوکیت اپنے بچاؤ کے لئے ہمیشہ پُرفریب چالوں سے کام لیا کرتی ہے خلیفہ نے اپنی مطلق العنانی کی حفاظت کے لئے علماء سوء کے دامن میں پناہ لے رکھی تھی۔ چونکہ ملائیت، اور ملوکیت میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں دونوں کی بنا جمہور کی سیاسی اور مذہب ناآشنائی پر ہے اس لئے ملاؤں نے خلیفہ کی "ظل اللّٰہی" کو قائم رکھنے لئے اپنے ترکش علم سے کفر و الحاد کے زہر میں بجھے ہوئے تیر نکال نکال ترقی پسندوں کے جگر میں ترازو کرنا شروع کر دیئے یہ ملت فروش مُلّا اصلاح پسندوں پر اپنے مخصوص اور گھریلو مذہب کی روشنی میں سختی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے اور ان کی خالص مذہبی جدوجہد کو یورپ کی کافرانہ تقلید کا نتیجہ قرار دینے لگے تاکہ عوام کی سادہ ذہنیت نام نہاد مذہبی احکام کے نام پر کوئی جمہوریت پسندانہ تحریک قبول نہ کر سکے اس جہالت آفریں زمانہ میں سید صاحب کا ورود قسطنطنیہ جلتی پر تیل سے کم نہ تھا۔

سید صاحب کا مطالعہ سید صاحب نے چند ہفتوں ہی میں دُنیائے اسلام کے اس سب سے بڑے شہر کی ذہنی و عملی تحریکات کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا ان پر یہ حقیقت بہ آسانی کھُل گئی کہ باشندگانِ ترکی ملوکیت و استبداد کی جگہ جمہوریت و دستوریت قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے خیالات سیاسی وہم و وسواس کی تاریکی سے پاک ہو چکے ہیں لیکن حکومت کا متشددانہ رویہ عزم و ارادہ کو میدانِ عمل میں آنے نہیں دیتا تاہم سید صاحب نے انتہا پسندوں کے طبقے میں اچھا خاصا رسوخ حاصل کر لیا سیاسی افکار سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک نہ

ایک جماعت ہر وقت ان کے پاس رہتی اور ان کے ارشادات سے فکر و نظر کو روشن کرنے کی کوشش کرتی چنانچہ جریدہ "ترجمانِ سرحد" راولپنڈی میں ایک عربی اخبار کے حوالے سے سید صاحب کی سیاحت ترکی کے متعلق ایک مختصر مضمون شائع ہوا تھا جس کی یہ سطور اس سلسلے میں خاص طور پہ قابلِ توجہ ہیں کہ:۔

"سید صاحب کا قسطنطنیہ جانے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ سلطان کا تقرب حاصل کر سکیں یا حکومت کے وسیع حلقہ میں اپنے لئے کوئی اچھی جگہ تلاش کریں وہ ان باتوں کی پروا نہیں کرتے تھے وہ ایک آزاد مشرب اور ترقی پسند بزرگ تھے اگرچہ ان کے نزدیک نظامِ خلافت ایک قابلِ اطمینان اور حریت پرور ادارہ کا نام تھا اور ادارہ کو وسیع الاثر بنانے کے لئے ان کو بے شمار مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن خلافت سے ان کی مراد بابِ عالی کی استبداد پسند ملوکیت نہیں تھی بلکہ اس جمہوری نظام کو وہ خلافت کہتے تھے جس کی ابتدا پیغمبرِ اسلام سے ہوئی اور انتہا امام حسنؓ کی دستبرداری سے۔ وہ اس حکومت کو خلافت کا لقب دینا چاہتے تھے جو جمہوری و عمومی اصول کے مطابق خلافتِ راشدہ کی قائم مقام ہو ورنہ خلافت نام کے بغیر اور کوئی خوبی نہیں رکھ سکتی۔ بابِ عالی کی نام نہاد خلافت کے متعلق ان کا خیال تھا کہ "گنہگار کی قبر پہ قبہ بنایا گیا ہے" یعنی یہ خلافت نہیں بلکہ اپنے استبدادی نظام اور حریت کش تشدد کے باعث ملوکیت کی بدترین تصویر ہے جس کو آئینۂ خلافت میں دکھا کر مذہبی نظامِ سیاست کو بدنام کیا جا رہا ہے گویا ان کو ملوکیت سے لینن اور ٹراٹسکی سے بھی زیادہ نفرت تھی اس لئے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ سید محض سلطانِ ترکی کو خوش کرنے کی غرض سے قسطنطنیہ تشریف لے گئے ہوں۔ وہاں جانے میں ان کا یہ مقصد تھا کہ اصلاح پسند ان ترکی میں تہذیبِ خلافت کا جو انقلاب انگیز احساس پیدا ہو چکا ہے اس کو مناسب تربیت سے عمل و حقیقت میں تبدیل ہونے کے قابل بنایا جائے تاکہ ترکی ملوکیت بوجوہ تمام خلافتِ راشدہ کی قائم مقام ہو سکے اس کے بعد تمام عالمِ اسلام کو رشتۂ اخوت میں منسلک کرنے کی ابتدا

قسطنطنیہ سے کی جا سکے گی":

مرقومہ بالا سطور اس حقیقت پر ناقابلِ تردید شہادت ہیں کہ قسطنطنیہ میں سید صاحب کا رجحان طبعی حریت پرستوں کی طرف تھا چنانچہ قسطنطنیہ کے تمام سیاسی مفکر رات دن ان کی صحبت میں رہتے بسا اوقات ان میں اور سید صاحب کے درمیان اکثر مسئلۂ دستوریت پر مذاکرے ہوتے رہے چنانچہ "کواکب الشرق" میں ان مذاکرات کی کسی قدر تفصیل پیش کی گئی ہے۔

حقیقی خلافت کیا ہے؟

"کواکب الشرق" میں لکھا ہے کہ ایک دن سید صاحب کے سامنے چند لوگوں نے مسئلۂ خلافت کے متعلق سوالات کئے جن کے جواب میں سید صاحب نے فرمایا کہ:-

یورپ اور سیاسی فلاح | اس وقت یورپ میں سیاسی فلاح کی بنا تسخیر رائے عامہ پر رکھی جا رہی ہے اس مقصد کے پیش نظر جو نظریے پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ایک دو کے بغیر سب کے سب خیالات و مباحث کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے یورپ کی علمی آزادی کا تخیل تو بہت وسیع ہے لیکن عملی آزادی کے لئے جو ماحول تیار کیا جا رہا ہے وہ بہت تنگ ہے۔

میں حکمائے مغرب کے بعض اجتماعی اصول پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ ان کے لئے امن خیال کے بغیر کہیں جگہ میسر نہیں آ سکتی اور خیال لباسِ عمل میں آنے سے پہلے تنقید و تبصرہ کے قابل نہیں ہوتا تاہم مختصر یہ ہے کہ سیاسیاتِ یورپ ان تین قالبوں میں ڈھلنا چاہتی ہے یعنی

(۱) دستوریت (پارلیمانی نظامِ حکومت) جو رائے عامہ کو محدود آزادی کے استعمال کا حق دیتا ہے۔

(۲) جمہوریت (رائے عامہ کی مکمل نمائندہ حکومت)

(۳) اجتماعیت (شخصی آزادی و اقتصادی مساوات کا نظامِ حکومت یعنی سوشلزم)

علاوہ ازیں اشتمالیت (کمیونزم) اور اشتراکیت (بالشوزم) کی طرف بھی بعض انتہا پسند طبائع راغب ہیں لیکن یہ دونوں اصول کوئی علیحدہ چیز نہیں ہیں بلکہ "اجتماعیت" کی ترقی یافتہ صورت ہیں

اجتماعیت اور اسلام | اس میں شک نہیں کہ اجتماعیت میں اسلامی اخوت کی ہلکی سی جھلک موجود ہے اس اصول پر عمل پیرا ہونے سے نسل و رنگ کی تفریق مٹ جاتی ہے اور انسانیت کے مختلف ٹکڑے منظم ہو کر ایک مضبوط جسم کی صورت اختیار کر سکتے ہیں لیکن حکماء یورپ نے اجتماعیت کے قوانین و اسباب اس درجہ فلسفیانہ بنا رکھے ہیں کہ عوام کا سادہ دماغ ان پیچ در پیچ عقدوں تک پہنچ ہی نہیں سکتا اس اصول کی وسعت حد اعتدال سے اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ اس کو رائے عامہ کے نزدیک لانے کے لئے صدیوں کی ضرورت ہے۔ اس نقص کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اجتماعیت کا "تخیل مرکزیت" اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتا کہ ساری دنیا مذہب و تمدن کی حدیں توڑ کر اس کے قریب آجائے اگر اقتصادی مساوات کو حکمائے مغرب نے اجتماعیت کا تخیل مرکزیت اور مقصد المقاصد قرار دینے میں بڑی عقلمندی اور عوام فریب قابلیت کا ثبوت دیا ہے لیکن موجودہ زمانہ تجارتی و سیاسی رشک و رقابت میں صدیوں تک مصروف رہنے کا تہیہ کر چکا ہے جب تک وطنی طور پر سیاسی و اقتصادی رقابت کی سیاہی قلب انسانیت پر موجود ہے کوئی ملک یا جماعت "اجتماعیت" کے ناقابل عمل اقتصادی مساوات کو قبول نہیں کر سکتی لیکن اسلام نے مسلمانوں کے لئے جو اصول مرکزیت پیش کیا ہے وہ دل و دماغ کے علاوہ روح و وجدان کو بھی اپنی طرف کھینچ رہا ہے اس اصول کا نام "توحید و رسالت پر مکمل اعتقاد" ہے مسلمانوں کو جمع کرنے کے لئے یہی ایک چیز ہے جس کی قوت و جذب و کشش مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دیتی ہے اگر آج مسلمان ایک بار پھر توحید و رسالت کے نام پر جمع ہو جائیں تو اسلامی اخوت کی تجدید کوئی مشکل امر نہیں۔ اگر فرزندان توحید نے اتحاد اسلامی کا بھولا ہوا سبق دوبارہ

یا نہ کیا تو یورپ کے مقابلہ میں وہ کوئی متحدہ محاذ نہیں بنا سکتے ۔

معیار صداقت | موجودہ زمانہ میں ہر مذہب کو سیاسی قوت کے معیار پر پرکھا جاتا ہے ہر مذہب دوسرے مذاہب کے سامنے ایک حریف قوت کی صورت میں آ جاتا ہے لہذا جو مذہب سیاسی قوت بطور ثبوت صداقت نہیں پیش کر سکتا، گمراہ دنیا اس کی کبھی قائل نہ ہوگی اور سچ پوچھئے تو سیاسی قوت کے بغیر مذہب زندہ ہی نہیں رہ سکتا فرض کیجئے کہ ایک مبلغ اسلام تبلیغ وارشاد کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کوسوں دور ہے لیکن جب اس کو پیغام حق کی اشاعت سے ظلم وتشدد کے ساتھ روکا جائے گا تو اس وقت اس کے لئے دو ہی راہیں ہوں گی یا امر معروف کے فریضہ کو چھوڑ دے یا سیاسی قوت کا استعمال کرے (اس خیال کو ہم نے اس شعر میں ظاہر کیا تھا کہ) ؎

دعوت دیں میں نہیں جبر مگر جب دیں کو — چھیننے آئے تو تلوار اٹھائی میں نے

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یورپ تو سیاسی فلاح کا دروازہ لامذہبیت کی امداد سے کھولنا چاہتا ہے؟ اس کے جواب میں سید صاحب نے کہا کہ

یورپ اور مذہب | یہ کافرانہ جسارت بھی نیک نیتی کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام سے معاندت کی پیداوار ہے اگر آج یورپ مذہب سے بالکل آزاد ہونے کا اعلان کر دے تو کل صلیب و مسیحیت کے نام پر دنیائے اسلام کو غلام بنانے کے قابل نہیں رہے گا ۔

موجودہ زمانہ میں یورپ کی اکثر حکومتیں ایشیائی مقبوضات کی دولت اور پیداوار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں ۔ ان مقبوضات میں سے اکثر پر قبضہ جمانے کے لئے حرمت صلیب کا حربہ استعمال کیا گیا ہے اس حقیقت کے پیش نظر یہ خیال کر لینا کہ اہل یورپ محض خیالی مساوات کے لئے مذہب کی ظاہری عقیدت سے کبھی دست بردار ہو جائیں گے ذہنی دھوکا نہیں تو کیا

ہے؟ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ لامذہبیت اعتقادی ہے یا سیاسی۔

عیسائیت اور اسلام | یورپ کی مروجہ مسیحیت بذات خود نسل و رنگ کا احساس پیدا کرنے کی موجب ہے مسیحی دُنیا اعتقادی وحدت سے اس درجہ دور ہو چکی ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کو حقوقِ انسانیت سے بھی محروم سمجھنے پر مجبور ہے اور ہر عیسائی گروہ نسلی شرافت کو تفوق کا معیار قرار دے چکا ہے لیکن عوام کا ترقی پسند طبقہ ان افتراق انگیز الجھنوں سے گھبرا چکا ہے وہ نسل و رنگ اور مذہب و اعتقاد کی حدیں توڑ کر مساوات و اخوت کی دنیا میں آنا چاہتا ہے اب اس گروہ کے لئے دو راہیں ہیں ایک راہ تو روحانیت ہے جو حقیقی مذہب تک پہنچا دیتی ہے دوسری راہ مادیت کی ہے جو لامذہبیت پر ختم ہوتی ہے اگر وہ پہلی راہ اختیار کریں تو ان کو مساوات و اخوت کی تلاش میں اسلام کے دروازے پر پہنچنا پڑے گا کیونکہ اسلام کے بغیر دنیا کا کوئی مذہب اخوت و مساوات کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتا لیکن یورپ کے مدبر اسلام کی ترقی کو بہتر سے بہتر صورت میں بھی دیکھنا نہیں چاہتے لہذا انہوں نے فکر و نظر کی قوت سے ترقی پسند طبقہ کو کفر و گمراہی کی راہ پر ہی چلانا مناسب سمجھا تاکہ نوجوانوں کو نہ مذہب سے دلچسپی ہو نہ وہ اخوت و مساوات کی تکمیل کے لئے اسلام قبول کر سکیں ان کا خیال ہے کہ اسلام کی مخالفت پر عیسائیت کی قربانی کوئی بڑی چیز نہیں شاید وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دہریت عیسائیت کے لئے اسلام سے کم خطرناک ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یورپ میں مذہب کی حقیقی روح موجود ہی نہیں دہریت حملہ کرے گی تو کس پر؟ لیکن اسلام تو ہر خیال کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے مفکرین یورپ یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ اگر مغربی ممالک میں اسلام کامیاب ہو گیا تو اس کی تعلیم یورپ کے سیاسی ماحول میں ملک گیری اور غلام سازی کے خلاف ایک زوردار آواز پیدا کر دے گی

جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یورپی حکومتیں اس دولت سے محروم ہو جائیں گی جو ایشیائی مقبوضات سے حکومت کرنے کی اجرت کے طور پر بٹور رہی ہیں۔

<u>مذہب یا سیاسی حربہ</u> | یہ ہے یورپ کی مذہب دشمنی کی حقیقت اگر اس سے چند قدم اور آگے بڑھا جائے تو یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی کہ یورپ توسیع مملکت کے لئے جو آلات استعمال کر رہا ہے ان میں سے مذہب کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ جب اُسے کسی قوم کو محکوم بنانے کے لئے مذہبی حربہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سرزمین کا ہر فرد اپنے آپ کو پاپائے اعظم سے بھی بڑھ کر عیسائیت پرست بتاتا ہے لیکن جب اسی محکوم قوم میں مذہب کی حقیقی روح کارفرما ہو جاتی ہے اور وہ احکام مذہب کی تعمیل وطنی آزادی کی صورت میں کرنا چاہتی ہے تو "مذہب پرست" یورپ اس کے خلاف "مذہبی مجنونیت" کا فتویٰ عائد کر دیتا ہے گویا اس مہذب و معزز خطہ ارضی کے سامعین مذہب سے روحانی فلاح نہیں چاہتے ہیں بلکہ اس کو ایک ایسا سیاسی حربہ بنا چکے ہیں جو کبھی موت کا نمائندہ بنتا ہے کبھی زندگی کا قائم مقام۔

اس کی مذہب دشمنی اگر فراغ دلی اور رواداری کے نام پر آزاد لوگوں کو محکوم بنا سکتی ہے تو اس کی مذہب پرستی صلیبی محاربے ایسے ہولناک مناظر بھی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔

ان سطور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے تھوڑے سے ہی عرصہ میں سیاسیاتِ مغرب اور اہل مغرب کی پُر فریب چالوں کا پوری طرح مطالعہ کر لیا تھا۔ ورنہ ایسے حقائق کا انکشاف تو موجودہ زمانہ کے سیاسیین کا عقلی تجسس بھی نہیں کر سکتا حالانکہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیان بلحاظ معلومات زمین و آسمان کا فرق ہے اس زمانہ میں جدید تعلیم اور حلقۂ معلومات کی وسعت سے مغربی سیاست و ذہنیت کے تمام گوشے بے نقاب ہو چکے ہیں لیکن بہت کم جدید العلم ایسے ملیں گے

جو سید صاحب کی طرح اس مسئلہ پہ دلائل قاطع کے ساتھ بحث کر سکیں لیکن بدقسمتی سے اس زمانہ میں اہل ترکی کا سیاسی فہم اتنا ترقی پذیر نہیں ہو چکا تھا کہ اتنے بڑے سیاسی حقائق کے لئے حلقۂ مقبولیت پیدا کر سکتا۔ عوام کی بیداری اگرچہ ایک عظیم الشان انقلاب کی طرف گامزن تھی لوگ اصول جمہوریت کو اگرچہ بطور فلسفہ نہیں سمجھ سکتے لیکن بطور عمل قبول کرنے کو تیار تھے لیکن طرز حکومت اس درجہ تنگ تھا کہ اس میں سیاسی ترقی کے خیالات کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مُلاؤں کا مقتدر طبقہ خلیفہ کی حمایت پر تھا ان مفتیان سرکاری نے مذہب کے مقدس نام پہ جبر و تشدد کے ناپاک طرز عمل کو جائز قرار دے رکھا تھا جن قوتوں کے بل بوتے پر ملوکیت کا بھوت ناچ رہا تھا ان میں سے مُلاؤں کی فتویٰ فروشی خاص اہمیت رکھتی تھی یہ لوگ ہر ترقی پسند کو الحاد و کفر کا علمبردار قرار دینے سے دریغ نہ کرتے تھے اور ہر جمہوری تحریک کو نصاریٰ کی تقلید پر محمول کرتے تاکہ عوام مذہب کے نام پہ پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں میں اس درجہ مبتلا ہو جائیں کہ ان میں کوئی صحیح و صالح نظریہ قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہے اس تاریک دور میں سید صاحب کے خیالات کو جس نظر سے دیکھا گیا ہوگا اس کی تفصیل ظاہر ہے۔ ان کی باتیں اندھیرے میں نمودار ہونے والی روشنی تو تھی لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کی تعداد ابھی کم تھی۔

"شیخ الاسلام کی حاسدانہ روش"

سید صاحب کو قسطنطنیہ میں آئے ہوئے تین ماہ گذر چکے تھے ان کے قیام و طعام کا حکومت نے شاہانہ انتظام کر رکھا تھا لیکن ان کی سرگرمیاں ہمیشہ مخالفین حکومت کی حمایت میں رہیں شیخ الاسلام تک کبھی ان کے خیالات بعض ذرائع سے پہنچتے رہتے تھے وہ سید صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی مقبولیت پہ آتش حسد سے تو جل ہی رہا تھا جب اس کو سید صاحب کی جدت پسندانہ تعلیم سے آگاہی ہوئی تو وہ اور بھی مشتعل ہوا اسے کو خطرہ ہو گیا کہ عوام الناس کے ذہن و دماغ کو مُلاؤں نے جن وہم و وسواس کی زنجیروں

میں جکڑ رکھا ہے وہ سید صاحب کی مجتہدانہ کوشش سے ٹوٹ نہ جائیں وہ اپنے حلقۂ اثر میں سید صاحب کے خیالات کو الحاد کا نتیجہ قرار دیتا رہا۔ اسی اثناء میں سید صاحب بھی شیخ الاسلام کے پاس ملاقات کی غرض سے گئے۔ بارگاہ مشیخت اچھی خاصی پرستش گاہ بنی ہوئی تھی جو شخص آتا پہلے حسن فہمی آفندی (شیخ الاسلام) کے ہاتھ پاؤں چومتا اور سر جھکا کر اظہار تعظیم کرتا اس کے بعد نہایت انکسار سے کسی گوشہ میں بیٹھ جاتا تھا لیکن سید صاحب شخصیت پرستی کے اصول و ضوابط سے بالکل ہی ناواقف تھے وہ سلام مسنون کے بعد حسن فہمی کے بائیں طرف جا بیٹھے حسن فہمی کو یہ طرز عمل انتہائی طور پر ناگوار معلوم ہوا اس کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ یہ افغانی سیاح فی الواقعہ مولویت کے خانۂ اقتدار میں آگ دینے کی غرض سے آیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہا جب سید صاحب چلے گئے تو اس نے اپنے عقیدت کیشوں کو سید صاحب کے خلاف پروپگنڈا کرنے کے منصوبے سوچنے اور سید صاحب کی توہین و تذلیل کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرنے کی تاکید کی ان مقدسین کا گروہ اپنے زہد و تقدس کے تمام دعاوی کے باوجود سید صاحب کے خلاف اتنے ذلیل پراپگنڈا پر اُتر آیا جس کا تصور بدترین جاہل کا دماغ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

سید صاحب انجمن دانش ترکی کے رکن تو بن ہی چکے تھے اس لئے سرکاری اہل علم میں ان کی قابلیت اعتماد کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ دسمبر ۱۸۷۰ء میں عثمانی یونیورسٹی کے ناظم اعلیٰ نے سید صاحب سے استدعا کی کہ طلباء کے سامنے مسئلہ قومیت پر لکچر دیں لیکن سید صاحب نے کہا میں ترکی زبان اچھی طرح نہیں جانتا اس لئے اپنے خیالات کو بہترین الفاظ کا جامہ پہنا نہ سکوں گا لیکن ناظم اعلیٰ کے حد سے بڑھے اصرار نے اپنی بات منوا ہی لی۔ سید صاحب نے ایک تحریری خطبہ مرتب کیا جو جامعہ عثمانیہ میں پڑھنے سے پہلے صفوت پاشا وزیر تعلیمات، شروانی زادہ وزیر تجارت اور دوسرے اکابر حکومت کو دکھایا جنہوں نے اس خطبہ کو افادی اور علمی فیوض کا سرچشمہ قرار دیا

اس خطبہ میں سید صاحب نے قوم کو ایک پیکر متحرک سے تعبیر کیا اور مختلف افراد قوم کو اس کے اعضا سے نسبت دی مثلاً مختلف خدمات و اعمال کے پیش نظر زمیندار کو جگر، ملاح کو پاؤں، سپاہی کو ہاتھ، بادشاہ کو دماغ اور مفکر کو گردن سے تشبیہ دی اور روح کے متعلق کہا کہ :-

"جسم کی زندگی اور اس کے تمام اعضاء کی تحریک و تعمیل روح کے ماتحت ہے اگر قالب سے روح نکل جائے تو جسم ایک بے کار ڈھانچہ ہو کر رہ جائے گا۔

روح کا نام نبوت ہے جو ملت کے تمام اعضاء کو تحریک حیات بخشتی ہے اور اس کے اعمال و محرکات کو ان اصول کے مطابق بناتی ہے جو جسم کی حقیقی ترقی اور اس کی ذہنی عملی قابلیت کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ نبوت کے بعد اگر پیکر ملت کی روح کسی چیز کو سمجھا جا سکتا ہے تو وہ فلسفہ ہے لیکن نبوت اور فلسفہ میں بلحاظ حقیقت، بہت بڑا فرق ہے نبوت ایک عطیۂ الٰہی ہے جو رحمت خداوندی جس کو چاہتی ہے عطا کرتی ہے اس لئے روح نبوت جسم کی جس طریقہ سے قیادت و رہنمائی کرتی ہے وہ نقص و لغزش سے پاک ہوتا ہے کیونکہ نبوت کا فعل خدا کی مرضی کے عین مطابق ہوتا ہے لیکن ثانی الذکر (فلسفہ) اکتسابی ہے جو حکمت و علم پر غور و فکر اور معلومات و مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے فلسفہ کے دامن سے اگرچہ آفتاب حقیقت کا طلوع ہو سکتا ہے جس کی روشنی خانۂ جسم کے ہر حصے خصوصاً دل و دماغ کو نور بصیرت بخشتی ہے لیکن یہ چیز چونکہ انسانی کوشش کی پیداوار ہے اس لئے بعض وقت گمراہی کی طرف بھی راغب ہو سکتی ہے اس لئے فلسفہ کا ماخذ بھی علم نبوت (یعنی قرآن و حدیث) ہونا چاہئے تاکہ گمراہی کا احتمال کم رہے"۔

سید صاحب یہ خطبہ پڑھ رہے تھے تو شیخ الاسلام بھی اپنے چیلے چانٹوں سمیت بیٹھا ہوا موقع کا انتظار دیکھ رہا تھا جب سید صاحب نے اپنے خطبے کا آخری حصہ پڑھا تو شیخ الاسلام بے اختیار چلا اٹھا اس کے

حواری بھی اپنے اپنے پھیپھڑوں کی ساری قوت کے ساتھ شور مچانے لگے کہ یہ شخص فلسفہ و نبوت میں کوئی فرق نہیں جانتا اس کے خیالات ملحدانہ ہیں بس پھر کیا تھا جو لوگ پہلے ہی طوفان بدتمیزی اٹھانے کا تہیہ کر کے آئے تھے ان کو جہالت و فساد انگیزی کا موقع مل گیا جلسہ گاہ میں اخبار نویس، ادیب، مفکر اور عمال حکومت کافی تعداد میں موجود تھے جو سید صاحب کے خیالات پر اظہار تحسین کر رہے تھے لیکن ہنگامہ جہالت کے سامنے علم و تدبر کی لطیف و نرم آواز دعوائے مبارزت نہیں کر سکتی شور و غوغا میں سید صاحب اپنا خطبہ ختم کرنے پر مجبور ہو گئے سید صاحب کے خاموش ہوتے ہی جاہلوں نے نعرۂ مسرت بلند کیا اور ہر اس حرکت کا اظہار کرنے لگے جو فطری کمینگی کا نتیجہ ہو سکتی ہے ان کے دل میں جوش فساد ہوا کے اس جھونکے کی طرح جو شعلے کے دامن میں کہ وتیں لے لے کر اس کو لپکنے کے قابل بنا دیتا ہے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ کارفرما تھا شرفاء نے بصد کوشش ان کو خاموش کرنا چاہا لیکن جہالت کا مظاہرہ جاہل کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔ بہرحال جلسہ گاہ میں ہڑبونگ مچ گئی لیکن خوش قسمتی سے سید اپنے دوستوں کی امداد سے بخیریت قیام گاہ تک پہنچ گئے۔

اس واقعہ کے بعد شیخ الاسلام نے اپنے ترکش مولویت سے حسب عادت ایک زہر میں بجھا ہوا تیر سید صاحب کی طرف پھینکا یعنی ان کے خلاف فتوئے کفر عائد کر دیا اور اس درجہ مخالفانہ پراپگنڈا کیا کہ قدامت پسند اور سادہ لوح عوام سید صاحب کی اعتقادی صحت کے بڑی حد تک منکر ہو گئے بدقسمتی سے عوام کی ذہنیت ایک مصفا آئینہ کی طرح ہوتی ہے جو ہر روز نیا عکس قبول کرنے کی متمنی ہے وہ کوئی معیار صداقت تو رکھتے نہیں جس پر سچ جھوٹ کو پرکھ سکیں ان کا ہر فعل کورانہ تقلید کے تابع ہوتا ہے اگر کوئی مقرر عام فہم انداز میں ان کے سامنے جہاد کی اہمیت بیان کر دے تو وہ گنتی ہی جوش شہادت سے تڑپ اٹھیں گے ان کی رگ رگ میں خون شجاعت ہنگامہ برپا کر دے گا لیکن دوسرے دن ہی کسی عافیت کیش واعظ سے جنگ و ہنگامہ کی برائیاں سن لیں تو فوراً ان کا جوش

جہاد عافیت پسندانہ افسردگی سے تبدیل ہو جائے گا جب تک رائے عامہ صحیح و مؤثر تربیت سے مستفید نہ ہو جائے قوم کے خیالات سے تلون و تغیر کی برائی دُور نہیں ہو سکتی چنانچہ وہی عوام جو سید صاحب کو فرشتۂ رحمت خیال کرتے تھے حسن فہمی کے پراپیگنڈے سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے خلاف ہر قسم کی غلط بیانی پہ آمادہ ہو گئے اور قسطنطنیہ کے جاہل حلقے ان کی مخالفت کو مذہب و ملت کی سب سے بڑی خدمت قرار دینے لگے اسی اثناء میں مولویوں نے خلیفہ کو بھی سید صاحب کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے صورتِ حالات کے مطالعہ کی مزید مہلت مانگی سید صاحب کے خلاف جن سازشوں کا سلسلہ ایوانِ حکومت سے لے کر منبر مسجد تک بچھایا گیا تھا اس کے اثرات مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہے۔

ترکی خلیفہ اور سیّد صاحب

ترکی کے رجعت پسند جاہلوں نے سید صاحب کی جس قدر مخالفت کی اسی قدر اربابِ نظر و کمال میں ان کا حلقۂ اثر و مقبولیت وسیع ہوتا گیا چنانچہ سلیم آفندی ایک مشہور ترکی مدبر لکھتا ہے کہ:-

اسلام اور جمہوریت ۱۱ جنوری ۱۸۷۱ء میں حامیانِ دستور نے سید صاحب کو اپنی مجلس میں دعوت دی جہاں آپ نے بابِ عالی کی حکومت کے خلاف ایک پُر جوش تقریر کی اس تقریر کا صحیح خلاصہ تو آج تک ہماری نظر سے نہیں گزرا لیکن اس زمانہ میں ترکی کے نیم سرکاری اخبار "الجوائب" نے جو کچھ لکھا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ

صحیح و مؤثر سیاسی قوت کے بغیر مذہب زندہ نہیں رہ سکتا اسلام نے سیاست و مذہب کے مابین کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی چنانچہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تک خلافتِ راشدہ کی مسندِ جس بزرگ کے قدوم سے فیض یاب ہوئی وہ سب کے سب اکابرِ مذہب بھی تھے اور اصحابِ سلطنت بھی گویا مذہب وسیاست

ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع مشترک ہیں۔

مذہبی سیاست کی اہمیت | مذہبی سیاست قوم کو صحیح جمہوریت کی طرف لے جاتی ہے اور دنیوی سیاست اس کے برعکس مطلق العنانی اور ملوکیت کی طرف رہنمائی کرتی ہے چنانچہ تمام خلفائے راشدہ کا انتخاب اور ان کی مجلس شوریٰ کا تقرر اس امر کی روشن ترین شہادت ہے کہ مذہبی سیاست رائے عامہ کو مکمل اور مؤثر آزادی دیتی ہے لیکن اس کے برخلاف دنیوی سیاست کا سب سے بڑا کارنامہ ملوکیت کی تخلیق ہے جو رائے عامہ کی علانیہ توہین کر رہی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم مذہبی سیاست کو ایک بار پھر زندہ کر کے رائے عامہ کو آزادی کے حق سے محروم نہ ہونے دیں مذہبی سیاست کی تجدید کے لئے پیروانِ اسلام کا فرض ہے کہ اپنی اپنی حکومت کو اس کے جمہوری احکام کے تابع بنانے کی کوشش کریں۔

ملوکیت اور اسلام | حکمرانوں کو ذہنی انقلاب کے ذریعے سے یہ حقیقت ذہن نشین کرا دینی چاہئے کہ اسلام آزادی و مساوات کے دستور العمل کا نام ہے جس کے قوانین ایک خانہ بدوش اعرابی کو خلیفہ عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور امیر المومنین پر بہ سرِ عام اعتراض کرنے کی آزادی دیتے ہیں۔

جب اسلام آزادیٔ ضمیر اور حقوقِ انسانی کے معاملہ میں شاہ و گدا کو ایک سطح پر دیکھنا چاہتا ہے تو ہمیں اس امر کا بحیثیتِ مسلمان حق پہنچتا ہے کہ ہم خلیفہ کہلانے والے بادشاہ سے پوچھیں کہ تم مذہب کے نام پر اپنے آپ کو کروڑوں فرزندانِ توحید سے افضل و بہتر کیوں ٹھہرا رہے ہو؟ تمہاری سلطنت کی بنا قال اللہ وقال الرسول پر کیوں نہیں؟ تم خلافت راشدہ کے کھنڈروں پر ایوانِ خلافت تعمیر کیوں نہیں کرتے؟ تم محض اپنی ذاتی خواہشوں کے لئے اسلام کے جمہوری نظام کو کیوں تہ و بالا کر رہے ہو؟ اگر مذہب ہی کے باعث تم ہیں

یہ برتری حاصل ہے تو ہم کبھی مذہب کے نام سے زیادہ عقیدت مند ہیں ہمیں کبھی حکومت کی ذمہ داریوں میں کیوں شریک نہیں کیا جاتا؟

فلاح ترکی کا راز | ترکی حکومت کی فلاح کا راز اس میں مضمر ہے کہ شخصی ملوکیت تدریجی ترقی کرتی ہوئی خلافت راشدہ کی بلندی پر پہنچ جائے اور اس میں جمہوری آزادی قبول کرنے کی اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے جس کا مطالبہ عوام کر رہے ہیں اس ترقی پسندانہ دور کی ابتدا اس امر سے ہو کر خلافت نسلی نہ رہے بلکہ قومی بن جائے کیونکہ اسلام خلافت کو ملت اسلامیہ کی نمایندگی کا حق دیتا ہے اور یہ حق تمام قبائل و افراد ملت کے لئے مشترک ہے کوئی شخص محض شاہی نسل سے ہونے کے باعث کروڑوں بندگان خدا کی قسمت کا فیصلہ نہیں کر سکتا امیر اور خلیفہ اسلام اسی کو تسلیم کرتا ہے جس کا انتخاب رائے عامہ سے ہو اس کے ساتھ ہی خلیفہ کی رہنمائی کے لئے اسلامی پارلیمان (یعنی زمانہ راشدہ کی قسم کی مجلس شورائے) ہو جو قوم کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہو۔

پیغمبر اسلام اور جمہوریت | حضور محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جب تک تمہارے معاملات باہمی صلاح و مشورہ سے تصفیہ پذیر ہوتے رہیں گے تو تم ناکام نہیں ہو سکتے"۔ لیکن اس ارشاد قدسی کو جانتے ہوئے اس پر عمل نہیں کیا جا رہا۔ خلافت کو بالکل شخصی اور مطلق العنان حکومت میں تبدیل کر دیا گیا ہے یہ افراد قوم کے مشورہ کے بغیر قوم کی قسمت کا فیصلہ کر رہی ہے میرا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ ملوکیت زیادہ دیر تک خلافت کی قبا زیب تن نہیں کر سکتی۔ ملوکیت ارشاد نبوی کے ارشاد کی عملی مخالفت ہے اور خدا وند کریم کا قہر و غضب اس مخالفت کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔

روشن ترین پیشینگوئی | اگر تم نے خلافت کے نام کو بٹہ لگا دیا اب عالی کی حکومت کو شرعی

احکام کے مطابق مہذب بنانے کی کوشش نہ کی تو یہ کام خدا کی قدرت تو ادھورا نہیں چھوڑ سکتی ۔ آئندہ نسل کو اس امر کا خود بخود احساس ہو جائے گا کہ خلافت جمہوریت و دستوریت کی عملی صورت کا نام ہے یہ لوگ جب کامل ایک جہتی اور عزم راسخ لے کر اٹھیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے سر پر رحمت خداوندی کا ہاتھ نہ ہو۔ یہ جماعت جوشِ ایمانی کی امداد سے اس خلافت کہلانے والی ملوکیت کو خلافتِ راشدہ کے شعائر و اصول کے قریب لا کر ہی دم لے گی ۔ لیکن اس وقت تمہارا ذکر اگر وہ نفرت کے ساتھ کریں تو حق بجانب ہوں گے ۔

لامتبدل فیصلہ | شخصی تعلق کے متعلق میرا آخری اور لا متبدل فیصلہ ہے کہ یہ انسانی غرور و تکبر کی پیداوار ہے اور خلافت قانون خداوندی کے مطابق ہے خلافت ایک مکمل جمہوری نظام اور جماعتی نمائندگی کا نام ہے اور جماعت کے سر پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے انسانی قانون احکام خداوندی سے ٹکرا تو سکتا ہے لیکن اس ٹکر کی ہلاکت آفریں نتائج سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا اپنے خطبے کے آخر میں سید صاحب نے جہاد پر ان الفاظ سے تبصرہ کیا :-

جہاد اور اسلام | حضرت صدیق اکبر (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) کا ارشاد ہے کہ جہاد کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو سکتا تم پانچوں وقت نماز ادا کر لو حج و زکوٰۃ اور دوسرے فرائض و واجبات کی ادائیگی سے پوری طرح فارغ ہو جاؤ اس کے بعد تم مسلمان کہلانے کے تو مستحق ہو گئے لیکن جب تک تمہارے دل جوشِ جہاد کی گرمی سے محروم ہیں تم صحیح معنی میں مومن نہیں بن سکتے ۔ ایک شخص دن کو صائم اور رات کو قائم رہتا ہے لیکن جب قوم اور اسلام کو اپنی سرخروئی کے لئے انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے دعوت جہاد عام کی جاتی ہے تو اس وقت اگر یہ زاہد و عابد خلوت سے میدان کی طرف نہیں آتا تو اس کے ایمان میں نقص ہے اگر کوئی شخص اس عابد کو میدان جہاد میں کود نے کی دعوت دیتا ہے تو اس کے جواب میں وہ جان بچانے

کے لئے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ مجھے دُنیا سے دلچسپی نہیں میں تو صرف خدا تک پہنچنا چاہتا ہوں اگر جہاد منشائے خداوندی کے مطابق ہے تو میری ہر سانس خوشنودی باری تعالےٰ سے معمور ہے البتہ میں مجاہدین کے لئے دُعا کرتا رہوں گا فقیروں کا کام دُعا کے بغیر کچھ بھی نہیں ۔

یہ شخص زہد و عبادت کے نام پر دُنیا کو دھوکہ دیتا ہے کیا اسلام کی بنا صرف دُعا ہی سے قائم ہوئی یا جوش عمل سے ؟ خونِ شہید کا ایک قطرہ ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ وزن دار ہے۔ ایک جاہل غازی ہزاروں عالموں اور عابدوں پر فوقیت رکھتا ہے ۔

(ماخوذ از "الاخوت فی الاسلام")

سید صاحب کے اس حریت افروز خطبے سے جب خلیفہ کو آگاہی ہوئی تو ایوانِ خلافت میں قیامت برپا ہوگئی دوسری طرف حسن فہمی کو بھی اپنے منحوس ارادوں کی تکمیل کا موقع مل گیا اس نے خلیفہ کو یقین دلادیا کہ سید صاحب بابِ عالی کی حکومت کو نیست و نابود کر کے اس کے کھنڈروں پر جمہوریت کا ایوان تعمیر کرنا چاہتے ہیں ، اگر ان کے خیالات سے ترکوں کو محروم نہ کیا گیا تو ملک میں انقلاب انگیز ہنگامے برپا ہوں گے اور عوام کا جوش بابِ عالی کا خاتمہ کئے بغیر ٹھنڈا نہ ہوگا۔ خلیفہ کو شیخ الاسلام کی باتوں پر بہت زیادہ اعتماد نہیں تھا لیکن سید صاحب کے خطبے نے اس کو بے چین کر دیا۔ ملوکیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے خلاف اگر حکم الٰہی کو بھی کچھ لے تو اس کے خلاف بھی کارروائی کرنے سے دریغ نہیں کرتی چنانچہ بارگاہِ سلطانی سے ایک حکم اس مضمون کا صادر کیا گیا کہ " چونکہ سید جمال الدین افغانی کی موجودگی قسطنطنیہ کے امن عامہ کے لئے خطرناک ہے اس لئے وہ کچھ عرصہ اس شہر کو چھوڑ دیں "!

__قسطنطنیہ سے اخراج__ | سید صاحب اپنے دوستوں سے مختلف مسائل پر گفتگو کر رہے تھے کہ نقیب سلطانی

نے بارگاہ خلافت کا حکم اُن کو سُنایا جس کے سُنتے ہی سید صاحب کے دوست اظہار حیرت کرنے لگے لیکن سید صاحب نے متانت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ :-

"تمہیں میرے حکم اخراج پر حیران نہیں ہونا چاہئے بلکہ حیرت انگیز امر تو یہ ہے کہ یہ حکم اتنی دیر کے بعد کیوں صادر کیا گیا۔"

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ جیسے محبِّ اسلام سے ایک اسلامی حکومت کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ :-

"ملوکیت اپنی دُور اندیشی کے باعث زندہ ہے وہ بے جان خیالات میں بھی پیدا ہونے والی روح عمل دیکھ لیا کرتی ہے وہ اس مظلوم کے خلاف بھی کارروائی کرنے سے نہیں شرماتی جو نادر مظلومی سے لوگوں کے دلوں میں ظلم کے خلاف نفرت پیدا کرتا ہے"۔ (کواکب الشرق)

دوسرے دن سید صاحب رخت سفر باندھ کر ایران جانے کے ارادے سے تیار ہوئے کہ ان کے قابل فخر شاگرد مفتی محمد عبدہ مصری نے ان کو مصر چلنے پہ مجبور کر لیا۔ وہ جب قسطنطنیہ چھوڑ رہے تھے تو جمعیت دستور کے ایک رکن نے سرد آہ کھینچ کر کہا کہ ہماری قوم جہلا کی افسوسناک حرکات کے باعث بے حد نادم ہے۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ :-

"قسطنطنیہ کے صحیح الخیال لوگ اگر میری گزارشوں سے مطمئن ہیں اور ان میں جمہوریت کا احساس پیدا ہو چکا ہے تو میں نے بخدا وہ سعادت سستے داموں حاصل کر لی جس کی قیمت ہزارہا انسانوں کے خون سے کبھی ادا نہیں ہو سکتی"۔

سیّد جمال الدین افغانی کا قیامِ مصر

(از جناب مولانا اظہر امرتسری)

کیا وا عقدۂ آزادیٔ مصر ایک افغاں نے
سپہرِ قاہرہ روشن ہوا خورشیدِ کابل سے

قاہرہ میں ورود سید جمال الدین افغانی ۱۸۶۹ء میں قاہرہ پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر تیس بتیس برس کی ہوگی لیکن جذب و کشش کا یہ عالم تھا کہ چند روز ہی میں اس جلیل القدر علمی مرکز کے تمام حلقے ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک بھی عالم نہیں تھا جو ان کی علمی فضیلت کو محسوس کرنے سے محروم رہا ہو۔

قاہرہ مشرق میں علم و حکمت اور تعلیم و تعلّم کے سب سے بڑے امتدار کی حیثیت سے قابلِ فخر ہے تاریخ علمیہ کا ہر دور اس شہر کے تعلیمی تفوق پر مہر تصدیق ثبت کرتا آیا ہے لیکن سید صاحب کی حیرت انگیز قابلیت نے علمائے مصر پر یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ قدرت کی علمی فیاضی اہل مصر یا جامعۂ ازہر ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اس عطیہ سے ایک افغان کو سب سے زیادہ حصہ ملا ہے۔ چنانچہ "کواکب الشرق" کے مصنف استاذ محمد عقیل علوی سید صاحب کے ورود مصر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"استاذی سید جمال الدین افغانی کا قاہرہ میں ورود رحمتِ الٰہی سے کم نہ تھا۔ وہ اس شہر میں خوشی کی ساعت کی طرح اچانک آگئے ان سے پہلی بار گفتگو کرنے سے ہر حقیقت شناس انسان کو معلوم ہو جاتا تھا کہ دنیا بھر کی علمی فضیلتیں ایک افغان سیاح کی قابلیت میں جمع ہو گئی ہیں۔ ان

کے سادہ اور عام فہم دلائل مسلسل گفتگو میں پیش کرتے تھے۔ ان کا اندازِ کلام بے حد سادہ اور مؤثر تھا لیکن میں نہیں سمجھتا بالخصوص مؤثر نقاد کے روحانیت کے جو آئینۂ علم میں تھا۔ سب پہلے میں اس کی تشخیص بھی اقوال کو فلسفہ آمیز روحانیت سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ مجھے جب پہلی بار ان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا تو مجھے اس امر کا یقین کرنا پڑا کہ یہ سادہ لباس میں لپٹا ہوا درویش اپنے منتخب مسلمانوں کے ہاتھ تعمیرِ وجدان کی ترجمانی کر رہا ہے۔ گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ دنیا نے علم و اشیا کے گہرے مطالعہ کے بعد انسانیت کی سیاسی نجات کے جو اصول وضع کیے ہیں۔ ان کی تہذیب و اصلاح کے لیے خدا نے ایک ایسے شخص کو بھیجا ہے جو فلسفہ کے دامن سے اعتقادی لغزش کے دھبے صاف کرنا چاہتا ہے۔ ان کے ارشادات سے مجھے اپنی عمر میں پہلی بار اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ دنیا کی سیاسی ترقی اور قومی و ذہنی فلاح کا سرچشمہ تہذیبِ جدید نہیں بلکہ اسلام اور اس کے داعیِ اعظم کی تعلیم ہے۔ گویا سید صاحب نے میرے سفینۂ اعتقاد کو بحرِ الحاد میں غرق ہونے سے بچا لیا۔

سید صاحب سے میں نے مسلمانوں کے موجودہ تنزل پر کئی گھنٹوں میں مبادلۂ خیالات کیا۔ اور ان سے اس مسئلہ پر بھی گفتگو کی کہ مسلمان اپنی ترقی کی ابتدا کس طرح کر سکتے ہیں۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ توحید و رسالت کو تمام اعتقادی خیالات و اعمال کا مرکز قرار دیا جائے شخصیت پرستی اور نسلی تفوق کی لعنت سے دماغ کو پاک کیا جائے اس کے بعد افکار خود بخود اوہام و وساوس کی زنجیریں کاٹ کر آزاد ہو جائیں گے لیکن اس آزادی کا مقصد صرف قوائے غیر اللہ سے مخلصی حاصل کرنا ہو ورنہ اہلِ مذہب کی طرح مسلمان بھی ذہنی بے اطمینانی کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اہلِ مذہب کو ظاہری طور پر بہشت کی خوشیاں میسر آرہی ہیں لیکن مذہب کے صحیح تصور سے محروم ہونے کے باعث ان کا دل اطمینان کی دولت

سے محروم ہے۔ ان کی قلبی راحت اس مخمصے میں گم ہو چکی ہے کہ خدا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے احکام سے کبھی آزادی حاصل کرنی چاہئے۔ اگر نہیں تو اس کو تسلیم کیوں کیا جائے؟ یہ ہیں وہ سوالات جو اپنے تسلی بخش جواب کی تلاش فلسفیانِ مغرب کے دماغوں میں کر رہے ہیں لیکن جواب تو مہیا ہو نہیں سکتے اور دماغ مفت میں پریشان ہو گئے۔ اس حقیقت کے پیش نظر مسلمانوں کی آزادی کا مقصد مذہب سے بغاوت نہیں۔ کیونکہ مذہب ایک ایسے محافظ کا نام ہے جو آزادی کو حد اعتدال سے آگے نہیں جانے دیتا اور اس کو ان خطرات سے محفوظ رکھتا ہے جو اس کے اصول پر ضرب کاری لگانا چاہتے ہیں۔ لہذا مسلمان کی آزادی کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مقصد یہ ہونا چاہئے کہ "احکام غیر اللہ کی تنسیخ اور قانون الٰہی کا نفاذ"! اگر آزادی کی بنا اس مقدس اصول پر ہو تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی کیونکہ سنت اللہ ایک لاتبدیل حقیقت ہے"

ان سطور پر قارئین کرام غور فرمائیں تو سید صاحب کی حیرت انگیز قوت جاذبہ کی وجہ خود بخود ذہن نشین ہو جائے گی جس شخص کے اقوال اس درجہ نور بصیرت میں ڈوبے ہوئے ہوں ان کی طرف علماء و اکابر مصر کا متوجہ ہو جانا قدرتی امر تھا۔ سید صاحب نے تین ہفتے ہی قاہرہ میں قیام کیا تھا کہ شیخ الجامعہ ازہر سے لے کر طفل ابجد خواں تک ان کی قابلیت کے مداح بن گئے۔ ان کا ایک ایک لفظ علم و حکمت کا بنیادی قانون خیال کیا جانے لگا۔ گدائے گوشہ نشین سے سلطان سریر آرائے تاج ان کو احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں خلیفہ ترکی نے بلا بھیجا لیکن ایام حج قریب آجانے کے باعث ارشاد سلطانی کی فوری تعمیل نہ کر سکے اور قاہرہ سے حجاز جا پہنچے۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان ترکی کے اصرار پر حج کا ارادہ ملتوی کرنے پر مجبور کر لئے گئے اور قاہرہ سے سیدھے قسطنطنیہ جا پہنچے۔

ورود سید کے وقت مصر کی سیاسی و تمدنی حالت

سید جب مصر میں دوبارہ تشریف لائے تو اُن دنوں تخت مصر پر اسماعیل پاشا رونق افروز تھا۔ اس کا دور حکومت بڑی حد تک غیر ملکی ریشہ دوانیوں کی حوصلہ افزائی

کا موجب تھا۔ مراعات کے نام پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ وہ آزادی کے ساتھ یہاں من مانی کارروائیاں کرتے ان کی حرکات کو فرانس و برطانیہ سے بھی زیادہ آزادی حاصل تھی۔ دوسری طرف احرار مصر کے جوش حریت سے انقلاب و اصلاح کے لئے وسیع ماحول تیار کیا جا رہا تھا مصر کی سیاسی صورت حالات تغیر و تبدل کے تمام مراحل سے گذر کر شورش و ہنگامہ کے دروازہ پر کھڑی تھی۔ حکومت اور عوام کے درمیان تخصیص مفاد کی جو خلیج حائل تھی۔ اس کو پاٹنے کے لئے ایک سیاسی انقلاب کی ضرورت تھی۔ جس کا تصور دماغ و تدبر میں تو موجود تھا لیکن اس کے ظہور کے لئے ابھی چند سال کی ضرورت تھی لیکن انتہا پسند گروہ وطنی فلاح و آزادی کے لئے صبر و انتظار کی گھڑیاں جھیلنے کو تیار نہیں تھا۔ ہر شہر میں احرار کی انجمنیں قائم تھیں جو ملک کی سیاسی قوت کو فیصلہ کن انقلاب کے لئے تیار کر رہی تھیں۔ حکومت کی سخت گیری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ جذبہ حریت کو ہر ممکن طریقہ سے دبایا جاتا تھا لیکن یہ تشدد ترقی پسندوں کے لئے پیغام عمل ثابت ہو رہا تھا۔ آتش آزادی کے جو شعلے خیال و افکار میں تڑپ رہے تھے اُن کا عالم وجود میں آجانا ممکن نظر آتا تھا۔

اسماعیل پاشا کا اصلاحی اقدام | اسماعیل پاشا میں وہ تمام جابرانہ خصائص موجود تھے جو ایک مطلق العنان مشرقی حکمران میں ہوا کرتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تو تھا لیکن اس کا طریقہ ترقی سیاسی زبوں حالی دور کرنے کا موجب نہیں تھا بلکہ وہ تمدنی اور شہری معیار کی بلندی ہی کو ملک کی تمام خرابیوں کا علاج سمجھ رہا تھا۔ مدرسوں اور شفاخانوں کا قیام سڑکوں کی صفائی۔ دیدہ زیب ایوانوں کی تعمیر، برقی روشنی کا انتظام۔ خدیو مصر کے نزدیک ملک کی فلاح و ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ وہ ملک کی شہری زندگی کو ہر لحاظ سے یورپی تمدن کی خوشحالی سے ہمکنار کرنے کا متمنی تھا۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شہری زندگی کی بنا وطنی آزادی پر ہوتی ہے۔ جو ملک غیر ملکی تسلط کی زنجیروں میں جکڑا

ہوا ہو اس میں فلاح عامہ کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں چنانچہ مشہور مصری اہل قلم استاذ محمد ذکی، اسماعیل پاشا کے طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

" اسماعیل پاشا ایک ترقی پسند حکمران تھا۔ اس کا دماغ تمدنی ترقیوں کے خیالات سے معمور اور اس کا دل حب وطن کے جذبات سے لبریز تھا لیکن اس کی نظر اس درجہ تاریک تھی کہ وہ اپنے خیالات و جذبات سے منشائے ملت کے مطابق کام نہ لے سکا۔ اگر اس کے طرز عمل میں دور اندیشی کو ذرا بھی دخل ہوتا تو وہ اپنی اصلاحات قوتوں کو صرف تمدنی خوشحالی پر ضائع نہ کر دیتا بلکہ اس کی کوشش کا انجام آزادی مصر پر ہوتا۔ اور مصری قوم اس کو اتفاق یا مذمت کا خیال نہ کرتی لیکن اس کے دماغ میں یہ دھن سمائی ہوئی تھی کہ ملک کی ترقی کا راز شہری زینت و آرائش میں مضمر ہے۔ اگرچہ اس نے سڑکوں کی تعمیر شفاخانوں اور دوسرے رفاہ عامہ کے ادارے کھولنے کے لئے مصریوں پر ٹیکسوں کا بہت زیادہ بوجھ ڈالا تھا لیکن مصارف پورے کر لینا بھی اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ چنانچہ اس کو غیر ملکی سرمایہ داروں اور حکومتوں سے قرض لینا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے کاندھوں پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا گیا اور مصری قوم پہلے سے سیکڑوں درجہ زیادہ اپنے مستقبل کو ہولناک تصور کرنے لگی۔ گویا اسماعیل کی غلامانہ سیاست اہل مصر کے سوئے ہوئے جذبہ حریت پر تازیانہ تھی جس کی بیداری چند سال بعد سعد زاغلول پاشا کی صورت میں رونما ہوئی۔ آج مصر میں جتنی تحریکات کارفرما ہیں۔ سب کی تخلیق کا ذمہ دار زاغلول کا جوش حریت قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس زمانہ میں زاغلول ابھی میدان عمل میں آنے کے قابل ہی نہیں ہوئے تھے اہل مصر آزادی کا مفہوم پوری طرح سمجھ چکے تھے اور سمجھانے کا فرض سب سے پہلے جس شخص نے ادا کیا تھا۔ وہ ایک غیر مصری مفکر

تھا جو محمد عبدہ کا اُستاد اور اخوت اسلامی کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اس جلیل القدر انسان کو جس نے مصریوں کے بجھے ہوئے دلوں میں آزادی کی آگ روشن کر دی تھی دُنیا سید جمال الدین افغانی کے نام سے یاد کرتی ہے"۔

ان سطور کے مطالعہ سے یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں مصر کو سید صاحب کی قدرتی طور پر ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں علامہ جرجی زیدان اپنی کتاب "مشاہیر الشرق" میں سید صاحب کے ورود مصر کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

"وہ جب دوسری بار مصر میں داخل ہوا تو مصریوں میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ قیام قسطنطنیہ میں اس کے نظریہ اخوت اسلامی میں اس درجہ وسعت پیدا ہو گئی تھی جس میں ساری دُنیائے اسلام سمٹ کر آسکتی تھی۔ اس تمنا نے اس کے خیالات کو انقلاب آموز تعلیم کا سرچشمہ بنا دیا تھا اس لئے اس کی قوت جذب و کشش ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتی تھی۔ جو اپنی تغیر پسند طبیعت کے باعث انقلاب و اصلاح کا پیغام قبول کر سکتے تھے"۔

اسی ضمن میں "الاخوت فی الاسلام" میں لکھا ہے :-

"جمال الدین افغانی جب پہلی بار مصر میں آئے تھے تو ان کی شہرت ایک عالم و فلسفی اور مفکر و سیاح کی حیثیت سے تھی لیکن جب وہ دوسری بار قاہرہ میں وارد ہوئے تو ان کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں یہ حقیقت بھی داخل ہو گئی کہ یہ افغانی سیاح صرف تعلیمی و ذہنی انقلاب کا داعی نہیں بلکہ ایشیائی اتحاد کی قوت سے مغربی ممالک کے غلبہ کو روکنا چاہتا ہے اور اس وسیع مقصد کی تکمیل جمہوریت کے قیام اور مطلق العنانیت کے خاتمہ سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کی سیاسی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ سیاسی ذمہ داریاں اور نظم و نسق کے فرائض عوام

حکام میں تقسیم ہوجائیں تاکہ قومی و سیاسی ترقی کی راہ میں راعی و رعایا برابر کی تیز رفتاری سے کام لے سکیں"۔

پروفیسر براؤن اپنی کتاب "انقلاب ایران" میں لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ شخص (جمال الدین افغانی) ایک جہاندیدہ سیاح اور عالم تھا۔ اس کو دولت دنیا سے لگاؤ نہ تھا لیکن اس کے پاس علمی و ذہنی دولت کا بہت بڑا خزانہ تھا جس کو فصاحت زبان، زور قلم، بتحر علمی، سیاسی عقل و فہم، وسیع معلومات اور اسلام کے سچے عشق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اسلام (یعنی پیروان اسلام) کا انحطاط شدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ تاہم یہ حقیقت مبالغہ و اضافہ سے بالکل پاک اور واقعات سے بری ہے کہ اس نے بادشاہوں کے تخت متزلزل کر دیئے۔ اور اس نے مدبرین یورپ کی تجاویز کو (جو اسلامی ممالک سے متعلق تھیں) کامیابی کے ساتھ پریشان اور بے نتیجہ بنا دیا۔ اس نے ان غیر معمولی قوتوں سے کام لیا جن کی طرف مشرق و مغرب کے سیاسی مدبرین کی توجہ کبھی مبذول نہ ہوئی تھی۔ اور (شاید اسی لئے) ان کو ان قوتوں سے فائدہ اٹھانے کا کبھی خیال نہ آیا تھا۔ صرف اسی کے ذریعہ سے مصر میں مذہبی اخوت اور حب وطن کے جذبات پیدا ہوئے"۔

سید صاحب اور حکومت مصر پروفیسر براؤن کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب ورود مصر کے ابتدائی ایام میں ریاض پاشا سے ملے۔ ریاض پاشا کابینہ مصر کے رکن تھے۔ وہ سید صاحب سے ملتے ہی ان کی قابلیت و ذہانت کے گرویدہ ہوگئے اور حکومت سے سفارش کرکے ایک ہزار قروش کا ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ یہ وظیفہ اس خیال کے پیش نظر نہیں تھا کہ سید صاحب کی قابلیت حکومت مصر کے لئے مفید ثابت ہوسکے گی بلکہ ایک جلیل القدر عالم و مفکر اور سیاح و مبصر کی عزت افزائی مقصود تھی تاہم یہ وظیفہ سید صاحب کو وابستگان حکومت میں شامل کرنے کا موجب ہوا

اس سے ان کی شخصیت پہلے سے زیادہ قابل اعتماد بن گئی لیکن مراحم خسروانہ سے ان کی سیاسی سرگرمیوں میں فرق نہ آیا۔ دل و ضمیر کی آواز سکوں کی جھنکار سے دب نہ سکی بلکہ پہلے سے زیادہ اثر و بلندی کے ساتھ عوام کے ذہن و وجدان تک پہنچنے لگی۔

سید صاحب جب پہلی بار قاہرہ میں آئے تھے، تو جاتے ہوئے اپنے ہم خیال عقیدت مندوں اور شاگردوں کو کثیر تعداد میں چھوڑ گئے تھے۔ جن کے پراپاگنڈے اور مبادلۂ خیالات کے حلقوں کی وسعت نے سید صاحب کی مقبولیت کے لئے ایک وسیع ماحول بنا لیا تھا۔ اس لئے علمائے مصر کی بہت بڑی جماعت اپنے افکار و نظریات کی اصلاح و تربیت کے لئے سید صاحب کی پہلے ہی سے منتظر تھی۔ علاوہ ازیں سیاستدانوں کا انتہاپسند طبقہ ان مجاہدانہ سرگرمیوں کا اخبارات کے ذریعہ سے بغور مطالعہ کر چکا تھا جن کی پاداش میں وہ قسطنطنیہ سے نکالے گئے تھے۔ اس چیز نے بھی سید صاحب کے عقیدت مندوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ کر دیا تھا۔ غرضیکہ سید صاحب سے مصریوں کی جو عظیم الشان امیدیں وابستہ تھیں ان کے ورود سے تازہ ہو گئیں۔ اور عالم و متعلم سیکڑوں کی تعداد میں ان کی محفل میں شریک ہونے لگے۔ جو ان کے نصائح، مواعظ اور مشوروں کو مقبولیت و تسلیم کے کانوں سے سنتے اور دل و دماغ کے خزانوں میں محفوظ کر لیتے۔

دوسری طرف خوش فہم خدیو مصر کو سید صاحب کی قابلیت کے پیش نظر یہ امید تھی کہ سید صاحب کی اسلامی سرگرمیاں مدنیت افروز نتائج کی حامل ہوں گی۔ ان کا مقصد و نصب العین مصر کی شہری زیب و آرائش اور یورپی طرز رہائش سے آگے نہیں جائے گا لیکن سید صاحب کے عمل نے ثابت کر دیا کہ وہ خوبصورت الفاظ کی پرستش کرنے والے نہیں بلکہ معنی کے طالب ہیں۔ وہ ذہنی و علمی اصلاح کے ذریعہ سے ایسا ماحول بنانا چاہتے تھے جہاں انقلاب و جہاد کی آواز آسانی سے گونج سکے۔

سید صاحب اور مطالعہ مصر | سید صاحب اگرچہ قسطنطنیہ میں مصر کے سیاسی حالات کا کافی مطالعہ

کر چکے تھے لیکن مشاہدہ و تجربہ نے ان کے معلومات میں واقعیت کی جھلک بھی پیدا کر دی اور وہ بغیر کسی کوشش کے خاریو مصر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی دوربین نظریں فوراً اس ملک کے سیاسی واقعات، ذی مستقبل سے ہمکنار ہو گئیں۔ ان کے سامنے وہ تمام ہولناک مناظر پھرنے لگے جو مصر کی موجودہ حالت کے انجام سے وابستہ تھے لیکن انہوں نے ہنگامی مصالح کے پیش نظر سیاسیات میں فوراً الجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تعلیمی مشاغل کے ذریعہ سے مقامی سیاست اور اس کے عملی محرکات کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ بظاہر ان کو عملی سیاست سے کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن حقیقت میں وہ ذہنی انقلاب کو ملکی ترقی کے خیالات کی پرورش گاہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو قوم ذہنی و علمی طور پر ترقی نہیں کر سکتی اس کی حرکت عمل انجام و نتائج کے اعتبار سے صحیح و صالح ثابت نہیں ہوتی۔ وہ مصریوں کے ذہن و دماغ سے خوف و سراسیمگی کی سیاہی دور کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ دیرینہ نظریات آسانی کے ساتھ قبول کر سکیں۔

سید صاحب کا مقصد | سید صاحب مصر میں جو مقصد لے کر دوبارہ آئے تھے اس کی مختصر تشریح یہ ہے ــــــ قیام قسطنطنیہ میں سید صاحب کو ان اسباب و علل پر غور کرنے کا کافی موقع مل گیا تھا جن پر موجودہ زمانہ میں اخوت اسلامی کا ایوان تعمیر ہو سکتا تھا۔ اگرچہ باب عالی کی حکومت ان کی توقع سے بڑھ کر مذموم ثابت ہوئی تھی تاہم وہ یہ خیال کرنے پر مجبور تھے کہ اخوت کی تجدید کے لئے قسطنطنیہ سے بہتر کوئی مقام نہیں۔ اور یہ شہر اپنی جغرافیائی و مدنی خصوصیات کے اعتبار سے بھی عالم اسلامی کا سیاسی مرکز ہو سکتا ہے لیکن حکومت ترکیہ نظم و نسق اور اصول حکمرانی کے نقائص کی وجہ سے یہ بار عظیم اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ خانہ جنگی اور اندرونی شورش کے بغیر یہاں جامع الصفات جمہوریت کا قیام عمل میں لایا جا سکے لیکن اس مقصد کی تکمیل باب عالی کا استبدادی نظام توڑے بغیر ناممکن تھی کیونکہ ـــــ

ہر بنائے کہنہ کآبادان کنند

اولیں بنیاد را ویراں کنند (رومی)

جب تک باب عالی کی حکومت کا ایوان کھنڈروں میں تبدیل نہ ہو جائے اس پر اسلامی جمہوریت کی بنا نہیں ڈالی جاسکتی تھی ملک میں انقلاب رونما ہو جانے کے باعث یورپی حکومتوں کو بروئے کار آجانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس زمانہ میں روس بالخصوص اور دوسری یورپی حکومتیں بالعموم ترکی کو غلام بنانے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتی تھیں۔ اگر جمہوریت کے نام پر داخلی شورش میں ملک پھنس جاتا تو روس جو جنگ و جدال کے لئے ہمیشہ منتظر رہتا تھا بغاوت و شورش کا طوفان اٹھتا ہوا قسطنطنیہ پر ان کے لشکروں کا دیا ہوا چھپا رہا تھا فوراً ترکی پر قبضہ کر لیتا۔ اس کے بعد رائے عامہ کی آزادی تو در کنار ترکی کی سیاسی و قومی آزادی بھی بذریعہ غلامی سے تبدیل ہو جاتی ان خطرات کے پیش نظر سید صاحب جمہوریت کے بجائے دستوریت ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو گئے ان کا خیال تھا کہ جب تک حکومت میں جمہوریت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی خلیفہ تو بدستور شاہی نسل سے منتخب ہوتا رہے لیکن اس کی رہنمائی اور امور حکومت کی تکمیل کے لئے ایک با اختیار مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) ہو۔ جو عوام کے منشا و مفاد کے مطابق خلیفہ سے فرائض خلافت پورے کراتی رہے چونکہ مجلس شوریٰ کے ارکان رائے عامہ سے منتخب ہوں گے اس لئے عوام و حکام میں بالواسطہ اشتراک عمل پیدا ہو جائے گا۔

اس صورت حالات کے ظہور پذیر ہوتے ہی ترکی خلافت دنیائے اسلام سے متعلق فرائض نمائندگی قبول کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ مرکزیت کی تعریف سید صاحب کے خیالات کے مطابق جو تھی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی ساری اسلامی حکومتیں ترکی کو اپنا نمائندہ و سردار تسلیم کر لیں لیکن اس نمائندگی کے معنی یہ نہیں کہ خود مختار اسلامی حکومتیں اپنے مقبوضات ترکی کے حوالہ کر دیں بلکہ وہ بجائے خود آزاد و مختار رہیں لیکن جب کسی اسلامی ملک پر اغیار کا حملہ ہو تو سب سے

اسلامی ممالک سلطان ترکی کی منظوری کے بعد اس کی حفاظت و مدافعت کے لیے اپنی ساری قوتیں مخصوص کر دیں۔ اس طرح مفاد کے لحاظ سے ساری دُنیائے اسلام میں ایک مصالحانہ اشتراک پیدا ہوجائے گا۔ اور یورپ کی بڑی سے بڑی حکومت بھی اس متحدہ محاذ کو مسخر نہ کر سکے گی سید صاحب نے انہی خیالات کا قسطنطنیہ میں پرچار کیا جس کے نتائج عہد حمیدیہ میں کسی حد تک رونما ہونے والے تھے۔ بہرحال سید صاحب مصر میں انہی خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے آئے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر یہ ملک اغیار کی غلامی سے بچ جائے تو زنجیر اخوت کی بہترین کڑی ثابت ہوسکے گا۔

علمی خدمات | سید صاحب نے قیام مصر کے دوران میں جو جلیل القدر علمی خدمات انجام دیں درحقیقت انہیں سے ان کی بلند پایہ شخصیت کے روشن ترین پہلو نمائش و اظہار کی دُنیا میں آنے کے قابل ہوئے اسی سرزمین میں ان کی انقلابی و اصلاحی قوتیں نمایاں سطح پر اُبھر کر پیغام و تعلیم کا سرچشمہ ثابت ہوئیں چنانچہ جریدہ الھلال کلکتہ لکھتا ہے کہ:

"وہ (یعنی سید صاحب) عربی زبان کے سب سے بڑے مرکز قاہرہ میں سب سے پہلے صحیح و صالح فن عربیّہ کا درس دیتا ہے اور عربی کتابت و تحریر کا ایک نیا دور پیدا کر دیتا ہے۔ آج مصر و شام کے تمام مشاہیر اہل قلم اعتراف کرتے ہیں کہ کتابت عربیہ میں ہم سب اسی عجمی کے عیال ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سب سے بہتر کاتب شیخ محمد عبدہٗ تھا جو اسی کا شاگرد تھا۔ اس نے علوم حکمیہ کی جس قدر بھی تعلیم حاصل کی تھی وہ وہی موجودہ مدارس عربیہ کی کج اندیش تعلیم تھی لیکن وہ ذہین اور مستند طلباء کی ایک جماعت منتخب کرکے علوم حکمیہ کا درس و املا شروع کر دیتا ہے اور قدیم معقولات کی وہ تمام گمراہیاں ایک ایک کرکے جن کے اعتقاد جمود نے صدیوں سے مشرقی دنیا کا ذہنی ارتقا معطل کر دیا ہے دُور کر دیتا ہے۔ مذہب اور علم دونوں میں اس کا فیصلہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے اور کسی گوشہ میں بھی اس کے قدم وقت کی مقلدانہ سطح سے مَس نہیں ہوئے۔ سیاست میں وہ

سرتا پا انقلاب کی دعوت ہے اور جہاں کہیں جاتا ہے۔ چند دنوں کے اندر مستعد اور صالح طبیعتوں میں

انقلاب و تجدید کی روح پھونک دیتا ہے ۔ (الہلال ۔ کلکتہ جلد ۱ نمبر ۱۱)

الہلال نے سید صاحب کی علمی خدمات کا نقشہ جن توجہ طلب لفظوں میں کھینچا ہے۔ ان کی شوق آفرین کیفیت اس اجمال کی تفصیل کے تمام گوشے ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہے لیکن مردم ناشناس زمانہ نے ان کی قابلیت کے نتائج پر جہل وغفلت کا اتنا بڑا پردہ ڈال رکھا ہے جس کو اٹھانے کے لئے شاید ایک صدی تک اہل تحقیق کو اور کوشش کرنا پڑے تاہم معلومات مختلفہ نے اس مسئلہ کے متعلق جو تفصیلات مہیا کی ہیں ۔ وہ اگرچہ بذات خود ایک مبہم اور غیر واضح اجمال کی حیثیت رکھتی ہیں تاہم کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے ۔ سید صاحب شروع میں اپنی قیام گاہ میں طالبان علم وحکمت کا درس دیتے رہے لیکن وہ سرکاری اور عمومی مدارس کے طریقۂ تعلیم میں ایک انقلاب انگیز اصلاح چاہتے تھے ۔ یہ انقلاب ایک ایسے دور کو قریب تر لانا چاہتا تھا جو سرتا پا عمل وحرکت کا موجب ہو اور ان کا خیال تھا کہ دماغ جس قدر ترقی کرتا ہے اسی قدر دل کمزور ہوجاتا ہے ۔ یعنی علم کی وسعت عمل وشجاعت کو حد اعتدال وعافیت سے آگے بڑھنے نہیں دیتی ۔ اس لئے وہ ایک ایسے طریقۂ تعلیم کی ترویج چاہتے تھے جس کی بدولت طالبان علم بھی علم وعمل کو ایک ہموار سطح پر دیکھ سکیں ۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء کے اوائل میں ان کی مساعی سے اصلاح تعلیم کے لئے ایک موثر حرکت عمل پذیر ہوئی جو جامعہ ازہر اور اس کی ماتحت درس گاہوں میں ارتقائی جنبش کا موجب ہو کر رہی ۔ اس ترقی پسندانہ اقدام سے تجدد پسند اہل علم کو مغربی اصول وضوابط کے مطابق تعلیمی فلاح وترقی کے مواقع میسر آگئے ۔

مفتی محمد عبدہٗ اور سید صاحب | سید صاحب کے حلقۂ تلمذ میں جن لوگوں کو داخل ہونے کا موقع ملا ان میں سے مفتی محمد عبدہٗ مصری خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مفتی صاحب کی علمی قابلیت اور تجدد پسند ذہنیت سید صاحب کے دامن شہرت پر چار چاند لگانے کا موجب ہوئی ۔ آج کل مصری علماء جب

سید صاحب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے تعارف کے لئے سب سے پہلے یہ کہتے ہیں کہ وہ مفتی محمد عبدہٗ کے اُستاد تھے۔

جب سید صاحب پہلی بار مصر میں آئے تھے تو مفتی صاحب ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے۔ ایک روایت کے بموجب وہ قسطنطنیہ بھی سید صاحب کے ساتھ گئے تھے جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے۔ سید صاحب کو دوبارہ مصر میں لانے کا موجب بھی مفتی صاحب کا حد سے بڑھا ہوا اصرار تھا۔ مفتی صاحب کو سید صاحب پر ناز ہے۔ اور سید صاحب کو مفتی صاحب پر فخر ــــ مفتی صاحب خود لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے شیخ جمال الدین افغانی سے ریاضی و فلسفہ اور علم الکلام کی چند کتابیں پڑھی تھیں۔ اساتذہ ازہر اور بعض طلبہ کو آپ سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ آپ کے خیالات اسلامی عقاید کی بنیادیں دل سے ہلا دیتے ہیں اور نفس کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں جس سے دین و دُنیا کی فلاح میسر نہیں آتی۔ میں نے حضرت شیخ سے ان لوگوں کی شکایات کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالے علیم و حکیم ہے۔ دُنیا کے تمام علوم اور حکمتیں اس کی نیاضی کا نتیجہ ہیں۔ جو شخص علم کا دشمن ہے جاہل ہے اور جو حکمت کا مخالف ہے وہ احمق ہے۔ البتہ خداوند کریم کے نزدیک وہ علم علم نہیں جس سے دُنیا فریبی کا کام لیا جائے۔ وہ عالم قابل ملامت ہے جو دامِ علم میں لوگوں کو پھنسا کر اپنے ذاتی اغراض پورے کرتا ہے۔" (ملخص)

سید صاحب کی صحبت نے مفتی صاحب کی ذہنیت پر کتنا گہرا اثر کیا ؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مختصر طور پر مفتی صاحب کی زندگی کے ابتدائی دَور کا مطالعہ ضروری ہے۔ مفتی صاحب جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل اور اسی درس گاہ کے قابل فخر طلباء میں سے تھے۔ جامعہ سے نکلتے ہی ان کی فکر و نظر نے ان پر یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ جب تک اہل مصر کے خیالات اوہام و

وساوس کی قید سے نکل کر کسی آزاد و صالح بلندی تک نہیں پہنچتے۔ قوم کی ذہنی و عملی ترقی ناممکن ہے۔ ان کے خیالات میں سیاسی جدوجہد سے پیدا کئے ہوئے انقلاب کی ذہنی و قلبی تغیر کی بہ نسبت زیادہ ضرورت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے اہل علم مشعل تہذیب و اصلاح لے کر جہالت خانۂ مصر میں گھوم جائیں۔ لیکن اس مشعل سے سیاسی حرکت و جنبش کو پیدا کرنے والی کوئی چنگاری نہ جھڑے۔ بایں ہمہ ازہر کے ماحول نے ان کے عوالم کو اس درجہ لپیٹ کر دیا تھا کہ وہ اپنے عملی جمود کے باعث اس خیر سیاسی لائحہ عمل کو بھی بروئے کار نہ لا سکے۔ اسی اثناء میں سید صاحب کا آفتاب شہرت طلوع ہوا جس کی دلکش روشنی مفتی صاحب کے قلب و دماغ پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور وہ کسی وسیلہ و واسطہ اور غور و تامل کے بغیر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ سید صاحب کی مجاہدانہ تربیت سے ان کا دماغ صرف تربیت پذیر ہی نہیں ہوا بلکہ ان کے اعتدال پسندانہ خیالات کو بھی ایک پرجوش شان کے ساتھ سطح عمل پر ابھرنے کا موقع مل گیا۔ سید صاحب کا فیض صحبت مفتی صاحب کے جوہر فطری کو نشو و نما حقیقتاً بخشنے کا موجب ہوا۔ اور وہ اعتدال پسند فلسفی کا چولا اُتار کر انتہا پسند فعال کی قبا زیب تن کرنے لگے۔ اگرچہ سید صاحب نے مفتی صاحب کو بالواسطہ سیاسیات سے اُلجھنے کی دعوت نہیں دی لیکن ان کے تمام ذہنی و اصلاحی مشاغل کا اصل الاصول ایک نتیجہ خیز سیاسی انقلاب کی توقع تھی۔ اس لئے مفتی صاحب علم و حکمت ہی کے پردے میں عمل و جہاد کی برکات معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ انگریز مورخین کی اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ اعرابی پاشا کی بغاوت محمد عبدہ کی ترغیب جہاد و حریت کا نتیجہ تھی۔

۱۸۸۲ء میں جب اعرابی پاشا کی فوجی تحریک، ایک خونیں انقلاب کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ اس وقت مفتی صاحب مصر کے سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" کے چیف ایڈیٹر

تھے۔ اس بغاوت کے ایام ردِ عمل میں جب توفیق پاشا کو وطن فروشی اور سلطان عبد الحمید کو کمزوری کے اظہار کا خاطر خواہ موقع مل گیا تو انگریزی فوج مصر میں داخل ہو گئی۔ اس زمانہ میں دوسرے احرارِ وطن کے ساتھ مفتی صاحب بھی گرفتار کر لئے گئے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ مصر میں بغاوت کی چنگاری سب سے پہلے انہیں کے قلم سے پھوٹی ہے۔ یعنی اعرابی کی بغاوت بڑی حد تک "الوقائع المصریہ" کے مقالات کی رہین منت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید صاحب کی صحبت نے مفتی صاحب پر انقلاب انگیز اثر کیا تھا۔

غازی سعد زغلول اور سید صاحب | ۱۸۷۳ء میں سید الاحرار حضرت سعد زغلول پاشا نور اللہ مرقدہٗ کی عمر بمشکل بیس برس کی ہوگی۔ سید صاحب کی علمی و فکری مجالس کی دھوم مصر کے علمی و سیاسی حلقوں میں پہنچنے لگی۔ سعد قدرت سے تڑپتا ہوا وسیع دل جس میں ساری قوم کے درد کے لئے گنجائش تھی لے کر آئے تھے لیکن ازہر کی ساکن و جامد فضا نے آپ کے عزائم و افکار پر بھی افسردگی طاری کر رکھی تھی۔ آپ مفتی محمد عبدہٗ ہی کے ارادت کیش ہو چکے تھے اور انہیں کی وساطت سے سید صاحب کا فیض تلمذ و ارادت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سید صاحب کی تعلیم و تربیت نے زغلول کی عملی زندگی پر جو گہرا اثر کیا اس کی تفصیل سعد کی سیاسی جد و جہد اور مجاہدانہ جوش و خروش سے ناظرین معلوم کر سکتے ہیں۔ یہاں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ سعد سید صاحب کے متوقع انقلاب کے سب سے بڑے داعی تھے اور اس دعوت کی ابتداء عملاً اس وقت ہوئی جب اعرابی پاشا کی بغاوت کے بعد مفتی محمد عبدہٗ کے ساتھ سعد بھی گرفتار کر لئے گئے تھے۔

جامعہ ازہر اور سید صاحب | سید صاحب چند ماہ تک تو گھر ہی میں درس دیتے رہے لیکن رفتہ رفتہ شاگردوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ ان کے لئے قیام گاہ کا مدرسہ تنگ نظر آنے لگا دوسری طرف حکومت اور اصلاح پسند علماء کی طرف سے تقاضا کیا جانے لگا کہ ازہر میں جا کر درس

و تدریس کا سلسلہ جاری کیجئے۔ آخر دسمبر ۱۸۷۱ء میں سید صاحب نے یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ اور جامعہ میں پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم دینے لگے۔

ان کے آنے سے پہلے جامعہ کا طریقہ تعلیم فرسودہ دماغوں کا نتیجہ تھا۔ عالم اسلام کی یہ سب سے بڑی درس گاہ اپنے مقاصد کے اعتبار سے ذہنی انحطاط کا وہ مظاہرہ پیش کرتی تھی جسے بذات خود مسلمانوں کے علمی زوال کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ طالب علم کے دماغ کو ایجاد و اختراع کا مرکز بنانے کی بجائے اس کی فطری صلاحیت بھی سلب کر لی جاتی۔ طلباء کے دماغ میں ضخیم کتابوں کی روح تو موجود ہوتی لیکن اس سے صرف امتحان ہی کے وقت فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ کتابوں سے فکر و نظر کی ترقی اور ایجاد و اختراع کی قوتوں سے کام لینا طلباء کے بس کا روگ نہیں تھا۔ انہیں جس طریقے سے تعلیم دی جاتی وہ تحقیق و تجسس کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے قدامت پسندانہ تاریکی کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ وہ طوطے کی طرح کتابیں رٹ لیتے اور اسی رٹ کے اعادہ سے امتحان میں کامیاب ہو جاتے۔ سید صاحب نے سب سے پہلے اس نقص کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ تعلیم کا مقصد طالب علم کو کولھو کا بیل بنانا نہیں کہ ہر پھر کر اسی علمی سطح پہ آجائیں جہاں اس کو بلندی پہ پہنچانے کے لئے لایا جاتا ہے۔ تعلیم کا مقصد طلباء کی فطری صلاحیتوں کو بیدار کرنا اور اس کے دماغ و ذہن میں مجتہدانہ افکار کی روح پھونکنا ہے تاکہ قوم کا یہ قابل قدر گروہ جس کے مستقبل سے قوم کے متوقع انقلابات وابستہ ہیں مدارس سے نکلتے ہی اصلاح و تجدد کے علمبردار بن سکیں۔ اور تعلیم خیالات و عقاید کو اوہام کی زنجیروں سے پوری طرح آزادی دلا دے۔

سید صاحب کے یہ خیالات ان مُلّاؤں کے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئے جو مسجد و مدرسہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو مشعل عمل و جہاد پہ ترجیح دیتے تھے۔ ان کے لئے عمل و جہد کے میدان میں قدم رکھنا انتہائی اذیت کا موجب تھا کیونکہ شوق عافیت نے ان کے کانوں میں پھونک رکھا تھا کہ اسلام صرف

روزہ و نماز ہی کی ادائیگی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ جتنی باتیں ہیں بدعت و کفر کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں ان کے اس مخصوص عقیدے پر حکومت مصر کی مہر تصدیق بھی ثبت تھی۔ ہر حکومت اپنے قیام و بقا کے لئے رعیت کو قدامت پرستی کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔ تاکہ لوگ کسی آزاد ماحول کو پیدا کرنے کے قابل نہ ہو سکیں ملاؤں نے سید صاحب کے خلاف بے پناہ پراپگنڈہ شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں ان کے ہر ہنر کو بدترین عیب کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی سب سے بڑا اعتراض ان پر یہ تھا کہ وہ علوم اسلامیہ پر فلسفہ و ادب کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ حیات جمال الدین افغانی میں (جو مکتبہ جامعہ دہلی کی طرف سے شائع ہوئی تھی)۔

"انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا کے حوالے سے لکھا ہے کہ "افغانی شیخ جامعہ ازہر میں پروفیسر تھے اس وقت انہوں نے بوعلی سینا کے فلسفہ کا درس دینا شروع کر دیا تھا اور ان چیزوں کو بھی جو بظاہر خاص مذہب سے تعلق نہیں رکھتیں۔ اپنے درس میں شامل کر لیا تھا۔ وہ کرہ ارض کو زمین کی شکل بنانے کے لئے مسجد میں ساتھ لے آئے تھے لیکن دوسرے پروفیسروں کو یہ بدعت ناگوار معلوم ہوئی انہوں نے مسجد جامعہ میں ان کا داخلہ بند کر دیا۔"

ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ ازہر میں علمی تنگدلی حد سے زیادہ تھی۔ وہ جدید علوم کے نام سے بھی کوسوں دور بھاگتے تھے۔ ان کا دائرہ علم و معلومات اس قدر محدود تھا کہ اس میں حکمت جدید و قدیم کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔

جامعہ ازہر کے طلبا کے لئے سیاست شجر ممنوعہ تھی۔ سید صاحب نے اس نقص کی طرف بھی توجہ کی۔ انہوں نے کہا کہ یہی نونہال مستقبل قریب میں قوم اور قوم کے رہنما بن جائیں گے۔ ان کے ایک ہاتھ میں قوم ہے اور دوسرے میں وطن۔ اگر چاہیں تو دونوں کو آپس میں ٹکرا کر فنا کر دیں یا دونوں کو آزادی و خوشحالی کی فضا میں لے جائیں۔ اس لئے ان کو سیاسیات سے الگ رکھنا اسلامی مفاد پر ضرب کاری سے کم نہیں۔

__قدامت پسند علما اور سید صاحب__ | سید صاحب کی بصیرت افروز تعلیم نے قدامت پسند مولویوں کو مضطرب کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ملک کی ذہنی ترقی اجتہاد و تجدید سے ہمکنار ہو سکے۔ ان مولویوں نے پرانی طرز کے طلبا کو سید صاحب کے خلاف بھڑکانا شروع کیا چنانچہ ایک دن جب سید صاحب درس دے رہے تھے تو ایک طالب علم نے ان کے عقیدہ کو جانچنے کے لئے سوال کیا کہ جب اجتہاد کی بنا قال اللہ وقال الرسول پر نہ ہو اس کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ :-

"شعائر اسلامی سے مراد اگر احکام، ارشادات نبویہ اور ائمہ اسلام کے اقوال کی عملی صورت ہے تو ان کے خلاف جو شخص اجتہادی نظریہ پیش کرتا ہے وہ ملحد ہے اور اپنی ملحدانہ روش سے دوسروں کو جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ اگر شعائر اسلامی سے مراد موجودہ زمانہ کے پست ہمت ملاؤں اور بے عمل صوفیوں کی وہ ناپاک رسمیں ہیں جن کے بھیانک چہرے پر مذہب کا خوبصورت پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو جو اجتہاد ان نام نہاد شعائر کی مخالفت پر مبنی ہوگا وہ سراسر قابلِ تسلیم اور مذہب کے مطابق ہے۔ اسلامی اجتہاد اس عملی حقیقت کا نام ہے جو مذہب کے چہرے سے توہمات کے پردے اٹھا کر اس کو حقیقی حالت میں پیش کرتی ہے۔"

سید صاحب کا یہ معقول اور قابلِ تسلیم جواب ملاؤں اور ان کے عقیدت کیشوں کے لئے سرمایۂ عبرت تھا لیکن جہنم چند چھینٹوں سے نہیں بجھ سکتا۔ خوئے بد بہانے میں تو استاد ہی ہوتی ہے۔ وہ خلوت و جلوت میں سید صاحب کے خلاف منافرت انگیز پراپگنڈا کرتے رہے۔

__ایک بصیرت افروز خطبہ__ | "کواکب الشرق" میں لکھا ہے کہ ایک دن سید صاحب نے طلباء کے سامنے ایک بصیرت افروز خطبہ دیا۔ جس میں انہوں نے علم و تعلیم کی غرض و غایت پر دلچسپ حقائق و معارف کا اظہار کیا۔ اس خطبے کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

"تعلیم کا مسئلہ موجودہ زمانے میں بہت زیادہ غور و فکر کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ شاید اسی لئے

درس گاہوں کو زمانہ قدیم کی یادگار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم حقائق و واقعات کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ سوال خود بخود حل ہو جائے گا کہ موجودہ زمانہ میں چار صدیوں پہلے کی بہ نسبت دماغی صلاحیتیں بڑھ چکی ہیں، انسانی ذہن معلومات کے سیکڑوں مراحل سے گزر کر ترقی کا ملہ کے دروازے پر آ پہنچا ہے۔ لیکن جس قدر اس کی فکر و نظر وسیع ہے اسی قدر تعلیم و تدریس کا دائرہ محدود ہے۔ وہ دامن ذہنیت کو بھرنا تو چاہتا ہے موتیوں سے، لیکن خزف ریزوں کو دیکھ کر اپنی ترقی سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمی ترقی بھی قوم کی ذہنی و دماغی رفتار کا ساتھ دے سکے۔ ورنہ قوم حصول تعلیم کی منزل سے آگے نکلنے پر مجبور ہوگی۔ وہ جانتا ہے کہ اگر تعلیم دماغی ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتی تو پھر جہالت میں کون سی برائی ہے؟

تعلیم اور اس کا مقصد | تعلیم کا مقصد بظاہر یہی سمجھا گیا ہے کہ طالب علم کے ذہن پر حکمت و معارف کی روشنی ڈالی جائے جس کی امداد سے وہ دنیائے بے خبری میں چھپے ہوئے علمی خزانوں کا انکشاف کر سکے۔ لیکن صرف اسی توقع کو نصب العین نہیں بنایا جا سکتا۔ عالم کے فرائض اس سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ عالم وہی ہے جو قومی زندگی کے ہر شعبہ سے واقف ہو اور ماحول و زمانہ کے مطابق رہنمائی کا فرض انجام دے سکے۔

عالم کے فرائض صرف یہی نہیں کہ اس کی قابلیت، جاذب توجہ الفاظ اور ادبی فصاحت و بلاغت تک محدود ہو۔ کوئی قوم صرف الفاظ کی خوبصورتی سے بام ترقی تک نہیں پہنچ سکتی۔ بلکہ ان کا وٹوں کو دور کرنے کے بعد اپنے مقصد تک پہنچے گی جو استبدادی نظام اور ذہنی پستی نے اس کی راہ میں حائل کر رکھی ہیں۔ عالم کا فرض ہے کہ قوم کی ہنگامی ضروریات کے مطابق اس کو دولت علم سے حصہ دے ورنہ اس کی حالت اس مسافر کی ہوگی جو اپنی منزل مقصود سے بھی بے خبر ہے۔ مثال کے طور پر غور فرمائیے کہ ایک قوم اپنی سیاسی پستی کے احساس سے مضطرب ہو جاتی ہے

اس کا جوش عمل کسی بلند سطح پر اُبھرنا چاہتا ہے۔ مگر علماء اس کو منطق و ادب کی اصطلاحات یاد کرانے میں ادائے فرض کی فرحت محسوس کرتے ہیں تو یہ کوشش میت کے سرہانے نغمۂ عشرت چھیڑنے کے مرادف ہوگی۔ کیونکہ صرف ادبی ترقی سے کوئی قوم سیاسی فلاح کے دروازے نہیں کھول سکتی۔ اس اختلاف کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا علماء کا وجود عدم کے برابر ہو کر رہ جائے گا۔ یا قوم کی نظریں حقیقی نصب العین سے دور ہو جائیں گی۔ لیکن قوم کی یہ معنوی خودکشی علماء کی عافیت پسندانہ گمراہی کی پیداوار سمجھی جائے گی۔

علم و حکمت منبع | علم و حکمت کا عالم مطلق خدا ہے جو حکمت ارشادات ربانی سے ماخوذ نہیں وہ گمراہی ہے چنانچہ خدا کی حکمت جو ہم تک پہنچی ہے اس کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ قرآن نے ہمارے سامنے تکمیل انسانیت، تہذیب اخلاق، تنویر خیالات، اصلاح اعمال، اور عبادت و ریاضت کے متعلق جتنے بھی اصول و اسباق پیش کیئے ہیں سب کا عملی پہلو تعلیمی صورت پر غالب ہے چنانچہ خداوند کریم کا ارشاد ہے کہ "جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی اور جانی و مالی جہاد کیا وہی لوگ خدا کی رحمت کے مستحق ہیں یعنی حرکت و عمل، قربانی و ایثار کے بغیر کوئی شخص رحمت الٰہی کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اور قرآن کریم کی تمام تعلیمات کا مقصد المقاصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ جو علماء جہاد و جہاد کا فرض ادا نہیں کرتے کیا وہ صرف علم و حکمت کی برکت سے رحمت خداوندی کے مستحق ہو سکتے ہیں؟ اور جو شخص رحمت الٰہی سے محروم ہے وہ دُنیا اور عقبیٰ میں سرخروئی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ہمیں اسوۂ رسولؐ کی طرف غور کرنا چاہئے حضور علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ حیات اجتماعیہ کی ذمہ داریاں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اگرچہ آپؐ خدا کے رسول کی حیثیت سے مبلغ اعظم تھے لیکن بدر و اُحد اور حنین کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کی تبلیغی و تعلیمی مساعی کی بنا عمل و جہاد پر تھی علمائے امت اور ائمہ اسلام کی زندگیاں بھی اس دعوے پر قابل تسلیم شہادت ہیں چنانچہ امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جو مصیبتیں برداشت کیں وہ علم و عالم کے فرائض کی زندہ جاوید تشریح ہیں۔ اگر حریت ضمیر اور دلیرانہ جرأت

منشاء علم میں شامل نہ ہوتی تو ان بزرگوں کی طرف سے اس کا مظاہرہ نہ ہوتا ۔

خدا کا انعام اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو "لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے تو خدا ان کو خلافت یعنی حکومت کا انعام دے گا"۔ اگر مذہب اور سیاست میں روح و جسم کا تعلق نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے پیروانِ مذہب کے مقدس گروہ کے لئے سیاسی انعام (یعنی حکومت) تجویز نہ کرتا ۔ قرآن بتاتا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو دُنیا میں حکومت کرنے کے قابل بنائیں تو عقبیٰ میں جنت کے حقدار بن سکتے ہیں جو قوم حکومت سے محروم ہے وہ اپنے آپ کو صحیح معنی میں مومن ثابت نہیں کرسکتی ۔ کیونکہ مومنوں کے لئے خدا نے حکومت مخصوص کردی ہے ۔ اسی طرح محکوم قوم جنت کی بھی شاید مستحق نہ ہوسکے ۔ کیونکہ جنت ایمان داروں کے لئے ہے ۔ اور ایمان داروں کو خدا دُنیا میں انعام حکومت سے محروم نہیں کرتا جو مسلمان اپنے آپ کو ایمان دار کہلانے کا مستحق سمجھتے ہیں ۔ وہ اپنی ایمان داری کی کوئی ایسی سند پیش کریں جو ارشاد ربانی کی روشنی میں قابل تسلیم ہو ۔

اعمال صالح اعمال صالح عبارت ہے ان مخلصانہ سرگرمیوں سے جو قوم کو منزل ترقی تک پہنچانے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں ۔ وہی شخص صالح اعمال ہے جو ذاتی اغراض قومی فائدہ پہ قربان کر دیتا ہے اور اس کام کو اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے ۔ اگرچہ ذاتی خوش اخلاقی بھی عمل صالح کہلا سکتی ہے لیکن یہ قومی نیک کرداری کی قائم مقام نہیں ہوسکتی ۔ ذاتی صالحیت انفرادی نجات کا ذریعہ تو ہے لیکن اجتماعی فلاح کی موجب نہیں ہوسکتی ۔ اور حکومت کا انعام حیات اجتماعیہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ ذاتی نیک اعمالی حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کی روشنی میں غور کیا جائے کہ "وہی شخص اچھا ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے" ۔۔۔ تو یہ حقیقت خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم نے اعمال صالح کو قوم کی خیر اندیشی اور اجتماعی فلاح سے تعبیر کیا ہے ۔

غیر مسلم قومیں اور اعمال صالح سورج کے سامنے جو چیز آتی ہے اس کا روشن ہونا یقینی ہے اس

لئے جو قوم اسلام کے قوانین کو دانستہ یا نادانستہ طور پر قبول کر لیتی ہے اس کے لئے فلاح لازمی ہے۔ اس اصول کے پیش نظر یہ اعتراض پیدا ہی نہیں ہوتا کہ غیر مسلم مسلمانوں پر کیوں حکمران ہیں حالانکہ وہ توحید و رسالت کے منکر ہیں؟ اس سوال کا جواب حضور علیہ السلام کے اس ارشاد سے ملتا ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اعمال صالحہ ان خدمات اور سرگرمیوں سے متعلق ہیں جو قوم کی ترقی و فلاح کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اگر نصاریٰ اپنی قوم کی بہتری کے لئے جانی و مالی قربانیوں سے دریغ نہیں کرتے تو وہ ان مسلمانوں سے زیادہ حکومت کے مستحق ہیں جو ذاتی فائدہ کے لئے قومی شرافت کا خون کر رہے ہیں آخر اسلام الفاظ و اصطلاحات کا نام تو ہے نہیں بلکہ اعمال و افعال کا نام ہے۔ جو شخص اسلام کے عملی پہلو کو کسی نہ کسی طریقہ سے قبول کر لیتا ہے وہ ترقی و فلاح کے میدان میں سب سے آگے نکل جانے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔

ان سطور بالا میں ان تمام نظریات کی روح کارفرما ہے جو مشرق و مغرب کے علماء نے مقاصد تعلیم کے لئے ظاہر کئے ہیں۔ قرآنی تلمیحات نے اس فلسفیانہ خطابت کو جس خوبصورتی کے ساتھ حقیقت ثابتہ کی خلعت بخشی ہے اس سے موضوع تقریر کی معجزانہ حیثیت اور بھی نمایاں ہو گئی ہے لیکن مصر کے قدامت پسند علماء کا ظرف معلومات اتنا وسیع نہیں تھا جس میں یہ دریائے معارف سما سکتا۔ انہوں نے سید صاحب کے ضمیر افروز خیالات سے استفادہ کرنے کی بجائے ان کو اپنے اقتدار کے لئے مستقل خطرہ خیال کیا۔ اور سید صاحب کو مصریوں کی نظروں سے گرانے کے لئے شرمناک پراپاگنڈا شروع کر دیا۔ ان کے عقاید و ارشادات کو غیر اسلامی عقاید کا نتیجہ خیال کیا گیا۔ تاکہ لوگ سید صاحب کے خلاف کوئی نتیجہ خیز آواز بلند کر سکیں۔ علماء سو کے علاوہ سید صاحب کی مخالفت میں جس گروہ نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ وہ بے عمل صوفیوں کی جماعت تھی۔ سید صاحب ان دکان داران جنس معرفت کے خلاف اکثر تلخ حقائق کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بے عمل صوفیوں کا وجود مسلمانوں کے اعتقادی انحطاط اور توہم پسندی کا بدترین نمونہ تھا چنانچہ

انہوں نے ایک شخص عبدالعزیز کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"آپ نے یہ توصیح فرمایا کہ تصوف و معرفت کے چشمے بایزیدؒ، جنیدؒ، حسن بصریؒ اور دوسرے اہل اللہ کی روحانیت سے اُبلے تھے جن کی پاکیزگی پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ میں آپ کے اس قول سے حرف بحرف متفق ہوں لیکن مجھے آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ملک میں کتنے صوفی ہیں جو جنیدؒ و حسنؒ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں کتنے مشائخ ہیں جو دنیوی راحت کو ترک کرنے کے بعد فنا فی اللہی کے لئے زندہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف و معرفت کے چشمہ صافی میں موجودہ غوطہ لگانے والے اپنے اغراض و مفاد کی غلاظت اس میں بکھیر رہے ہیں۔ جس سے اس چشمے کا پانی گدلا ہوگیا ہے۔ اب اس کے دوبارہ صاف کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان لوگوں کو اس کے پاس جانے کے قابل نہ رہنے دیا جائے تاکہ پانی کو نتھرنے کا موقع مل سکے یہ گندم نما جو فروش حقیقی صوفیوں کا نام بدنام کر رہے ہیں۔ قوم میں بے عملی کی وباجتنی سرعت سے ترقی کر رہی ہے وہ سب ان کی گوشہ گیرانہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اسلام تو رہبانیت اور ناجائز ترک و توکل کا مخالف ہے لیکن یہ لوگ حامی ہیں۔ اگر آپ کے ملک کے " بدنام کنندگان تصوف " حقیقت و معرفت کی دُنیا میں نکو نام ہونا چاہتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو حضورؐ داعی اسلام کی سنت اور اسوۂ حسنہ کا مقلد بنائیں اس کے بعد مجھے بھی ان کے حلقۂ غلامی میں داخل ہوتے ہوئے سعادت دارین نظر آئے گی۔"

مصر میں ایسے باخدا صوفی تو تھے نہیں کہ اس دعوت پر لبیک کہتے یہاں تو ان نفس پرست بدمعاشوں کا نام صوفیائے کرام تھا۔ جو " روحانی حکومت کی بقا کے لئے مُریدوں کے قوائے عمل مضمحل کرتے رہتے تھے چونکہ یہ لوگ سادہ لوح مسلمانوں پر اپنی کرامت و ولایت کا اثر ڈالنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس لئے بے علم اور قدامت پسند مسلمان ان کے اشارۂ ابرو کو حرکت تقدیر کا ترجمان خیال کرتے تھے بدقسمتی سے اس زمانہ میں مصر میں عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے مسلمان ہندوستان سے کم نہیں تھے اس لئے ان نام نہاد مشائخ کا کاروبار خوب ترقی پر تھا۔ یہ لوگ قوم کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے اپنی زندگی

کی راتیں شب برات اور روز روز عید سے زیادہ مسرت انگیز بنائے ہوئے تھے لیکن قوم کے لئے صرف اتنا کام کرتے کہ نذریں وصول کیں اور جنت کا پروانہ لکھ دیا۔ گویا ؎

یہاں گاڑھے پسینے کی کمائی دے کے پیروں کو
مٹانا چاہتے ہیں لوگ قسمت کی لکیروں کو (اظہر)

مصر کے بے عمل صوفیوں کا مسلک مصر کے بے عمل صوفیوں کا مسلک کیا تھا؟ اس سوال کا جواب "تمدن مصر" نے یوں دیا ہے کہ بے عمل مشائخ کا حلقہ اثر سارے ملک پہ حاوی ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی روحانی تجارت کو فروغ دینے کے لئے سادہ لوح لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا کہ عرفان حقیقت اور تقرب الٰہی کے اصول و ضوابط قرآن و حدیث میں نہیں بتائے گئے۔ کیونکہ یہ کتابیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو دُنیا میں دُنیا دارانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تعلیم صرف ان صوفیائے کرام تک سینہ بسینہ پہنچی ہے جو وسیع الظرف ہونے کے باعث کشف و الہام کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں اور روحانی طور پہ ان مشکلات و مصائب کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو تقرب الٰہیہ کی راہ میں قدم قدم پہ رُکاوٹ ڈال رہی ہیں۔ یہ روحانی تعلیم اگرچہ اوراد و وظائف کا مجموعہ تھی تاہم ان کی راز دارانہ خصوصیات پہ اہل عقیدت کو حد سے زیادہ اعتماد تھا۔ لوگ مشائخ کے پاس اس لئے نہیں جاتے تھے کہ ان کے اعمال و اقوال ارشادات ربانی کے ماتحت ہیں بلکہ اس عقیدت مندانہ یقین کے ساتھ ان کے آستانوں پہ ماتھے رگڑتے تھے کہ مشائخ کی ایک نگاہ لُطف مُریدوں کو کم سے کم خدا تک پہنچا سکتی ہے۔ بایں ہمہ مشائخ کے ذاتی اعمال عام لوگوں سے بھی زیادہ تشویشناک تھے۔ اس سلسلے میں الاسلام فی المصرؒ کے مصنف کا یہ قول کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ :-

"اگر اہل مصر کے سامنے اٹھارہویں صدی کے نام نہاد مشائخ کا اسلام پیش کیا جاتا تو کوئی بھی دردار باعمل شخص مسلمان ہونا منظور نہ کرتا۔ ان کی مصنوعی حیثیت اس راہب سے ملتی جلتی ہے جو ترک و قناعت کے پردے میں وہ ساری سیاہ کاریاں کر گزرتا ہے جن سے دُنیا پرست عیاشوں کا ذوق گناہ بھی واقف نہیں"

یہ طور نام نہاد مشائخ مصر کی اعتقادی غرابت، اور انفرادی زندگی پہ کافی روشنی ڈالتی ہیں لیکن ان کی زندگی کا جو پہلو قوم سے تعلق رکھتا ہے وہ انتہائی طور پہ قابل مذمت اور افسوسناک ہے چنانچہ مشہور اطالوی سیاح موسیو ایم۔ ایل۔ لاول اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ:-

داستان غداری کا شرمناک باب | "مجھے قاہرہ میں رہتے ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں اپنے آبائی مذہب پر قبول اسلام کا پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میرا مسلمان میزبان بے حد خدا پرست اور ماہر روحانیات تھا اکثر راتوں کے پچھلے حصوں میں وہ عربی زبان کے چند جملے باآواز بلند پڑھتا تھا جب وہ ورد میں مشغول ہو جاتا تو اس کی آواز ایک اور آواز کا غلاف بن کر رہ جاتی۔ میں نہیں جانتا یہ ملفوف آواز اس کے جسم کے کس حصے سے اٹھتی تھی مگر اتنا جانتا ہوں کہ جب وہ پڑھتا تو اس کے بائیں پہلو کی ہڈیاں جنبش کرتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل کو اپنا ہمدرد بنا رہا ہے چند گھنٹوں کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور اس حالت میں وہ اکثر وجد میں ڈوبی ہوئی باتیں کرنے لگ جاتا جن کو ایک اجنبی آدمی دماغی انحطاط کا نتیجہ کہے بغیر نہیں رہے گا لیکن یہ خیال غلط اندیشی پر مبنی ہوگا۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ میرے میزبان پر غیر معمولی بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اس کی نبضیں ڈوب گئیں۔ آنکھوں کی پتلیاں پھرنے لگیں جلد مس سے گرمی رخصت ہو گئی۔ یہ منظر میرے لئے انتہائی اضطراب کا موجب تھا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر پڑوسیوں کو مدد کے لئے پکارا لیکن کسی شخص کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں نے خیال کیا کہ میرا میزبان بے ہوش نہیں تھا بلکہ روح وضمیر سے باتیں کرنے کے لئے دنیوی ہنگاموں سے الگ ہو گیا تھا۔ اتنے میں پڑوسی بھی آ گئے لیکن اب ان کی ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال میرے میزبان نے ہوش میں آتے ہی اپنی چمکتی ہوئی سرخ آنکھوں کو جنبش دے کر کہا کہ میں نے گوہر مقصود پا لیا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ گوہر مقصود سے اس کی مراد کیا تھی لیکن اس کی مسرت افروز آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خدا تک پہنچ چکا ہے۔ اس واقعہ سے دو ہفتہ بعد (یعنی ۱۱ جنوری ۱۸۷۱ء کو) مجھے میزبان نے ایک

گاؤں میں ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ یہ گاؤں قاہرہ سے ۱۳ میل جنوب کی جانب تھا۔ جہاں ایک بہت بڑے پیر کی قیام گاہ تھی۔ ہم دن کے چار بجے گاؤں میں پہنچے۔ شیخ کے حضور میں حاضر ہوتے ہی میرے ساتھی نے شیخ کے پاؤں پر ماتھا رکھ دیا۔ یہ حرکت میرے لئے انتہائی حیرت کا موجب تھی۔ کیونکہ اسلام کے متعلق میرے مطالعہ و معلومات میں یہی تھا کہ مسلمان خدا کے بغیر کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا۔

رات ہم نے شیخ کے آستانہ پر قیام کیا۔ ہمارے ساتھ شیخ کے اور عقیدت کیش بھی آرام فرما تھے جو ملک کے مختلف حصوں سے حصول عرفان کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ رات کے دس بج چکے تھے خانقاہ کا ہر گوشہ درویشوں کی ہُوحق سے ہنگامہ زار بنا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک موٹر آیا جس پر سے ایک غیر ملکی حکومت کا نمائندہ اُترا اور ایک درویش سے مختصر سی گفتگو کرنے کے بعد اس کمرے میں آیا جہاں ہم مقیم تھے۔ اس غیر ملکی نے اپنی آمد کی خبر ایک درویش کے ذریعہ شیخ کو بھیجی۔ شیخ صاحب بھی آ گئے اور ان دونوں میں اس مسئلہ پر گفتگو ہونے لگی کہ مصری سیاسیات پر ایک یورپی حکومت کا (جس کا نام میں نہیں لینا چاہتا) تسلط کس طرح ہو سکتا ہے؟

شیخ نے اپنے مہمان کو یقین دلا دیا کہ میں آپ کا کام ہر ممکن طریقہ سے کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد غیر ملکی مہمان شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوا اور جاتے ہوئے چمڑے کی بنی ہوئی ایک خوبصورت تھیلی جو غالباً اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی شیخ کے پاؤں کے قریب چھوڑ گیا۔

شبستانِ شیخیت کے سنہری لمحات شیخ کے چلے جانے کے بعد میرا دماغ مختلف خیالات کی رزم گاہ بن گیا۔ میں آنکھیں میچ میچ کر نیند کو بلا رہا تھا لیکن دماغی کیفیات نے اس کے آنے کے تمام رستے بند کر رکھے تھے۔

جب آدھی رات کا وقت ہوا۔ کائنات پر ساز فطرت کے خاموش نغمے بکھرے پڑے تھے تو اس وقت گاؤں میں کانوں کو ستانے والا صرف ایک ہی ہنگامہ تھا جو درویشوں کی ہُوحق پر مشتمل تھا۔ ہمارے کمرے میں اچانک غیر معمولی روشنی نمودار ہوئی۔ میں نے اپنی غنودگی زدہ آنکھیں ہتھیلیوں سے ملیں اور اس ناگہانی منظر

کو دیکھنے کے قابل ہو گیا میں نے آنکھیں کھولتے ہی چند پرچھیرہ عورتوں کو اپنے سرہانے کھڑے دیکھا جو ا
میں لیمپ لئے ہوئے کمرے میں سونے والوں میں کسی خاص شخص کی تلاش کر رہی تھیں۔ اسی اثنا میں ایک در
کی آنکھ کھلی۔ اس نے عورتوں پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ حضرت شیخ آج مہمانوں کی وجہ سے دوسرے
کمرے میں چلے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی عورتیں شیریں تبسم میں ڈوبا ہوا شکریہ ادا کرنے کے بعد چلی گئیں۔ اب درویشوں
کی ہو حق کا ہنگامہ خاموشی میں ڈوب گیا۔ اور رات اپنی حقیقی شان کے ساتھ لوگوں کو سلانے میں مصروف
ہو گئی۔ اس خاموشی میں مجھے عورتوں کی پراسرار آمد پر شکوک و مشتبہ خیالات کرنے کا موقع مل گیا لیکن وہ درویش
جس نے گوشت و پوست کے ان خوشنما پھولوں کو شیخ کے پاس پہنچانے کا فرض ادا کیا تھا چپکے سے میری خوابگاہ
کے قریب آیا اور کہنے لگا "جاگتے ہو؟" میں نے کہا "ہاں نیند نہیں آتی"۔

"تم نووارد ہو"۔ وہ کہنے لگا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ عورتیں تزکیہ نفس کے اصول معلوم کرنے کی غرض سے
رات کو آیا کرتی ہیں۔ آخر دن کو مردوں کے ہجوم میں پردہ نشین خواتین نہیں آسکتیں"۔

درویش کا یہ کہنا ایک ایسے سوال کا جواب تھا جو اس کی دور اندیشی نے خود ہی پیدا کر لیا تھا میں یہ خیال
کرنے میں حق بجانب تھا کہ عقلمند درویش میری بدگمانیوں کو اظہار سے پہلے ہی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا

مشائخ مصر کی ہوسناکی، غداری اور عشرت پسندی کے جو سنہری لمحات ان سطور میں دکھائے گئے
ہیں ان کے مطالعہ کے بعد اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مختصر یہ کہ بدترین وطن فروش
اور نفس پرستوں کا گروہ اپنے عیوب پر شیخیت کا مسلم فریب پردہ ڈال چکا تھا۔ سید صاحب نے ان
لوگوں کی چھپی ہوئی بداعمالیوں کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا۔ انھوں نے مشائخ کے خلاف زوردار آواز
بلند کی لیکن شیخ پرستوں کا دل و دماغ اتنا صحیح و معقول تو تھا نہیں کہ آزادانہ اصلاح کا پیغام قبول کر سکتا
وہ اجتہاد و تجدد تو درکنار کسی قدیم نظریہ کو بھی جس کی بنا صحت خیال پر ہو کبھی برداشت نہیں کر سکتے

تھے۔ ان کے پاس دلائل و براہین کا ذخیرہ بھی نہیں تھا کہ سید صاحب کے اعتراضات کے حریف ہو سکتے۔ وہ اپنے عقاید کے جواز میں صرف ایک دلیل پیش کر سکتے تھے جو ان کے توہمات میں اُلجھی ہوئی پریشان خیالی کی پیداوار تھی لیکن

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر   بُرا مت مانیو غالب جو کہتا ہے بُرا ناصح

مشائخ اور ان کے مریدوں نے سید صاحب کے خلاف پروپاگنڈا شروع کر دیا۔ اور عوام میں یہ غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی کہ افغانی شیخ عقاید و خیالات کے اعتبار سے اسلام کے سیزدہ صد سالہ روایات کے مخالف ہیں۔ ان کے خیالات و تفکرات میں الحاد و زندقہ کی سیاہی چھپی ہوئی ہے۔ اس پروپاگنڈے کو تقویت دینے والا جامعہ ازہر کے قدامت پسند اساتذہ کا گروہ تھا جو پہلے ہی سید صاحب کی خدا لگتی باتوں پہ آتش زیرپا ہو چکا تھا مصر میں بھی قسطنطنیہ کی طرح عقل کے اندھوں کی کمی نہ تھی، مشائخ کے قول کو الہام کا قائم مقام سمجھنا ان کی جہالت کا ادنےٰ کرشمہ تھا۔ اس لئے سید صاحب کے خلاف عداوت و اشتعال کی چنگاری سب سے پہلے تصوف و معرفت کی سرزمین ہی سے اٹھی جو علماؤں کے شعلۂ انتقام سے بھڑکتی ہوئی جہنم مخالفت بن کر رہ گئی

مشائخ اور مشیخیت سید صاحب مشائخ اور ملاؤں کی معاندانہ تبلیغ سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان کی غوغا آرائی سید صاحب کے سمند عمل پر تازیانہ ثابت ہوئی۔ وہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے اجتہاد آمیز خیالات کو پھیلانے لگے۔ چنانچہ اصلاح پسندوں کی انجمن میں تقریر کرتے ہوئے سید صاحب نے مصر کے بدنام کنندگان طریقت پر مخفتا کے ساتھ نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

" مشائخ میری خدا لگتی باتوں کو انتقامی جوش کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے میرے خیالات کو بد اعتقادی یا طریقت دشمنی کا نتیجہ قرار دے رکھا ہے تو ان کی یہ غلطی روز نیل سے بھی سے زیادہ وسیع اور نمایاں ہے مشیخیت نام ہے سنن رسولؐ کی تصویر کا۔ جو شیخ اپنے اعمال و افعال میں وحدت پیدا نہیں کر سکتا جب کا عمل قول سے مطابقت نہیں رکھتا جس کی تربیت سے سعی و جہد کے جوہر نمایاں نہیں ہو سکتے اس کی ہستی دامن مشیخیت پر ایک ایسا بدنما دھبہ ہے جس نے اسلام کی خوبصورتی چھپا رکھی ہے۔

مسلمان ایک مکمل اور تربیت یافتہ اصول و قوانین کے مجموعہ کا نام ہے جس میں دنیوی ترقی اور اخروی فلاح کے سارے قواعد موجود ہیں۔ لیکن ان مشائخ نے صرف ترک دنیا ہی کو اسلام کا اصل الاصول قرار رکھا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام صرف رہبانیت اور ناجائز ترک و توکل ہی سکھاتا ہے۔ حالانکہ قرآن و احادیث اور فقہائے اسلام کی تعلیم کا مرکز یہ ہے کہ جب تک مسلمان دنیوی طور پر خوشحال نہیں ہیں ان کی دینی ترقی ناممکن ہے۔ روحانیت ایک مقدس چیز ہے لیکن روح مادہ کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قوم کی پشت پر سیاسی و مادی قوت کا ہاتھ نہیں اس کی مذہبیت اور روایات محفوظ نہیں رہیں۔ اغیار کے پیہم حملوں نے اس کے دین و عقائد کو بالکل بے اثر بنا رکھا ہے یہود کی طرف دیکھئے اگر دولت یا رہبانیت سے مذہب اور حکومت کو حاصل کیا جا سکتا تو آج ساری دنیا یہود کے مذہب و حکومت کی محکوم ہوتی۔ چونکہ وہ سیاسی قوت سے محروم ہے۔ اس لئے اس میں مذہب کی حقیقی جھلک نہیں پائی جاتی۔ ان کے عقائد حقیقت سے محروم ہو کر الفاظ و توہمات کی تاریکی میں کھو گئے ہیں ان حقائق کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مشائخ سیاسیات سے علیحدہ رہ کر قوم کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہونا ضروری تھا۔ تو یہود کے راہب آج ساری دنیا کے حکمران ہوتے۔" (الاخوت فی الاسلام)

ان خوفناک باتوں سے جب مشائخ کو آگاہی ہوئی تو ان کا غیظ و غضب اور بھی بڑھ گیا۔ اور سخت مشتعل ہوئے انہوں نے سید صاحب کے متعلق بیہودہ باتیں کہنی شروع کر دیں جن کا تصور بھی کوئی شریف دماغ برداشت نہیں کر سکتا لیکن سید صاحب بدستور اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مشائخ کی غلط بیانیاں، الزام طرازیاں اور غلط پراپگنڈا ان کے خیالات و اقوال میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔

حکومت میں بنیادی تبدیلی | سید صاحب کے ورود مصر سے پہلے وہاں جدید خیالات کا شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ اخبار نویس اور مصنف بہت کم تعداد میں تھے لیکن تحریر و تقریر میں بعض افراد کوئی آزاد اور بیباک حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں مصطفیٰ نحاس پاشا، وہبی پاشا، عبداللہ پاشا، فکری پاشا، خیری پاشا اور محمود پاشا شوقی بہت شہرت کے مالک تھے۔ اتنے بڑے ملک میں چند اہل قلم کی قوت تحریر و تقریر کافی نہیں ہو سکتی تھی۔ سید صاحب نے ذہنی انقلاب

کے اسباب و محرکات کو بیدار کرنے کی غرض سے جدید علمی و تحقیقی ترقی کو فروغ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں ہی مصر میں کثیر التعداد اخبار نویس اور ادیب پیدا ہو گئے جن کے قلم اور زبان اصلاح و تجدید کی آرزوؤں کو عالم الفاظ و اظہار میں لانے لگے۔ آزادیٔ تحریر کی حدت بڑھی، ہوائے خواہش حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ ثابت ہونے لگی۔ ملک کی ذہنی بیداری اس درجہ ترقی کر گئی کہ وہ خیالات و باتیں جن کو دماغ بطور خیال و تصور بھی قبول کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ زبان و قلم پر عام الفاظ کی طرح آنے لگیں۔ خدیو مصر کی عیش پرستانہ اور مسرفانہ مطلق العنانیوں پر عام مجالس اور اخبارات میں اس سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی جانے لگی کہ مصر کے استبدادی نظام حکومت کو ہر شخص اپنی آزادی کے لئے ایک ناقابل برداشت قید خیال کرنے لگ گیا۔

فری میسن لاج | سید صاحب نے اپنے خیالات کے اظہار اور ان کے اثرات کو منظم بنانے کی غرض سے "فری میسن لاج" کی بنا ڈالی۔ یہ ادارہ ملک کے اصلاح پسند آزاد خیالوں کی مرکزی انجمن تھا جس میں مبادلۂ خیالات کے ذریعے سے اصلاحی و انقلابی اسباب و ذرائع کی تعیین کی جاتی۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد یہ تھے: مصر کو اغیار کے تسلط سے محفوظ رکھنا اور حکمران کے مسرفانہ رویہ کی اصلاح کرنا۔

سید صاحب کی جادو بیانی اور معجز نما اثر و کشش نے سب سے زیادہ جو شاندار کام کیا یہ تھا کہ توفیق پاشا (ولی عہد حکومت) کو اصلاح پسند گروہ میں شامل کر دیا۔ توفیق پاشا باقاعدہ طور پر لاج کے رکن کی حیثیت سے اپنے باپ کے خلاف تنقیدی مباحث میں شرکت کرتا۔ ان تمام اصلاحی و انقلابی سرگرمیوں میں برابر کا حصہ لیتا۔ لیکن جب ہم توفیق کے عہد حکمرانی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ خیال کرنا پڑتا ہے کہ توفیق نے نیک نیتی کے ساتھ یہ دعوت قبول نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ اس انقلاب کو جو سید صاحب کے افکار و خیالات سے نمایاں تھا تخت و تاج کا ذریعہ حصول بنانا چاہتا تھا۔ وہ ایک عجلت پسند شہزادہ تھا۔ اس کو ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ ولی عہدی جلد از جلد بادشاہی میں تبدیل ہو جائے ورنہ وہ بھی آغوش ملوکیت میں پل کر جوان ہوا تھا۔ اس کی فطرت میں اگر کوئی اصلاحی جذبہ مضمر تھا تو اس کی وسعت حصول حکومت تک ہی محدود تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہنگامی ضروریات کے پیش نظر سید صاحب ہی نے اس

کو یقین دلا دیا ہو کہ اسماعیل پاشا کی ملوکیت کا خاتمہ تمہاری ولی عہدی کو قبل از وقت بادشاہی سے تبدیل کر دے گا۔

فری میسن لاج میں سید صاحب نے جو انقلاب انگیز تقریریں کیں وہ ان کی قابلیت کا بہترین نمونہ ہیں لیکن ہمارے پاس مختلف ذرائع سے جو معلومات آسکی ہیں وہ انتہائی طور پر مختصر ہیں۔ تاہم کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ لہذا سید صاحب کے جس قدر ارشادات میسر آسکے وہ درج ذیل ہیں،

"تربیت حسنہ" کے عنوان پر سید نے لاج میں مندرجہ ذیل مقالہ پڑھ کر سنایا تھا:-

تربیت حسنہ اور قومی ترقی "انسان ہر حالت میں انسان ہے۔ اگرچہ مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی قوم وحشی خیال کی جا سکتی ہے لیکن تربیت فطری سے وہ بھی خالی نہیں۔ اگر کسی شخص کو اس کی فطرت کے پیش نظر اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر سمجھ میں آجائے گا کہ اس کی باتربیت زندگی محالات عادیہ میں سے ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ انسانی زندگی باتربیت قائم نہیں رہ سکتی تو یہ نظریہ بلاشک و شبہ قبول کرنا پڑے گا کہ انسانی تربیت کے مراحل طے کئے بغیر حیوانوں سے بھی بری زندگی کا مالک ہے۔

مبادئ تربیت تربیت سے مراد وہ جنگ ہے جو طبیعت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ یہ وصف انسان اور حیوان بلکہ نباتات میں بھی پایا جاتا ہے لیکن تربیت کی قسمیں اور اثرات مختلف ہیں۔ اگر تربیت اچھی ہوگی تو طبیعت نقص سے کمال اور پستی سے عروج تک جا پہنچے گی۔ اگر تربیت اچھی نہ ہوگی تو طبیعت اپنے اصلی جوہر سے بھی محروم ہو کر تنزل و انحطاط کی طرف مائل ہو جائے گی۔ یہ امر باغبانوں اور حیوانات پالنے والوں، بچوں کی پرورش کرنے والوں، انتظامی افسروں نیز مذہبی رہنماؤں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان، حیوان، اور نباتات کی تمام خوبیاں اور خوبصورتیاں اچھی تربیت کا نتیجہ ہیں جس سے تمام برائیاں اور بدصورتیاں جو بری تربیت کا نتیجہ ہیں دور ہو جاتی ہیں۔ جب یہ امر سمجھ میں آجائے تو یہ حقیقت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی قوم کمال تربیت سے تمام قوموں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے اور وہی قوم دوسری اقوام کو اصناف پر ایک طبعی اور غالبانہ اثر ڈالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اسی کو حقیقی ترقی کی راہ پر

کا مزن ہونے کا حق حاصل ہے ۔

تربیت کا نقص ہر جماعت اور ہر صنف اپنے اپنے جزیرہ و صلاحیت کے مطابق اس تربیت یافتہ قوم سے درس کمال لے گی یا کمال حاصل کرنے کے لئے اس کے سامنے کوشش کے ہاتھ پھیلائے گی۔ تمام جماعتیں آپس میں توازن عدل و انصاف قائم رکھنے کی غرض سے اس قوم کے معنوی فیوض و برکات کی محتاج ہوں گی۔ یہی قوم عظیم الشان بادشاہی قائم کر سکتی ہے۔ اسی قوم میں حکماء، فضلاء، علماء، ادباء تجار اور صاحب ایجاد و اختراع پیدا ہوں گے۔ جب تک یہ قوم حسن و تربیت سے فیض یاب ہوتی رہے گی اس کا قومی وقار ساری دُنیا میں ممتاز رہے گا۔ چونکہ ہر صنف کا کمال دوسری اصناف کی عمومی ترقی سے ایک قدرتی رابطہ رکھتا ہے۔ اور یہ رابطہ قانون الٰہیہ و سنت قدرت کے مطابق ہے۔ اس لئے اصناف کا جوش رشک و حسد بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کے خلاف تخریبی کوششوں میں لگا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب کمال صنف میں نقص تربیت واقع ہو جاتا ہے۔ اس کے تصرفات کمزور ہو جاتے ہیں جس کے باعث اس کے تمام مطیع و فرمانبردار طبقے روگردانی اختیار کر لیتے ہیں ۔

عام طور پر کمال تربیت اصحاب عقل و فکر کی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اس لئے نقص تربیت کی ابتدا بھی حکماء، علماء، ادباء، تجار اور دوسرے قائدین فکر و خرد سے ہوتی ہے ۔

قائدین تربیت قوم کی تربیت قائدین کی مساعی حسنہ کی شرمندۂ تخلیق ہوتی ہے۔ اور قوم میں فساد تربیت بھی انہیں کے معلومات و اعمال میں ضعف و خلل آجانے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ فساد بسا اوقات عمومی اخلاق اور اجتماعی کردار کو تباہ کئے بغیر نہیں چھوڑتا خصوصاً شریف طبقہ تو تدریجی ضعف سے ہوتا ہوا مضمحل ہو جاتا ہے۔ اور اس سے معنویت بالکل رخصت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جماعت اپنا لباس قومیت اُتار کر تہذیب و تمدن اور حیثیت و روایات کے اعتبار سے کسی قوم کا جزو بن کر رہ جاتی ہے۔ اس نظریہ کی تائید کلدانیوں اور قبطیوں کی تاریخی حیثیت سے ہوتی ہے۔ یہ قومیں کبھی عنایات ازلیہ سے بہرہ ور تھیں لیکن اپنے دانش مند اور

صاحب ذکاوت افراد کے فساد تربیت سے بھی ذہن و ذہنی انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی معنویت کو زائل کر دیتی ہے لیکن اگر فساد تربیت کے بعد صاحب عقول و اذہان اشخاص اپنے کو تربیت کے اثرات سے نجات دلانے کی کوشش کریں تو ان میں حسن تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر سکتی ہیں اور قوم انکی نئی قوت سے آشنا ہو جائیگی۔ کیونکہ ان میں صنفی ترقی اور حیات عقلی کی صلاحیت موجود ہے لیکن گردش زمانہ سے فراموشی میں مدفون ہے۔

مہدی منتظر کا عقیدہ: جو قوم زوال و انحطاط سے اپنی معنویت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کے تمام طبقوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی شان حاصل کرنے کے لئے اپنی قوت بازو پر بھروسہ نہیں کرتی بلکہ مجدد اور صاحب دانش و عمل رہنما کا انتظار رکھتی ہے۔ جو حکیمانہ تدبیر اور کامیاب مساعی سے افراد قوم کے عقول و اذہان روشن و پاکیزہ کر دے۔ اور فساد تربیت کا اثر زائل کر دے۔ جس سے قوم پہلی ترقی یافتہ حالت کے قریب پہنچ جائے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تمام طبقے بیچارگی اور پریشانی سے گھرے ہوئے ہیں۔ لہذا ہر ملک میں ہر مسلمان مہدی یا مجدد کا انتظار کر رہا ہے۔ ملت اسلامیہ کا ہر فرد اس انتظار میں ہے کہ مہدی یا مجدد کسی طرف سے جلد ظاہر ہونے والا ہے جو مسلمانوں کے نفوس و عقول کو فوراً اصلاح سے منور کر دے گا۔ اور بغیر کسی محنت کی پیداوار کی بجائے خامیاں اس کی کوشش سے دور ہو جائیں گی۔ اس عقیدے کی پیداوار عقلی و علمی ترقی کے ساتھ ساتھ پھیلتی ہے لیکن جہاں مہدی کے ظہور یا تجدید ظہور سے ملت اسلامیہ انکار نہیں کر سکتی۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ اس خیال نے مسلمانوں کے توانائی عمل پر پہلے ہی تعطل اور مستقبل فراموشی کا رنگ چڑھا رکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان مستقبل سے تعلق رکھنے والی اکتسابی ترقی کے حصول میں قرآن کریم کی کوشش کریں اور وہ وسائل مہیا کریں جن سے تجدید حسنہ کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

(... کابلی)

یہ خطبہ دلائل کے اعتبار سے تہذیب و تمدن کے نتائج پر مشتمل اور مبنی تبصرہ و تجزیہ کے مطالعہ سے انسان کے فکر و خیال میں نئی تازگی اور بقیہ زندگی کی روشن فضائیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس خطبہ سے زیادہ مفید وہ تقریر ہے جو سید صاحب نے "مسلمان اور غیر اسلامی تسلط" کے موضوع پر کی تھی۔ تمہید کے بعد فرمایا:

مسلمان اور غیر اسلامی تسلط: قوموں کی معنوی ترقی کا راز تربیت حسنہ میں مضمر ہے لیکن تربیت سے پہلے ذہن و دماغ میں تربیت قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہیے۔ یہ صلاحیت درس و تدریس یا علم و تعلیم سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کا رشتہ براہ راست اس معنوی قوت سے وابستہ ہے جس کو اصطلاح میں روح کہا جاتا ہے۔ روح سے مراد وہ جوہر ہے جو ہماری قوت حسی اثبات آسانی سے قبول نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ کیفیت انسانی قابلیت پیدا کرنے کی مستعد رہتی ہے۔ لیکن یہ بیداری کسی بیرونی حادثہ اور واقعہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے صاحب روح کی فرستادہ تعلیمات ہے جو تجربہ و مشاہدہ سے دور یا چیز نہیں ہوتا بلکہ وجدان کی ایک خاص کیفیت سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کیفیت علم طب یا اعتقاد و یقین کی انتہائی ترقی سے پیدا ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اعتقاد و یقین کی لازوال قوت کس طرح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس چیز کے حصول کے لیے کن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے؟

اس مسئلہ پر فلسفیانہ دلائل و براہین کی نمائش سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ ہمیں کس اصول پر غیر متزلزل اعتقاد رکھنا ہے۔ جب اس سوال پر پوری طرح غور کیا جائے گا تو ہماری تحقیق سے یہ بات معلوم ہوگی کہ [illegible] اس وقت [illegible] یہ کہنا پڑے گا کہ ہم اصول [illegible] مذہبی [illegible] اعتقاد کا مرکز ہیں۔

جب ہمیں [illegible] کہ قرآن کریم پر کامل اعتقاد ہوگا تو ہماری تربیت قبول کرنے کی صلاحیت [illegible] اور اس کی کامل استعمال [illegible] قرآن کریم [illegible] کو [illegible]

کا نصب العین بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمارے معیار ترقی کو اعلیٰ بنا کر ہماری قوت ارادی کو مستحکم اور مضبوط بنا دیا ہے۔ درحقیقت قوت ارادی کی تحریک ہی سے انسان کی فطری صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے کہ تم فتح و غلبہ کے مالک ہو۔ تمہارا مسلمان ہونا اسی وقت ثابت ہوگا جب تمہاری غالبیت مسلم ہوگی۔ جب مسلمان اس قرآنی اصول کے مطابق اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر فتح و غلبہ کا مستحق خیال کرنے لگ جائیں تو ان میں تربیت حسنہ اور درس ترقی قبول کرنے کی صلاحیت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن کریم کی مشہور آیت ہے کہ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ " دین سے مراد پیروان دین کی عملی روایات ہیں اور عمل و حرکت پیروان دین کی سنت جاریہ سے متعلق ہے۔ اللہ کریم اس آیت کے ذریعہ سے بتاتا ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ کی معرفت خدا کا پیغام قبول کر لیا ان کو تمام ادیان عالم کے متبعین پر غالب کیا گیا۔ اس ارشاد قدسی کے پیش نظر جو مسلمان جماعت غیر اسلامی تسلط قبول کر لیتی ہے اور اس کے بعد غلبہ و تفوق کے احساس و اعتماد سے محروم ہو کر محکومی پر قناعت کر لیتی ہے۔ وہ ارشاد الٰہی کی روشنی میں اس دین کی پیرو کہلانے کی مستحق نہیں جس کو "دین الحق" کا اعزاز حاصل ہے اس کا اسلام وہ اسلام نہیں ہوگا جس کی اشاعت خداوند تعالیٰ نے حضرت سید المرسلینؐ کے ذریعہ سے کی بلکہ وہ حقیقی بصیرت سے محروم ہو کر مذہب کو توہمات و عافیت کیشی کی تاریکی میں دیکھ رہی ہے اس کا اعتقاد خود اسی کی معنوی لغزش اور روحانی تنزل کا عکس ہے جب تک مسلمان کا اعتقاد و احساس اس ارشاد الٰہی کو قبول کر لینے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوتا اس کی قوت و حرکت سے ہمیشہ معنوی قوتیں بیدار ہوتی رہیں گے جس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ وہ ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس کا یقین ہے کہ ترقی کا دامن اسلام سے اور تنزل کا رشتہ کفر سے وابستہ ہے۔

عذر انتظار مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں پر جمود و عافیت کی نیند طاری

ہے۔ ان کے قوائے عمل بیکار رہنے کی وجہ سے مُردہ ہو چکے ہیں۔ ترقی و خود اعتمادی کا وہ بلند ترین نصب العین جو قرآن کریم نے ان کے سامنے رکھا تھا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ وہ عمل و حرکت سے کوسوں بھاگتے ہیں بے عملی اور جمود کے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس کام کے لئے نت نئی وجہ جواز پیش کرنے کے عادی ہیں۔ خانقاہوں۔ مدرسوں اور مسجدوں میں رہنے والے اپنی مذہب پرستی کے نقارے پر رات دن چوٹ تو لگاتے رہتے ہیں لیکن جب اسلام کے شجر حیات کی آبیاری کے لئے خون کے چند قطروں کی ضرورت ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم تو امام مہدی کا انتظار دیکھ رہے ہیں۔ یہ عذر صدیوں سے نئی نئی دلیلوں کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ کیا جب تک امام آخرالزمان کا ظہور نہیں ہوتا ہم غلامی اور غیر اسلامی تسلط پر قناعت کریں گے۔ فرض کیا جائے کہ امام کا ظہور ہی جہاد کے لئے شرط ہے تو کیا امام کو ایسے بُزدل سپاہیوں کی ضرورت ہے جو جنگ کا تجربہ اور مشق کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے۔ آپ کو تو عافیت کیش حجرہ نشینوں کی ضرورت نہیں۔ آزمودہ کار مجاہدین کی ضرورت ہوگی جو بے پناہ سیلاب کی طرح ساری دُنیا میں پھیل جائیں۔

امام کے لئے مناسب ماحول | ئیں ظہور مہدی کے اعتقاد پر بحث کر کے اختلاف و تشتت کا نیا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا لیکن اس حقیقت کو چھپانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ اس عقیدہ کے اثرات بھی موجودہ زمانے میں ردعمل کا شکار ہو چکے ہیں ورنہ اس عقیدہ کی مقبولیت کا ابتدائی زمانہ انتہائی طور پر عمل و حرکت اور سعی و جہاد سے بھرپور تھا۔ تاریخی طور پر یہ امر مسلّم ہے کہ اس عقیدہ سے سب سے زیادہ فائدہ اسماعیلی فرقہ نے اُٹھایا جنہوں نے محض اس خیال پر کہ امام آخرالزماں کا ظہور ہونے والا ہے اور ان کے لئے ایک مناسب و موزوں ماحول کی تیاری ضروری ہے، قوم کی انقلاب انگیز قوتیں بیدار کر دیں اور اپنی مسلسل کوشش و سعی سے درجنوں حکومتوں کی بنیادیں متزلزل کر

دیں گے کہ یہ ظہورِ مہدی کی پیشین گوئی [illegible] جہاد [illegible] اور [illegible] کا مرکزی اصول تھا لیکن اب اسی
عقیدے کو بدل، عافیت پسندی کا [illegible] کے [illegible] بنا دیا جاتا ہے۔ [illegible]
یہاں تک اس عقیدے سے کوئی کام کیا جاتا ہے [illegible]
قائل بنا دیا ہے۔ اور ایسے سادہ لوح پیدا کر دیئے ہیں [illegible] آنکھیں بند کر کے [illegible] کے
جھوٹے دعووں پر مہرِ تصدیق ثبت کریں۔

اگر فی الواقع ظہورِ مہدی کا وقت قریب ہے۔ تو ہمیں [illegible] کی [illegible] کے [illegible] حال
تیار کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ عقیدہ [illegible] کی صلاحیت [illegible] کرتے [illegible]
[illegible] سے [illegible] ہو کر رہ جائے گا۔" (الاخوت فی الاسلام)

خدیو مصر اور [illegible] صاحب | سید صاحب نے خدیو مصر اسماعیل پاشا کی [illegible] کے [illegible]
میں [illegible] لیکن اس موضوع پر کوئی مکمل تقریر میسر نہیں آ سکی۔ البتہ [illegible] المشرق۔ [illegible] المشرق۔
الاخوت فی الاسلام۔ رسالہ المنار، مسٹر بلنٹ اور [illegible] کے بیانات اور دوسری [illegible]
کے متعلق مختلف شذرات ملتے ہیں جن کا مفہوم درج ذیل ہے۔

[illegible] | اسماعیل پاشا کی [illegible]
نہیں [illegible] امام [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible]
وہ ملک کی [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible]"

[illegible] | [illegible]
[illegible]

تک اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر کامیاب نہیں بنا سکتا جس حکومت کی بنا دجل و مکر اور ذاتی خواہشوں پر ہو اس کی حیثیت اس خیالی عمارت سے زیادہ نہیں جس کی بنا ہوا پر ہو۔

ظلم سہنا اور ظالم کی مدد کرنا | ظلم بری چیز ہے، ظالم سے زیادہ قابل مذمت کوئی شخص نہیں ہو سکتا لیکن ظلم کو خاموشی کے ساتھ قبول کر لینا بھی تو اتنا ہی مہلک جرم ہے۔ اگر مظلوم یہ تہیہ کر لیں کہ ہم آج سے ظلم نہیں سہیں گے تو ظلم اور ظالم دونوں کا خاتمہ ہو جائے۔ مظلوموں کا صبر و تحمل ہی ظالموں کی تعداد بڑھاتا رہا ہے جب تک بے بسی کے ساتھ گردن کٹانے والا موجود ہے تاریخ کی خون آشامی رک نہیں سکتی۔ یہ بات فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ ظلم کی اعانت ظلم عظیم ہے بلکہ ظلم سے کہیں بڑھ کر ہے۔

جب تک تم صبر و تحمل کے ساتھ شاہ مصر کی حرکات پر خاموش رہو گے، اس تشویشناک مستقبل کو بدل نہیں سکتے جو غلامی اور بیچارگی کی ظلمتیں لے کر آ رہا ہے۔

سید صاحب کی مساعی کے نتائج | غرضیکہ سید صاحب کی جرأت آموز تعلیم نے مصری قوم میں انقلابی و اصلاحی ترقی کا جوش و خروش پیدا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسمٰعیل پاشا خدیو مصر خلع ہو کر ملک سے باہر چلا گیا اور اس کی جگہ توفیق پاشا تخت و تاج مصر کا مالک قرار پایا۔ توفیق نے حکمران ہوتے ہی ان تمام امیدوں کو توڑ دیا جن کو پورا کرنے کے لئے اسے تخت و تاج حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ سید صاحب کا توفیق کے متعلق خیال تھا کہ وہ برسر اقتدار ہوتے ہی مصر سے غیر ملکی تسلط کا جنازہ نکال دے گا۔ اور حکومت کی بنا مطلق العنانی اور شخصی استبداد کے بجائے رائے عامہ اور دستور جمہوریت پر ہو جائے گی۔

توفیق نے جن لاووں میں جن خیالات کا اظہار کرتا رہا اس کے پیش نظر اس کا مستقبل مفاد ملت کے لئے بہتر معلوم ہوتا تھا لیکن ملوکیت ایک ایسی تاریکی کا نام ہے جس کے قریب جاتے ہی تمام نورانی روشنیاں مسدود ہو جاتی ہیں جن کا نتیجہ توفیق جیسا شہزادہ جو کبھی استبداد اسمٰعیل سے بھی برگشتہ ہوا تھا، مقام ملت کی تحریکات کا تمام ۔۔۔ سید صاحب کے خلاف

بھی پُرجوش پروپیگنڈا کیا لیکن حالات نے اُس کا ساتھ نہ دیا اور اُس کا انجام اسماعیل کی طرح عبرتناک نہ ہو سکا

توفیق کو قتل کرنے کی کوشش سید صاحب کا ارشاد ہے کہ "جو لوگ قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں ان کو ہر ممکن طریقہ سے ہٹا دینا چاہئے"! ان کا خیال تھا کہ جن شخصیتوں پر قوم کو راہ فلاح پر چلانے کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ اگر اپنے فرائض انجام نہیں دیتے تو ان کو قیادت و سیادت کے قابل نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ورنہ قوم ردّ عمل کی رَو میں بہ جائے گی۔ اسی اصول کے پیش نظر سید صاحب نے توفیق پاشا کا قتل جائز سمجھا۔ اور اس کام کو انجام دینے کے لئے متعدد لوگوں کو آمادہ کیا لیکن ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

جب اس فرض کو انجام دینے کے لئے انتخاب ہوا تو قرعہ فال مصر جدید کے بانی اعظم مفتی شیخ محمد عبدہ مصری کے نام پڑا۔ مفتی صاحب ایسے معتدل فلسفی کے لئے یہ کام مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ تاہم وہ استاد کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے آمادہ ہو گئے۔

توفیق پاشا قاہرہ سے اسکندریہ جا رہا تھا مفتی صاحب نے اس موقع کو اپنے خونیں ارادے کے لئے ذریعہ تکمیل سمجھا۔ وہ سڑک پر پستول لے کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب توفیق اس سڑک پر سے گزرے تو پہلی پہلی نگاہ کے ساتھ ہی گولی پستول سے نکل کر اس کا دل چھیدتی ہوئی نکل جائے لیکن صاحب دماغ انسان ہنگامی جذبات سے چاہے کتنا ہی متاثر ہو جائے اس کے ارادہ میں استقامت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب موقع آیا تو پستول کی بجائے مفتی صاحب کا دل ہی متحرک ہو گیا۔ وہ اپنا کام کرنے کی بجائے کام کے نتائج پر غور کرنے لگ گئے۔ ان کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ دل کی بے پناہ تڑپ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ توفیق پاشا زندہ و سلامت بچ کر نکل گیا۔ اور مفتی صاحب اپنے وعدہ کو عاقبت اندیشی پر محمول کرتے ہوئے واپس آ گئے۔

مصر سے اخراج توفیق پاشا جن ایام میں خدیو مصر ہوا وہ سید صاحب کی مساعی کو نتیجہ خیز بنانے کے موجب تھے۔ مصر کی بیداری ایک خونیں انقلاب کے دروازے پر کھڑی تھی۔ جا بجا آئینی اور غیر آئینی شورشوں کے چشمے پھوٹنے

گئے تھے۔ ان حالات میں ملوکیت کو اپنی ستمرانیوں کے لئے مناسب موقع خود بخود مل رہا تھا۔ توفیق پاشا سید صاحب کے لائحہ عمل سے پوری طرح واقف تھا، کیونکہ وہ لاج کا رکن رہنے کے باعث ان کے سیاسی مقاصد پوری طرح معلوم کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے شخصی استبداد کو جاری رکھنے کے لئے سید صاحب کے وجود کو خطرۂ عظیم خیال کیا اور ان کو بلاتوقف مصر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

اخراج کے اسباب ناظرین اس مضمون کے مطالعہ سے اس سوال کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے کہ مصر سے سید صاحب کے اخراج کے اسباب کیا ہیں کیونکہ ان کی حریت آموز سرگرمیاں ملوکانہ مقاصد کی راہ میں سنگ حائل سے کم نہ تھیں جن کے نتائج ملک کی عمومی بیداری سے گزر کر جہاد سوڈان اور عرابی پاشا کی فوجی تحریک کے پس منظر میں ظاہر ہونے والے تھے۔ تاہم بعض نقادوں کی غیر ضروری تنقیدات نے اس روشن ترین واقعہ کو بھی قابل تحقیق مسئلہ بنا دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مختلف روایات پیش کی جاتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ فری میسن لاج میں حکومت مصر اور انگریزوں کے خلاف منافرت انگیزی پیدا کرنا۔

۲۔ اہل علم اور ارباب اثر و رسوخ کو سیاسی انقلاب کے قابل بنانا۔

۳۔ سوڈان میں مخفی بیداری کی تخم ریزی۔ ۴۔ صوفیوں، ملاؤں اور قدامت پسندوں کی معاندانہ غوغا آرائی۔

۵۔ برطانوی سفیر کی توفیق پاشا سے درخواست۔ ۶۔ حکومت مصر کے خلاف فوجی تحریک۔

ان اسباب میں سے کسی ایک کو سید صاحب کے متعلق وجہ اخراج قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ تمام اسباب ان کے اخراج کے موجب تھے۔ البتہ سید صاحب نے آخری سبب کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ بالآخر سید صاحب ۸ شوال ۱۲۹۶ھ (مطابق ۱۸۷۹ء) میں قاہرہ سے عازم ہندوستان ہوئے۔

شیر اور اس کی خوراک جب حمید منا رخشت سفیر یا ندمہ کر مصر کو اپنے قدوم سعادت لزوم سے محروم کرنے والے تھے تو اس وقت ان کی مالی حالت اطمینان بخش نہ تھی۔ ایرانی سفیر نے ان کو کچھ طلائی سکے دینے چاہے لیکن وہ لینے پر رضامند نہ تھے تو سفیر نے کہا کہ آپ پردیس میں افلاس کا کس طرح مقابلہ کریں گے؟ سید صاحب نے جواب دیا کہ "شیر جہاں بھی جاتا ہے اپنی خوراک مہیا کر لیتا ہے"۔ ✦

اتحادِ اسلامی کی اولین دعوت

(از - افادات علامہ سید جمال الدین افغانی قدس اللہ سرہٗ)

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ۔

فرمانبرداری کرو اللہ کی اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ آپس میں نہ جھگڑو، ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

اسلام کی حکومت عرض میں مغرب بعید کے انتہائی نقطہ تس کینی ([illegible] واقع اطلانیہ) سے لے کر چین کی سرحد تک، اور طول میں بسمت شمال قازان سے لے کر جنوب میں خطِ استوا کے نیچے لنکا تک پھیلی ہوئی تھی اس کے تمام ممالک آپس میں ایک دوسرے سے متصل اور مربوط تھے۔ ان کی کوئی مصنوعی سرحدیں نہ تھیں۔ ان ملکوں کے تمام شہروں میں آمدورفت کی کسی پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یہاں مسلمان ہی آباد تھے اور وہی یہاں کے حکمران تھے۔ ان پر کسی کا دباؤ نہ تھا۔ نہ ہے شہ پادشاہوں نے جہاں حکومت ہاتھ میں لی اور اپنی شوکت سے زمین کے گوشے کونے تک کو ہلا دیا۔ بہت کم ایسا ہوا کہ ان کے لشکر کو ہزیمت ہوئی ہو۔ ان کا جھنڈا بلند ہی ہوتا رہا اور ان کا حکم تسلیم ہی کیا جاتا رہا۔

ان کے قلعے مستحکم تھے اور ان کی گڑھیاں مضبوط تھیں۔ ان کی پست و بلند زمینوں پر ان کے کھیت لہلہاتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ہاتھوں لگائے ہوئے باغ مختلف انواع درختوں اور پودوں سے ڈھکے رہتے تھے۔ ان کے شہر بسے ہوئے اور آباد تھے کیونکہ وہ آباد کاری کے محکم اصولوں پر بنائے گئے تھے۔ یہاں کے باشندوں کی صنعت و حرفت اور ان کی ایجادوں پر تمام دنیا کی قومیں فخر کرتی تھیں۔ دنیا ان پر فخر کرتی تھی کہ وہ تہذیب کے آفتاب تمدن کے ماہتاب

اسپانیہ اور ہندوستان کے گوہر شب تاب تھے۔ انکی ہی وجہ سے علم وادب میں ان کا مرتبہ بلند تھا۔

ایک طرف مشرق میں مسلمان حکماء میں ابن سینا، فارابی، رازی وغیرہ اور دوسری طرف مغرب میں ابن باجہ، ابن رشد، اور ابن طفیل جیسے اکابر پیدا ہوئے۔ ان دونوں سمتوں کے درمیان ایسے بکثرت مقامات تھے جہاں حکمت، طب، ہیئت، ہندسہ اور تمام علوم عقلیہ ونقلیہ کے عالموں کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ سب علوم وفنون شرعیہ کے سوا تھے جن کا رواج ملت کے ہر طبقہ میں عام تھا۔

عباسی خلفاء کی زبان سے ادھر ایک جملہ نکلتا اُدھر ایک طرف فغفور چین اپنا سر تسلیم خم کرتا تو دوسری طرف یورپ کا بڑے سے بڑا بادشاہ کانپ اٹھتا۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں میں محمود غزنوی، ملک شاہ سلجوقی اور صلاح الدین ایوبی، مشرق میں تیمور گورگانی اور مغرب میں محمد فاتح اور سلیمان قانونی جیسے فرمان روا ہوئے۔ گو اب وہ نہیں رہے، لیکن زمانہ نے ان کو بھلایا ہے نہ ان کا اثر ہی زائل ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کے بحری کی قوت کا یہ عالم تھا کہ بحیرۂ ابیض واحمر، اور بحر ہند میں اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا حالیہ زمانے تک بھی ان سمندروں میں انہیں کا بول بالا تھا۔ ان کے مخالف بھی ان کی قوت کی برتری کا اسی طرح اعتراف کرتے تھے جیسے ان کی بری برتری کا۔

آج بھی مسلمان ہیں۔ ان ہی ملکوں میں رہتے بستے ہیں جو ان کو اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملا ہے۔ ان کی تعداد چالیس کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان سب ملکوں میں ایسے افراد بستے ہیں جن کے دلوں میں دینی عقائد کا جوش موجزن ہے اور وہ ہر ظالم کے خلاف موت کے منہ میں جانے کے لئے تیار ہیں۔ اسی کے لئے وہ دنیوی زندگی کو ٹھوکر مارتے اور نمود ونمائش سے بے پرواہ رہتے ہیں۔ قرآن اپنے اٹل قوانین کے ساتھ آیا ہے اور وہ اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے عقیدوں کو دلیلوں سے پرکھ لیں۔ ظن وتخمین کی تاریکی سے نکل آئیں اور شک وشبہ کے خارزار میں نہ الجھیں۔ قرآن نے دعوت دی کہ انسان فضل وکمال حاصل کرے اور جذبات کو عقل کا پابند بنائے۔ اس طرح اس نے انسان کے دماغ میں حقیقت کی آبیاری کی اور اس کے دل میں کمال کا بیج بویا۔ اسی وجہ سے ان کی عقلیں روشن،

ان کے ذہن خبردار و چوکس اور انسانی کمالات کے حاصل کرنے میں ان کی استعداد بے پایاں ہے۔ اور اخلاق میں وہ استقامت سے بہت قریب ہیں۔ بلکہ اکثر تو وہ شرف مزیت کو اپنے ہی لئے مخصوص سمجھتے ہیں، خواہ اہل باطل کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے لیکن مسلمانوں کی سچی کتاب ان سے وعدہ کرتی ہے کہ تمام دُنیا کی مجموعی خصوصیتوں پر ان ہی کی خصوصیت نمایاں رہے گی۔ مسلمان اپنے اوپر کسی غیر کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور نہیں کر سکتا کہ اس کے ساتھ خواہ کتنی ہی سختی یا کتنی ہی نرمی کیوں نہ برتی جائے۔ وہ اپنے سوا کسی اور کے سامنے، خواہ وہ کتنا ہی ذی سطوت کیوں نہ ہو، اپنے گھٹنے ٹیک دے گا۔ مسلمانوں کے درمیان عقاید کی بندھنوں کی وجہ سے جو مضبوط برادرانہ تعلق قائم ہے اس کی بنا پر ہر فرد مسلم یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کی جماعت کا کوئی شخص بھی اجنبی طاقت کے زیر تسلط آجائے گا تو گویا وہ خود بھی اس اجنبی طاقت سے مغلوب ہو جائے گا۔ یہ ایسا احساس ہے کہ وجدان بھی اس کا ادراک کرتا ہے جس سے گریز نہیں۔ ان کے دین نے ان کے دلوں میں علم و حکمت کا جو بیج بویا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنی حکومت کے زمانۂ شباب میں اس کے بہترین حصہ کے مالک ہو گئے تھے اسی کی بنا پر وہ اب بھی اپنے آپ کو دوسروں کی بہ نسبت علم کے لئے زیادہ موزوں اور زیادہ اہل تصور کرتے ہیں۔ یہی حالت ان کی ابتدا میں تھی اور یہی حالت ان کی اب بھی ہے لیکن ان کے باوصف ان کی ترقی کی منزلیں ختم ہو گئیں۔ اور ایک عرصے تک دُنیا کے استاد رہنے کے بعد علم و فنون میں وہ اب غیروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کے ملکوں کی سرحدیں سکڑتی جارہی ہیں۔ اور ان کے علاقے پارہ پارہ ہوتے جارہے ہیں، حالانکہ ان کا دین ان کے دلوں پر نقش کرتا اور ان پر یہ لازم گردانتا ہے کہ جو ان کی مخالفت کرے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ ان کے دین کا سب سے بڑا رکن ہی یہی ہے کہ غیروں کی حکومت کی زنجیر اپنی پیٹھوں سے نکال پھینکی جائے اور ان کو اپنے ملکوں سے نکال دیا جائے بلکہ ہر صاحب حکومت سے جنگ کی جائے۔ کیا انہوں نے اپنے متعلق اللہ کا یہ وعدہ بھلا دیا کہ وہ تمام قوموں میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو نمایاں کرے گا خواہ گنہگار اس بات سے کتنی ہی بیزاری کا اظہار کیوں نہ کریں۔ کیا وہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اللہ نے جنت کے بدلے مسلمانوں کی جان اور ان کا مال خرید لیا ہے کہ وہ اس کا بول بالا کریں گے۔ ہرگز نہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اسلامی

عقیدے مسلمانوں کے دلوں کے مالک اور ان کے ارادوں کے حاکم ہیں۔ ان کے عوام اور ان کے خواص سب میں بلا تفرقہ نمود جنس، دینی عقیدے اور شرعی فضیلتیں یکساں جاگزیں ہیں۔

ہاں، ان میں علوم کی ترقی رُک جانے اور ان دلوں کی کمزوری کے اسباب میں سب سے بڑا سبب اقتدار پسند اور جاہ طلب افراد کا اختلاف ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کے سوا مسلمانوں کی اور کوئی قومیت نہیں ہے۔ مسلمانوں میں ایک سے زیادہ بادشاہوں کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے ایک قبیلے میں کئی سرداروں یا ایک قوم میں کئی بادشاہوں کا موجود ہونا جن کے اغراض مختلف اور جن کے مقاصد جدا جدا ہوں۔ ہر دشمن نے طبقہ خاص کے غور و فکر کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کے مظاہرے اور عوام کی خواہشوں کو جنگ کے وسائل کی تیاری میں مشغول کر دیا اور خود آپس میں لڑتے رہے۔ اس قسم کے جھگڑوں اور فسادوں کی حیثیت آپس کے خاندانی جھگڑوں کی سی ہے۔ بہر حال ان ہی جھگڑوں کی وجہ سے انہوں نے ان علوم و فنون کو بھی گنوا دیا جن کو وہ حاصل کر چکے تھے اور اس وجہ سے وہ ان چیزوں کو بھی حاصل نہ کر سکے جن کو انہوں نے اب تک حاصل نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے ترقی کئے بغیر وہ جمود و خمول میں پڑ گئے۔ یہیں سے وہ فلاکت و غربت پیدا ہوئی جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی قوت ضعف سے بدل گئی ہے اور ان کا انتظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ امرا کی لڑائیوں نے مسلمانوں کو اپنی اپنی طرف کھینچ کر ان کی فکر وحدت کو پارہ پارہ اور ان کی مادی قوت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ آپس کی دشمنیوں کی وجہ سے انہوں نے ایسے اجنبیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کیا جو خود ان کے دشمن تھے۔

اس صاف و صریح ہلاکت میں مسلمان امراء اس وقت تک مشغول رہے جب تک کہ جنگ و جدال کے میدانوں میں وہی سب پر چھائے رہتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس میدان میں ان پر غالب نہیں آ سکتی تھی، لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ بُرائی امراء کے دلوں میں جاگزیں ہوتی گئی۔ بے جا حرص اور بے بنیاد لالچ ان کی طبیعتوں میں پیدا ہوتا گیا اور ان ہی چیزوں نے ان کی کایا پلٹ دی۔ عزت و عظمت کا جمع شدہ سرمایہ جو ان کو وراثت میں ملا تھا، رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا اور اب وہ صرف امارت کے خطابوں اور سلطنت کے القابوں پر قناعت کرنے لگے۔ ایک طویل مدت تو اسی حالت

میں گزری کہ وہ صرف ان القاب کی شان و شوکت اور ان خطابوں کی ظاہری اور سطحی نمود و نمائش کے گرویدہ ہو کر محض عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے ایسے اجنبیوں اور ایسے غیروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو اپنی دینی حیثیت سے ان کے مخالف تھے اور قومی حیثیت سے ان کے جبلی دشمن۔ امداد و اعانت ان لوگوں سے طلب کی جو خود ان کے ہم مذہبوں کو کمزور اور بے دست و پا کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کو چھوڑ کر وہ دوسروں سے مدد کے طالب ہوئے اور یہ سب اس لئے کہ فانی لذتوں کو باقی اور ڈھلتے ہوئے سایہ کو برقرار رکھ سکیں

اندلس کے مسلمان اسی طرح تباہ ہوئے۔ ہندوستان میں سلطنت تیموریہ کے ارکان اسی طرح فنا کے گھڑے اترے ان کا فکری اثاثہ تباہ ہو گیا اور ان کے مادی آثار برباد ہو گئے۔ ان ہی کھنڈروں اور ویرانوں پر ان ممالک میں انگریزوں نے اپنی حکومت کی مستحکم عمارت تعمیر کی۔ اسلامی ملکوں میں احمقوں کی ہوا و ہوس گل کھلاتی رہی اور ان کی جھوٹی آزادی نے مسلمانوں کو ضعف و اضمحلال کے غاروں میں دھکیل دیا۔ کیا ہی بُرے کام تھے جو انہوں نے انجام دیئے اور جو کیا بُرا کیا۔ وہ بُرائیوں کی دلدل میں پھنسے رہے، ذلتوں کی کیچڑ میں لوٹتے اور نفس کی ہوا و ہوس میں سڑنے والے۔ ان ہی لوگوں نے ملت کے اجتماع کو پراگندہ کیا، اس کی شان و شوکت کو کمزور کیا، اس کے علوم و فنون کی ترقی کو روک دیا۔ صنعت، تجارت اور زراعت جیسے مفید کاموں میں رخنے ڈالے اور ان پیشہ وروں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

اللہ دُنیا کی حرص کا بُرا کرے۔ بُرائیوں کے شوق کی مضرتیں کیسی شدید اور ان کے اثرات کتنے بُرے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اللہ کے کلام کو پس پشت ڈال دیا اور تمام فرائض میں سب سے بڑے فرض کو بجا لانے سے انکار کر دیا۔ دشمن ان کے دروازوں پر کھڑا تھا اور یہ اختلاف کی آگ میں جل رہے تھے درآں حالیکہ ان پر فرض تھا کہ وہ کسی ایک بات پر متحد ہو جاتے اور اپنے دشمن کے حملہ کو پسپا کر دیتے۔ اس کے بعد ان کو موقع حاصل تھا کہ اپنی اپنی حالت پر پلٹ جاتے۔ حرص و طمع کی زیادتی نے ان کو کیا فائدہ پہنچایا؟ چھچھورپن کے ساتھ لاف زنی سے ان کو کیا حاصل ہوا؟ جب تک زندہ رہے دائمی حسرت ان کا حصہ اور مرنے کے بعد ابدی بُرائی ان کا ورثہ رہا۔ دنیا بزبان کی

برائیوں کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔

عزت حق کی قسم! راز عدل اس پر گواہ ہے۔ اگر مسلمان اپنے عقائد کی بناء اور اپنے با عمل عالموں کی نگرانی میں اپنے ہی حال پر رہتے تو ان کی فکریں متحد اور ان کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے پیوست رہتے مگر افسوس کہ ان مفسدہ پردازوں نے مسلمانوں میں اختلاف و افتراق کی آگ بھڑکائی کیونکہ ان کو سب سے زیادہ اسی میں اپنی بھلائی نظر آتی تھی کہ لوگ ان کو امیر یا بادشاہ کے لقب سے یاد کریں خواہ ان کا حکم کسی چھوٹے سے قریہ پر بھی نہ چلتا ہو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو ان مقاموں پر تباہ حال کر دیا ہے جن پر اللہ نے ان کو والی بنایا تھا۔ یہ اپنے ہی بادشاہ اور اپنے ہی خلفاء کے خلاف صف آرا ہوئے۔ حد یہ کہ وہ ایک دوسرے کی صورت تک سے بیزار ہوگئے، اور ان کی آپس کی الفت باہمی نفرت میں بدل گئی۔

یہ حقیقت شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اسلامی ملکوں کی عزت اور ان کے احترام کے لئے باہمی اتحاد و اتفاق اسلامی قانون کا سب سے اہم رکن ہے اور اس پر ایمان رکھنا مسلمانوں کا اولین عقیدہ ہے۔ اس کے لئے مسلمان کسی استاد کے محتاج نہیں ہیں کہ وہ ان کو اس کا سبق پڑھائے اس کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں کہ جس کو پڑھ کر یہ اصول اخذ کیا جائے اور نہ اس کو معلوم کرانے کے لئے کسی رسالے کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں جو لوگ اپنے ساتھیوں سے فکر و نظر کے لحاظ سے بلند ہیں ان کا ذکر نہیں ہے بلکہ عامۃ المسلمین بھی جب یہ دیکھتے ہیں کہ افکار کی پراگندگی اور اغراض کے انتشار کی وجہ سے ملت پر کیا افتاد پڑ رہی ہے تو ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں اور شدت غم سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اگر قوت و اقتدار باہمی کی کشاکش میں مبتلا رہنے والے ہوس کار امراء کی گمراہیوں کا وجود نہ ہوتا تو مشرق کا مسلمان مغرب کے مسلمان سے اور شمال کا مسلمان جنوب کے مسلمان سے مربوط و متحد رہتا اور وہ سب کے سب ایک ہی آواز پر لبیک کہتے۔

مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے سب سے پہلے ان اصولوں کا جاننا ضروری ہے کہ جن کے ذریعہ وہ اپنی مدافعت کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ وقت ضرورت وہ اتفاق رائے اور مستقل مزاجی سے کام لیں، اور تیسرے یہ کہ وہ

دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے افکار و آراء سے ربط و تعلق پیدا کریں اور ملت پر آنے والے خطرات کا احساس کرکے متحد ہو جائیں ۔

کیا آپ روسیوں کو نہیں دیکھتے کہ ان میں ان تین اصولوں کے سوا اور کوئی بات نہیں پائی جاتی فنون و صنائع کی ترقی کے اعتبار سے یہ قوم تمام یورپی قوموں میں سب سے پیچھے تھی ۔ ان کے ملک میں دولت و ثروت کے ذرائع بھی موجود نہ تھے اور اگر یہ موجود ہوتے تب بھی وہاں ایسی صنعتیں بھی نہ تھیں جن سے وہ ان ذرائع سے استفادہ کر سکتے ۔ اس لئے وہ افلاس اور تنگ دستی کی مصیبت میں مبتلا ہیں ، مگر اس کے باوصف جب ان کی قوم پر کوئی مصیبت آئے تو وہ اس سے خبردار ہو کر اس کے دفع کرنے کی تدبیریں کرتے اور وسائل ترقی پر اتفاق کرتے ہیں ۔ ان کے خیالات میں ہم آہنگی ، اور ربط ہونے کی وجہ سے وہ یورپ کی تمام سلطنتوں میں ایک عظیم الشان شہنشاہیت کے مالک ہو گئے ہیں ۔ روس میں آلات حرب تیار کرنے کے بڑے بڑے کارخانے نہیں لیکن اس کے باوجود اس کو ترقی کرنے سے کوئی نہ روک سکا ۔ روس کے ہمسایہ ملکوں میں فنون حرب کی جتنی ترقی ہوئی اتنی خود روس میں نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اپنی فوجوں کی تربیت کے لئے دوسری قوموں سے ماہروں کے حاصل کرنے سے اسے کوئی نہ روک سکا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس کی فوجوں کی یہ حالت ہے کہ یورپ کی سلطنتیں اس کی قوت سے خوف کھاتی اور اس کے حملہ سے ڈرتی رہتی ہیں ۔

لیکن ان امور میں ہم کو اپنے سوا کسی اور کی پیروی کرنے پر کس نے مجبور کیا ہے ۔ درآں حالیکہ ہمارے لئے ایسا کرنا بہت آسان ہے ، کیونکہ ملت کی برتری کے ہم سب سے زیادہ شائق اور جو کچھ گزر چکا ہے اس پر افسوس کناں ہیں ۔ ایک مرکز پر کل قوم کو جمع کرنے کے لئے اگر ہم تعاون کریں تو ہماری اس کوشش میں کون روڑے اٹکائے گا ۔ بلند حوصلہ ہمتوں کو پست کرنے اور آمادۂ عمل افراد کو روکنے والے بجز ان راحت طلبوں کے اور کون ہے جو صرف لذیذ کھانوں کی خواہش رکھتے ، نرم بستروں کی آرزو کرتے ، فلک بوس عمارتوں کی ہوس رکھتے اور خدم و حشم کی کثرت پر فخر کرتے ہیں ۔ یہ لوگ آنے والے سخت دنوں سے اپنی حکیتیوں کی حفاظت نہیں کرتے

البتہ اپنے ظاہری خطابوں اور اپنے وہمی رسموں کی نگہداشت میں لگے رہتے ہیں۔ موسموں کے تغیر پر محفلیں جمانے اور عیدوں کے مواقع پر جشن منانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ درباری آداب کے طور پر تعظیماً سر ہلاتے اور شان و شکوہ کے اظہار کے لئے توجہ کو اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔ پھر سرکاری کاغذوں پر اپنے لئے ایسے لقب درج کر لیتے ہیں۔ جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ انسانیت کے رتبے سے گرے ہوئے یہ لوگ گذشتہ تخیلات کی بنا پر ہر قسم کی ونائت پر راضی ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں اپنے دشمنوں کے ایسی تصرفات کو قبول کر لیتے ہیں جن کو کوئی شخص اپنی جان دیئے بغیر قبول کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی گردنوں کے طوق، ان کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں اور ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے ہیں، اور ان کے نیزوں کو اپنے شکار سے روکے ہوئے ہیں، بلکہ اس کو لوٹری کا شکار بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

اے اولوالعزموں کی یادگارو! اے عظیم المرتبت ہستیوں کے جانشینو! اے جواں مردوں کی نسل سے نسبت رکھنے والو! کیا زمانہ تم سے پھر گیا ہے؟ کیا تدارک کا وقت گزر گیا، کیا مایوسی کی گھڑی آ پہنچی؟ نہیں ہرگز نہیں! اللہ تمہیں اس سے محفوظ رکھے، خدا نہ کرے کہ زمانہ تم سے مایوس ہو جائے۔ اَورنا سے لے کر پشاور تک کا علاقہ اسلامی حکومتوں کے زیر سایہ ہے۔ ان سب کا عقیدہ ایک ہے۔ ان کو ایک مرکز پر جمع کرنے والا قرآن موجود ہے۔ ان کی تعداد آٹھ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ دُنیا کی تمام قوموں میں شجاعت اور بسالت کے لحاظ سے ان کا درجہ ممتاز ہے۔ کیا ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مدافعت کے اقدام کے لئے متحد ہو جائیں جس طرح کہ تمام دوسری قومیں متحد ہو چکی ہیں۔ اگر وہ اتفاق اور یک جہتی اختیار کریں تو یہ ان کے لئے کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ اتفاق تو ان کے دین کا اصل اصول ہے۔ کیا ان کے حواس جاتے رہے ہیں کہ انہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کی ضروریات ایک دوسرے سے کتنی وابستہ ہیں؟ کیا ان میں سے ہر فرد پر لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اس طرح دیکھے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور صرف ایک ایسا حصار قائم کرلیں جو ان کی جانب ہر طرف سے جوش میں اٹھتی ہوئی موجوں

کا رُخ پھیر دے۔

میرے اس کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تمام امور میں ایک شخص واحد ہی کا حکم چلا کرے کیونکہ اکثر حالتوں میں یہ ایک نہایت مشکل کام ہوگا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان سب پر قرآن ہی کی حکومت ہو۔ اور وہ اتحاد کا ذریعہ اپنے دین کو بنائیں۔ ہر ملک کی حکومت اپنے ہم مذہب دوسری حکومت کی حفاظت کی تاحد مقدور کوشش کرتی رہے کیونکہ ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی اور ایک کی بقا دوسرے کی بقا پر منحصر ہے۔ اس سے خبردار رہو کہ یہ ان کے دین کی اساس و بنیاد ہے جس سے خاص کر موجودہ زمانے میں اجتماعی ضرورتیں اور سیاسی احتیاجیں پوری ہوتی ہیں۔

اب اتفاق کا وقت آگیا ہے۔ یہی وقت اتفاق کا ہے۔ خبردار ہو جاؤ کہ زمانہ تمہیں مہلت دے کر تم سے ہمدردی کر رہا ہے پس اس مہلت کو غنیمت جانو، اور اپنی کوششوں میں کمی نہ کرو۔ رونے سے مُردہ زندہ نہیں ہوتا۔ کف افسوس ملنے سے متاع گم گشتہ ہاتھ نہیں آتی غم کھانے سے مصیبت دُور نہیں ہوتی۔ عمل ہی گنج نجات کی کنجی ہے۔ صداقت و اخلاص، فوز و فلاح کا زینہ ہے۔ خوف موت سے قریب کرتا ہے۔ مایوسی اور دوں ہمتی ہلاکت کے اسباب فراہم کرتی ہے۔

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمومنین ثم تردون الی عالم الغیب والشھادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون۔ — جو چاہو کرو، اللہ، اس کا رسول اور مومنین تمہارے اعمال کا جائزہ لیں گے۔ پھر تم عالم غیب و حضور کے آگے پیش کئے جاؤ گے اور جو کچھ تم نے کیا ہے، اس کی وہ خبر دے گا۔

خبردار، ان لوگوں میں نہ شامل ہو جاؤ جن کی ترقی اللہ کو ناپسند ہے۔ جن کو اللہ نے بٹھا دیا ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ اس بات سے ڈرتے رہو کہ کہیں خدا کے اس قول کے مصداق نہ ہو کہ رضوا بان یکونوا مع الخوالف وطبع اللہ علی قلوبھم فھم لا یفقھون۔ وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہنا پسند کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، پس وہ نہیں سمجھتے۔ بے شبہ

قرآن زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت نہیں آئے گی جسے، کہ اس کی اچھائیوں میں سے کچھ بھی حصہ ملے گا وہ خوش نصیب ہوگا اور جو اس کی مخالفت کرنے والوں میں شریک ہوگا وہی بدنصیب ہوگا۔ اللہ کی کتاب منسوخ ہونے والی نہیں ہے اسی کی طرف رجوع کرو اور اسی کو اپنے احوال و اعمال کی کسوٹی بناؤ۔ وما اللہ بغافل عما تعملون۔ بیشک جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے غافل نہیں۔

غالباً اب مسلمان امراء اپنے گذشتہ اعمال کے بُرے نتائج سے سبق حاصل کر چکے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان سے پہلے گزرے ہوئے ظالموں پر جو آفت آئی تھی۔ ویسی ہی آفت ان پر آنے سے پہلے وہ اپنے اعمال کو درست کر لیں۔ ہمیں امید ہے کہ اتفاق و اتحاد کی دعوت دینے والی پہلی آواز اور خواب غفلت سے بیدار کرنے والی پہلی پکار اس کی طرف سے آئے گی جو ان میں مرتبے کے لحاظ سے بلند اور شان و شوکت کے لحاظ سے سب سے قوی تر ہوگا۔ ایسے تبع باعمل علماء اس نیک کام میں اس کی پوری پوری امداد و اعانت کریں گے۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وللہ الامر من قبل و من بعد۔ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اوّل و آخر سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

سیّد جمال الدین افغانی اور شعر و شاعری

(از جناب شبلی صاحب بی کام اڈیٹر عالمگیر و خیام لاہور)

شعر اور شاعر علامہ سیّد جمال الدین افغانی گزشتہ دو صدیوں میں عالم اسلام کے سب سے بڑے مفکر، مجتہد اور مرد مجاہد تھے۔ اور آج اسلامی ممالک میں جتنی بھی سیاسی تحریکیں زندہ نظر آتی ہیں اُن سب کا سرچشمہ سید مرحوم کی تعلیمات ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کو گل و بلبل اور زلف و رخسار کی شاعری سے نفرت تھی۔ وہ شاعر کو ایک قومی معمار تصور کرتے تھے جو ہیئت اجتماعی کی ترقی اور ارتقائے مدنیت میں بیش از بیش حصہ لیتا ہے۔ انہوں نے شعر و شاعری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فارسی کے ایک مقالہ میں کیا ہے جس کا ترجمہ قارئین کے استفادے کے لئے درج ذیل ہے:۔

"بعض لوگ ایک عجیب ذوق، نادر وجدان اور مذاق سلیم کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ مذاق "مذاقِ سخن" اور یہ ذوق "ذوقِ شعر گوئی" کہلاتا ہے۔ اس طبیعت کے آدمی نادر معنے کو عالم وجود میں لاتے ہیں۔ اور نئے نئے افکار اس طرح ایجاد کرتے ہیں کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ گویا وہ مٹی کو اس طرح صاف کرتے ہیں کہ وہ چاندی ہو جاتی ہے۔ یا غواص کی طرح تفکر کے دریا میں غوطے لگا کر ایسے آب دار موتی نکال لاتے ہیں جو نازک اندام حسینوں کے زیب گوش و گلو ہوتے ہیں۔ کبھی مبتذل مضامین کو ایسے پیرایہ میں جلوہ گر کرتے ہیں کہ طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ اُن کی مثال ایک ایسے سنگتراش کی سی ہے جو پتھر کے ایک بے ڈھنگے ٹکڑے کو اپنی صناعی سے تراش کر ایک دلربا حسینہ ایک نامور شجاع یا انصاف پسند بادشاہ کا مجسمہ تیار کرتا ہے۔

"اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بعض انسان میں ایک خاص رجحان اور ایک عجیب ذوق لطیف

پایا جاتا ہے جس کو ہم "وجدان" اور "ذوقِ شعری" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ افراد بسا اوقات نہایت ہی نادر معنیٰ کو عالمِ وجود میں لاتے ہیں۔ نظم گوئی کا میلان اور شعر و شاعری کا ذوق اپنے اثر و نفوذ میں بہت حیرت انگیز ہوتا ہے۔ جب وہ پوری قوت سے فعل میں ظہور کرتا ہے تو ڈرپوکوں، بزدلوں اور مُردہ دلوں کے اندر بھی گرمئ حیات پھونک کر اُن کو شجاعت و بہادری کے میدانِ کارزار میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ اپنی معنی خیز لطافت سے بداخلاقی اور نفرت انگیز صفات کو لوحِ دل سے مٹا دیتا ہے۔ اور اپنے دلکش و دلآویز انداز سے غیر متمدن اور غیر مہذب افراد پر بھی لاثانی اثرات نقش کر دیتا ہے۔

"انسانی جدّ و جہد کی تاریخ میں اسی ذوقِ شعری نے نہ صرف حکمت و فلسفہ کا ساتھ دیا ہے بلکہ ان کے لئے میدان بھی تیار کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی ذوق انسان کو ہیئتِ اجتماعی کی ترقی اور ارتقائے مدنیت میں حصہ لینے والے عوامل میں سب سے پیش پیش رہا ہے۔ حقیقی ذوقِ شعری رکھنے والے ایسا بلند اور عالی رتبہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے خاص ارشادات، مجازات اور لطیف تشبیہات سے اپنے ولولہ انگیز کلام کو ایسی خوش اسلوبی سے مزیّن کرتے ہیں کہ وہ بلا امتیازِ زمان و مکاں ہر انسان کے دل میں راسخ ہو کر اُس کی عقل پر بھی قبضہ جما لیتا ہے۔ اسی طرح شاعر مذموم حرکتوں اور بداخلاقیوں کو ایسے نادر اور پُر اثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ بداخلاق انسان خود بخود اپنے خبثِ باطن کا اعتراف کر کے اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے۔ اقوامِ عالم میں اس طرح کا ذوقِ شعری رکھنے والے افراد کی تعداد خود اس کے علوم و معارف کی بلندی و برتری کی نسبت سے ہوتی ہے۔

"واضح رہے کہ حقیقی شعر اور شاعر سے مراد وہی ہے جس کے رتبہ عالیہ کو ہم نے ابھی متعین کیا ہے۔ نہ کہ وہ یاوہ گو شاعر یا بیہودہ گفتار ناظم، جن کو چند گنے چنے رکیک استعارات و تشبیہات کو جو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملے ہیں، بوسیدہ اور کہنہ لباس پہنانے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنی ساری عمر زید و بکر کی مدح و ذم میں بسر کر دیتے ہیں۔"

داغ دہلوی سے ملاقات

سید جمال الدین افغانی نے اپنا جرأت آموز پیغام مسلمانوں کے کانوں تک پہنچانے کے لئے اُن تمام مقامات کا دورہ کیا جہاں مسلمان آباد تھے۔ چنانچہ آپ ہندوستان بھی تشریف لائے۔ اور کلکتہ کو اپنی آمد سے سرفراز کیا۔ اُن دنوں نواب میرزا داغ دہلوی بھی کلکتہ میں فروکش تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کا خونین ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ دہلی اور لکھنو کی شاہی بساط اُلٹی جا چکی تھی۔ اور عظمت پارینہ کے کھنڈروں پہ ایک نئے ایوان کی تعمیر ہو رہی تھی۔ تاہم پرانی شاعری کی شمعیں بدستور ٹمٹما رہی تھیں! ور دہلی و لکھنو کے شاعر غریب الوطن ہو کر کلکتہ میں جمع ہو رہے تھے۔ "اختر پیا" (سلطان واجد علی شاہ) کی آمد نے سُونی محفلوں میں ایک مرتبہ پھر زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ اور کلکتہ میں آئے دن عیش و نشاط کی شاعرانہ محفلیں برپا کی جاتی تھیں جو کی حیثیت اچھے خاصے میلوں سے کم نہ تھی۔ میرزا داغ حضرت العلامہ کے علم و کمال کا شہرہ سُن چکے تھے جب انہیں سید صاحب کی آمد کا علم ہوا تو ملاقات کے لئے اُن کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے لیکن یہاں نہ تو ٹھاٹھ باٹھ تھے نہ سرمایہ دارانہ طرح داریاں اور تکلف۔ سید مرحوم ایک سادہ سی کرسی پہ تشریف فرما تھے۔ ارد گرد ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ اور کسی خشک سے علمی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میرزا داغ بھی ایک کونے میں جا بیٹھے۔ آخر ایک صاحب نے سید مرحوم سے داغ کا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ آپ اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ شہریار دکن کے استاد ہیں۔ اور اپنی شیریں نوائیوں کی بدولت "بلبل ہند" کہلاتے ہیں۔ سید نے ہاتھ ملایا۔ اور رسمی بات چیت کے بعد کلام سُنانے کی فرمائش کی۔ داغ اپنی تازہ غزل سُناتے رہے اور سید چُپ چاپ بیٹھے سُنتے رہے۔ غزل ختم بھی ہو گئی لیکن سید نے نہ کسی شعر کی داد دی۔ نہ عام سامعین کی طرح اپنا سر ہلایا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ حضرت داغ اپنا کلام سُنا کر رخصت ہو گئے لیکن سید بدستور سر جھکائے بیٹھے رہے۔ آخر کسی نے اُن سے پوچھ ہی لیا کہ حضرت! اس خاموشی کی وجہ کیا ہے۔ آپ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اور افسردہ لہجے میں ایک رباعی پڑھی جس کا آخری مصرعہ آج تک مشہور ہے۔ ع بجائے اسپ خر را داغ کردند

دراصل علامہ مرحوم ایک مجاہد آدمی تھے۔ وہ اسلامیانِ عالم کی رگوں میں جہد و حریت کا خون دوڑا دینا چاہتے تھے اور جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اُن کو گُل و بُلبل۔ زلف و رخسار اور ہجر و وصال کے قصّوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ "زلفِ دوتا" کی فرسودہ کہانی سُننے کے بجائے دار و رسن کا پیغام سُننا چاہتے تھے لیکن میرزا داغ دہلوی کے فانوسِ شاعری میں عمل و جہد کی چنگاری کہاں؟ وہ تو "اگلے وقتوں کے لوگ تھے اور اگلے وقتوں کے شاعروں کے نزدیک قصیدہ خوانی اور شہنشاہ پرستی ہی زندگی کا اصل مقصد تھا۔

سید مرحوم کون سے اشعار گنگناتے تھے؟ | سید مرحوم کے ذوقِ شعری کا اندازہ اُن اشعار سے بھی ہو سکتا ہے جو آپ تنہائی میں اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ میرزا لطف اللہ آپ کے خواہرزادہ تھے اور بعض روایات کے مطابق وہ عرصہ تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ شیخ کو خود بھی اُن پر بڑا اعتماد تھا چنانچہ ایک دفعہ آپ کے بعض شاگردوں نے آپ سے درخواست کی کہ اپنی زندگی کے حالات لکھوا دیجئے لیکن آپ نے جواب میں فرمایا کہ میرے حالاتِ زندگی میرزا لطف اللہ سے دریافت کرو۔ میرزا صاحب نے شیخ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ فرصت کے لمحات میں شیخ اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ اور عام طور پہ ذیل کے شعر اُن کے وردِ زبان رہتے تھے۔

نخستین بادہ کاندر جام کردند   ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند
چو خود کردند سرِ خویشتن فاش   عراقی را چرا بدنام کردند

باز از سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد است   ویران نشود عالم تا میکدہ آباد است

یا دل کہ تواند کہ دہد جان کہ تواند داد   دل گم شد و جان داند این بود خداداد است

آسمان رشک برد بہر زمینے کہ دراو   یک دو کس بہر خدا یک نفسے بنشینند

من آن شوخ طلعت از را می شناسم — من آن مایۂ ناز را می شناسم
بگوش من آمد همی آواز پائے — من آن صاحب آواز را می شناسم

اگر وہ اشعار جو ہم گنگناتے ہیں ہمارے کردار کے آئینہ دار ہو سکتے ہیں تو مندرجہ بالا اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ افغانی مرحوم کس دل و دماغ کے مالک تھے۔

سید کا ایک منظوم فارسی خط مجھے کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہو سکا کہ سید مرحوم شعر بھی کہا کرتے تھے یا نہیں۔ لیکن "مقالاتِ جمال الدین" (مترجمہ سید مبارز الدین رفعت ایم۔اے) میں ایک منظوم فارسی خط شامل کیا گیا ہے جس کے متعلق رفعت صاحب کا بیان ہے کہ یہ خط مولانا میرزا علی رضا شیرازی (لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی) نے اُن کو عطا فرمایا تھا۔ اور یہ "الموسی" (حیدر آباد دکن) میں شائع ہو چکا ہے۔ اگر یہ خط واقعی علامہ مرحوم نے لکھا ہے (اور بظاہر اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی) تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کا ذوقِ شعر گوئی بڑا پاکیزہ تھا۔ قارئین کی معلومات کے لئے یہ خط جو شاہ ناصر الدین قاچار کے نام لکھا گیا ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ ؎

تو تا باشی اے خسرو نامور — مرنجاں کسے را کہ دارد ہنر
بہ ویژہ کہ باشد ز روشن دلی — بہ جان دوستدار نبیؐ و علیؓ
یکی نامدارے ز ایران منم — کہ خود کردہ در جنگ شیران تنم
قلم دارم و علم و فرہنگ و رائے — نژاد بزرگاں و فر ہمائے
بگاہے کہ آمد تمیزم پدید — روانم بدانش ہمی بر کشید
ز گیتی نجستم بجز راستی — نگشتم بگرد کم و کاستی
ہمہ خیر اسلامیاں خواستم — دلم را بہ نیکی بیاراستم
ہمی خواستم تا کہ اسلامیاں — بوحدت ببندند یکسر میاں

همه دوستی با هم افزون کنند — ز دل کینهٔ دیرینه بیرون کنند
مر اسلامیان را فزاید شرف — نفاق و جدائی شود برطرف
مر اسلام آید بفرِ حمید — یکے اتحادِ سیاسی پدید
شود ترکِ ایران و ایران چو ترک — نماند دوئی در شهانِ سترک
همه نیز دانندگانِ عراق — بسلطانِ اعظم کنند اتفاق
ز دل ها زدانید این کینه نود — نگویند سنی و شیعه که بود
وزان پس بگیرند گیتی بزور — ز جانِ مخالف بر آرند شور
ابا چند آزاده مردِ گزین — بجستیم بس نام هائے متین
روانه نمودیم سوئے عراق — که برخیزد از عالمِ دین نفاق
به نیروے دادارِ جان آفرین — همه برنهادند امضا بر این
بجنشید حسن اثر نامه ها — که خام و نپخته نشد خامه ها
سپاسم ز یزدانِ پیروزگر — که این نخلِ امید شد بارور
نوشتند ز ایران و هم از عراق — که از دل بشستیم گرد نفاق
همه جان فدائے شریعت کنیم — بسلطانِ اسلام بیعت کنیم
گذاریم قانونِ بیگانگی — بگیریم آئینِ فرزانگی
از این پس همه کفر سازیم پست — بیازیم گیتی سراسر بدست
کیے از سلاطینِ اسلامیان — ز عباسیان تا به عثمانیان
ز سامانی و غزنی و دیلمی — ز سلجوق و خوارزمی و فاطمی
ز صدرِ سلف تا بگاهِ خلف — موافق نگردید بر این شرف

مگر اندریں عصر کامد پدید چنیں طرحِ محکم ز رائے سدید
گرت زیں بد آید گناہ من است کہ ایں شیوہ آئین و راہ من است
بر ایں زادہ ام ہم بر ایں بگذرم وز ایں فخر بر چرخ ساید سرم
اگر شاہ را بود گنجے نہاں مرا ساختی بے نیاز از جہاں
وگر از مسلمانیش بود بہر بہ نیکی مرا شہرہ کردی بہ دہر
چو در خونِ او جوہرِ شرک بود ز توحید اسلام خشمش فزود
مرا بیم دادی کہ در آرد پیل تنم را بزنجیر بندی چو پیل
ز کشتن نترسم کہ آزادہ ام ز مادر ہمی مرگ را زادہ ام
کسے بے زمانہ بگیتی نمرد بمرد آنکہ نامِ بزرگی نبرد
نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام کہ ایں طرحِ توحید افگندہ ام
گرم کش از مرگ شہم بسے مژدہ است دلم گنجِ گوہر ز علم آگندہ است
پس از مردنم ہست پایندگی کہ جاوید باشد مرا زندگی
نصیبِ من آباد و تحسین بود ترا بہرہ ہموارہ نفریں بود
پس از من نگویند نام آوراں مرا بندہ با یک دگر مہتراں
کہ کرمانیٔ راد پاکی نہاد ہمہ داد مردی و دانش بداد
پس از سیزدہ قرنِ پُر اختلاف نمودار کرد او رہِ ائتلاف
بہ توحید دعوات کرد ادعوئی بپیچید از کشتی و جادوئی
مرا آید از مشتری آفریں کہ بودم فدا کارِ دینِ مبیں
درودم ز مینو رسانند حور ہماں آسمانم فشانند نور

بدوزخ بمانی تو تیره روان — همه لعنت آید ز پیر و جوان

نشینند و گویند پیران راد — به نیکی نیارند نام تو یاد

که شه ناصر الدین بُدی یار کفر — از او گرم گردید بازار کفر

کسانیکه توحید دین خواستند — بدین مقصد قدس برخاستند

بیازرد و وافرو از خود براند — بگیتی بجز نام زشتی نخواند

تو ای شه چنین راه دین زد مکن — بنخیر همی نام خود بد مکن

که تا گر برآری دلم را ز جائے — همه دودمانت برآرم ز پائے

بگویم سخن هائے ناگفتنی — بشبنم گهرهائے ناسفتنی

که چون بود بیخ و تبار قجر — چگونه بشام آمدند در سر

به تاتار بهر چه آمیختند — ز شام از برائے چه بگریختند

مرا هست تاریخ اندر اروپ[1] — بقوت فزون تر ز توپ کروپ[2]

مبادا که آن نامه افشان شود — که بیخ و تبارت پریشان شود

همان به که خاموش سازی مرا

ز کینه فراموش سازی مرا

---

[1] اروپ ۔ یورپ ۔ [2] کروپ ۔ کارخانۂ توپ سازی

مفکرِ ملّت جمال الدین افغانیؒ

(طالوت)

تفکر جس کا اسلامی، تخیل جس کا ایمانی وہی ہے رہنما اپنا، جمال الدینؒ افغانی

وہ جس کے فکر سے تھے زلزلے قصرِ امارت میں ہُوا جن سے ملوکیت کا استیصال امکانی

نہال اسلام کا سینچا تمناؤں کے قطروں سے وہ جس کی آرزوؤں سے بڑھی قدرِ مسلمانی

وہ کلکتے سے قسطنطنیہ تک جس کی سیادت سے جیوشِ قوم میں پیدا ہُوا تھا جوشِ ایمانی

وہ شاہیں رفعتِ پرواز تھی جس کی ثریا تک وہ جس کی ہمتوں کی عرش و کرسی تک تھی جولانی

طراوت جس نے بخشی قوم کی افسردہ روحوں کو ترفع بخشِ انساناں ہے جس کی روحِ انسانی

ملا کر خاک میں خود کو جلایا قوم کو اپنی یہ ہیں وہ زندۂ جاوید سمجھا جن کو تو فانی

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

کہ خوش باشند گر شانرا بخاک و خون غلطانی

جمال الدین افغانی

(مولانا اظہر امرتسری)

محمدؐ کی وہ تعلیمِ اخوت فیض سے جس کے
ہوئی اک قصۂ پارینہ عالم کی پریشانی

فراہم کر کے قطروں کو کیا تبدیل موجوں سے
منظم کر کے موجوں کو بنایا بحرِ طوفانی

کیا مسلم کے دل میں درد پیدا ساری دنیا کا
کہ اک ذرّے کو بخشی مہرِ تاباں کی درخشانی

اگر اب دیکھنا ہے تجھ کو اس کا عکسِ نورانی
تو دیکھ آئینۂ علم جمال الدین افغانی

بڑھایا حسنِ مشرق صلح و یکسوئی کے غازے سے
کئے دور اُس کے رخساروں سے داغِ بغض و جنگ اُس نے

ایاغِ دہر خالی کر کے آبِ خانہ جنگی سے
انڈیلی اُس میں وحدت کی شرابِ لالہ رنگ اُس نے

بنایا ملتِ واحد تمام اقوامِ مشرق کو
سکھایا اس طرح آزادیٔ کامل کا ڈھنگ اُس نے

جہاں کے بتکدے میں زورِ بازوئے اخوت سے
کئے صد پارہ اصنامِ تمیزِ نسل و رنگ اُس نے

بصیرت دے کے اپنی دیدۂ وحدت و ملت کو
فرات و نیل و دجلہ میں دکھا دی موجِ گنگ اُس نے

جو کر دیتا ہے گھر آنکھوں میں بن کر خوابِ محکومی
کیا دور ایشیا والوں سے وہ سحرِ فرنگ اُس نے

اگر اب بھی ہو تقلیدِ جمال الدین افغانی
تو ہو سکتی ہے دور اقوامِ مشرق کی پریشانی

سید جمال الدینؒ افغانی کا پیغام مزارِ اقبالؒ پر

(از اصغر حسین خان صاحب نظیر لودھیانوی)

نظر آیا مزارِ شاعرِ مشرق کے پہلو میں   مجھے جس وقت تابوتِ جمال الدین افغانی
طلوعِ مہر و مہ ہے ایک ہی مطلع سے میں سمجھا   دو عالم ہو گئے جلوہ نما اک جا بآسانی
ملا عرشِ مقدس میں دونوں کی روحیں کل ملیں باہم   ملے ملائے زمیں پر آج دونوں کے تنِ فانی
کشش کتنی ہے خاکِ شاعرِ اسلام میں مسلم   کہ آئی خود بخود پروانہ بن کر شمعِ عرفانی
یہ کیا اعجاز ہے مردانِ حق مر کر بھی زندہ ہیں   ہے زیرِ خاک بھی ذوقِ محبت کی فراوانی

پیامِ زندگی دیتے ہیں ذرے خاکِ تربت کے
کہ یہ مٹی کے تودے ہیں خزینے علم و حکمت کے

صدا تابوتِ افغانی سے میرے کان میں آئی   کہ اے اسلام کی شانِ گزشتہ کے تمنائی
کبھی سوچا بھی یہ کیوں قوم کو ادبار نے گھیرا   ہوئی جلوہ گر اقوام میں کیوں تیری رسوائی
نظر کو کر لیا محرومِ قرآں کے حقائق سے   حرم میں تو نے پیدا کر دیا رنگِ کلیسائی
کیا تھا ختم جس قیصر و کسریٰ کی شوکت کو   سپردِ گوشۂ نسیاں ہے وہ شمشیر آبائی
مرے پیشِ نظر اُس شاعرِ مشرق کا مدفن ہے   کہ چشمِ کور جس کی خاک سے پاتی ہے بینائی
گزشتہ عظمتوں کو یاد کر کے عمر بھر رویا   اُسے بھولی نہ دینِ مصطفیٰ کی عالم آرائی

سُنا تو نے پیام اُس کا مگر سمجھا نہ راز اُس کا
مفسر ہے کلام اللہ کا ہر تارِ ساز اُس کا

نوائے جبریل

(مظاہر القادری)

پیغام سُناتے ہیں یہ اب تک لبِ جبریل — ہے ذاتِ محمدؐ ہی پہ ہر خیر کی تکمیل

وہ مدرسے بازارِ تجارت ہیں کہ جن میں — مذکورِ احادیث نہ قرآن کی ترتیل

بے سوز ہے بے روح ہے یہ گرمیٔ محفل — واعظ کے فسانوں میں ہے تخئیل ہی تخئیل

اس دور میں اربابِ تصوف کے اشارے — قرآں کا مفہوم بھی کر دیتے ہیں تبدیل

یہ واعظ و صوفی کی حکایات و کنایات — یہ حسنِ مراعات ہے وہ صنعتِ تعلیل

الواحِ زبور آج بھی اہرام میں ہیں خاموش — باقی نہ رہی عصمتِ اوراقِ اناجیل

اُس قوم کے ایمان کا اللہ نگہباں — جس قوم میں ہوتی ہو مزارات کی تقبیل

ہے بدر کا میدان مسلمان کی فردوس — اتنی بھی بہت کچھ ہے اس اجمال کی تفصیل

یہ خانقہی سلسلۂ رُشد و ہدایت — کچھ جدتِ تشبیہ ہے کچھ ندرتِ تمثیل

ہو روح کی تہذیب کہ قلبوں کا تمدن
یہ فتنۂ نمرود ہے وہ مکرِ عزازیل

جمال الدینؒ افغانی اور موجودہ مسلمان

(مولانا لطیف انور گورداسپوری)

جمال دین تھا گویا جمال الدین افغانی! — جہان خاک میں تھی اس کے دم سے شعلہ سامانی
دلِ بے باک، چشم حق نگر، ذوقِ خود آگاہی — حضورِ عشق میں تھا ناگوارا طعنِ کوتاہی
محمد مصطفےٰؐ کی ذات تھی آئینۂ ہستی — اسی دولت سے تھا بھرپور گویا سینۂ ہستی
اسی جلوہ سے اُس کا دیدۂ بینا منوّر تھا — کہ اس آئینہ بے عیب کا بے عیب جوہر تھا
شکستِ ماسوا سے سربلندی ہاتھ آتی ہے — خدا والوں کے سائے میں خدائی ساتھ آتی ہے
خیالِ غیر سے جب دیدہ و دل پاک ہوتے ہیں — تو فرشِ راہ گویا آپ ہفت افلاک ہوتے ہیں
مسلماں کی جبیں تابندۂ تقدیر ہوتی ہے — نظر میں جلوۂ حق ہاتھ میں شمشیر ہوتی ہے
جمال الدین افغانی، وہ مردِ پاک فطرت تھا — کہ جس کا ہر قدم راہِ خدا میں خوش طریقت تھا
وہ اپنی منزلِ مقصود سے ہرگام شاداں تھا — کہ اس کے سامنے باطل کا ہر عالم گریزاں تھا
زمانہ روکنے کے واسطے جب راہ میں آیا — وہ سیلِ تند تھا کہ ہر خس و خاشاک پہ چھایا

تُو اپنے جادۂ منزل سے واقف کیوں نہیں اب تک
کہ فرشِ راہ ہے تیرے لئے ہر سرزمیں اب تک

ہماری مطبوعات

شرح اسرار خودی از پروفیسر یوسف سلیم چشتی بی اے قیمت ؏ر	**تعلیمات اقبال** از پروفیسر یوسف سلیم چشتی بی اے قیمت ؏ر	**یادِ اقبال** از غلام سرور فگار قیمت ؏ر
اقبال کے چند جواہر ریزے از پروفیسر عبدالحمید ایم اے قیمت ۱۰ر	**اقبال کا تصور زمان و مکان** از پروفیسر رضی الدین صدیقی ایم اے قیمت ۱۰ر	**موت و حیات اقبال کے کلام میں** از پروفیسر رضی الدین صدیقی ایم اے قیمت ۶ر
تعلیم کا مسئلہ از پروفیسر رضی الدین صدیقی ایم اے قیمت ؏ر	**سیدہ فاطمہ** از مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری قیمت ؏ ۱۲ر	**محمد عبدہ** از مولوی مظہر الدین صدیقی بی اے قیمت ؏ر
القاء الہام اور وحی از مولانا سید محمد ذوقی شاہ صاحب ایم اے قیمت ؏ر	**کتب سماوی پر ایک نظر** از مولانا سید محمد ذوقی شاہ صاحب ایم اے قیمت ؏ ۱۲ر	**ابو جعفر منصور** از مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری قیمت ؏ر
القول الجمیل (عربی) از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قیمت ۸ر	**ملتِ بیضا پر ایک نظر** از ڈاکٹر سر محمد اقبال قیمت ۶ر	**اقبال پر ایک نظر** از سید محمد شاہ ایم اے قیمت ؏ ۸ر

شفاء العلیل اردو ترجمہ القول الجمیل قیمت عہ	**تقویۃ الایمان** حضرت شاہ اسماعیل شہید قیمت عہ	**ہیگل کا فلسفہ** قیمت ۸ر
معرکۂ اسلام و جاہلیت از مولانا صدر الدین اصلاحی قیمت عہ	**بکھرے موتی** نہایت پاکیزہ ادبی افسانے از لفٹنٹ کرنل عطاء الرحمن صاحب قیمت ۱۲	**عہد نبوی کے میدان جنگ** از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب قیمت عہ

مولانا ابو الکلام آزاد (تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں) از مولانا ابو سعید بزمی صاحب قیمت عہ	**المنبہات (عربی)** از شیخ ابن الحجر العسقلانی قیمت عہ

اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے طلب فرمادیں

ہماری تازہ ترین مطبوعات

۱۔ فیوچر آف اسلام ان انڈیا مسٹر ایف۔ کے درانی مرحوم کی کتاب ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر ایک شاندار اور زبردست کتاب ہے انگریزی داں حضرات مسٹر درانی مرحوم کے طرز نگارش اور زور انشاء پردازی سے خوب واقف ہیں انہیں مرحوم کی اس آخری تحریر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ قیمت تین روپے بارہ آنے (۳/۱۲)

۲۔ اشتراکیت اور اسلام۔ اشتراکیت اور اسلام پر آج تک جس قدر قابل قدر مضامین لکھے گئے ہیں یہ کتاب اُن سب کا ایک شاندار مجموعہ ہے اسمیں مولانا عبیداللہ العمادی، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اشتراکیت کے اس پرآشوب زمانہ میں اس کتاب کا مطالعہ ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

۳۔ شرح جاوید نامہ۔ یہ علامہ اقبال کی کتاب جاوید نامہ کے مضامین پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی اس سے اچھی نظیر آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ قیمت ایک روپے آٹھ آنے (۱/۸)

۴۔ شفاء العلیل۔ یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی کتاب القول الجمیل کا اُردو ترجمہ ہے اسمیں تصوف کے آداب اشغال اور طریق کار پر بحث کی گئی ہے چشتیہ، نقشبندیہ اور قادریہ کے وظائف اور اوراد علیہ اوران سے فوائد حاصل کرنے کے طریقے حضرت شاہ صاحب نے بالکل مستند طریق سے بیان فرمائے ہیں۔ یہ کتاب صوفیاء کرام کیساتھ عقیدتمندی رکھنے والے حضرات کیلئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱/۸)

۵۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ اس کتاب میں اُن مجاہدین اسلام کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں جنہوں نے حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے زیر قیادت سولھویں صدی کے ربع اول میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا اسکے علاوہ انگریزوں کی وہ تعلیمی اور سیاسی پالیسی کھول کر بیان کی گئی ہے جو انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تسلط کے آغاز کار ہی سے مسلمانوں کو پست کرنے کیلئے وضع کی تھی۔ بڑی مقبول کتاب ہے آپ بھی ضرور مطالعہ فرمادیں۔ قیمت دو روپے بارہ آنے (۲/۱۲)

۶۔ کالا پانی۔ مولانا سید احمد بریلوی کی جماعت مجاہدین اسلام کے ایک فرد مولانا محمد جعفر تھانیسری کو انگریزوں نے گرفتار کرکے جزائر انڈیمان بھیج دیا تھا۔ انہوں نے اپنی گرفتاری، مقدمہ اور حالات زندگی پر اس کتاب میں روشنی ڈالی ہے بڑی کام کی کتاب ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (۱/)

مینجر اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور

اقبال اکیڈمی

اقبال ایک شاعر [illegible]

[illegible]

[illegible] اقبال

اقبال کا پیام حریت

اقبال [illegible]

[illegible] اقبال [illegible]

تعلیم کا مسئلہ

اقبال کے چند جواہر ریزے۔ [illegible]

یاد اقبال۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

اسلام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]